مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ العنکبوت —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورة العنكبوت)
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز ؒ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	اکتوبر 2008ء
مطبع	....	زبیر خالد اینڈ اختر پرنٹرز، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز ؒ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔معراجِ انسانیت)



فہرست مشمولات سورۂ العنکبوت

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نواں باب: **العنكبوت** (آیات 26 تا 28: مسئلہ جنسیات)

دسواں باب: **العنکبوت** (آیات 29 تا 37)

گیارھواں باب: **العنکبوت** (آیات 38 تا 44)

بارھواں باب: **العنکبوت** (آیت 45: تصور و مبادیاتِ صلوٰۃ)

تیرھواں باب: **العنکبوت** (آیت 45: صلوٰۃ اور ذکر)

سترھواں باب: **العنکبوت** (آیات 60 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسبیل

برادرانِ عزیز آج ایک بار پھر اس محیرالعقول کائنات کے خالقِ حقیقی کی عظمت کے سامنے ہمارا سر تسلیم خم ہے کہ جس کی فیض یابی کے باعث بزمِ طلوعِ اسلام لاہور ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان'' کے سلسلہ کی سولہویں جلد سورۃ العنکبوت کی تفسیر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔

عزیزانِ من اس سے پیشتر ہم نے سورۃ الفرقان میں ''حرف تمنا'' کے عنوان کے تحت تحریر کیا تھا کہ:

''قرآن حکیم کے متعلق نوعِ انسانی کے نزدیک سب سے اہم اور مقدم سوال یہ سمجھا جاتا ہے کہ آخر وہ کون سی خصوصیتِ کبریٰ ہے کہ جس کے تحت اس قندیل آسمانی کو ذکر للعالمین کہا گیا ہے اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ قرآن حکیم کی صداقتوں اور حقیقتوں کو علیٰ الوجہ بصیرت تسلیم کیے بغیر کوئی شخص بھی مومن نہیں ہوسکتا۔'' اس لیے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا تعلق اس کے مقرر کردہ قوانین و اقدار سے ہی ہوتا ہے جب کہ اس کے برعکس انسانی دنیا میں سب سے بڑا جرم قوم کو نظریاتی طور پر خوئے غلامی میں مبتلا کر دینا ہے لیکن آج تو پوری انسانیت کی معاشی، سیاسی، تمدنی زندگی کا انگ انگ شخصیت پرستی میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت بالغہ کی وضاحت کرتے ہوئے اس عہد کے عظیم مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ نے مئی 1980ء کی 16 تاریخ کو درسِ قرآن حکیم کے شروع میں فرمایا:

> ''جیسا کہ آپ احباب کو علم ہے میں نہایت انکساری سے متعدد بار عرض کر چکا ہوں کہ میری عمر قریباً ساری کی ساری قرآنِ کریم کے ہی غور و فکر میں گذری اور اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ آخر اس کے بعد آپ نے قرآن حکیم کی تعلیم کا ملخص کیا پایا اور اس کا نقطۂ ماسکہ، اس کا مرکزی موضوع، اور اس کا عمود کیا ہے یعنی یہ کیا چاہتا ہے اور اس نے کیا کیا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے؟ تو وہ ایک فقرے میں یہ ہے کہ اس نے انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرایا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں تو یہ ہے کہ خدا نے کچھ اپنے متعلق اس میں کہا ہوا ہے وہ یہ کچھ کر رہا ہے اور یہ اس کی کتاب ہے، اس نے اپنے متعلق یہ کچھ کہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کتاب تو اسی کی ہے مگر وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

یہ ترجمان جو ہے یہ تو انسان کا ہے اور اس میں اس کے صحیح مقام سے اسے آشنا کرایا گیا ہے اور یہ چیز مذاہب کی دنیا میں تو ایک طرف رہی، یہ تو دنیائے فکر و دانش میں کہیں نہیں ملے گی، جو اس نے قرآن حکیم میں بیان کی ہے۔''

عقل انسانی کے بل بوتے پر تشکیل پانے والے نظامِ حیات کا ماحصل

عزیزانِ من جہاں تک سورۃ العنکبوت پر دیئے گئے درس کا تعلق ہے تو اس سورۃ کے عنوان کے پیشِ نظر قرآن حکیم کی روشنی میں علامہ پرویز صاحب تنہا عقل انسانی کے بل بوتے پر تشکیل کردہ نظام کے ماحصل کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''جہاں کہیں بھی کوئی ایک بڑی ہی عمیق اور نظری چیز آتی ہے تو قرآن وہاں فوراً محسوس مثال دیتا ہے۔ کہا کہ مَثَلُ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡلِیَآءَ (29:41) یہ لوگ جنہوں نے اقدارِ خداوندی کو چھوڑ کر اور نظام اور اصول اور اقدار اور روشیں اختیار کیں، اور پھر وہ ایسی قومیں تھیں جنہوں نے اس قسم کے لوگوں کو اپنا سہارا بنایا، تو وہ بہت مطمئن تھیں۔ کہا کہ کیفیت یہ تھی کہ کَمَثَلِ الۡعَنۡکَبُوۡتِ (29:41) یہ تو مکڑی کا جالا تھا۔ مکڑی کا جالا کرتا یہ ہے کہ جو اُس سے کمزور مکھیاں مچھر ہوتے ہیں، ان کو تو پھانس لیتا ہے۔ اور اگر کوئی اُس سے طاقتور پھونک بھی مار دے تو سامنے کچھ نہیں ہوتا۔ کہا کہ یہ سارا تمکن، یہ سارا علم و بصیرت اپنے سے کمزور کو پھانسنے کے لیے تو بہت ٹھیک تھا لیکن اس سے زیادہ قوت والا ایک بھی آئے تو اُس کی تو پھونک کو نہیں سہار سکتا۔ کیا بات ہے اس مثال کی! کہا کہ گھر وہ بناؤ جو طاقتور کو پھانس لے اور کمزور کی حفاظت کرے، وہ گھر نہیں ٹوٹے گا۔ مکڑی کے جالے نہ بناؤ جو ہر کمزور کو پھانس لے گا۔ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی (2:256) جس نے غیر خدائی قوانین کو تیاگ کر، اقدارِ خداوندی کے محکم سہارے کو پکڑ لیا، تو اُس نے ایسا سہارا پکڑا جس کا ٹوٹنا تو ایک طرف، وہ تو تڑکتا بھی نہیں ہے۔ کہا کہ سہارا لینا ہے تو وہ سہارا لو۔ ان مکڑی کے جالوں کے سہاروں کی کیا کیفیت اور تمہاری کیا حالت ہوگی۔ اِتَّخَذَتۡ بَیۡتًا ؕ وَ اِنَّ اَوۡہَنَ الۡبُیُوۡتِ لَبَیۡتُ الۡعَنۡکَبُوۡتِ (29:41) کوئی ذرا سا بھی مقابل میں زور والا آ جائے تو اُس کے سامنے یہ ختم ہو جاتی ہے۔ کہا کہ ہم نے مثال سے بات تو سمجھائی ہے، خدا کرے کہ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ (29:41) تم علم و عقل کی رو سے بات سمجھو کہ میں کیا کہہ گیا ہوں''۔

عقل انسانی کی یہی وہ ناکامی ہے کہ جس کا احساس کرتے ہوئے علامہ اقبال نے آج سے 70 سال قبل فرمایا تھا کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

چنانچہ ان گنت قسم کی معاشرتی، سیاسی، تمدنی ہزار کوششوں کے باوجود بھی یہ عقل انسانی مصائب والام کے بھنور سے نکل کر آزادی کے بحرِ بے کراں کے آبِ حیات سے اپنی تشنگی نہ بجھا سکی۔

عزیزانِ من! زندگی کے یہی وہ حقائق ہیں کو جن محسوس کرتے ہوئے۔

ہمارے اس دَور کے ماہرِ سیاسیات ایچ جے مینکن (H.J.Mencken) نے اپنی کتاب Treatise on Right and Worng میں لکھا ہے:

''تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقل مند ہے اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لیے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقع محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا، تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے، اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ جب حکومت ہاتھ آجاتی ہے تو اس پبلک کی حکومت نہیں بلکہ سلب ونہب ہوتا ہے۔''

مندرجہ بالا حقیقتِ حال کے پیشِ نظر اگر یہ پوچھا جائے کہ آخر ایسا کیوں ہے تو اس کا جواب علامہ اقبال کے الفاظ میں اس کے علاوہ اور کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ

عقل بے مایہ امامت کی سزا وار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

عزیزانِ من! عقلِ بے مایہ کی یہی وہ خامی تھی کہ جس کے پیشِ نظر خدائے علیم وخبیر نے نوعِ انسانی کو قرآن حکیم کی روشنی عطا فرمائی تا کہ یہ حضرت انسان زندگی جیسی عظیم نعمت کو ''زبوں کارِ حیات'' ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔

قرآن حکیم اور سائنس

پرویزؒ صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآنی حقائق کی بلاغت کو سمجھنے کے لیے یہ لازم ہے کہ انسان اپنے دور کی علمی سطح

سے کماحقہٗ واقف ہو چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ اس حقیقت کے پیشِ نظر محترم علامہ پرویزؒ نے ''سورۃ العنکبوت'' پر پیش کردہ دورس کے دوران اس کے آٹھویں درس میں قرآن حکیم کے لفظ ''بدع'' اور ''فطر'' (کہ جس کے بغیر لفظ خلق کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے) کے متعلق نظریہ ارتقا کے سلسلہ میں جو سائنسی انکشافات اور علامہ اقبال کی بصیرت افروز راہنمائی پیش کی ہے انہیں ضرور دیکھ لیا جائے کیونکہ اس سے ہمیں یہ بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ قرآن حکیم نے اپنے ہاں چودہ سو سال پیشتر انسانی سوچ کو جلا بخشنے کے لیے کس قدر بلند نگہی کا سامان مہیا کر رکھا ہے ہمارا خیال ہے کہ اس درس کے مطالعہ کے بعد آپ بے ساختہ اس حقیقت کا اعتراف لیے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ وحی کی آغوش میں نشوونما پانے والی شخصیت کا شعور گوہر تابدار بن کر صدیوں پر پھیلے ہوئے انسانی زندگی کے اس طویل سفر کو کس قدر محدود سے محدود حد تک سمیٹ سکتا ہے۔

عزیزانِ من! یہی وہ قندیل آسمانی ہے کہ جس کے روشنی میں نوع انسانی قیصر و کسریٰ کی جکڑ بندیوں اور احبار و رہبان کی زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کرتے ہوئے آزادی کی اس نعمت سے لطف اندوز ہو سکے گی جسے آسمان کی آنکھ صدیوں سے دیکھنے کی منتظر ہے۔

اقبال کے الفاظ ہیں:

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لاہور
اکتوبر 2008ء

پہلا باب: **العنکبوت** (آیت 1: ابتدائیہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اور [1] ہم جو ورق پلٹتے ہیں تو اگلی سورۃ جو ہمارے سامنے آتی ہے، وہ العنکبوت ہے۔ عنکبوت کا نام ہی بتا رہا ہے کہ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے جتنے بھی قوانین اور نظام ہیں، یہ مکڑی کے جالے کی طرح ہیں۔ یہ اپنے سے جو کمزور ہے اس کو پھنسا لیتے ہیں لیکن جو اپنے سے طاقتور ہو، وہ اُس کی پھونک کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔

انسانوں کی سوچ پر مبنی نظام مکڑی کے جالے کی طرح ہوتا ہے

عزیزانِ من! اس سورۃ کی ابتدا ہوتی ہے اور دیکھیے کہ کتنا ربط ہے! پیچھے کہا ہے کہ اتنا بڑا نظام ہے جو تم نے قائم کرنا ہے اور اب کہا کہ الٓمّٓ (29:1) خدائے علیم و حکیم کا ارشاد ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ھُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ (29:2) یہ لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہوں نے اگر کہہ دیا کہ ہم نے خدا کو مان لیا یا میں خدا کو مانتا ہوں تو بس کیا اس سے چھٹی پائی اور جنت میں پہنچ گئے۔ دیکھا کہ یہ اٰمنا کہاں آیا ہے۔ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا (29:2)۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ کہہ دیا کہ ہاں صاحب! میں خدا کو مانتا ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ یقولوا والی بات نہیں ہے۔ وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ (49:14) یہ ایمان ان کے دل کا تقاضا (Inner Urge) نہیں بنا ہے، یہ اَحَسِبَ النَّاسُ ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ھُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ (29:2) یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ بس کہا کہ میں خدا کو مانتا ہوں اور ایمان ہو گیا۔ یہاں کہا ہے کہ وَ ھُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ (29:2)

---

[1] یہ درس مارچ 1979 کی 16 تاریخ کے درس کا آخری حصہ ہے۔ اسے کتابی سہولت کے لیے اس سے الگ دیا جا رہا ہے تا کہ قارئین سورہ العنکبوت کی تمام آیات کو اس سورۃ کے سیاق و سباق کے حوالے سے وجہِ آگاہیٔ قلب و نگاہ بنا سکیں۔

یہ تو خام لوہا ہے جو تم لائے ہو۔ پتہ نہیں کتنی مرتبہ اور کن کن بھٹیوں میں سے گزار کر اِس کو فولاد بنانا پڑے گا۔ فتن بھٹی کو کہتے ہیں۔ خام لوہے کو فولاد بنانے کے لیے یا دھات کو سونا یا کندن بنانے کے لیے بھٹیوں میں سے گزارنا پڑتا ہے:

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

آپ نے دیکھا کہ اگلی سورۃ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اِس میں پچھلی سورۃ کے ساتھ ربط ہے۔ دنیا بھر کے جتنے حکمران ہیں، اُن کو بُتانِ آزری[1] کہہ کر ایک خدا کی محکومیت اختیار کر لینا۔ **یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا** سے بات نہیں بنے گی کہ ہم نے کہہ دیا کہ ہاں صاحب! ہم خدا پہ ایمان لائے۔

جنت کے حصول کے لیے انسان کو کئی ایک تصادمات سے گزرنا پڑے گا

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں اس کی تفسیر آئی ہے کہ یہ بھٹیاں کیا ہیں، کس کس قسم کے تصادمات ان میں ہوتے ہیں؟ کوئی شخص بھی برضا و رغبت اپنا ایک پیسے کا مفاد نہیں چھوڑنا چاہتا۔ یا تو اُس کو فریب دیا جاتا ہے یا سحر کیا جاتا ہے، یا مذہبی پیشوائیت ہے، یا چھینا جھپٹا جاتا ہے۔ یہ استبداد ہے۔ ویسے تو کوئی نہیں دیتا۔ جس سے آپ خیرات کے طور پہ لیتے ہیں تو بظاہر نظر آتا ہے کہ رضامندی سے دے رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے دل کے اوپر آپ اپنا ایک اثر ڈالتے ہیں اور وہ اُس کے تابع دے رہا ہوتا ہے۔ تو یہ جو اتنے بڑے مفادات ہیں، کیا یہ آسانی سے چھوڑ دیں گے؟ کہا کہ **اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ** (2:214) کیا تم سمجھتے ہو کہ بس ہم نے جو کہہ دیا کہ ایمان لے آئے تو کیا اِس سے تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ تم سمجھتے ہو کہ بس اتنے سے ہی کام ہو جائے گا۔ ایک تو ٹکٹ لینا پڑتا ہے اور اُس کے لیے پیسے دینے پڑتے ہیں، ''اک فری پاس ہوندا ہیگا اے''[2]۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یوں جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ **وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ** (2:214) حالانکہ ابھی تمہیں تو اُن بھٹیوں سے گزرنا نہیں پڑا جن سے اس سے پیشتر اِس قسم کی قومیں گزریں جنہوں نے اپنے آپ کو جنت میں جانے کا اہل ثابت کیا۔ اُن کی کیا کیفیت ہوئی؟ کہا کہ **مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا** (2:214) انہیں اِس قدر تصادمات، اِس قدر رتزاحمات، اِس قدر جنگ، اِس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ اُن کے اندر زلزلہ آ گیا، اُن کے دلوں کی بنیادیں ہل

---

[1] سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی، باقی بُتانِ آزری (اقبالؒ: بانگ درا)

[2] ایک فری پاس ہوتا ہے۔

گئیں۔ اِس قدر مشقت ومصائب ومشکلات کی چیزیں ہیں۔ **حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ** (2:214) یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ وہ رسول اور اُس کے ساتھی بھی خدا سے پکار اُٹھے کہ یا اللہ! جس مدد کا تُو نے ہم سے وعدہ کیا تھا وہ کب آئے گی؟ یعنی وہ یہ نہیں تھا کہ اُن کو یقین نہیں تھا کہ وہ آئے گی نہیں بلکہ یہ تھا کہ وہ کب آئے گی۔ کہا کہ یا اللہ! ہمیں یقین ہے کہ وہ آئے گی لیکن

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک [1]

رسول اور اُن کے رفقا کی یہ حالت ہوگئی کہ اُن کے اوپر تزلزل آ گیا' وہ پکار اُٹھے کہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ کامیابی ہوگی' فتح مندی ہوگی تو وہ کب ہوگی۔ اس مقام پہ پہنچ کر اُن سے کہا کہ **اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ** (2:214) گھبراؤ نہیں' بہت قریب آ گئے ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ رسول اور اُن کے ساتھیوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ ان مراحل میں سے گزرنے کے بعد کہیں جا کر پھر وہ اِس کے مستحق بنتے ہیں کہ ان تدخلوا الجنة (2:214)۔ اِسی موضوع کے متعلق دو ایک آیتیں اور لیجیے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم تو سارا انہی تصادمات سے بھرا پڑا ہے۔ کہا کہ **اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوْلِهٖ وَ لَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَ لِیْجَةً** (9:16) یہ سمجھتے ہیں کہ بس کہہ دیا کہ ہم خدا پہ ایمان لائے اور ان کو چھوڑ دیا جائے گا حالانکہ ابھی تو خدا نے یہ دیکھا ہی نہیں ہے کہ تم میں سے کون اِس جدوجہد میں پورا اترتا ہے۔ اِس میں سے دنیا کے ہر ساتھی کو چھوڑنا پڑتا ہے اور صرف خدا اور اُس کے رسول اور اُس کے مومنین کی جماعت کا ساتھ دینا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جو منزل تم کہتے ہو کہ وہ جنت کا اہل بننے کی ہے' تو پھر کہیں جا کر وہ آتی ہے۔

ایک اور آیت ہے۔ اس میں خود نبی اکرم ﷺ کی اور صحابہ کبار ؓ کی جو کیفیت ہے وہ بتائی جا رہی ہے۔ حضور ؐ مدینے میں آ گئے تھے اور ان جنگوں کا سلسلہ مسلسل جاری تھا۔ یہ قریباً اسی بیاسی کے قریب جھڑپیں ہوئیں' ان میں بڑی بڑی جنگیں بھی تھیں۔ اُن میں اِس قسم کی جنگیں بھی ہوئیں جن میں یہ کہا کہ **اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ** (33:10) دشمن اوپر سے' نیچے سے' دائیں سے' بائیں سے تمہارے اوپر حملہ کر رہے تھے۔ **وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ** تمہاری نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ **وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ** (33:10) تمہارے دل اچھل کے حلق تک پہنچ چکے تھے۔ **وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا** کئی کئی

---

[1] مرزا اسداللہ خان غالب (1797-1869)

خیالات دل میں گزر رہے تھے کہ خدا کی مدد کب آئے گی۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (33:10-11) جو خدا پہ ایمان کے دعوے دار ہوتے ہیں تو اُن پہ یہ حالتیں گزرا کرتی ہیں اور اِس کے بعد کہیں جا کر وہ اِس کے مستحق قرار پاتے ہیں۔اس میں استحقاق کا' حق کا' سوال نہیں ہے بلکہ اہل ہونے کا سوال ہے۔ جو کسی چیز کے معیار کے اوپر پورا اترے تو پھر وہ ایسا بنتا ہے۔ یہ ہے جنت میں داخل ہونے کی بات۔ یہ پاس لے کر داخل ہونے والی بات نہیں ہے۔ یوں وہ ان مراحل میں سے گزر کر جنت کا اہل بنتا ہے۔ یہ ہیں وہ بھٹیاں جو قرآن نے کہی ہیں۔قرآن نے کہا کہ شاید تم سمجھے ہوئے ہو کہ ہم نے يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا کہہ دیا اور جنت میں پہنچ گئے۔ پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ آپ کہتے رہیے' ہمیں ڈراتے رہیے جبکہ ہمارے پاس جنت میں داخل ہونے کے فری پاس ہیں۔

روایات کی رو سے جنت میں داخل ہونے کے سہل الحصول طریقے

اب میں چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرونگا جن میں جنت میں داخل ہونے کے سہل الحصول طریقے ہیں جو احادیث کے اندر موجود ہیں اور وہ بھی کوئی چھوٹی موٹی کتابیں نہیں ہیں بلکہ بڑی بڑی کتابیں ہیں جن کو صحاح ستہ [1] کہا جاتا ہے یعنی صحیح اور معتبر۔نظر آ رہا ہے کہ جب وہ چیزیں ذہنوں سے نکلیں اور صرف خدا پر ایمان آ گیا تو اُس کے بعد پھر جنت کے حصول کے کس کس طرح کے طریقے وضع کیے گئے۔ابو داؤد کی حدیث کی کتاب میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ اُنہیں بخش دیتا ہے۔مسلم کی حدیث ہے کہ وضو کرنے والے کے تمام گناہ پانی کے ساتھ ٹپک جاتے ہیں یہاں تک کہ پانی کا آخری قطرہ ہر عضو کے آخری گناہ کو ساتھ لے کر ٹپک جاتا ہے۔طبرانی کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم جہنم کی آگ میں جلتے رہتے ہو یعنی آگ کے کام کرتے رہتے ہو لیکن جب صبح کی نماز پڑھ لیتے ہو تو وہ تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے یعنی دوزخ سے دور کر دیتی ہے' پھر ظہر تک وہی کام کرتے ہو لیکن ظہر کی نماز تم کو پھر ٹھنڈا کر دیتی ہے' پھر عصر تک وہی کام کرتے ہو لیکن عصر کی نماز ٹھنڈا کر دیتی ہے' اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں اپنے درمیانی اوقات کے گناہوں کو مٹا دیتی ہیں' جب تم سو رہے ہوتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا یہاں تک کہ نیند سے جاگو اور اگر رات کو دوزخ کے کوئی کام کرتے ہو تو صبح کی نماز اُنہیں ٹھنڈا کر دیتی ہے۔''روز دا روز حساب مکدا تریا جاندا پیا اے'' [2] ۔ایک اور حدیث میں ہے کہ ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے والا اگر دوسری نماز کے وقت سے پہلے مر

---

[1] حدیث کی چھ مستند کتابیں (۱) بخاری (۲) مسلم (۳) ترمذی (۴) ابوداؤد (۵) ابنِ ماجہ (۶) نسائی

[2] روزانہ کا حساب کتاب ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔

جائے تو جنت میں چلا جائے گا۔عزیزانِ من! یہ وہ احادیث ہیں جنہیں صحیح احادیث کہا جاتا ہے۔

جنت کے سلسلہ میں حضورؐ کی حدیث' جنت تلوار کی دھار کے نیچے ہے

میں تو یہ عرض کرونگا کہ قرآنِ کریم کے ان احکام کے مقابلے میں نظر آتا ہے کہ کس طرح یہ روایات وضع کی گئی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ ہیں کہ جنہوں نے خود اپنی زندگی تیرہ سال مکے میں اُن مصیبتوں میں گزاری' سات سال مدینے میں لڑائیاں کرتے گزر گئی۔ان کی ایک حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جنت تلوار کی دھار کے نیچے ہے۔ یہ ہے جسے کہا جاتا ہے کہ یہ حضور ﷺ کی حدیث ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ شہید کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اُسے مردہ بھی نہ کہو۔ بلند مرتبہ شہادت کا ہے۔

جنت کے حصول کے لیے مسلم کی روایت

مسلم کی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو؟ حاضرین نے عرض کیا کہ جو خدا کی راہ میں مارا جائے۔حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اِس طرح تو میری امت میں شہداء کی تعداد بہت کم رہ جائے گی' لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہیں؟ کہنےؐ لگے کہ جو طاعون سے مر گیا وہ شہید ہے' جو اسہال یا دستوں کی بیماری سے مر گیا وہ شہید ہے' جو پانی میں ڈوب کر مر گیا وہ شہید ہے' جو مکان کے گرنے سے دب کر مر جائے وہ شہید ہے۔اِسی طرح سے ایک اور حدیث کی کتاب میں ہے کہ جو نمونیا سے مر جائے وہ شہید ہے' جو آگ میں جل کر مر جائے وہ بھی شہید ہے' جو عورت وضعِ حمل سے مر جائے وہ بھی شہید ہے' تو یہ سارے جتنے بھی ہیں یہ شہید ہیں۔ایک تو پاس وہ ہوتا ہے جو مسٹر پرویز کے لیے ہے' ایک پاس وہ ہوتا ہے، جو مسٹر پرویز اینڈ فیملی کے لیے ہوتا ہے۔روایات کی رو سے یہ کہا گیا ہے کہ شہید اکیلا ہی جنت میں نہیں جاتا بلکہ اپنے ساتھ بہت سے اقربا کو بھی جنت میں لے جاتا ہے۔ابوداؤد ؒ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ شہید کو اپنے خویش و اقارب میں سے ستر آدمیوں کی شفاعت کا حق دیدیا جائے گا۔یعنی اگر ایک ڈوب گیا ''بھاویں چپنی اچ پانی پا کے ڈوبے' او آپ تے نال اوہدے ستر''[1]۔عزیزانِ من! یہ بات ہنسنے کی نہیں ہے بلکہ یہ بات رونے کی ہے۔قرآن نے کہا تھا کہ کیا تم یوں خیال کیے بیٹھے ہو کہ یونہی جنت میں جا پہنچو گے' حالانکہ تم پہ یہ چیزیں نہیں گزریں۔ یہ چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں کہ تم یہ کچھ کہتے رہو لیکن ہم بتائیں گے کہ جنت میں کیسے جایا جاتا ہے۔ یہ تو جنت میں چلے گئے اور اس کے بعد کچھ رہ گئے جہنم میں جانے والے۔تو امام بیہقی کی روایت ہے کہ رمضان کی ہر رات میں سے چھ لاکھ دوزخی آزاد کیے جاتے ہیں اور رمضان کی آخری شب میں تمام گزشتہ تعداد کی مثل دوزخ سے آزاد کیے جاتے ہیں۔اسی طرح مسلم میں ہے کہ عرفہ کا روزہ رکھنے سے ایک سال پہلے اور

---

[1] بے شک وہ چلّو بھر پانی میں ہی ڈوبا ہوُ وہ آپ بھی اور اس کے ساتھ ستر اور بھی۔

ایک سال بعد کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں' محرم کی دسویں کا روزہ گزشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ اِس سے آئندہ ایک سال کے گناہوں کا بھی کفارہ بن جاتا ہے۔ عزیزانِ من! میں کہاں تک یہ چیزیں دہراتا چلا جاؤں۔ ایک وہ ہے جو قرآن نے مومن کی زندگی بتائی ہے اور ایک یہ ہے جو بقول ان کے ''تمام صحیح حدیث کی کتابوں'' کے اندر جنت میں جانے کے متعلق ہے۔ اب آپ سوچ لیجیے کہ یہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ یہ ہے وہ چیز جو یہ شخص چیخ کر کہہ گیا ہے کہ

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست
بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش
بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز' شیخ محمد اینڈ سنز' لاہور' ص 826)

''اللہ واسطے وی ملدی ہیگی اے''[1]

قرآن یہ کہتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرِکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْآ اٰمَنَّا وَ ھُمْ لاَ یُفْتَنُوْنَ (29:2) لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یونہی یہ کہہ دینے سے کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے وہ جنت میں چلے جائیں گے تو کیا ان کو اِن کٹھالیوں میں سے نہیں گزرنا پڑے گا' کیا یہ لوگ یہی سمجھے بیٹھے ہیں؟ یہ سمجھے ہی نہیں بیٹھے بلکہ یہ ایمان رکھتے ہیں اور اس ایمان کو وہ اُس ذاتِ اقدس ﷺ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جن کی ساری زندگی' آخری دم تک' انہی مشکلات کے اندر گزری۔ اس کی ایک مثال حضرت عمر ♦ کی بھی ہے۔ جب حضرت عمرؓ (581-644/45AD) سے کہا تھا کہ آپؓ نے تو بڑی عمدہ خلافت کی ہے اور قرآن کے مطابق نظام قائم کیا ہے تو اُنہوںؓ نے کہا کہ تم لوگ یہ کہہ رہے ہو! اُنہوں ♦ نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں عمر ہونے کے بجائے یہ ایک تنکا ہوتا تو مجھ سے مواخذہ تو نہ ہوتا' اب اگر کسی ایک مظلوم کی فریاد بھی خدا تک پہنچ گئی ہے تو میری ساری نیکیاں ایک طرف اور وہ جرم ایک طرف ہوجائے گا۔ آپ اندازہ لگائیے کہ یہاں ایک دن کا روزہ رکھنے سے جنت کا پاس مل رہا ہے۔ اب آپ اُس کے بعد انکوائری کمیشن بٹھاتے ہیں کہ ہماری یہ حالت کیوں ہوگئی ہے۔ عزیزانِ من! سورۃ العنکبوت کی پہلی ہی آیت ہم نے لی' دوسری آیت آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

---

[1] اللہ واسطے کی ملتی ہے۔

دوسرا باب: **العنکبوت** (آیات 2 تا 7)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1979ء کی 30 تاریخ ہےاور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی دوسری آیت سے ہوتا ہے: (29:2)۔ سابقہ جمعہ کو ہم نے اعلان کیا تھا کہ درس کا وقت 30-9 کی بجائے 00-9 کردیا جائے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ عام طور پر وہ بات ذہن میں نہیں رہی اس لیے ہم نے تھوڑا سا توقف کیا ہے اور کچھ دس منٹ دیر سے درس شروع کررہے ہیں کہ احباب وقت پہ آ جائیں۔

جنت کے حصول کے معاملے میں ہم فریبِ نفس میں گرفتار ہیں

پچھلا درس خصوصی تھا' اس لیے تجدیدِ یادداشت کے لیے دہرادوں۔ کہا یہ گیا تھا کہ **اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ھُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ** (29:2) کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ''میں خدا پر ایمان لایا'' کہہ دینے سے اُن کو چھوڑ دیا جائے گا اور اس ایمان کے صدقے میں وہ جنت میں پہنچ جائیں گے؟ کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں؟ عزیزانِ من! غور کیجیے کہ یہ کون لوگ ہیں جنہیں مخاطب کیا گیا ہے اور جن کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اِس فریبِ نفس میں مبتلا رہتے ہیں کہ صرف کہہ دیا کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں تو بس معاملہ ختم ہوگیا۔ کیا یہ ہمیں ہی مخاطب نہیں کیا جا رہا؟ جیسا کہ میں نے اُس دن بھی یہ کہا تھا کہ یہ بات کہ ''میں خدا کو مانتا ہوں'' کیا کبھی سوچا بھی ہے کہ اِس کے معنی کیا ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں اور دوسرا کہتا ہے کہ میں خدا کو نہیں مانتا تو ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ ہمارا خدا پر ایمان تو اتنا ہی ہے کہ ہم سے پوچھا جائے تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ میں خدا کو مانتا ہوں اور بات ختم ہوگئی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ نہ

ماننے والا معاملات کی دنیا میں، کردار کی دنیا میں، ہم سے بہتر ہی ہو لیکن ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ یہ کافر ہے اور ہم مومن ہیں۔ یہ فقرہ بڑا فریب انگیز ہے۔ اور یہ اِس قسم کی چیزیں واقعی خاص طور پر فریب دہی کے لیے Introduce (متعارف) کی گئی تھیں:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اِسے ❶

یہ عیسائیت کا نظریہ تھا کہ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پر ایمان لے آنے سے جنت مل جاتی ہے یعنی یہ مان لینے سے کہ وہ صلیب دیئے گئے تھے، اُنہوں نے ہماری خاطر صلیب پہ جان دی تھی اور اللہ نے اُن کو زندہ رکھا تھا تو جنت مل جاتی ہے۔ عیسائیت میں پولوس ❷ کا یہ فقرہ ہے کہ جنت اعمال کے بدلے میں نہیں ملتی بلکہ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے کے صدقے میں ملتی ہے۔ اُن کے خلاف تو ہم مناظرے اور مباحثے کرتے ہیں، اُن کے اس عقیدے کی تردید کرتے ہیں، جھٹلاتے ہیں۔ اور اپنی کیفیت یہی ہے کہ ہم نے کہا کہ ہم خدا کو مانتے ہیں اور اُس کے بعد معاملہ ختم ہو گیا اور ہم ایماندار ہو گئے۔ قرآن کہتا ہے کہ کیا یہ، یہ سمجھے بیٹھے ہیں اور اپنے نفس کو فریب دیئے بیٹھے ہیں کہ اتنا کہہ دینے سے کہ اٰمنا ہم ایمان لے آئے اور ہم خدا کو مانتے ہیں اور بس آگے کچھ نہیں کرنا۔ تو کیا انہیں چھوڑ دیا جائے گا کہ اب جو جی میں آئے کرو؟

لفظ یفتنون کا قرآنی مفہوم

اسی آیت میں اگلا ٹکڑا یہ تھا کہ وَ هُـمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (29:2)۔ کیا بات ہے اس عربی زبان کی اور قرآن کے انتخاب کی! آگ میں ڈالنا عذاب دینے کی بات ہے۔ انہی معنوں میں یہ لفظِ یفتنون عام طور پہ استعمال ہوتا ہے کہ آگ میں جھونک دینا۔ قرآنِ کریم میں جہنم کے لیے لفظ ہی النار ہے۔ لیکن یہ عربی زبان ہے۔ ایک تو کسی کو بھسم کر دینے کے لیے آگ میں ڈالنا ہوتا ہے اور دوسرا سونے کو کندن بنانے کے لیے آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ خام لوہے کو آگ میں تپایا جاتا ہے کہ وہ فولاد بن جائے۔ تو یہ کسی کی خامیوں کو دور کر کے

---

❶ مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے (اقبالؒ: ارمغانِ حجاز اردو)

❷ سینٹ پال (پولوس) جو پہلے یہودی تھا اور حضرت عیسیٰؑ کے متبعین کو سخت ایذائیں پہنچایا کرتا تھا، عیسائی ہو گیا تو اُس نے سینٹ برناس کی معیت میں انطاکیہ میں مسیحیت کی عام منادی کر دی (ص۔38)۔۔۔۔ کفارہ کے عقیدے کا بانی اور مبلّغ سینٹ پال ہے۔ عہد نامۂ جدید میں پولوس (سینٹ پال) کے خطوط پڑھیے، ہر جگہ اسی عقیدہ کی تبلیغ دکھائی دے گی (پرویزؒ: مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں، طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، 1996)۔

Paul, Saint (C.A.D. 5-67), also known as Saul of Tarsus, The Apostle to the gentiles. Originally an anti-Christian, he had a vision on the road to Damascus that led to his conversion; his life and doctrines are set forth in the Acts of Apostles and his epistles. (Reader's Digest: Universal Dictionary, Reader's Digest Association Limited, London, 1990, p.1136)

اُس میں پختگی پیدا کر دینا' اُس کی صلاحیتوں میں جلا پیدا کر دینا ہے۔ اِس طرح سے آگ میں ڈالنے کے لیے عربی زبان میں فتــن آتا ہے۔ اب یہاں یہ جو آگ میں ڈالنا کہا گیا ہے تو یہ مشکلات کا سامنا کرنا ہے۔ میں نے مختلف مقامات کی آیات کو پیش کر کے یہ بتایا تھا کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ جنت میں جانے کی اہلیت یا صلاحیت اُس میں پیدا ہوگی۔ یہ چیز نہیں ہے کہ اُس کے لیے پاس Issue (جاری) کیے جاتے ہیں کہ یہ جائے گا یا نہیں جائے گا بلکہ اُس کا اہل ہوا جاتا ہے' اتنی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے کہ اُس امتحان میں پاس ہونے کے بعد اگلی جماعت میں Promote ہوتا ہے۔ اور یہ جو مشکلات کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے' اُس سے انسان کو پتہ چلتا ہے کہ میرے اندر کتنی قوت آ گئی ہے' کتنی توانائی آ گئی ہے' کتنی صلاحیت آ گئی ہے۔ اگر یہ ٹکراؤ نہیں ہوتا تو انسان خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے۔

نظریۂ ارتقا کی بنیادی خصوصیت

یہ جسے نظریۂ ارتقا یعنی Theory of Evolution کہتے ہیں اُس کی بنیاد اس پر ہے کہ جتنی Species (انواع) ایسی آئیں جن کا ٹکراؤ نامساعد ماحول کے ساتھ ہوا اور اُنہوں نے اُس میں مقابلہ کر کے اپنے آپ کو زندہ رہنے کا اہل ثابت کر دیا تو وہ انواع (Species) تھیں جو آگے بڑھیں۔ جو ایسی تھیں جن کا ٹکراؤ نامساعد ماحول سے نہیں ہوا' یا تو وہ وہیں جامد ہوگئیں یا ساکت ہوگئیں یا ویسے کی ویسے ہی رہیں۔ اور اگر اور زیادہ عرصے تک یہی جمود اُن کے اندر رہا تو وہ Extinct (ناپید) ہوگئیں' فنا ہوگئیں' باقی ہی نہیں رہیں۔ یہ جو نامساعد ماحول سے یا مشکلات سے ٹکراؤ ہے یا تصادم ہے یا تزاحم ہے' یہ حقیقت میں جلا پیدا کرتا ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں مخالفت یا نامساعد ماحول کا مقابلہ کرنے کی کتنی قوت آ گئی ہے۔

خدا کا کسی کو آزمانے کا تصور بنیادی طور پر غلط ہے

ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو آزماتا رہتا ہے۔ اس سے ذہن میں یہ آتا ہے کہ جیسے وہ بیٹھا ہوا یہ دیکھتا ہے کہ ہم جو حکم دیتے ہیں' یہ مانتا ہے یا نہیں۔ یہ آزمانا ہوتا ہے۔ یہ بڑا غلط تصور ہے۔ خدا کو سب کچھ معلوم ہے۔ خدا بندے کو آزماتا نہیں ہے۔ ابتــلاء کے معنی ہوتے ہیں کہ ''ایسے مواقع بہم پہنچانا جن میں انسان اپنے آپ کو آزماتا رہے کہ مجھ میں کتنی قوت پیدا ہوئی''۔ انسان خود اپنے آپ کو آزماتا ہے۔ یہ ابتلائے خویش ہوتا ہے' اپنی آزمائش ہوتی ہے۔ خدا کسی کو نہیں آزماتا۔ اور یہ آزمائش تو بہرحال مخالف کے ساتھ تزاحم' تصادم اور ٹکراؤ میں ہی پتہ چل سکتا ہے کہ مجھ میں کتنی قوت پیدا ہوگئی ہے۔ اگر یہ تصادمات نہ ہوں تو انسان کو معلوم ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ ہے وہ چیز کہ تصادمات میں' مقابلے میں' اپنی ہستی کو برقرار رکھے اور دوسرے کے اوپر غالب آئے۔ یہ وہ چیز ہے جو ارتقا یا Evolution یا آگے بڑھنے کی ایک سیڑھی ہے جس پہ اُس نے قدم رکھا ہے۔ اِس طرح ان سیڑھیوں کے اوپر قدم رکھتے ہوئے جو

آ گے جاتا ہے' عروج کی طرف جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہیں جنہیں آپ جنت کہہ لیجئے' ارتقا کی اگلی منزل کہہ لیجیے۔ یہ ہیں اس کے معنی کہ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کہہ دینے سے کہ ''ہم خدا پر ایمان لے آئے'' بس اُس کے بعد وہ بیٹھے رہے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور وہ جنت میں داخل ہوگئے۔ اُنہوں نے یہ پاس Issue (جاری) کیا اور وہ جنت کے اندر چلے گئے۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہاں آیا ہے کہ وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۔ یہ بات کہ جب تک آگ میں تپانے کے بعد یہ سونا اپنے آپ کے متعلق نہ بتادے کہ مجھ میں کندن بننے کی صلاحیت ہے تو اُس سے پہلے جنت میں جانے کا تصور فریبِ خویش ہے۔ کہا کہ یہ بات انہی کے ساتھ نہیں ہوئی بلکہ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (29:3) یہ ہمارا ایک قانونِ ارتقا شروع سے چلا آ رہا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ جو انہی کے لیے ہم کہہ رہے ہیں۔ پہلی اقوام کے ساتھ بھی یہی ہوا' پہلی انواع (Species) کے ساتھ بھی یہی ہوا اور یہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ تو ہمارا ایک غیر متبدل قانون ہے کہ جو ٹکراؤ میں اپنے آپ کو کھڑے رہنے یا آگے بڑھنے کا اہل ثابت کرتا ہے تو وہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ یہی پہلے سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (29:3)۔ اب یہاں عام ترجمہ تو یہی ہوگا کہ یہ ٹکراؤ ہوتا رہا تا کہ خدا دیکھ لے کہ تم میں سے کون سچا ہے۔ تو خدا کے دیکھ لینے کے کیا معنی ہوئے؟ کیا خدا کو پہلے علم نہیں ہے کہ ان میں کتنی صلاحیت ہے اور کون ان میں سچا ہے اور کون جھوٹا ہے اور وہ یہ کچھ معلوم کرنے کے لیے کرتا ہے؟

خدا کی ذات وقت اور جگہ کی کیفیات سے ماورا ہے

وہ خدائے علیم ہے جو دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے اور جس کے نزدیک Past , Present & Future (ماضی' حال اور مستقبل) شے ہی کچھ نہیں ہے۔ اُس کے سامنے تو ایک Eternal Now (ابدی حال) ہے' ہر چیز اُس کے سامنے ہے۔ یہ تو ہمارے ذہن کا محدود دائرہ ہے' جو ہمارے ہاں ایک کل (yesterday) تھا' ایک آج (Today) ہے اور ایک آنے والا کل (Tomorrow) ہے اور آنے والے کل (Tomorrow) کے متعلق کوئی جانتا ہی نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ اُس کے لیے تو کوئی بھی کل آنے والا نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا ''تا کہ خدا اِس کو معلوم کرلے یا جان لے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے'' صحیح نہیں تو یہ بات خدا کے متعلق نہیں ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ تم اپنے کردار سے' اپنے ردِعمل سے' یہ ظاہر کردو کہ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (29:3) تم میں سے کون اپنے دعویٰ ایمان میں سچا ہے اور کون جھوٹا ہے۔

ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کی پہچان

ایمان کا دعویٰ تو تم سب کا ہے' وہ جو يَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا تھا وہ تو تم سب کہتے تھے۔ اب یہ جو کہنے والے ہیں ان میں سے کون سچا ہے

اور کون جھوٹا ہے؟ جسے جھوٹا کہا جائے گا وہ یہ بات تو نہیں کہے گا کہ صاحب! میں یہ کہنے میں جھوٹ بول رہا ہوں کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں بلکہ وہ تو کہتا ہے کہ صاحب! میں تو خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ اب قرآن کہتا ہے کہ ان میں سے کچھ سچے ہیں اور کچھ جھوٹے ہیں۔ یہ پتہ اُس وقت چلے گا جب اِن کو کٹھالی میں ڈالا جائے گا' ٹکراؤ ہوگا' تزاحم ہوگا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ یہ چیز میں پھر دہرا دوں' اس لیے کہ یہ بڑی بنیادی چیز ہے کہ ہم اپنے آپ کو فریبِ نفس میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں بات یوں سمجھ میں آئے گی کہ ایک شخص پاکستان کی شہریت قبول کرتا ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مملکتِ پاکستان کے وجود پر ایمان لاتا ہے' وہ مانتا ہے کہ یہ پاکستان کی ایک مملکت ہے اور وہ اُس کی Nationality (شہریت) قبول کرتا ہے۔ Nationality (شہریت) قبول کرنے کے معنی کیا یہ ہوتے ہیں کہ تم اُس کی Nationality (شہریت) بھی قبول کرو اور جو جی میں آئے وہ بھی کرتے جاؤ؟ Nationality (شہریت) قبول کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ پاکستان کے آئین' یہاں کے قوانین' یہاں کے قواعد وضوابط' یہاں کے احکام کی محکومیت' اختیار کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں یا اقرار کرتے ہیں۔ Nationality (شہریت) قبول کرنے سے یہ بات لازم آجاتی ہے کہ یہاں کے قواعد وضوابط اور احکام وقوانین وغیرہ جتنے بھی ہیں اُن کی محکومیت کو آپ تسلیم کرتے ہیں۔ اُس کے بعد اگر اُس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو آپ کو اُس کی سزا ملتی ہے۔ خدا پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اُس کی کتاب کو' اُس کے آئین کی محکومیت کو' تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اُس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ اُس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اُس کی سزا ملتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے ایمان لانا۔ یہ جو کہا ہے کہ تمہارے ردِعمل سے' تمہارے کردار سے' اِس امر کی نمود ہو جائے کہ تم میں سے کون اپنے اس دعوے میں سچا ہے اور کون جھوٹا ہے تو یہ اِن کے متعلق کہا ہے۔

دینِ خداوندی کی مخالفت کرنے والوں کا حشر

اب وہ جو مقابلہ کرنے والے ہیں کہ ہم یہاں حق کو متمکن نہیں ہونے دیں گے' اُن کے متعلق آیا کہ **اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ** (29:4) جو لوگ ہمارے نظام' ہمارے قانون' ہمارے آئین کا مقابلہ کرتے ہیں تو کیا وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ وہ ہم پر غالب آجائیں گے؟ ''سبقونا'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''کسی کو پیچھے چھوڑ جانا اور آپ اُس سے آگے بڑھ جانا''۔ عام طور پر میلوں میں' دھکم پیل میں' یہ ہوتا ہے کہ ''کسی کو مونڈھا مار کے آپ آگے چلے جانا''۔ یہ جو انداز ہوتا ہے تو اس کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ کہا کہ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمیں پچھاڑ دیں گے اور خود آگے بڑھ جائیں گے؟ سنو! **سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ** (29:4) یہ فیصلہ کتنا بُرا ہے جو یہ اپنے دل میں کیے بیٹھے ہیں! یہ بڑی اہم بات ہے۔ خدا کے قوانین کی مخالفت کرنے والے

کیا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کو مغلوب کر لیں گے' اِس کے اوپر غالب آ جائیں گے؟ اعتراض کرنے والا بجا طور پر اعتراض کر سکتا ہے کہ ہم دیکھ تو یہ رہے ہیں کہ خدا کے قانون اور آئین سے انکار کرنے والے ان کے اوپر غالب آتے ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ وہ بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور یہ دن بدن مغلوب اور ذلیل اور مفتوح ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ تو خدا نے یہ کہہ دیا کہ یہ ہم پہ غالب نہیں آ سکتے مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ خدا کو نہ ماننے والے دہریئے یا مشرک یا کافر' یہ سارے کے سارے' آج ساری دنیا میں آپ دیکھیے کہ جن کو ''خدا پرست'' کہا جاتا ہے' یہ خدا کو نہ ماننے والے اُن کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہیں' غالب ہیں' فاتح ہیں۔ یہ جہاں جہاں بھی ہیں اُن کے محتاج ہیں۔ اگر اِس سے یہی مفہوم لیا جائے تو یہ تو پھر دعویٰ ہی (معاذ اللہ) غلط ہو گیا۔ خدا یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ جو ہمارے قانون و آئین کی مخالفت کرتے ہیں' کیا یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہ ہم پہ غالب آ جائیں گے' ہمیں پچھاڑ دیں گے اور آپ آگے بڑھ جائیں گے؟ یہ کتنا بُرا فیصلہ ہے جو یہ اپنے ذہن میں کیے بیٹھے ہیں۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ قرآنِ کریم نے خود یہ بتایا ہے۔

قرآنی نظام کی بالا دستی انسانوں کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے

پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا کے قانون اور آئین کی بالا دستی انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوتی ہے۔ یہ لوگ جو دعویٰ کریں کہ ہم خدا کے آئین اور قوانین کے مطابق زندگی بسر کر کے اس نظام کو قائم کریں گے' تو یہ لوگ اِس دعوے اور اِس نظام کو قائم کرنے کے لیے اُٹھتے ہیں اور اُدھر ان کے مقابلے میں جو لوگ انسانوں کا خود ساختہ غلط نظام لے کر اُٹھتے ہیں' وہ ان پر غالب نہیں آ سکتے۔ خدا کا نظام از خود باطل کے اوپر غالب نہیں آ جاتا بلکہ وہ انسانوں کے ہاتھوں سے غالب آتا ہے۔ یہاں جو کہا ہے کہ کیا یہ لوگ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم خدا سے آگے بڑھ جائیں گے' اُس کو پچھاڑ دیں گے اور غالب آ جائیں گے؟ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ جماعت جو خدا کے قانون کو لے کر حق کی حمایت میں کھڑی ہو' اُس کے مقابلے میں باطل کی حمایت میں کھڑے ہونے والی جماعت ان پر غالب نہیں آ سکتی۔ یہ ہے قرآن کا دعویٰ اور یہ ہے وہ دعویٰ جس کے الفاظ ہمارے سامنے بالکل واضح ہیں۔ (4:141) بڑی اہم آیت ہے۔ اس میں ذکر لڑائیوں اور جنگوں کا آ رہا ہے جسے ہم جہاد کہتے ہیں۔ اُس ضمن میں یہ کہا گیا ہے کہ وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (4:141) یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ یہ کفار مومنین کے اوپر غالب آ جائیں بلکہ یہ ہے کہ وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ (4:141) خدا یہ کبھی نہیں کرے گا کہ اُس کے آئین و قوانین کی مخالفت کرنے والے اُن لوگوں پر غالب آ جائیں جو اُس کے آئین و قوانین کی حمایت میں کھڑے ہوں گے۔

کوئی بھی خود ساختہ نظام قرآنی نظام پر غالب نہیں آ سکتا

یہ خدا کے آئین و قوانین کی حمایت میں کھڑے ہونے والے ہوئے مومن اور یہ اس کے قوانین کی مخالفت کرنے والے ہوئے

کافر۔ وہ کہتا ہے کہ ہم کبھی ایسا نہیں کریں گے کہ کافر مومن پر غالب آ جائیں۔ اب ہمارے سامنے کسوٹی آ گئی۔ اگر اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں پر جنہیں یہ کافر کہتے ہیں' غالب ہیں تو دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے اور یا یہ ہے کہ یہ مومن نہیں ہیں۔ یاد رکھیے! اُس نے یہ دعویٰ مومنین کے متعلق کیا ہے۔ اگر دونوں ہی برابر کے کافر ہیں تو پھر وہ ان کی آپس کی لڑائی ہے' خدا درمیان میں نہیں آتا۔ خدا اس وقت درمیان میں آتا ہے جب خدا کے آئین کو برقرار و مستحکم کرنے کے لیے ایک جماعت وجود میں آئے۔ آج ہماری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئے گی۔ ہمیں معلوم ہی نہیں ہے کہ اُس کا آئین کیا ہے' اُس کا قانون کیا ہے' اُس کو مستحکم کرنے کے لیے کیسے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں؟ ہم تو یَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا والے ہیں' یعنی یہ کہنے والے کہ ہاں جی' ہم اللہ پہ ایمان رکھتے ہیں۔ اس ایمان کا وہ جانتے تھے جن کا مخالفین کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تھا۔ وہ جو ایران کا پابجولاں گورنر [1] آیا ہے' اُس ایران کا جس کی تہذیب ہزاروں سال سے دنیا کے اوپر چھائی ہوئی تھی' اُس سے مسلمانوں کے امیر المومنین [2] نے یہ کہا تھا کہ ایرانیوں کی کیفیت یہ تھی کہ صُلح تو ایک طرف وہ عرب کے ساتھ جنگ کرنا باعثِ ذلت سمجھتے تھے' کہتے تھے کہ ان کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترنا ہماری توہین ہے۔

ایران کا گورنر حضرت عمرؓ کی عدالت میں

ایران والے کہتے تھے کہ ''زشیرِ شتر خوردن وسوسمار [3]'' کیا اونٹیوں کا دودھ پینے والوں' گوہ کھانے والوں' کے مقابلے میں ہم اتریں؟ یعنی اُن کی یہ کیفیت تھی۔ آج اُن کا جو گورنر ہے وہ پابجولاں ہے' ہتھکڑی ہاتھ میں لگی ہوئی ہے اور وہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ (581-44/45AD) کے سامنے آیا ہے۔ حضرتِ عمرؓ نے اُس سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ کل تک تمہاری کیفیت یہ تھی کہ تم عربوں کے مقابلے میں تو ایک طرف تم عربوں کے ساتھ جنگ کرنا بھی اپنے لیے باعثِ ذلت سمجھتے تھے' یہ آج کیا ہو گیا؟ وہی تم ہو اور وہی یہ عرب ہیں۔ یہ اُٹھے ہیں اور تمہارا پورا ملک اِنہوں نے فتح کر لیا اور تم پابجولاں' قیدی کی حیثیت سے' ہمارے سامنے آئے ہو۔ کہا کہ پوچھتے ہو کہ یہ فرق کیوں پڑا؟ یہ کیا بات ہے! وہ کہنے لگا کہ جی! بات تو کچھ مشکل نہیں ہے' آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ عزیزانِ من! سنیے کہ جنہوں نے مومن اور کافر کا یہ ٹکراؤ دیکھا تھا' وہ کس طرح حقیقت تک پہنچے تھے۔ اُس نے کہا کہ جی! بات یہ تھی کہ اِس سے پہلے ایک طرف تنہا عرب ہوتے تھے' ایک طرف تنہا ہم ہوتے تھے۔ یہ عربوں کی اور ایرانیوں کی لڑائی ہوا کرتی تھی اور سوال ہی نہیں تھا کہ یہ عرب ایرانیوں پہ غالب آ جائیں۔ اب جو یہ میدان

---

[1] یہ ہرمزان تھا۔

[2] آپ حضرت عمر فاروقؓ (581-644/45AD) تھے۔

[3] یہ فردوسی کے الفاظ ہیں۔ اس کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 92 تا 94 نیز انہی صفحات کے فٹ نوٹ۔

میں گئے ہیں تو ایک طرف تو تنہا ایرانی تھے اور دوسری طرف عرب اور اُن کے ساتھ اُن کا خدا تھا اس لیے ان دو کا مقابلہ ہم نہیں کر سکتے۔

عزیزانِ من! یہ ہے ہماری تاریخ۔ یہ ہیں اس دعوے کی صداقتیں جو خدا نے کہا تھا کہ **وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا** [1] (4:141)۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ جو تنہا لڑ رہے ہوں، وہ ان کے اوپر غالب آ جائیں جن کے ساتھ خدا بھی ہو۔ یوں بات بنی۔ اب بات سمجھ میں آ گئی جو قرآن نے کہا کہ **اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا** (29:4) یہ جو انکار کرنے والے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیں پچھاڑ دیں گے یعنی خدا اپنے متعلق کہہ رہا ہے کہ کیا ہمیں پچھاڑ دیں گے۔ گویا مقابلہ خدا کے ساتھ ہو رہا ہے لیکن جب تک یہ عرب نہیں اٹھے تھے، خدا تو اُس وقت بھی موجود تھا۔ کہا جائے گا کہ اُس وقت تک تو ان خدا سے انکار کرنے والوں نے خدا کو پچھاڑ رکھا تھا، اِس کا دنیا میں کوئی نام ہی نہیں لیتا تھا۔ یہ کس طرح سے ہوتا ہے جو خدا نے کہا ہے کہ ہمیں نہیں پچھاڑ سکیں گے؟ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ جماعت جو ہمیں ساتھ لے گی وہ کبھی مفتوح اور مغلوب نہیں ہو سکتی۔ اُس کے ساتھ اُس جماعت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

خدا کا تیر اور محمدؐ کی کمان کی باہمی رفاقت کی کیفیت اور صورت

جب وہ جماعت حق کے لیے اٹھتی ہے تو وہاں خدا یہ کہتا ہے کہ تیر اندازو! یہ جو تم غالب آئے ہو تو یہ تیر تم نہیں چلا رہے تھے بلکہ ہم چلا رہے تھے لیکن جب تک یہ تیر ان کے دست و بازو سے نہیں نکلا تھا خدا تو اپنے تیروں کو ویسے کا ویسا لے کر بیٹھا ہوا تھا، اُس وقت تک اُس کے تیر نہیں چل رہے تھے۔ کیا بات ہے غالب [2] کی! کئی دفعہ یہ شعر آ گیا ہے اور ہزار دفعہ آنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نعت کی دنیا میں اور حقائق کی دنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا شعر اس کے مقابلے کا ہو:

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قضا کے تیر خدا کے ترکش کے اندر ہر وقت رکھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن

اما کشادِ آں ز کمانِ محمد است

وہ تیر اُس وقت چلتا تھا جب محمد ﷺ کی کمان کے اندر آ جاتا ہے، اُس کے بغیر ترکش کے اندر رکھے کا رکھا رہ جاتا ہے۔ قرآن کی ساری تعلیم کو اس شعر میں دہرا کر رکھ دیا۔

---

[1] تم کچھ بھی کر لو۔ یہ کبھی نہیں ہو گا کہ خدا کفار کو مومنین پر غالب آ جانے دے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔224)۔

[2] مرزا اسد اللہ خان غالب (1797 تا 1869)

عزیزانِ من! یہ تھے یہ لوگ جو سمجھے ہوئے تھے۔ یہ خدا اور بندے کی رفاقت ہے جسے ایمان کہتے ہیں' تیر اُس کے ہوتے ہیں اور کمان اِس کی ہوتی ہے۔ یہ دونوں جس وقت ملتے ہیں تو پھر یہ دوسروں کے مقابلے میں غالب آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جو خدا کا کائناتی قانون ہے وہ خود بھی چلتا ہے لیکن اُس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ پچاس پچاس ہزار سال کا اُس کا ایک ایک دن ہوتا ہے۔ وہ یہ تیر ہے جس کو آپ زمانے کے تقاضے کہتے ہیں' وہ انسانوں کو مار مار کے ایک طرف لاتا ہے۔ وہ انداز اور ہے لیکن جب اِس نے ٹکراؤ کی بات کہی ہے کہ جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرنے والے ہیں تو کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم سے آگے بڑھ جائیں گے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مقابلے میں ایک جماعت ہاتھوں میں کمان لیے ہوئے اُٹھتی ہے تا کہ خدا کے ترکش کے تیر ہدف کے اوپر جا کر لگیں ورنہ تیر ترکش کے اندر دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اسی لیے تو جب قرآن نے یہ کہا ہے کہ اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ اَنۡ يَّسۡبِقُوۡنَا (29:4) جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرنے والے ہیں' کیا یہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ ہماری گرفت سے بچ کر آگے نکل جائیں گے؟ یہ السیاٰت کتنا جامع لفظ ہے!

لفظ حسنات کا اور سیئات کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! بات ساری ہمواری اور ناہمواری کی ہے۔ جب بھی آپ نے انسانوں کے اندر تفریق پیدا کی تو اُسی کا نام سیاٰت ہے جس کا ترجمہ ہم نے برائی کر دیا اور حسنہ کا ترجمہ بھلائی کر دیا۔ ہم نے ذہن کے اندر خود ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ بھلائی ہے اور وہ برائی ہے۔ یہ بھلائی اور برائی کی بات نہیں ہے۔ جب بھی آپ نے انسان اور انسان کے اندر تفریق کی تو وہ چیز سیاٰت کے اندر داخل ہو گئی خواہ اُس کی شکل کچھ بھی کیوں نہ ہو' اُس سے ناہمواری پیدا ہو گئی۔ جب بھی آپ نے انسان اور انسان کے اندر ہمواری پیدا کی تو وہ حسنہ ہو گیا' یہ بھلائی ہے' یہ نیکی ہے۔ یہ نیکی اور بدی' اچھائی اور برائی ایران کے تصورات تھے۔ قرآن نے سیاٰت اور حسنات کہا ہے۔ اُس کا بنیادی Test (ٹسٹ) یہ ہے کہ آپ نے انسان اور انسان کے اندر کسی بھی انداز کی تفریق یا تفاوت پیدا کی تو بات سیاٰت میں آ گئی۔ کہا کہ وہ جو سیاٰت والے ہیں یعنی انسان اور انسان میں تفریق پیدا کرنے والے ہیں' ناہمواری پیدا کرنے والے تو کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم پہ غالب آ جائیں گے؟ یعنی کیا وہ اُس جماعت پر غالب آ جائیں گے جو شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کو لے کر اُٹھی ہے؟ وہ اپنے لیے نہیں اُٹھی بلکہ تمہارے لیے اٹھی ہے۔

حضور ﷺ کے دور میں تبلیغ کا عملی مفہوم اور ہمارے ہاں کے تبلیغی اجتماعات کا طریق

حضور ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کے لیے جو خط لکھا تھا اُس سے دیکھیے کہ اُس دور کے اندر تبلیغِ اسلام کسے کہا جاتا تھا۔ خط ایرانیوں کو

بھی لکھا تھا' رومیوں کو بھی لکھا تھا' حبش والوں کو بھی لکھا تھا۔ ایرانیوں کو جو لکھا تھا تو کہا یہ تھا کہ یاد رکھو! میں یہ پیغام تمہاری طرف پہنچا رہا ہوں۔ اگر تم نے ان حقائق کو تسلیم کر لیا اور اپنا نظام' اپنا انداز' اِس کے مطابق کر لیا تو ٹھیک ہے' ہم تم سے کچھ نہیں کہیں گے لیکن اگر تم نے اِس سے انکار کیا یا اس سے سرکشی برتی تو یاد رکھو! جتنے مظالم اِس وقت تمہارے ہاں کے کاشتکاروں پہ ہو رہے ہیں' اُن سب کا بدلہ تم سے لیا جائے گا۔ یہ جسے تبلیغِ اسلام کہتے ہیں یہ اس کے لیے تھا۔ وہاں کے جو مزارع' کاشتکار' غریب' محنت کش تھے اُن کے اوپر جو مظالم ہو رہے تھے اُن کا انتقام لینے کے لیے اِن کو کہا جا رہا تھا۔ اِنہوں ◆ نے اُن سے کہا تھا کہ باز آ جاؤ ورنہ یاد رکھو! اُن کا کفارہ تمہیں ادا کرنا پڑے گا اس لیے کہ تم اُس ناہمواری کے ذمہ دار ہو جو وہاں پیدا کی گئی ہے۔ یہ تھا نامہءمبارک' یہ تھے تبلیغ کے خطوط جو حضورؐ نے بھیجے تھے۔ اِسے کہتے ہیں اسلام کی طرف دعوت دینا۔ وہ دوسروں کو اسلام کی دعوت کیا دیں گے جن کے اپنے ہاں ناہمواریاں ہوں۔

سرمایہ داری نظام کی پیدا کردہ باہمی تفریق کی ذہنیت

عزیزانِ من! بات سے بات نکلتی ہے۔ ناہمواری کی تو پہلی چیز یہ ہے کہ انسان کھڑے ہو کر کبھی غور ہی نہیں کرتے کیونکہ ہمیں بتایا تو یہ گیا ہے کہ سوچنا ہی کفر ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ صاحب! ہم محنت کشوں کے لیۓ' اُن کی بہبود کے لیۓ یہ کرتے ہیں' ہم مزدوروں کے لیے یہ کرتے ہیں' اگر یہ کوئی حکومت کرے یا کوئی کارخانہ دار کرے تو یہ بڑا Creditable (مستحسن) ہوتا ہے۔ پوچھو کہ یہ ہم اور یہ' دو الگ الگ تم نے کہاں سے پیدا کیۓ' تم کون ہو کرنے والے' کن کے لیے یہ کر رہے ہو؟ یعنی تم نے انسانوں کی تقسیم پہلے ہی کر دی' تم تو ہم ہو گئے اور یہ تم ہو گئے۔ یعنی کہتے ہو کہ ہم تمہارے لیے یہ کر رہے ہیں جیسے وہ کہیں مریخ سے نئے نئے اترے ہیں اور یہاں سے وہ واقف نہیں ہیں' جانتے نہیں ہیں' گھر بار نہیں ہے تو کہاں سے کھائیں' اس لیے اُن کے لیے انتظام کر رہے ہیں۔ یہ ان میں کے انسان ہیں۔ اور یہ انہیں ایسے محنت کش کہتے ہیں کہ جیسے یہ کوئی اور ہی جنس ہے' یہ کوئی اور ہی طبقہ ہے' یہ کسی اور ہی کرۂ فلکی سے آئے ہیں اور یہ الگ ہیں۔ یہ بہبود کا کام کرنے والے اور اِن کی ویلفیئر کا کام کرنے والے کچھ اور ہیں اور یہ جن محنت کشوں کے لیے کرتے ہیں یہ کچھ اور ہیں۔ یہ کتنی بڑی ناہمواری ہے۔ قرآنِ کریم میں کہیں ان دو طبقات کا ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ محنت کش الگ ہے' نہ آجر یا مستاجر الگ ہے۔

قرآنی نظام میں جو خود محنت نہیں کرتا وہ انسان ہی نہیں

یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) جو محنت نہیں کرتا وہ انسان نہیں کہلا سکتا۔ یہ جو کہتے ہیں کہ ہم محنت کشوں کے لیے یہ کرتے ہیں تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تو محنت کش ہیں اور قرآن کی رو سے انسان ہیں۔ اور یہ جو محنت نہیں کرتے ہیں تو یہ تو انسان کی شق میں ہی نہیں آتے۔ وہ انہیں انسان ہی تسلیم نہیں کرتا اور یہ چوہدری بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہتے

ہیں کہ ہم نے محنت کشوں کے لیے یہ کیا' ہم نے محنت کشوں کے لیے کیا۔ ارے تم کون ہو؟ تم وہ ہو جو محنت نہیں کرتے اور اُن کا دیا ہوا کھاتے ہو۔ یعنی یہ جو کہتے ہیں کہ تم محنت کش ہو تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہم محنت کش نہیں ہیں۔ محنت نہیں کرتے تو بات تو سیدھی ہے کہ ان کی محنت سے کھاتے ہیں اور اُن پہ احسان جتاتے ہیں کہ ہم تمہارے لیے یہ کرتے ہیں۔ قصاب جیسے بکرے کو چارہ دے رہا ہو اور اُس پہ احسان جتا رہا ہو کہ دیکھو! میں تمہارے لیے کتنا کچھ کر رہا ہوں۔ یہ ہے ناہمواری' یہ ہیں جنہیں سیــاٰت کہا جاتا ہے جس کا ترجمہ ہم نے برائی کیا اور پتہ نہیں کیا کچھ ترجمہ کر لیا ہے اور ان ترجموں نے تو ہمیں تباہ کر دیا ہے۔ وہ جو ابلیس نے کہا تھا کہ تُو آدم کو تو بھیج ہی رہا ہے' خیر کوئی بات نہیں' بس ایک شرط ہے کہ جب تک یہ زندہ رہے تو مجھے زندہ رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ میرا ہاتھ اِس کی گردن پہ پہنچے اور تم میرا ٹینٹوا دبا دو' مجھ سے وعدہ کرو کہ ایسا تو نہیں ہوگا۔ اُس نے کہا کہ جاؤ تم برابر کے ہو۔ کہنے لگا کہ برابر کے ہیں تو ''فیر ویکھیں کس طرح تگنی دا ناچ نچانا ہیگاں''[1]۔ ایک تو لگام ہاتھ میں لے کر گھوڑے کے اوپر سوار ہوتا ہے تو اُس میں بھی کچھ نہ کچھ تو گھوڑے کی عزت ہوتی ہے خواہ وہ سر یا خان بہادر کے خطاب جیسی عزت ہی کیوں نہ ہو لیکن ایک وہ ہوتا ہے جو وہ گاؤں کے لڑکے یونہی کوئی بچھیرا پکڑ لیتے ہیں اور اُس پہ کاٹھی یا زین یا لگام وغیرہ بھی کچھ نہیں ہوتی بلکہ یونہی مونجھ کی رسی لی اور تھوتھنی کے اوپر لپیٹی اور ہاتھ میں لیا۔ یہ جو ہوتا ہے اس کو اِحتِنَـاکٌ کہتے ہیں۔ اُس نے کہا تھا کہ تُو اِس کو بھیج دے اور اتنی سی شرط میری مان' میں یہ نہیں کہتا کہ تُو میری حمایت کر' پھر تو دیکھ کہ میں کس طرح اِس کی تھوتھنی کے اوپر رسی لپیٹ کر اِس کے اوپر بیٹھتا ہوں۔

نظامِ سرمایہ داری نے غلام کا نام محنت کش رکھ دیا

تاریخ کا پہلا ورق الٹیے تو اُس میں ایک Slave (غلام) ہے اور دوسرا آقا۔ ہم کہتے ہیں کہ اوہو! انسان اس درندگی کے دور میں رہتا تھا اور یہ کیفیت تھی۔ اُس کو مٹایا' بڑا جہاد کیا اور کہا کہ ہم مزدور ہیں اور یہ آقا۔ یعنی وہ Slave یا غلام کا نام مزدور رکھ کر مطمئن ہو گئے کہ ہم نے Slavery (غلامی) کو مٹا دیا۔ ارے وہ تفریق تو ویسے کی ویسی ہے' وہ الگ ایک طبقہ بنایا ہوا ہے اُن کا نام تم Slave نہیں رکھ رہے' محنت کش رکھ رہے ہو۔ نہ وہ Slave (غلام) اپنی شرائط آپ متعین کرتا تھا اور نہ یہ مزدور اپنی شرطیں آپ منوا سکتا ہے۔

قرآنی معاشرے میں مساوات کی مثال

عزیزانِ من! یہ ہے ناہمواری مگر تقسیمِ کار اور چیز ہے۔ مشین کے پرزوں کے کام کرنے کے جو فرائض ہوتے ہیں اُسے تقسیمِ کار کہتے ہیں۔ وہاں مشین کے اندر کبھی یہ نہیں ہوتا کہ فنر ایک پیچ سے یہ کہے کہ تم بہت ذلیل ہو اور ہم بہت بڑے حاکم ہیں۔ اُس نے کہا کہ یہ

---

[1] تو پھر دیکھ کہ میں کس طرح اسے تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔

تو سوال ہی نہیں ہے۔ ایک مشینری کے اندر رکھے ہوئے پرزے ہیں' تم اپنا فریضہ انجام دے رہے ہو اور ہم اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں' ہمارے سب کے تعاون سے مشین چلتی ہے۔ وہ پیچ کہتا ہے کہ اگر میں ذرا سا ڈھیلا ہو جاؤں تو ساری مشینری بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ ہے مساوات' یہ ہے اُس کا وزن۔ سوچیے تو سہی کہ سو سو کے نوٹوں کی اگر گدی رکھی ہوئی ہو تو کیا وہ اوپر کا نوٹ نیچے کے نوٹ سے کہے گا کہ تُو تو بڑا ذلیل ہے' تیری تو کوئی قیمت ہی نہیں ہے کیونکہ تُو تو نیچے ہے۔ اُن کو آپ نے پھیلا کے تو نہیں رکھنا' اس طرح رکھنا پڑے گا کہ کچھ اوپر آئیں گے اور کچھ نیچے آئیں گے۔ اس طرح اوپر سے نیچے آنے والوں کی قیمت کم نہیں ہوتی' سب سے نیچے کے نوٹ کی قیمت بھی اتنی ہے جتنی سب سے اوپر کے نوٹ کی قیمت ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے مساواتِ انسانیہ۔ تقسیمِ کار کی رو سے کسی کو نیچے رکھیے اور کسی کو اوپر بٹھائیے لیکن قیمت سب کی ایک ہی ہو گی۔ اِسے قرآن کی اصطلاح میں حسنات کہتے ہیں' یہی نیکی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جو اِس نظام کو لے کر اُٹھیں گے اُن کا مقابلہ وہ کبھی نہیں کر سکیں گے جو انسانیت میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں۔ اور اگر دونوں طرف ناہمواریوں والے ہوں تو پھر وہ لڑائی عربوں کی اور ایرانیوں کی ہوتی ہے اُس میں خدا بیچ میں نہیں آتا۔ لہٰذا جب اُس نے کہا ہے کہ جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں تو کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں شکست دے دیں گے؟ یہ جماعت جو اُس کا نام لے کر اُس کے نظام کو قائم کرنے کے لیے اٹھی ہے تو اُس نے کہا ہے کہ ہم ساتھ ہیں۔ اب یہ ٹکراؤ کی باتیں چلی آ رہی ہیں۔ ایک طرف خدا کے آئین کے اوپر عمل کرنے والی اور اِس کو غالب کرنے والی جماعت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ** (9:33) دنیا کے ہر نظام پر ہم اِس کو غالب کریں گے۔ دوسری طرف وہ جماعتیں ہیں جو انسانوں کے اندر ناہمواریاں پیدا کرنے والی ہیں۔ اور ان دونوں کا ٹکراؤ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ **مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ** (29:5) خدا کو ماننے والے انسان کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ کہیں خدا سے ملاقات ہو جائے' خدا کو دیکھ لیں۔ یہ ہمارے ہاں کے جو تصوف والے ہیں اُن کے ہاں بھی جو سب سے بڑا رتبہ ہوتا ہے وہ لقآء ہوتا ہے۔ یہ لفظ ملاقات سے آ رہا ہے۔ عام ترجمہ کیجیے تو بات یہ ہو جائے گی کہ جو شخص اِس کی آرزو کرتا ہے کہ خدا سے ملاقات ہو جائے۔ تو یہ تو بڑی چیز ہے کہ خدا سے ملاقات ہو جائے۔ لقآء کے معنی یہ ہوا کہ ''آمنے سامنے'' ہونا۔ تو کیا خدا کبھی کسی کے سامنے آج تک ہوا ہے؟ وہ اکبرالہ آبادی[1] نے کہا تھا کہ

---

[1] اکبر الٰہ آبادی (1846-1921)

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

سر سیدؒ [1] وہ شخص تھا جو اپنی عقل میں ایک ذرہ بھی فالتو نہیں سمجھتا تھا۔ ایک دفعہ وہ ٹرین میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ فارغ نہیں بیٹھتا تھا۔ اگر کچھ نہیں کر رہا ہوتا تھا تو اپنے پروگرام کو سوچ رہا ہوتا تھا۔ اُس نے ساری زندگی اس کام کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ وہاں ٹرین میں ساتھ پادری بیٹھا ہوا تھا۔ پادری کا کام ہی کچھ نہیں ہوتا' اُس نے تو صرف بحث کرنا ہوتی ہے۔ اُس نے یہ دیکھا کہ داڑھی والے صاحب ہیں' اُس نے سوچا کہ یہ تو بہت بڑے مولوی صاحب ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ صاحب! خاموش چلے جا رہے ہیں تو کچھ بات وات کریں۔ سر سیدؒ نے کہا کہ تم مجھ سے کس موضوع پہ بات کرنا چاہتے ہو؟ کہنے لگے کہ میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ مسلمان ہیں اور مولوی صاحب بھی ہیں تو قدرِ مشترک خدا ہے' اس کے متعلق بات کرتے ہیں [2]۔

اب بات لقائے رب کی شروع ہو گئی' کئی مقامات میں یہ لفظ لقاء آیا ہے کہ اُس کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو' بے نقاب دیکھنا چاہتے ہو۔ لِقَآء یہ ہوتا ہے کہ پسِ پردہ بھی نہ ہو اور بے نقاب ہو اور اُدھر وہ کہہ رہا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:104) کوئی آنکھ اُس کا ادراک نہیں کر سکتی' اسے دیکھ نہیں سکتی۔

خدا کو اگر دیکھنا مقصود ہو تو کائنات کی پہنائیوں پر غور و کرو

عام انسان تو ایک طرف' خدا کے نبی [3] نے یہ کہہ دیا کہ صاحب! آپ باتیں تو کر رہے ہیں اور یہ کیسا پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں۔ باتیں کر رہے ہو تو ذرا پردہ اُٹھا کر آمنے سامنے آؤ اور ذرا شکل دکھاؤ [4] تو اُسے کہہ دیا تھا کہ لَنْ تَرٰىنِیْ (7:143) تم نہیں دیکھ سکتے۔ خدا کی تو یہ کیفیت ہے کہ وہ نبی تک کو کہتا ہے کہ تم دیکھ نہیں سکتے۔ یہاں (29:5) میں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ ہم سے ملاقات چاہتے ہو' ہمارے آمنے سامنے ہونا چاہتے ہو تو بہت اچھی بات ہے' یہ بھی ہو جائے گا۔ کہا کہ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (13:2) خدا کے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہو تو پہلے تو یہ سن لو کہ یہ وہ ہے جس نے ان تمام اجرامِ سماوی کو بنایا ہے اور وہ اس طرح سے فضا کے اندر کھڑے ہیں کہ گردش میں محو ہیں اور اُن کے نیچے کوئی ایسا ستون نہیں ہے جس کے اوپر وہ کھڑے ہوں۔ ستون کے متعلق کہا ہے کہ ستون ضرور ہے لیکن لَمْ تَرَوْنَهَا ایسا نہیں ہے' جسے تم محسوس طور پر دیکھ سکو۔ وہ جو کششِ ثقل ہے جس نے اُن کو تھاما ہوا ہے یہ

---

[1] سر سیّد احمد خاں (1817-1898)

[2] اس کے بعد اس کیسٹ کی سائیڈ تبدیل ہوئی ہے تو سر سیدؒ اور اس پادری کا باہمی مکالمہ ریکارڈ نہیں ہو سکا۔ بات لقاء رب (13:2) کی شروع ہو گئی ہے۔

[3] یہ اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے: رَبِّ اَرِنِیْ (7:143) اے میرے پروردگار! تُو میرے سامنے بے حجابانہ آ جا۔

[4] اَنْظُرْ اِلَيْكَ (7:143) تا کہ تیرے دیدار سے میری نگاہ بھی کامیاب ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 373)۔

اُس کے متعلق ہے کہ **بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا** تمہاری آنکھیں اُن کو نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ سائنسدانوں سے پوچھو کہ وہ یہاں کیا بات کہہ گیا ہے۔ **ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ** (13:2) اور پھر اُس نے ان سب کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ **وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ** (13:2) چانداور سورج کو مسخر کر رکھا ہے' ان میں سے کسی کی مجال نہیں کہ سورج صبح کو کہدے کہ رات نیند پوری نہیں آئی اس لیے تھوڑا سا اور سولوں۔ اگر وہ ایک سیکنڈ کے لیے زیادہ سو جائے تو اِس کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ **كُلٌّ يَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی** (13:2) ان میں سے ہر ایک اُس معینہ وقت کے لیے محوِ گردش ہے جو ہمارے قانون نے ان کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ **يُدَبِّرُ الْاَمْرَ** (13:2) وہ اپنے اس نظام کی تدبیر اس طرح سے کیے چلا جا رہا ہے کہ ذرا اِدھر اُدھر کچھ نہیں ہوتا۔ **يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ** (13:2) اور اِس طرح سے یہ ہماری آیات ہیں' یہ آیاتِ خداوندی ہیں جن کا ابھی بتایا ہے۔ آیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی دوسری شے کے متعلق یقین ہو جائے کہ وہ ہے۔ دور سے اگر آپ دھواں دیکھتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ نیچے آگ ہوگی۔ یہ دھواں اُس آگ کی آیت کہلاتا ہے۔ ریگستان میں اگر آپ کو کوئی پرندہ نظر آ جاتا ہے تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کہیں گردو پیش میں پانی ہوگا۔ وہ پرندہ اُس پانی کی موجودگی کی آیت کہلاتا ہے۔ **يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ** (13:2) دیکھیے! ہماری یہ نشانیاں ہیں۔ ہم نے ان کو کیسا واضح کر کے' نکھار کے' ابھار کے بیان کیا ہے! یہ بیان کیا ہے کہ اجرامِ فلکی محوِ گردش ہیں' یہ سارے مسخر ہیں' اس طرح سے کائنات کا سلسلہ چلا جا رہا ہے کہ تدبیرِ امور اُس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ جو سارا نظام ہے یہ ہم نے اس لیے بیان کیا ہے کہ **لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ** (13:2) تاکہ تمہیں یقین ہو کہ خدا ہمارے سامنے ہے۔

ذاتِ خداوندی اپنے قانون کی کارفرمائی سے نظر آتی ہے

عزیزانِ من! یہ ہے خدا کا دیکھنا۔ اُس کے قانون کی کارفرمائی سے وہ نظر آتا ہے۔ جو آئین مملکت ہے وہ معلوم نہیں کہ وہ لوگ کون تھے جنہوں نے وہ بنایا ہے' وہ ہمارے سامنے نہیں ہوتے۔ ہم اُس آئین کی اطاعت و محکومیت اختیار کرتے ہیں حالانکہ وہ انسانوں نے بنایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ انسان تو اُس وقت سامنے نہیں ہوتے۔ اُس نے ہمیں الکتاب دی ہے' اُس نے ہمیں کتابِ فطرت دی ہے۔ کہا ہے کہ ہم سے ملاقات کرنا چاہتے ہو تو بہت اچھا! ہم ملیں گے اور بے نقاب تمہارے سامنے آ جائیں گے۔ اور یہ ہے وہ دیکھنا جو بتایا گیا ہے۔ اُس کے آگے ہے کہ **وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِی الَّيْلَ النَّهَارَ** (13:3) زمین کو دیکھیے کہ گول ہونے کے باوجود کس طرح سے پھیلی ہوئی نظر آ رہی ہے' اِس میں دیکھیے کہ پہاڑ کس طرح کھڑے ہیں اور وہاں سے نہریں کس طرح بہہ کر آ رہی ہیں اور دیکھیے کہ اُن سے سبزیاں کس طرح اگتی ہیں' پھل کیسے پیدا

ہوتے ہیں' کیسے رات دن کو ڈھانپ لیتی ہے اور کس طرح دن رات کے اوپر لپٹ جاتا ہے۔ کہا کہ **اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ** (13:3) ان چیزوں کے اوپر غور و فکر کرو تو **لَعَلَّکُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّکُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ** (13:2) ہوگا' تمہیں یقین آ جائے گا کہ رب مل سکتا ہے۔

قدم قدم پر خدا کی کاریگری کی شہادت کا یورپ کے سائنسدانوں سے پوچھیے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم ''لقاء رب'' کا طریقہ بتاتا ہے۔ ہم آپ اِس سب کو کیسے دیکھیں گے؟ یہ اُن سے پوچھو جن کے متعلق ہم کفر کے فتوے لگا رہے ہیں' یہ پوچھو یورپ کے سائنسدانوں سے' یہ پوچھو اُس فرانسیسی [1] سائنسدان سے جس کی کتاب کا میں نے بار بار ذکر کیا ہے۔ قرآن کی ایک ایک آیت کو لے کر سائنس کے انکشافات سے مقابلہ کرنے کے بعد' وہ پکار کر کہتا ہے کہ او دنیا کے سائنسدانو! خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ کیا کوئی انسان چودہ سو سال پیشتر یہ بات کہہ سکتا تھا؟ اگر یہ خدا کی کتاب نہیں ہے تو اور کس کی ہو سکتی ہے۔ یہ بات وہ کافر سائنسدان کہہ رہا ہے۔ ''لقآء رب'' تو انہیں میسر آ سکے گا' یہ رب کو بے نقاب دیکھیں گے۔

عزیزانِ من! اُس کے بعد پھر اُس مقام پہ آ جایئے جہاں اُس نے کہا ہے کہ خدا سے ملاقات چاہتے ہو' تو ٹھیک ہے ہم ملتے ہیں۔ آیئے ہم تمہیں بتائیں کہ کہاں ملیں گے۔ وہ ایسے ہے کہ جیسے باقیوں سے چوری ملنا ہوتا ہے۔ کہنے لگے کہ یہ بات جو ہم نے تصادمات کی کہی ہے' یہ جو ناہمواریاں پیدا کرنے والے ہمارے راستے میں مزاحم ہو رہے ہیں اور تم اس لیے اٹھے ہو کہ ان کی مزاحمت کو توڑ دو اور ہمواریاں پیدا کرو۔ کہا کہ **لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ** (29:5) یاد رکھو! وہ میدانِ جنگ ہے جہاں ان کا آمنا سامنا ہوگا۔ وہ ان کا آمنا سامنا نہیں ہوگا بلکہ ہم وہاں ہی تمہیں ملیں گے۔ میدانِ جنگ نہیں ہے تو یہ کائنات کے گلی کوچوں میں ملے گا' وہ تو ہر جگہ ملے گا۔ اور اگر مقام متعین چاہتے ہو تو میدانِ جنگ میں ملے گا' شمشیر کے سایوں میں ملے گا۔ عزیزانِ من! اس طرح سے لقآء رب ہوگا۔ یہ یا تو اس کائنات کے اندر ہوتا ہے۔ یہ جتنے بھی مفکر اور سائنٹسٹ ہیں وہاں اِن سے لقآء ہوگا اور یا پھر میدانِ جنگ میں ہوگا۔ اُس نے تو اپنا پتہ نشان تک بتا دیا ہے کہ ہم کہاں ملیں گے۔ کہا کہ **وَ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ** (29:5) اور یہ بات نہیں ہے کہ تم جاؤ اور ایسا ہو کہ پتہ نہیں اُس نے ہمیں دیکھا بھی ہے یا نہیں بلکہ یقین رکھو کہ تمہاری ہر بات بھی ہم سنیں گے اور ہمیں اُس کا علم بھی ہوگا کہ تم کیا سوچ رہے ہو یا کر رہے ہو۔ وہاں ہم ہونگے' آ کر دیکھ لو۔ وہاں یہ نظر آئے گا کہ یہ ہم سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جب یہ تم سے آگے نہیں بڑھ سکیں

---

[1] مورس بوکائے۔ اس کی کتاب کا نام ہے ''بائیبل' قرآن اور سائنس''۔

Bucaille, Maurice: The Bible, The Qur'an and Science, Islamic Book Service, Lahore, 1998.

گے تو اِس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یوں ہمارا لقآء ہوتا ہے' یوں ہم ملتے ہیں۔ وہ جو اپنے وصال کی شرطیں بتا دے' مقامات تک بتا دے اور اُس کے بعد بھی جو اُس کو نہ ملے تو وہ اپنے دعویٰ عشق میں صادق نہیں' کاذب ہے۔ وہ تھا جو کہا ہے کہ ہم دیکھیں گے کہ کون تم میں سے صادق ہے اور کون تم میں سے کاذب ہے۔

محبوبہ کو خط لکھا کہ دیکھیے میرا عشق کتنا صادق ہے کہ میرے اور تمہارے راستے میں پہاڑ آ جائیں تو میں پہاڑوں کو کاٹ لونگا' دریا آ جائیں گے تو میں تیر کر نکل جاؤنگا' آگ آ جائے گی تو اُس کے شعلے مجھے نہیں روک سکیں گے۔ دیکھو تو سہی کہ کس طرح سے میں یہ کچھ کرتا ہوں۔ دنیا کی اور کوئی ایسی طاقت نہیں جو تم سے ملنے میں میرے راستے میں حائل ہو جائے۔ اس کے بعد نیچے دستخط کیے اور اُس کے بعد' P.S لکھا جسے مقرر کہتے ہیں کہ کل تین بجے اگر موسم صحیح رہا تو فلاں مقام پہ ملنے کے لیے آئیں گے۔ یہ سارا پہلا جو ہے وہ ہمارا ایمان ہوتا ہے اور اُس کے بعد اُس نے پتہ بتایا ہوتا ہے کہ فلاں مقام پہ میں ملوں گا۔ اور خط میں کہا کہ ٹھیک ہے ہم آئیں گے بشرطیکہ موسم ٹھیک رہا۔

خدا سے ملاقات میں بھلائی انسان کی اپنی ہی ہے

عزیزانِ من! اُس نے تو لِقاء کے لیے اپنا پتہ نشان تک بتا دیا ہوا ہے کہ میں تمہیں کہاں کہاں ملونگا۔ اُس کے بعد یہ کہا کہ ایک بات اور سن لو کہ یہ جو کچھ ہم کہتے ہیں کہ ہم وہاں آ جائیں گے اور تم سے ملیں گے تو یہ نہ سمجھ لینا کہ تمہارے بغیر ہمارا کوئی کام رکا ہوا ہے۔ قطعاً نہیں بلکہ **مَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ** (29:6) تم آؤ گے اور ہم سے ملاقات کرو گے تو تمہارا ہی کچھ بھلا ہوگا۔ **اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ** (29:6) تم تو ایک طرف! ہم تو پوری کائنات سے بے نیاز ہیں۔ ''بھائی صاحب! کوئی ساڈا اپنا کم نہیں رکیا ہویا[1] ہے''۔ اقبالؒ (1877-1938) نے وہ سچ کہا تھا کہ پھر اقبال کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں ''اوناں اچ وی سواد نہیں رہے گا جس دن قرآن سمجھ آن لگ پئے گا[2]''۔ عزیزانِ من! یہ ہے قرآن۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اُسے میں سر سے پاؤں تک' جہاں بھی دیکھوں تو اس کا ایک ایک مقام یہ کہتا ہے کہ یہ ہے حسن۔ قرآن کی تو کیفیت یہ ہے۔ آپ

---

1. بھائی جان! کوئی ہمارا اپنا کام رکا ہوا نہیں ہے۔
2. جس دن قرآن سمجھ آنے لگے گا ان (اشعار) میں بھی مزہ نہیں رہے گا۔

دیکھتے ہیں کہ اِس میں کیسا ربط چلا آ رہا ہے! کہا ہے کہ ہم سے ملنا چاہتے تو ٹھیک ہے ہم وہاں ملیں گے اور ذہن میں سمجھ لو کہ ہم یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اِس میں ہمارا بھلا نہیں ہے۔ **مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ** (29:6) یہ تمہارے ہی بھلے کے لیے ہے، ہمارا کوئی کام نہیں رکا ہوا، ہم تو بے نیاز ہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کا مفہوم

ہمارے ہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ایک عقیدہ ہے۔ حقوق العباد تو ٹھیک ہے کہ تمدنی زندگی ہے، ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے اور دوسرے کا ہمارے اوپر حق ہوتا ہے۔ جیسے اُس نے کہا ہے کہ اگر تمہاری ضرورت سے زیادہ تمہارے پاس پیسہ بچ گیا ہے تو **حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۔ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ** (70:24) یہ اُن کا حق ہے جن کی اپنی محنت سے اُن کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں یا جو کسی طرح اِس قابل نہیں رہتے کہ وہ کوئی کام کر سکیں۔ حقوق العباد تو قرآن میں قدم قدم پہ ہیں۔ جسے تعاون کہتے ہیں کہ تم میرا کام کرو، میں تمہارا کام کروں تو وہ حقوق ہو جاتے ہیں۔ حقوق العباد تو ہیں۔ یہ حقوق اللہ کیا ہیں؟ یعنی خدا کچھ اپنے حقوق ہم سے لینا چاہتا ہے؟ سوچیے تو سہی کہ وہ تو پوری کائنات سے بے نیاز و مستغنی ہے۔ یہ سارا کچھ تو اُس کا دیا ہوا ہے، پھر جو اُس کا دیا ہوا ہے تو اُس میں سے ہم کچھ دے کر کہتے ہیں کہ یہ اُس کا حق ہے جو ہم نے اُس کو دیا ہے۔ سوچیے تو سہی کہ یہ سارا کچھ تو اُسی کا دیا ہوا تھا۔ وہ حق کی بات نہیں ہے، وہ تو مستغنی ہے، وہ اپنے حق کے طور پہ ہم سے کچھ نہیں مانگتا اور نہ لیتا ہے۔ وہ تو دیا ہوا ہی سارا اُس کا ہے۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ کیا بات کہہ گیا ہے!

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

انتہا یہی ہے کہ تم اُس کے راستے میں جان دیدو گے تو وہ کہتا ہے کہ یہ بھی تو اُس کی دی ہوئی تھی۔ وہ **لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ** [1] (29:6) ہے۔

تمدنی زندگی میں حقوق العباد کو ادا کرنے کا طریق

لہٰذا اصل بات حقوق اللہ کا تصور نہیں ہے بلکہ حقوق العباد ہیں جو اُس نے ہم پہ عائد کیے ہوئے ہیں کہ تمہارے مال کے اندر محروم و سائل کا حق ہے۔ اُس نے انسانوں کے حقوق متعین کر دیئے ہیں۔ قرآن میں ایک ہی جگہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ **حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ** (6:141) اور وہاں بھی وہ اللہ کا حق نہیں ہے۔ کہا یہ ہے کہ جب یہ کھیتی باڑی فصلیں وغیرہ کاٹو تو اُس میں سے کاشت کا حق دیدو۔ یعنی وہ جو اُن فصلوں کا

---

[1] وہ ساری کائنات سے مستغنی ہے۔ وہ اس کا محتاج ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کے لیے کچھ کرے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 910)۔

تمہارے ذمے Due (واجب الادا) ہے وہ اُن کو دیدو جو اپنی محنت سے اتنا نہیں حاصل کر سکتے تا کہ اپنا گزارہ کر سکیں۔ لہٰذا اُن کا حق دیدو۔ وہ اُن کا حق ہے۔ ہماری سمجھ میں آج یہ بات مشکل سے آتی ہے لیکن ہم نے اپنے بچپن میں گاؤں کی زندگی میں وہ دور دیکھا ہے۔ گاؤں کے اندر تقسیمِ کار ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں زمیندار اور کاشتکار میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا لیکن اُسی گاؤں کے اندر اور کام کرنے والوں کی بھی تو ضرورت ہوتی تھی یعنی درزی ہوتا تھا' دھوبی ہوتا تھا' جولاہا کپڑے بننے والا ہوتا تھا' موچی جوتا بنانے والا ہوتا تھا' کمہار برتن بنانے والا ہوتا تھا' لوہار ہوتا تھا' ترکھان ہوتا تھا۔ گاؤں کی یہ تقسیمِ کار تھی۔ اُس اعتبار سے اُنہوں نے بانٹا ہوا تھا کہ کچھ لوگ تو زمین سے فصل پیدا کریں اور کچھ لوگ یہ باقی جتنے کام ہیں وہ کریں۔ جب وہ فصل کٹتی تھی تو وہ یہ جتنے ایسے لوگ تھے جو کاشت نہیں کرتے تھے' یہ جو سارے میں نے ابھی گنائے ہیں' وہ اُس میں سے سب سے پہلے اِن کے جو حقوق تھے پہلے وہ ادا کر دیتے تھے۔ وہ اِن کے جو دانے تھے وہ پہلے دیدیتے تھے اور اُس کے بعد جو باقی بچتا تھا اُسے اپنے گھر میں لے کر جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اُس گاؤں میں کوئی ایک فرد بھی بھوکا نہیں رہتا تھا۔ کام سب اپنا اپنا کرتے تھے۔ یہ بات نہیں ہے کہ کمہار اگر برتن بنا رہا ہے ''تے اوسِلاں نوں چک مارے گا❶''۔ اور اگر کمہار وہ برتن نہ بنائے تو زمیندار فصل اگا کر دکھائے۔ تعاون کی یہ صورت تھی۔ ہوتا کیا تھا؟ زمیندار کا حق تھا کہ یہ کمہار اُس کے لیے یہ ٹنڈیں بنائے' کمہار کا حق تھا کہ جب فصل اُگے تو زمیندار اُس میں سے اِس کا حصہ دے۔ یہ ہے صحیح نظام۔ اِسے تو آپ کہیں گے کہ یہ ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت رکھنا ہے' انہیں پورا کرنا ہے۔ اگر یہ زمیندار اُس کمہار کو اُس کا حق نہیں دیتا ہے تو ٹھیک ہے وہ کہے گا کہ اِس دفعہ تو تم نے بھوکا مارا ہے تو پھر اگلی دفعہ وہ تمہاری ٹنڈیں نہیں بنائے گا اور فصل نہیں اگ سکے گی۔ تو یہ باہمی حقوق العباد ہوتے ہیں۔ تمدنی زندگی اسے کہتے ہیں۔ اِس میں خدا کا کیا حق ہے وہ تو لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (29:6) ہے' اُسے نہ گیہوں کی ضرورت ہے اور نہ ٹنڈوں کی۔ تو اِس لیے یہ تصور غلط ہے کہ نماز حقوق اللہ ہے۔ ''توں چار سجدے دے کے اوہدا کی سنوار دتا❷''۔ ابھی ابھی یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ صاحب! یہ جو ٹیکس ہیں یہ تو مملکت کے Dues (ڈیوز) ہیں' حقوق ہیں اور زکوٰۃ خدا کا حق ہے۔ یہ خدا کا جو حق ہے وہ کون وصول کرتا ہے کیونکہ وہ تو آگے آتا ہی نہیں ہے۔ یہ جسے ہم خدا کا حق کہتے ہیں اُس دولت کو اربابِ شریعت مصرف میں لائیں گے ''ایہہ ساڈے وِلے اوہدے ایجنٹ مقرر کِتے ہوئے نیں❸''۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ حقوق اللہ کی لم کیا ہے۔ یہ انسانوں کے ایک دوسرے کے اوپر سارے حقوق ہیں جو خدا کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ اگر ایک انسان اس حق کو ادا نہیں کرتا جو اُس نے دوسرے انسان کے لیے مقرر

---

❶ وہ اینٹیں کھائے گا۔

❷ تم نے چار سجدے کیے تو اس کا کیا سنوار دیا۔

❸ یہ ہمارے لیے اس کے ایجنٹ مقرر کیے ہوئے ہیں۔

کیا تھا تو وہ نظام تہس نہس ہو جاتا ہے۔ اگر یہ زمیندار یہ دانے لوہار، ترکھان، جولاہے، درزی اور موچی کے ہاں نہ دے تو گاؤں کا سارا نظام تہس نہس ہو جائے گا۔

انسانوں کے حقوق Wages (اجرتیں) مقرر کرنے کی شکل میں ادا کرنے کا نتیجہ

یہ ہے بات جس کی وجہ سے دنیا کا سارا نظام ابتر ہو رہا ہے کہ پہلے تو انسانوں نے خود ہی دوسروں کے حقوق متعین کیے جسے آپ Wages (اجرتیں) کہتے ہیں۔ اب جو مقرر کرنے والا ہے، وہ ہر وقت اس کوشش میں ہوتا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ کھینچ لوں اور کم از کم دوں۔ دنیا میں یہ ساری کشمکش اِس وجہ سے ہو رہی ہے کہ انسانوں کے حقوق انسان مقرر کرتا ہے۔

نظامِ خداوندی میں انسانوں کے حقوق ادا کیے جاتے ہیں

جسے ہم نظامِ خداوندی کہتے ہیں تو اُس میں ہوتا ہی اتنا ہے کہ اُس میں انسانوں کے حقوق اُس نے مقرر کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ وہی نظام جو گاؤں کے اندر بارٹر نظام (Barter) ہوتا ہے، وہ بڑا صحیح چلتا تھا۔ وہ تھا خدا کا مقرر کیا ہوا حق کہ کوئی شخص رات کو بھوکا نہ سوئے۔ یہ تھا اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ❶ (29:6)۔ اب یہ ہوا کہ یہ اپنے لیے کرے گا، جو کچھ یہ ٹکراؤ ہوگا، مخالفتیں ہونگی اور میدانِ جنگ تک میں آئے گا، یہ جو کچھ تم کرو گے یہ سب تم اپنے لیے کرو گے، ہمارے لیے اس میں کچھ نہیں ہے۔ خدا تو مستغنی ہے، سب کچھ اُس کا عطا کردہ ہے۔ کہا کہ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ (29:7) یہ لوگ جو پہلے اقرار کریں گے کہ ہم نے مملکتِ خداوندی کی Nationality (قومیت) قبول کر لی، اب اِس سے وہ اِس حلقے کے اندر آ گیا۔ کہا کہ اِس کے بعد وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ہے۔ یہی بات نہیں ہے کہ اُس نے کہہ دیا اور بات ختم ہوگئی بلکہ پھر وہ پروگرام جو ہم نے تجویز کیا ہوا ہے جس سے انسانوں کی صلاحیتیں بڑھتی ہیں، یہ جماعت اُس پر کاربند ہوگی۔

معاشرتی تعاون کا نتیجہ حسن کی نوید ہوتا ہے

کہا کہ اِس پر کاربند رہنے کے لیے پھر دو باتیں ہونگی۔ قرآن نے دو چیزیں یہاں اکٹھی کر کے زندگی کے سارے مقاصد کا احاطہ کر دیا۔ پہلی چیز یہ ہوگی کہ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ (29:7) جو اُن میں ناہمواریاں پیدا ہوئی ہونگی ہم اُن کو مٹا دیں گے۔ اب یہ چیز تو Negative (منفی) ہوگئی کہ تفریق نہیں کی جائے گی۔ اس کے بعد Positive (مثبت) بات کیا ہوگی، عملاً کیا چیز ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ وَ لَنَجْزِیَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (29:7)۔ اب یہاں سیأت کے مقابلے میں احسن آ گیا۔ یہ بات

---

❶ وہ ساری کائنات سے مستغنی ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی شخص اُس کے لیے کچھ کرے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔910)۔

نہیں ہے کہ وہ ازخود اپنی طرف سے کرتا چلا جاتا ہے بلکہ جب وہ ہمارے پروگرام کے مطابق جو کام کریں گے تو اُس کا مثبت نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن کے معاشرے کے اندر حسن پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ حُسن تو نام ہی صحیح Proportion (تناسب) کا ہوتا ہے۔ یعنی جو تقسیمِ عمل ہے وہ ہے اصل شے۔ وہ جو نسخے کے اجزاء ہوتے ہیں' اُن اجزاء میں ایک تناسب ہوتا ہے' Proportion (تناسب) ہوتی ہے اور شفا کے لیے یہ بڑی ضروری چیز ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ مریض دوسرے دن آیا اور اُس نے کہا کہ حکیم صاحب! اِس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ حکیم نے کہا کہ اِس میں منقیٰ کے چار دانے کر دو۔ وہ پھر آیا اور اُس نے کہا کہ جی' کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ اُنہوں نے پوچھا کہ کیسے پیا تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ جی' آپ نے کہا تھا کہ اِس کو جوش دے کر پینا ہے۔ کہنے لگے ٹھیک ہے اب اِس کو بھاپ نکال کے پینا۔ اُس نے بھاپ نکال کے پیا اور آرام ہو گیا۔ میں اُن سے پوچھ لیا کرتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اِس کے اندر جو صحیح تناسب ہے اُس میں کچھ فرق ہے اور اِس طرح سے پورا ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ تم کائنات میں نگاہ دوڑا کر دیکھو تو تمہیں کہیں عدمِ تناسب نظر نہیں آئے گا۔ کہا کہ پہلی چیز تو یہ تھی کہ وہ جو تم نے انسان اور انسان میں ناہمواریاں پیدا کی تھیں اُن کو دور کیا اور اُس کے بعد آگے یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے جیل خانہ بنا دیا کہ صبح سب کو دال بانٹ دی جائے۔ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (29:7) اُس پروگرام کے مطابق عمل کیا تو ہم نے معاشرے کے اندر صحیح توازن پیدا کر دیا۔ سنار اپنا کام کرے' لوہار اپنا کام کرے' زمیندار اپنا کام کرے لیکن ان کے اندر ناہمواری اور تفاوت نہ ہو بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہو۔ کہا کہ یہ ہے حسن۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ العنکبوت کی آیت 7 تک آ گئے ہیں' 8 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط



تیسرا باب: **العنکبوت** (آیات 8 تا 15)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1979ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 8 سے ہو رہا ہے: (29:8)۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک نوعِ انسانی دو گروہوں میں منقسم ہے

آپ کو یاد ہو گا کہ سابقہ آیات میں دو گروہوں کے ٹکراؤ کا ذکر چلا آ رہا تھا اور سابقہ آیات ہی کیا' سارے قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ اُس کی بنیادی تعلیم ہی یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دو ہی گروہوں میں تقسیم کرتا ہے: فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (64:2)۔ تو دو گروہ ہیں۔ ایک وہ ہیں جو خدا کے بتائے ہوئے اِس پروگرام پہ' اِس اصول پہ' یقین رکھتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو اِس سے انکار کرتے ہیں اور یہی بنیاد ہے جسے آپ دوقومی نظریہ کہتے ہیں۔ وہ کسی خاص ملک کے اندر دو قومیں نہیں ہوتیں۔ ہوتیں تو بہرحال ہر جگہ ہیں لیکن

قرآن نے تو پوری نوعِ انسانی کو دو صنفوں میں' دو قسموں میں' تقسیم کر دیا ہوا ہے۔ ایک وہ جو خدا کے بتائے ہوئے اصول پہ پہلے یقین رکھتے ہیں اور پھر اُس کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو اِس کے خلاف جاتے ہیں۔ دنیاوی نقطہء نگاہ سے ان کو مذہبوں میں تقسیم کر دیجیے' قوموں میں تقسیم کر دیجیے' گروہوں میں تقسیم کر دیجیے۔ قرآن انسانیت کو دو ہی شقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہی وہ دو شقیں ہیں' جس کے مطابق انسانیت دوقومی نظریئے میں بٹ جاتی ہے۔ دوقومی نظریہ کی بنیاد اِس پہ ہے' یہ قرآن کی بنیادی تعلیم ہے۔ اب یہ جو چیز ہے کہ مِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ تم میں سے ایک گروہ وہ ہے جو تر جمے کے مطابق ایمان لانے والا ہے۔ اور پھر اپنے آپ کو یہ کہہ کے فریب دے لیا کہ وہ تو ہم ہوئے۔ اور دوسرا جو اُس نے کافر کہا تو وہ ہوئے ہندو۔ جب وہاں رہتے تھے تو ساری جنگ ہی اِس پہ تھی۔ ہماری نیشنلسٹ جماعت والے یہ کہتے تھے کہ وہ تو سارے ایک ہی قوم ہیں۔ یعنی وہاں دوقومیں بھی ختم ہو گئیں لیکن جہاں ہم اب دوقومیں کہتے بھی ہیں تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تو ہو گئے مومن اور وہ ہو گئے کافر۔ اپنے آپ کو جب مومن کہہ لیا تو معاملہ ختم ہو گیا۔

صاحبِ ایمان کے لیے ایک بنیادی شرط

سوال یہ ہے کہ وہ کونسی بنیادی چیز ہے جسے تسلیم کرنے سے یہ گروہ مومن کہلا سکتا ہے یا اُسے ایمان والا کہا جاتا ہے اور وہ دوسری کونسی چیز ہے جس کی بنا پہ آپ کہیں گے کہ وہ مومن نہیں ہیں' وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ قرآن میں یہ ہے کہ اللہ پہ ایمان' اُس کی کتاب پہ ایمان' رسول پہ ایمان' ملائکہ پہ اور آخرت پہ ایمان۔ یہ تو اُس کے اجزا ہیں۔ جس چیز کے یہ اجزا ہیں وہ کیا ہے؟ بنیادی چیز ایک ہی ہے جس سے انسانوں کی تقسیم ہوتی ہے اور وہ ہے سورۃ آلِ عمران کی آیت 78۔ ویسے تو سارے قرآن میں یہ ہے لیکن جامع طور پر اِس ایک آیت کے اندر دیا ہوا ہے کہ یہ ہے جسے تسلیم کرنے سے' جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے' صاحبِ ایمان یا مومن کہلا سکتے ہے اور اِس سے انکار کرنے سے کافر کہلاتے ہیں۔ وہ اصول یہ ہے کہ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَهُ اللّٰهُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ لٰکِنۡ کُوۡنُوۡا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡکِتٰبَ وَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ (3:78)۔ یہ ہے بنیادی چیز کہ جس کے ماننے سے ایمان آتا ہے اور مومن کہلایا جاتا ہے' یہ گروہ یا یہ قوم الگ بنتی ہے۔ اسے نہ ماننے سے دوسرا گروہ ہوتا ہے۔ کسے باشد۔ نام خواہ اپنا مسلمان ہی کیوں نہ رکھ لیں۔ اس آیہ جلیلہ کے معنی یہ ہیں کہ ''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' خواہ اُنہیں قوانین سازی کے اختیار حاصل ہوں' خواہ اُنہیں حکومت کے اختیارات حاصل ہوں اور خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو کہ کسی دوسرے سے کہے کہ میری اطاعت کرو۔ یہاں انسانوں میں جامع طور پہ تین قسمیں بتائیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ان تینوں گروہوں کے اندر سارے ہی صاحبِ اقتدار آ گئے۔ یہ جیسے ہمارے ہاں Judiciary (عدالتی) اور Executive (انتظامیہ)

کہتے ہیں وہ تو کتاب اور حکم کے اندر آ گئے' قانون سازی اور قانون پہ عمل کرانے والی بات نبوت کی ہے۔ اور دوسری چیز ہے جسے آپ مذہب کہتے ہیں۔ اب اس اتنے حصے کو پھر دہرا لیجیے کہ کسی انسان کو اِس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ اُنہیں قوانین سازی کے اختیارات حاصل ہوں' خواہ وہ نظمِ حکومت کے اوپر اقتدار رکھتے ہوں اور خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہوں' کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ کسی دوسرے سے کہے کہ میری اطاعت کرو۔ عزیزانِ من! اسلام یا قرآن شرفِ انسانیت کو مستحکم کرنے کا ضابطہ ہے' تکریمِ انسانیت کے لیے ہے۔ اسے ہی مساوات کہتے ہیں۔

بغیر کسی قسم کی تفریق کے تکریمِ آدمیت کا ہی دوسرا نام مساوات ہے

مساوات ایک جیسی شکل اور ایک جیسے لباس کا نام نہیں ہے۔ مساوات کے معنی ہیں: ایک جیسی تکریم اور ایک جیسی عزت۔ کوئی انسان جب کسی دوسرے انسان سے اپنی اطاعت کرائے تو ظاہر ہے کہ اب یہ مساوی تکریم نہ رہی' ان کا مقام ہی مساوی نہ رہا۔ یہ شرفِ انسانیت کے خلاف چلا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے جھکے:

تُو جھکا جب غیر کے آگے' نہ من تیرا نہ تن

(اقبالؒ: بال جبریل)

وَ لَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡۤ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر بنی آدم' جسے آپ انسان کہیں گے' کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یہ بات تکریم کے منافی ہوگی کہ کوئی انسان دوسرے انسان سے اپنی اطاعت کرائے۔ کہا کہ کسی انسان کو اِس کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ تقسیمِ کار کہہ لیجیے کہ کچھ قوانین وضع کرنے والے' کچھ انتظامیہ والے یعنی اُن کو نافذ کرنے والے اور تیسرا گروہ جس کو مذہب کہہ لیجیے۔ خواہ نبی بھی کیوں نہ ہو' اُسے حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنی اطاعت کرائے۔

خدا کی اطاعت اس کی کتاب کے ذریعے ہوگی

کرنا یہ ہوگا کہ وَ لٰكِنۡ كُوۡنُوۡا رَبّٰنِيّٖنَ (3:78) ربّانی یعنی اُس کے نظامِ ربوبیت کے علمبردار بن جاؤ۔ ان سب کو یہ کہنا چاہیے اس لیے کہ بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ (3:78) اس کی تعلیم یہ ہوگی کہ تم سب' اُس کتابِ خداوندی کی اطاعت سے' جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور اس پر غور و تدبر سے' اس کے مغز تک پہنچتے ہو تم خدا کی اطاعت کرو۔ اب خدا ایک Abstract (غیر محسوس) سی چیز ہے' خدا ہمارے سامنے نہیں ہے' ہمیں براہِ راست کوئی حکم نہیں دیتا' ہم اُس کو دیکھتے نہیں ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ خدا کی عملاً اطاعت کیسے ہوگی؟ کہا کہ بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ (3:78) اُس کتاب

کی بنا پر ہوگی جسے پڑھتے بھی ہو اور جسے اپنے دل کی گہرائیوں میں اتارتے بھی ہو۔ اُس کتاب کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے' اِس کے سوا کوئی اور اطاعت' انسان کی اطاعت ہے اور اِس کا کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے سے اطاعت کرائے۔ اطاعت کرانے والا اور اطاعت کرنے والا دونوں کفر کے زمرے میں چلے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ** (5:44) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے' حکومت نہیں بناتے' وہی ہیں جن کو کافر کہا جاتا ہے۔ کفر اور ایمان میں خطِ امتیاز ہی یہ ہے۔

اُس آیہ جلیلہ (3:78) میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی انسان کو اِس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی انسان سے اپنی اطاعت کرائے یا اپنا حکم منوائے۔ اور وہاں یہی کہہ دیا گیا ہے کہ یہ اطاعت اور یہ حکم ماننا تو صرف خدا کی کتاب کا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ کافر ہے۔ یہ اصول یاد رکھیے کہ یہ ہے ایمان اور کفر۔ تو اب اُس نے دنیا میں دو گروہ بتا دیئے۔ ایک تو وہ ہیں جو خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے کرتے ہیں' اُس کے مطابق نظام قائم کرتے ہیں اور اُس کے مطابق چلتے چلاتے ہیں۔ یہ ایک گروہ ہو گیا جو کتابِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے۔ اور اگر اِسے چھوڑ دیجیے تو باقی جتنے بھی ہیں خواہ وہ کسی نام سے کسی انسان کی اطاعت کرے' وہ دوسرے زمرے کے اندر آ گئے جسے اُس نے کفر کہہ دیا۔ اِس اصول کو پیشِ نظر رکھیے تو کفر اور ایمان کا سارا تنازع ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن نے ایسی بنیادی چیز دیدی ہے جس میں کسی شک وشبہ' ابہام والتباس یا کسی قسم کی کوئی Abstract (غیر محسوس) سی چیز یعنی ذہنی یا نظری یا عقائد کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک عملی چیز ہے۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پہ اُس نے کہا ہے کہ دو گروہ ہوتے ہیں اور یہ دو ہی گروہ ہیں جن کا وہ انسانوں میں ٹکراؤ بتاتا چلا جاتا ہے۔ ایک وہ جو انسانوں سے اپنی اطاعت کرائیں اور اپنا حکم منوائیں۔ مقابل میں دوسرا وہ جو کہیں کہ یہ چیز شرفِ انسانیت کے منافی ہے۔

کوئی بھی نبی کسی سے یہ نہیں کہتا تھا کہ عباد الی میرے بندے بن جاؤ

کسی انسان کو اِس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنی اطاعت کروائے۔ آ ؤ اور تم اور ہم دونوں' اور سارے مل کر' خدا کی اطاعت کرنے والے بنیں۔ یہاں کوئی بھی اطاعت کرانے والا نہیں ہوتا' وہ خود بھی اطاعت کر رہا ہوتا ہے۔ یہ ہے بنیادی چیز۔ میں نے یہ بات یہاں اس لیے صراحت سے کہنی ضروری سمجھی کہ اگلی آیت ایسی آتی ہے کہ اگر یہ بات ذہن میں نہ ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آیت درمیان میں کیسے آئی۔ اور یہی وہ مقامات ہیں جہاں پہنچ کر ہمارے ہاں کے اربابِ دین بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ صاحب! قرآن میں تو ربط نہیں ہے۔ دیکھیے کہ یہاں وہ کہیں مکے کی بات کر رہا ہے' پھر درمیان میں حضرتِ نوحؑ کا قصہ لے آتا ہے' پھر تفسیرِ کائنات بیان کر رہا ہوتا ہے' اِدھر آتے ہیں تو والدین کا قصہ درمیان میں لے آتا ہے۔ یعنی بڑی بے ربط سی چیزیں ہیں۔ آپ کو

شاید اِس کا علم نہیں ہے کہ ہمارے ہاں یہ جو دار العلوم ہیں' جہاں سات سات دس دس سال کی تعلیم کے بعد وہ فاضل ہوتے ہیں' فارغ التحصیل ہوتے ہیں' دستار بندی ہوتی ہے۔ دس سال کے نصاب میں اُن کے ہاں قرآنِ کریم نصاب میں داخل نہیں ہوتا۔ شاید آپ کو تعجب آئے' اُن سے پوچھ لیجیے۔ آخری سال میں صرف سورۃ البقرہ کی ایک بیضاوی کی تفسیر ہے جو تبرکاً اُن کو پڑھا دی جاتی ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی چیز۔

پیچھے سے بات آئی تھی کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (29:2) کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے تو بس معاملہ ختم ہوا اور یہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور کہہ دیا جائے گا کہ یہ پاس ہیں اور یہ جنت میں چلے جائیں گے؟ قرآن نے کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ تو بھٹیوں میں سے گزر کر جانا پڑتا ہے' کٹھالیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے جب یہ ملاوٹ والا سونا اور دھات کندن بنتا ہے۔ تو یہ ٹکراؤ ہے جو کٹھالیاں اور بھٹیاں بتائی ہیں۔ اب قرآن یہ کہتا چلا آ رہا ہے۔

بچپن میں بچے کے عقائد اور نظریات کی بنیاد ماں کی گود کی رہینِ منت ہوتی ہے

درمیان میں وہ آیت آ گئی جہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے۔ کہا کہ وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ [1] (29:8) بچے کے خیالات' اس کے عقائد' اِس کے نظریات' اُس وقت مرتب ہوتے ہیں جب یہ ماں کی گود میں ہوتا ہے اور گھٹنوں چل رہا ہوتا ہے۔ یہ وہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ جس قسم کے خیالات ماں باپ رکھتے ہوں یا اُس گھر کی فضا میں ہوں تو بچہ پیدائشی طور پر خیالات لے کر بڑا ہوتا ہے۔ خیالات کی بنیاد وہاں پڑتی ہے۔ کہا کہ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (29:8)۔ پوچھو نہیں اِس آیت سے کتنی چمکتی ہوئی چیز پیدا ہوتی ہے! اِس میں ذرا سے تدبر و تفکر کی ضرورت ہے۔ کہا کہ وہ زمانہ جس میں ہنوز تمہیں علم حاصل نہیں ہوتا' اُس زمانے میں ماں باپ' یہ خیالات پختہ کر دیتے ہیں۔ اور اِس قسم کا ماحول یا ماں باپ تو خیر کسی خوش نصیب بچے کو میسر آئیں کہ وہاں توحید کے خیالات ہوں یعنی ایک خدا کی اطاعت کے خیالات وہاں ہوں۔ اس دور میں تو ہمارے ہاں کوئی ایسا گھرانہ ملتا ہی نہیں ہے جہاں بچپن میں بچے کے ذہن میں توحید کے عقائد اور خیالات راسخ کیے جاتے ہوں۔ ہمارے سب گھروں کے اندر آپ دیکھیں گے کہ

---

[1] ہم نے ان (یعنی والدین) کے متعلق بھی یہی حکم دیا ہے کہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرو لیکن اگر وہ تم پر زور ڈالیں کہ تم خدا کے اقتدار و اختیار میں ان کو شریک سمجھو' ان کا ایسا کہنا جہالت پر مبنی ہے۔ کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہیں جو اس کی خدائی میں شریک ہو سکے' تو تم ان کی بات مت مانو (31:14-15)۔ تم ہر معاملہ میں خدا کے سامنے جواب دہ ہو۔ وہی تمہیں یہ بتائے گا کہ تم نے جو کچھ کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 910-911)۔

انسانوں کی اطاعت ہوتی ہے۔ آپ اُسے کسی شکل میں کہہ لیجیے۔ سیاست کے معاملے میں اربابِ اقتدار ہیں' شریعت کے معاملے میں ہمارے ہاں کے اربابِ شریعت یا مذہبی پیشوائیت یا آئمہ فقہ یا محدث ہیں۔ کہیں چلے جایئے ان میں سے آخر میں جا کر بات ایک انسان پہ جا کر رکے گی۔ طریقت میں لے لیجیے تو وہاں تو ہر حجرے کے اندر ایک خدا بیٹھا ہوتا ہے۔ یہی تعلیم ہے جو بچپن میں ہمارے گھروں میں ملتی ہے یعنی حضرت صاحب کی اطاعت' پہلی چیز ماں باپ کی اطاعت' ہر بڑے بوڑھے کی اطاعت' اسلاف کی اطاعت۔ قرآن کہتا ہے کہ **مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ** (29:8)۔ اُس دور میں جب ہنوز تمہیں علم نہیں ہوتا یہ خیالات تمہارے ذہنوں کے اندر راسخ کر دیئے جاتے ہیں اور یہ عقائد تمہارے اندر پختہ ہو جاتے ہیں۔

صاحبِ شعور ہونے کے بعد انسان کی ذمہ داری

یہ ٹھیک ہے کہ بچے کی پرورش و تربیت کی ذمہ داری ماں باپ پہ ہوتی ہے اور اُسے تو ماں باپ کے حکم کے مطابق ہی چلنا ہوتا ہے۔ ابھی اُس کو علم بھی حاصل نہیں ہوتا اس لیے اُنہی کی بات ماننی ہوتی ہے۔ ویسے بھی اُس کی حفاظت اور اُس کی پرورش اِسی میں ہوتی ہے کہ وہ ماں باپ کے Direction (ہدایات) کے اوپر چلے۔ یہ وہ دور ہے کہ **مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ** (29:8)۔ جب وہ صاحبِ شعور ہو جائے اور اُس کو علم حاصل ہو جائے تو کہا کہ وہ جو شرک کی باتیں اُنہوں نے اُس دور میں تمہارے ذہن میں ڈالی تھیں اور عقائد پختہ کیے تھے یہ کہتے ہوئے اُن کو ہی لیے ہوئے آگے نہ چلو۔ کہ میرے ماں باپ نے یہ کہا۔ کہا کہ **فَلَا تُطِعْهُمَا** (29:8) اب اِس دور میں اُن کی اطاعت نہیں ہے۔

علامہ پرویزؒ کا بچپن کیسے گزرا؟

آپ کو شاید یاد ہوگا کہ قرآن میں جب بھی والدین کا یہ قصہ آیا ہے تو میں نے پہلے بھی یہ بات دہرائی ہے کہ پہلی چیز جس کے اوپر میں کھٹکا تھا وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ پھر ایک عرصے تک میں سرگرداں رہا' میری تو کئی سالوں کی زندگی ایسی گزری ہے۔ پھر ان عقائد کے اوپر شکوک پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ قرآن ابھی سامنے آیا نہیں تھا' بڑی پریشانی کی زندگی تھی۔ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہا۔ تصوف میں تو چھوڑ دیجیے کہ کیا چیز ہوتی تھی' وہ بات تو میں کسی اور وقت بتاؤں گا۔ شریعت کے معاملے میں دنیا کے ہر مذہب کے اندر یہ مسلمہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کرو اور ہمارے ہاں بھی یہی ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس پہ کبھی سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ بعض چیزیں تو مسلمات ہیں اور دنیا کے ہر مذہب میں یہ مسلمات ہیں مثلاً یہ کہ ماں باپ کی اطاعت کرو۔ جب میں نے قرآنِ کریم میں دیکھا کہ جہاں جہاں اُس نے ماں باپ کے بارے میں کہا ہے تو اُس نے یہ کہا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آیا کرو کہ

یہ عمر کے اُس حصے میں پہنچ گئے ہیں جہاں یہ اپنی ضرورتیں آپ پوری کرنے کے قابل نہیں رہے' ان میں کچھ کمی واقع ہوگئی ہے اس لیے ان کی کمی پوری کردیا کرو۔ ایک مقام پہ یہ کہا ہے کہ یہ دیکھیے! اِس عمر میں پہنچ کر ان کے اعصاب میں بھی توازن نہیں رہتا اور کچھ بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں' بچہ اور بوڑھا ایک جیسا ہوجاتا ہے۔

عزیزانِ من! یہاں قرآن نے کہا ہے کہ اگر وہ تم پر زور ڈالیں کہ تم خدا کے اقتدار واختیار میں ان کو شریک سمجھو تو **فَلَا تُطِعۡهُمَا** (29:8) تم ان کی بات بھی مت مانو' اِن کو جھڑکا نہ کرو[1]' یہ ہمدردی کے قابل ہوتے ہیں' ان کی بات کے اوپر غصہ نہ کیا کرو کیونکہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ کہیں یہ کہا کہ جب عمر زیادہ بڑھ جاتی ہے تو قوٰی کمزور ہوجاتے ہیں' عقل اوندھی ہوجاتی ہے۔ کہیں یہ کہا کہ اِس عمر میں پہنچنے کے بعد حافظے میں اتنی کمزوری ہوجاتی ہے کہ جو بات ابھی گھنٹہ بھر پہلے یاد تھی اُس کے بعد اُس کو بھول جاتا ہے' عینک لگا رکھی ہے اور عینک کمرے کے اندر ڈھونڈ رہا ہے۔ یعنی قرآنِ کریم جن کے متعلق یہ کہے کہ قوٰی کی کمزوری سے عقل اوندھی ہوجاتی ہے' علم باقی نہیں رہتا' حافظہ نہیں رہتا' چڑچڑے ہوجاتے ہیں' قوتِ برداشت نہیں رہتی اس لیے ان کو جھڑکا نہ کرو۔ اور یہاں کہا کہ **وَ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا** (17:23) ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا کرو' ڈانٹا ڈپٹا نہ کرو۔ ان کی جو کمزوری ہے' جو کمی ہے' وہ پوری کیا کرو۔

اب سوال یہ ہے کہ جن کے متعلق قرآن خود یہ کہہ رہا ہے' کیا اُن کے متعلق یہ اِس نوجوان کو حکم دے گا جو ایک اور فضا میں بڑھا ہے' پھولا پھلا ہے' نیا تجربہ ہے' نیا علم ہے' نئی دنیا ہے جس میں یہ بڑھ رہا ہے کہ ان کی اطاعت کرو جن کے متعلق وہ خود کہہ رہا ہے کہ اُن کی عقل اوندھی ہوچکی ہوئی ہے۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ساری دنیا کے مذاہب میں یہ مسلمہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ پھر سوچ رکھیے کہ یہ ماں باپ کی ہی ذمہ داری ہے کہ اُن کی پرورش' اُن کی حفاظت' اُن کی تربیت کریں۔ تو بچے یہ نہ سمجھ لیں کہ کہا گیا ہے کہ صاحب! ماں باپ کا کوئی حکم نہیں ماننا اور اُس کو اماں کہیں کہ اسکول جاؤ اور وہ کہے کہ نہیں صاحب! باباجی[2] نے درس میں کہا تھا کہ ماں باپ کا حکم نہیں ماننا اور وہ بیٹھ جائیں۔ بچو! یہ سمجھ لو کہ یہ بات میں تمہیں نہیں کہہ رہا۔ جب بڑے ہوجاؤ گے' علم حاصل ہوجائے گا' شعور آجائے گا' زندگی کی پختگی میں پہنچ جاؤ گے' اپنے فیصلے آپ کرنے کے قابل ہوجاؤ گے' تو پھر اُس وقت اس چیز کی آپ کے اوپر Binding (پابندی) نہیں رہے گی کہ آپ اُن کی ہر بات اس لیے مانیں کہ ماں باپ نے یہ کہہ دیا ہے۔ اُن کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر خود فیصلے کرو۔

---

1. فَلَا تَقُلۡ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنۡهَرۡهُمَا وَقُلۡ لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡمًا (17:23) انہیں حقارت آمیز باتیں مت کہو۔ نہ ہی ان سے سختی اور درشتی سے کلام کرو۔ اُن سے ادب اور عزت سے بات کرو اور کشادہ نگہی سے پیش آؤ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔633)۔
2. پرویزؒ کو عقیدت واحترام سے باباجی کہا جاتا تھا۔

ماں باپ کی اطاعت کے سلسلہ میں ہندوؤں کے ہاں رامائن کے خدوخال

باقی مذاہب میں اور خاص طور پہ ہندوؤں میں ہم ساتھ رہے کیونکہ ہم ہندوستان میں رہتے تھے اور ہندو مذہب کا قریب سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔ رامائن کا پاٹھ تو اُس زمانے میں ہر چوک' ہر بازار میں' ہندوؤں کے ہاں ہوتا تھا' ہمارے ہاں بھی بہت ہوتا ہے۔ اُس کا نقطہء ماسکہ یہ ہے کہ راجہ بوڑھا ہوا اور اُس نے نئی شادی کی' اُس بیوی نے اُس سے یہ قول لے لیا کہ تمہارے بعد ولی عہد میرا بیٹا ہوگا اور یہ جو تمہاری پہلی بیوی کا بڑا بیٹا ہے وہ نہیں ہوگا حالانکہ اُن کے ہاں بڑا بیٹا ہی راج پاٹ کا مالک یا ولی عہد ہوا کرتا تھا۔ اُس نے یہ قول لے لیا۔ اب قول تو دیدیا اور جب بعد میں سوچا تو رونے لگا' بیٹے کو بلایا اور کہا کہ بھئی! یہ بات ہو چکی ہے۔ اُس نے کہا کہ پتا جی! میرا تو دھرم یہ ہے کہ آپ کے قول کا پالن کروں اور میں آپ کی اطاعت کروں' اس لیے یہ بات ٹھیک ہے آپ اُسی کو راج پاٹ دیجیے۔ اُس بیوی نے کہا کہ ہمیں اس پہ کیسے اعتبار آئے کہ یہ کل کو دعویٰ نہیں کرے گا اور راج پاٹ چھین نہیں لے گا؟ اِنہوں نے اِس سے کہا کہ بھئی! پھر یہ ہے کہ تم ملک چھوڑ جاؤ اور جنگلوں میں چلے جاؤ۔ اس نے بن باس لیا اور جنگل میں چلا گیا۔ اب اُس میں یہ ہے کہ اِس رام کا یہ جو عمل تھا کہ باپ کی اطاعت کی ہے یعنی باپ بیٹا دونوں سمجھ رہے ہیں کہ بڑی نامعقول سی بات ہے لیکن رام کا یہ عمل کہ اُس نے باپ کے حکم کی اطاعت کی ہے تو اِس پر اُنہوں نے رام کو خدا بنا لیا اور اُس کی پرستش کرتے ہیں۔ اُس کے ہاں اُس کا یہ ایک ہی جوہر ہے' ایک ہی عمل ہے۔ ادھر تو رام' اس بات پہ اوتار بنا کہ اُس نے باپ کا اتنا نامعقول سا جو حکم تھا وہ مانا کیونکہ ماں باپ کی اطاعت فرض جو ہوئی اور اِدھر میں نے دیکھا کہ حضرتِ ابراہیمؑ بیٹھے ہیں وہ اپنے باپ سے کہہ رہے ہیں کہ تم اپنے ہاتھ سے پتھر کی مورتی بناتے ہو اور اُس کے سامنے جھکتے ہو۔ اور خدا کہتا ہے کہ ہم نے ابراہیم ◆ کو اپنے مخلص بندوں میں شمار کر دیا۔ دونوں جگہ یہ ہے کہ باپ ہے اور بیٹا ہے۔ وہ رام کو خدا مانتے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق خدا کہتا ہے کہ اِس کا یعنی حضرت ابراہیم ◆ کا بڑا مقام ہے۔

باپ کے حکم کی اطاعت گزاری کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم ◆ کا کردار اور اس کی لم

عزیزانِ من! سوچیے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ میں نے جب قرآن پہ فکر شروع کیا تھا تو ایسے مقامات سامنے آتے تھے۔ بچپن سے ماں باپ کی اطاعت کرتا چلا آ رہا تھا اور اُس سے بے حد نقصان بھی اُٹھائے۔ اگر اطاعت فرض ہے تو ہندو کا تو وہ عمل سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن قرآن کی یہ کیا بات ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہہ رہا ہے۔ ہمارے سامنے ابراہیمؑ کی یہ بات کہہ کر کہا کہ تمہارے لیے ابراہیمؑ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے' اسوۂ حسنہ ہے۔ قرآنِ کریم میں دو ہی شخصیتیں ہیں جن کی زندگی کو اسوہء حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک نبی اکرم ﷺ کی زندگی کو اور دوسرے حضرتِ ابراہیم ◆ کی زندگی کو کہ جہاں ابتدا اِس سے ہوتی ہے کہ اُنہوں نے اپنے باپ سے

بھی یہ کہہ دیا ہے۔ یعنی ساری دنیا کے مذاہب کے مسلمہ کے خلاف ابراہیم ◆ نے ایک بات کی ہے اور خدا اُس سے کہتا ہے کہ شاباش' تیری کیا بات ہے! اور ہم سے کہتا ہے کہ یہ ہیں جن کی تقلید تم پہ لازم ہے' رام کی نہیں۔ یہ کیا چیز ہے' اِس کے اندر کیا راز ہے؟ کیا قرآن خوامخواہ گھروں کے اندر انارکی پیدا کرنا چاہتا ہے؟ کہ لڑکا جوان ہو جائے' صاحبِ شعور ہو جائے' اُس کو علم حاصل ہو جائے تو پھر یہ کہے کہ بھئی! اپنے فیصلے آپ کرو' ماں باپ کے فیصلے کو جانچا کرو' تولا کرو' اگر وہ ٹھیک ہوں تو اُس پہ عمل کیا کرو۔

قرآن نے کہا کہ تم کائنات میں غور کرو کہ کائنات کی اشیاء کی ابتدا کس طرح سے ہوتی ہے اور پھر وہ کس طرح ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں' اوپر اُٹھتی چلی جاتی ہیں۔ اُس نے بتایا یہ ہے کہ ہمارا تخلیقی پروگرام یہ ہے کہ یہ ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا اوپر اُبھرتا ہے۔ ہر نئی نسل میں پچھلی نسل سے ایک ردا اوپر رکھا ہوا ہوتا ہے' ایک درجہ اوپر ہوتا ہے اگر معاشرے کی فضا صحیح ہو' تعلیم وتربیت کا انتظام درست ہو تو ہر نئی نسل پچھلی نسل سے ایک درجہ آگے اور اونچی ہوتی ہے۔ کائنات کے تخلیقی پروگرام کے جو ارتقائی منازل ہیں' اُن کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نئی منزل میں آنے والا پچھلی منزل سے ایک درجہ اونچا ہو۔ یہ جو اُس نے کہا ہے کہ ذرا غور کرو کہ ہم کائنات کو ایک Life Cell سے' ایک ذرے سے' انسان کی ہیئت تک لے آئے ہیں۔ اس طرح لے آئے ہیں کہ ہر منزل پچھلی منزل سے اونچی اور آگے تھی۔ اگر وہ منزل اُسی جیسی ہے تو جمود ہے' وہ وہیں رک گئے' ٹھہر گئے۔ وہ Species (انواع) موجود ہیں جنہوں نے اپنے اندر ارتقائی منازل کی صلاحیت پیدا نہیں کی تو وہ ویسے کی ویسی ہیں۔ اور اگر اُن میں وہ صلاحیت بھی نہیں رہی تو وہ ختم ہو گئیں' پیچھے رہ گئیں۔ ارتقا کے سلسلے میں اگلی کڑی میں وہی پہنچی ہیں جنہوں نے پچھلی کڑی سے زیادہ اپنے اندر صلاحیت حاصل کی۔ اس لیے قرآن کی رو سے تو ہر نئی Generation (نسل) کا بچہ اگر اُس کی صحیح تعلیم ہے تو وہ پچھلی Generation (نسل) سے ایک قدم آگے ہوگا۔ اُسے ایسا ہونا چاہیے۔ اس لیے اگر قرآن بھی ماں باپ کی اطاعت فرض قرار دیدیتا تو یہ اگر پیچھے نہ مڑتی تو کم از کم رک کے وہیں رہ جاتی۔ جیسا غار میں پیدا ہونے والا ہمارا باپ تھا ویسے ہی آج ہم ہوتے کیونکہ اُن کی اطاعت ہوتی۔ اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے جیسا بنانا چاہتے ہیں۔ گھر کے اندر جس قسم کا ماحول ہوگا اور تو اور باپ جس قسم کے کپڑے پہنتا ہے وہ بچوں کو ویسے کپڑے پہننے کو کہتا ہے' بال کٹوانے پہ گھروں کے اندر باپ ناک بھوں چڑھا لیتا ہے کہ دیکھو تو سہی تمہارے بزرگ کس قسم کے بال رکھا کرتے تھے اور تم آ گئے ہو یہ کچھ کرنے والے۔ یعنی وہ اتنا بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ بچے میں اُس سے ذرا سا فرق پڑ جائے' وہ جو اُن کا گھر کے زیست کا عام انداز ہے' وہ اُسے ہی رکھتا ہے۔ اگر یہ چیز کہیں قرآن کا حکم ہوتا کہ تم نے اِن کی اطاعت کرنی ہے تو یہ نسل ٹھٹھر کے رہ جاتی اور ہم ٹھٹھر کے رہ گئے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں کے یہ اگلی نسل کے بچے' جس معاملے میں ماں باپ سے سرکشی برتتے ہیں' وہ بھی بال کٹوانا یا پینٹ پہننا ہوتا ہے۔ فکری اعتبار سے یا ذہنی اعتبار سے اُن کی کوشش نہیں ہوتی کہ ہم اُن سے آگے جائیں۔ وہ تو اُن سے بھی پیچھے گئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ہے وہ فطرت

کا نظام کہ زندگی کی ہر منزل کو قرآن نے کہا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم ہے؛ وہ آگے چلنے کی ہے اور خدا ذی المعارج ہے، یعنی سیدھی سیڑھیوں کے اوپر چڑھنے کی ہے؛ دائرہ نہیں ہے کہ اُسی کے اندر گردش کرتا رہے۔ ہر نئی نسل پرانی نسل کے ساتھ چلے تو یہ تو دائرے میں گردش ہو جائے گی ۔نہ ہی یہ ہے کہ ہموار ہے اور بلند نہیں ہوتی۔

انسانی زندگی کے لیے خدا تعالیٰ کی دو صفات کے بیان کرنے کا مقصد

کہا ہے کہ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56) تیرا خدا صراطِ مستقیم پر ہے؛ تیرا رب ذی المعارج ہے۔قرآن نے دو چیزیں بتائیں اور زندگی کے ارتقا کا سارا مسئلہ ان دونوں میں آ گیا ہے۔ تیرا رب صراطِ مستقیم پہ جا رہا ہے یعنی جو اُس کا کائناتی پروگرام ہے؛ وہ دائرے (Cyclic order) میں نہیں چل رہا کہ گردش کیے چلا جا رہا ہو اور ویسے کا ویسا ہی رہتا ہو بلکہ آگے جا رہا ہے اور آگے بھی ایک سطح کے اوپر ہی نہیں جا رہا بلکہ ذی المعارج ہے یعنی سیڑھیوں والا ہے؛ اوپر بھی چڑھتا ہے اور آگے بھی بڑھتا ہے۔عزیزانِ من! یہ ہے زندگی کا راز۔ لہٰذا نئی جنریشن (نسل) کو فکری، علمی، اخلاقی، تربیتی انداز سے پچھلی نسل سے آگے ہونا چاہیے۔ وہ جو حضورِ نبی اکرم ﷺ کی چمکتی ہوئی حدیث ہے کہ جس کے دو دن ایک جیسے ہوں اور آگے نہ بڑھا ہوا ہو تو سمجھ لو کہ وہ تباہ ہو گیا۔اور جہاں صدیاں ایک جیسی گزر رہی ہوں تو وہاں کیا کیفیت ہوگی؟ اپنے آپ کو تو فریب دیا جا سکتا ہے کہ دوسری قوم کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھیے بہت اچھی حالت میں ہیں!!!

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالہء جرسِ کارواں رہے

ماں باپ کی اطاعت فرض نہیں، حُسنِ سلوک فرض ہے

اب بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں جہاں والدین کا ذکر کیا ہے تو کہا ہے کہ اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کیا کرو، جھڑکا نہ کرو، ڈانٹا نہ کرو، اُن کی ضرورتیں پوری کیا کرو کیونکہ اُن کا علم کم ہو رہا ہے، اُن کے قوٰی مضمحل ہو رہے ہیں اور اُن کی وجہ سے کمزور ہو رہے ہیں اور تم آگے بڑھتے چلے جاؤ۔قرآن نے تو پہلے ہی سورۃ البقرہ میں یہ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ (2:4) کہا ہے یعنی مستقبل کے اوپر نگاہ رکھنے والا مومن ہوتا ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ اہلِ جہنم کی پہچان یہ ہے کہ اُن کی آنکھیں گدی میں لگی ہوئی ہوتی ہیں، اُن کے سامنے تاریکی ہوتی ہے اور اُن کا ماضی درخشندہ ہوتا ہے۔ جب بھی پوچھو تو کہتے ہیں دیکھیے صاحب! سبحان اللہ، ہارون رشید کا

زمانہ ❶ کیسا بہترین تھا، ہم تہذیب وتمدن میں آسمان پہ چڑھے ہوئے تھے۔ عزیزانِ من! اس لیے اسے سوچ رکھیے کہ صحیح تعلیم یہ ہے کہ جب تک بہر حال بچے ماں باپ کی حفاظت اور پرورش و تربیت میں ہیں تو اُن کی Direction (ہدایت) کے مطابق ہی اُن کو چلنا ہوگا لیکن جب یہ خود صاحبِ شعور وعلم ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنی دنیا آپ پیدا کر لی ہے تو اُس وقت پھر اپنے فیصلے آپ کریں۔

اب آ گئی قرآن کی یہ آیت کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے سے کہے کہ تم میری اطاعت کرو۔ ماں باپ کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ اگر وہ بھی یہ کہتے ہیں تو ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں مستبد ہوتا ہے' استبداد چاہتا ہے' دوسرے سے حکم منوانا چاہتا ہے لیکن یہ بات نہیں ہے کہ آپ گستاخ ہو جائیں یا سرکش ہو جائیں۔ قرآن حسنِ سلوک کی تاکید کرتا ہے۔ اُن کے ساتھ احسان کا سلوک کرنا ہے' نرمی برتنی ہے' جھڑکنا نہیں ہے لیکن فکری اعتبار سے' ذہنی اعتبار سے' علمی اعتبار سے اُس منزل سے اگلی منزل میں پہنچنا ہے جس سطح پہ وہ تھے اُس سے اونچی سطح پہ پہنچنا ہے۔ یہ کہا کہ یاد رکھو! جب تمہیں علم نہیں تھا تو اِس قسم کے شرک کے عقائد تمہارے ذہنوں میں اُنہوں نے ڈال رکھے تھے۔ **وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ** (29:8) اگر بڑے ہونے کے بعد بھی وہ تمہیں اِس کے اوپر مجبور کریں اور کوشش کریں کہ تم اُنہی کے مشرکانہ عقائد پر رہو جو انہوں نے بچپن میں تمہارے ذہن میں ڈالے تھے تو **فَلَا تُطِعْهُمَا** (29:8) بالکل اُن کی اطاعت نہ کرو بلکہ

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

یاد رکھو! ہم تم سے یہ سوال نہیں پوچھیں گے کہ تم نے ماں باپ کے کہنے کے مطابق کیا کچھ کیا تھا۔ ہم یہی پوچھیں گے کہ **اِلَـيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (29:8) ہم نے جو کچھ کہا تھا اُس کے مطابق تم نے کیا کیا؟ مکافاتِ عمل کی دنیا میں تو اس نے کہا ہے کہ باپ بیٹے کو چھوڑ دے گا اور بیٹا باپ کو چھوڑ دے گا۔ کوئی بھی کسی دوسرے کی ذمہ داریاں نہیں سنبھالے گا' یہ سوال ہی نہیں ہے۔ **وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (29:9)۔ یہ آ گئی امنوا والی وہ بات جو سورۃ آلِ عمران کی آیت 78 میں کہی ہے۔ عزیزانِ من! اِس کو نوٹ کر رکھیے' وہ دین وایمان کی بنیاد ہے کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ** (3:78)۔ صرف خدا کی کتاب کے مطابق جو حکم دیتا ہے وہ وہی ہے جو قرآن کے مطابق کہا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ **وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (29:9)۔ انسان کے قریب ترین جہاں انسان فریب کھاتا ہے وہ یہ عقیدہ ہے جو چلا آ رہا ہے کہ ماں

---

❶ ہارون الرشید کا زمانہ (170-193A.H/786-809A.D) تھا۔

باپ کی اطاعت کرو۔ اب قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اگر وہ بھی تمہارے ذہنوں کے اندر یہ عقیدہ ڈالیں کہ فلاں امام کی' فلاں حضرت کی' فلاں صاحب کی' فلاں کی' اطاعت کرنی ہے تو جب صاحبِ شعور وعلم ہو جاؤ تو وہاں پہنچ کر اُن سے کہو کہ نہیں' یہ غلط ہے۔ اطاعت صرف خدا کی کتاب کی ہے۔ اگر تم نے یہ کیا اور وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (29:9) اُس کے مطابق وہ کام کیے جو تمہاری صلاحیتوں کو بڑھاتے جائیں تو لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِى الصّٰلِحِيۡنَ (29:9) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم اُن میں داخل کریں گے جن کی صلاحیتیں بڑھی ہوئی ہونگی۔ ارتقا کی اگلی منزل میں تو وہی پہنچے گا جس کی صلاحیتیں بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔

فرعون کی فرعونیت کا راز' دوسروں کی صلاحیتوں کو مفلوج کیے رکھنے میں تھا

استبداد میں یا جو شخصی اطاعت ہوتی ہے اُس میں' نقص یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص یہ برداشت ہی نہیں کرسکتا کہ اُس سے جو زیادہ صلاحیتوں والا ہے وہ پنپتا رہے۔ استبداد کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ کوشش کرتا ہے کہ اِس کی صلاحیتیں دبی رہیں' مجھ سے کم رہیں۔ وہ جو فرعون کے متعلق کہا کہ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَ هُمۡ (2:49) وہ ابنائے قوم کو ذبح کردیا کرتا تھا۔ تو وہ یہی چیز تھی۔ اردو کا لفظ ''دیکھ نہیں سکتا'' تو ہے لیکن ''جے میں اینوں پنجابی اچ کہاں تے زیادہ ٹھیک اے ''وکیھ نہیں سکھوندا''[1]۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔

اب دو گروہ سامنے آ گئے۔ ایک کھلے بندوں یہ کہنے والا کہ اطاعت صرف خدا کی کتاب کی ہے اور وہ اس کے اوپر عمل کرنے والے ہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ یہ ایمان لاؤ گے تو ہم تمہیں فرقان عطا کر دیں گے یعنی ساری دنیا کے مقابلے میں ایک امتیازی زندگی دیں گے۔ دور سے پتہ چلے گا کہ یہ وہ ہے جو خدا کے سوا کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔ دوسرا وہ ہے جو کھلے بندوں یہ کہتا ہے کہ نہیں' یہ چیز غلط ہے بلکہ انسان انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق ہی زندگی بسر کرسکتا ہے' خواہ وہ سیاست میں ہو' خواہ وہ مذہب میں ہو' خواہ وہ طریقت میں یا تصوف میں ہو۔

عربوں کی زبان میں منافق کی تعریف

قرآن کہتا ہے کہ بین بین ایک تیسرا گروہ بھی ہوتا ہے۔ وہ اِس سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو کھلے بندوں یہ کچھ کرتا ہے۔ اور وہ ہے جنہیں وہ منافق کہتا ہے' جسے قرآن نے بدترینِ خلائق کہا ہے۔ کھلے بندوں جو دشمن ہوں تو اُس سے تو آپ اپنی حفاظت کا سامان کرتے ہیں لیکن جو آپ کے ہاں دوست بن کر آتا ہے' آپ کی جماعت میں شامل ہوتا ہے اور اُس کی نیت شروع سے ہی تخریب کی ہوتی ہے' اِس کی تخریب سے بچنا بہت مشکل ہے۔

---

[1] اگر میں اسے بزبانِ پنجابی کہوں تو وہ زیادہ صحیح ہے: ''وکیھ نہیں سکھوندا''۔ یعنی برداشت ہی نہیں کرسکتا۔

اب یہاں بات ہے عربوں کی۔ ایک جنگلی چوہا ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب کی زمین میں تو صحرا ہوتے تھے۔ وہاں عام طور پہ یہ جنگلی چوہے ہی ہوتے تھے اگر جھاڑیاں وغیرہ ہوں تو وہ بھاگ کر اُن میں چھپ جاتا ہے' لیکن اگر ریت کا صحرا ہو تو وہاں تو چیونٹی بھی چل رہی ہو تو پتہ چل جاتا ہے۔ وہ جو اُن کے ہاں کا جنگلی چوہا ہوتا تھا وہ اپنا بل بناتا تھا۔ اب چوہے کا وہ بل تو سامنے نظر آ جاتا ہے اور اُس کو اگر پکڑنا ہو تو آسانی سے ذرا سا کھود دیئے اور اندر سے وہ پکڑا جا سکتا ہے۔ یہ جنگلی چوہا کرتا کیا ہے؟ وہ جب بل بناتا تھا تو اِدھر سے تو اندر جانے کا راستہ ہوتا تھا اور اندر سے وہ اپنے لمبے بل بنا کے' اِدھر اُدھر چور دروازے ساتھ ہی نکال لیتا تھا یعنی بل میں گھستے وقت ہی وہ باہر نکلنے کا راستہ پہلے بنا لیتا تھا اور بعد میں اندر داخل ہوتا تھا۔ عرب اِس غار کو ''نفق'' کہتے تھے ''ایہہ نیفہ ساڈے جتھوں نکلیا ہے' او دوویں پاسوں کھلیا ہوندا اے' نیفے دا اگلا پاسہ بند کر دیوتے او نیفہ ای نہیں رہندا[1]''۔ وہ چونکہ عربوں کا چوہا تھا اور اُس کا پتہ چلتا تھا تو ہمارے ہاں جب یہ آیا ہے تو ہم تو منافقت میں اور شدت اختیار کر گئے ''اسی ق ای وچوں اڑا دتا' نیفہ ای رہن[2] دتا''۔ جو شخص کسی تنظیم' کسی جماعت' کسی حلقے' کسی زمرے' کسی مجلس' میں داخل ہونے سے پہلے یہ سوچ لے کہ مجھے چوری چوری کس راستے سے نکلنا ہے تو اُسے منافق کہا جاتا ہے۔ یہ ہے عربوں کی زبان۔ مومن کھلے بندوں دل و دماغ کی کامل رضامندی سے ایک راستہ اختیار کرتا ہے اور جماعت میں داخل ہوتا ہے' ایک مسلک اختیار کرتا ہے اور یہ اُس کا اُسی وقت تہیہ ہوتا ہے کہ **فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ** (2:132)۔ میں نے آخر تک' موت تک' اسی مسلک کے اوپر رہنا ہے۔ یہ جو کفر ہے' وہ بھی اپنے اندر ایک جوہر رکھتا ہے اور اسی لیے اُس[3] نے کہا تھا کہ

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے

اسی لیے اُس نے کہا تھا کہ اگر مندر میں بھی مرے' تو کعبے میں گاڑو برہمن کو: اس لیے کہ

مرے بُت خانے میں' تو کعبہ میں گاڑو و برہمن کو
وفا داری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے

وہ[3] بڑی بات کہہ گیا ہے۔ کفر پہ ہی ایمان سہی' بہ شرطِ اُستواری تو ہے۔ منافق کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نظر کچھ آتا ہے اور ہوتا کچھ

---

[1] جہاں سے ہمارے ہاں نیفہ نکلا ہے' وہ دونوں اطراف سے کھلا ہوتا ہے' اگر نیفے کا اگلا طرف بند کر دیں تو وہ نیفہ ہی نہیں رہتا۔
[2] ہم نے درمیان سے ''ق'' ہی اڑا دیا' نیفہ ہی رہنے دیا۔
[3] یہ اشارہ مرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1797) کی طرف ہے۔
وفاداری بہ شرطِ اُستواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانہ میں' تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ہے' بتاتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے' زبان میں کچھ ہوتا ہے اور دل میں کچھ ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک سب سے زیادہ محتاط رہنے کی تاکید منافق کے متعلق ہے

عزیزانِ من! قرآنِ مجید میں شروع سے آخر تک کفر کے متعلق بھی بہت کچھ ہے لیکن اُس کے بعد سب سے زیادہ جس کے متعلق اُس نے کہا ہے کہ احتیاط برتو' تو وہ منافقت ہے۔ شروع قرآن میں ہی آپ دیکھیے کہ پہلے اُس نے ایمان والوں کا ذکر کیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات ہیں کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ . الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ [1] (2:2-3)۔ یہ ایک گروہ ہو گیا۔ آگے ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ [2] (2:6)۔ یہ دوسرا گروہ ہو گیا۔ اور تیسرے گروہ کے متعلق کہا ہے کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ [3] (2:8) زبان سے کہتے چلے جائیں گے کہ ہاں صاحب! ہم بھی مومن ہیں' ہم بھی ایمان لائے' یقیناً وہ مومن نہیں ہوتے۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (2:9) خدا کو دھوکا دیتے ہیں' جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں کہ جن کے اندر شامل ہوتے ہیں۔ دل میں پہلے سے یہ رکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہم نے تخریب کرنی ہے۔ وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (2:9) یہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں' وہ خدا کو تو دھوکا دے ہی نہیں سکتے۔ جماعتِ مومنین کو بھی دھوکا نہیں دیتے کیونکہ وہ بڑے کھرے لوگ ہوتے ہیں اور پہچان لیتے ہیں۔ یہ منافق جو ہم لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں تو منافق کو منافق دھوکا دینے کی ہی کوشش کرتا ہے اور ہم بھی ویسے ہی ہیں ورنہ مومن کو منافق کیسے دھوکا دے سکتا ہے۔ ''اوہدے تے پیرای نہیں ہوندے ہیگے [4]''۔ زندگی کی ساری کشمکش میں ''چوہا'' اپنی گھات میں اور ''بلی'' اپنی گھات میں رہتے ہیں۔ ''اسی اوہدی فکراچ ہوندے آں تے اوہ ساڈی فکراچ ہوندا اے کہ جیہڑا مار دے [5]''۔ مومن تو شمشیرِ برہنہ ہوتا ہے' کھلا کھلا ہوتا ہے۔

---

[1] یہ ضابطۂ قوانین' سفرِ زندگی میں' اُن لوگوں کو انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اُن حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔2)۔

[2] دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے کہ صحیح زندگی کا صحیح راستہ نمایاں طور پر ان کے سامنے آجاتا ہے لیکن وہ ضد' حسد' تکبر اور اپنی مفاد پرستیوں کی بنا پر اسے اختیار نہیں کرتے' وہ خود بھی اس راستے پر نہیں چلتے اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے سے روکتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان کی اس روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے' ان کے لیے برابر ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔3)۔

[3] تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور قانونِ مکافات اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے' لیکن وہ درحقیقت ان پر ایمان نہیں رکھتے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔4)۔

[4] اس کے تو پاؤں ہی نہیں ہوتے۔

[5] ہم اس کے تعاقب میں' اور وہ ہمارے' پھر جو جس کو مار دے۔

یہ تیسرا گروہ ہے جو وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ (2:8) ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ شروع میں کہا گیا ہے کہ دعوئے ایمان کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ جب دشمن سے مقابلہ پڑے تو سینہ سپر ہوکر سامنے کھڑا ہوجائے' دھڑلے سے جان دیدے۔ کہا کہ یہ ہے جس کٹھالی میں داخل ہوکر وہ کندن بن کر نکلے گا۔ کہا کہ ایک گروہ یہ ہے کہ آ گئے' دستخط کردیئے اور فارم بھی بھر دیا اور آپ سے کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں لیکن اُن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر تو ساتھ رہنے میں فائدہ ہوتا چلا جائے تو ساتھ ہیں' ذرا تکلیف ہوئی تو کہا کہ کس مصیبت میں پھنس گئے اور چھوڑ گئے اب منافق کی ایک بڑی عمدہ Definition ہی نہیں بلکہ اُس کی پہچان سامنے آ گئی کہ اپنی مفاد پرستی کے لیے اگر کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے تو وہ منافق ہے۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ فَاِذَاۤ اُوۡذِیَ فِی اللّٰہِ جَعَلَ فِتۡنَۃَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰہِ (29:10) یہ سوچ کر ان کے ساتھ شامل ہوا کہ ان کے ساتھ مزے ہی مزے ہیں لیکن جب مقابلے میں جانا پڑا اور وہاں کچھ تکلیفیں ہوئیں تو اُن تکلیفوں کے متعلق چلا اُٹھا کہ صاحب! یہ تو ہمارے اوپر خدا کا عذاب آ گیا۔ ہم تو یہ سمجھ کر نہیں آئے تھے' یہ کیا ہو گیا۔ وَ لَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّکَ لَیَقُوۡلُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُمۡ (29:10) اور جب اِن کو کامیابی نصیب ہوئی' دیکھا کہ ان کی طرف زیادہ ووٹ پڑتے چلے جا رہے ہیں تو کہا کہ صاحب! ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ ہے کہ جب مفادات تمہارے ساتھ رہنے میں ہیں تو قسمیں اٹھا اٹھا کر کہتا ہے کہ میں تمہارے ہی ساتھ تھا' میں دوسرے کو فریب دے رہا تھا۔

حضرت عمرؓ کی نظر میں مومن کی پہچان

قرآن نے کہا تھا کہ یہ فریب تو ضرور دے رہا تھا لیکن یہ ہر ایک کو فریب دے رہا ہے' اس سے بچنا۔ یہی تو وہ چیز تھی جو حضرتِ عمرؓ (581-44/45AD) نے کہی تھی۔ اُن کے قول کی کیا بات ہے! وہ تو چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا' میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا تھا کہ مومن وہ ہے جو کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپؓ نے کہا تھا کہ فقرہ پورا کرو' آدھا کیوں کہتے ہو۔ کہنے لگے کہ جی کیسے فقرہ پورا کروں۔ کہا کہ مومن وہ ہے' جو کسی کو دھوکا نہیں دیتا اور کسی سے دھوکا کھاتا بھی نہیں ہے۔ مومن خدا کی صفات کے رنگ میں رنگا ہوا ہوتا ہے۔ خدا اگر دھوکا نہیں دیتا ہے تو دھوکا کھاتا بھی نہیں ہے۔ مومن کی بصیرت یہ ہے۔

عزیزانِ من! ہمیں تو پتہ نہیں ہے کہ ایمان ہوتا کیا ہے؟ اور وہ کیا جوہر پیدا کرتا ہے؟ وہ ایمان تو انسان میں ایسی فراست پیدا کرتا ہے کہ مفاد پرستیاں اور منافقت انگیزیاں ہوں ہی نہیں۔ مفاد پرستیاں حقیقت کو دھندلا کر دیتی ہیں ''اندھا ہو جاندا اے آدمی[1]''۔

---

[1] آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ مومن کی فراست سے محتاط رہا کرو وہ تو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اور اللہ کا نور کتاب ہے۔ مومن دھوکا نہیں کھاتا لیکن یہ گروہ منافقین ہمیشہ اس ٹوہ میں ہوتا ہے کہ جب مفادات تمہارے ساتھ رہنے میں ہیں تو تمہارے ساتھ رہے۔ اُس کے بعد جب دیکھتا ہے کہ مستقل طور پر اپنے مفادات الگ ہیں تو وہ ہر قسم کا دھوکا دیدیتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ان سے بچنے کی بہت ہی زیادہ تاکید کی ہوئی ہے۔ آپ تاریخِ انسانیت پہ نگاہ ڈالیے تو دیکھیے کہ کھلا ہوا کافر کسی قوم کے اندر آ کر وہ تباہیاں نہیں مچاتا جو اِس قسم کے نقاب پوش جسے قرآن نے خنجر برآستیں منافق کہا ہے، وہ جو تباہیاں پیدا کرتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ **اَوَ لَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِمَا فِىۡ صُدُوۡرِ الۡعٰلَمِيۡنَ** (29:10) نہیں صاحب! ہم تو دل سے تمہارے ہی ساتھ تھے، وہ تو یونہی اوپر اوپر سے اُن کے ساتھ تھے۔ کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا ان کا خیال ہے کہ یہ اُس خدا پہ ایمان لائے جو دلوں کے حالات کو نہیں جانتا؟ اگر ان کا ایمان اِس قسم کے خدا پہ نہیں ہے تو یہ اُس کو تو فریب دے سکتے ہیں۔ کہا کہ وہ تو نوعِ انسانی کے قلوب کے اندر کی چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے، تم اُس کو کیا جُل دے سکتے ہو، کیا فریب دے سکتے ہو۔ **وَ لَيَـعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَيَعۡلَمَنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ** (29:11) وہ جانتا ہے کہ مومن کون ہیں اور وہ جانتا ہے کہ منافق کون ہیں۔

عزیزانِ من! زندگی میں قرآنِ کریم کی اس تعلیم کی روشنی میں اس حقیقت کو سمجھنا چاہیے، ہمیشہ اس کی احتیاط برتنا چاہیے کہ جو آپ کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا ہے، کیا وہ فی الحقیقت مخلص ہے، اخلاص سے ساتھ دے رہا ہے؟ کسی کے اوپر یونہی نہ بھروسہ کرلو۔ قرآن کی تعلیم یہی ہے۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم منافقین سے بچنے کی بڑی تاکید کرتا ہے۔ جہنم میں تو بہرحال جنہیں وہ کفار کہتا ہے، اُنہیں وہ بھیجتا ہی ہے لیکن جہنم کا سب سے نیچے کا جو درجہ ہے اُس میں منافق ہے۔ کہا کہ **وَ لَيَـعۡلَـمَـنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ** (29:11) یہ گروہ وہ ہے۔ **وَ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوۡا سَبِيۡلَنَا وَلۡنَحۡمِلۡ خَطٰيٰكُمۡ** (29:12) تمہاری جماعت میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اِن سے آ کر کہتے ہیں کہ یہاں تو تم سے روز باز پرس بھی ہوتی ہے کہ یہ نہیں کیا، وہ نہیں کیا، یہ قصور ہوگیا، وہ غلطی ہوگئی۔ جماعتوں میں تو ایسا ہوگا۔ کہا کہ ان کا ساتھ چھوڑو، یہ روز تمہیں تنگ کرتے ہیں، تم ہمارے ساتھ آؤ۔ تم جو کچھ کرگزرے ہو، اس کا کوئی مواخذہ ہی نہیں ہوگا، تمہاری جو لغزشیں بھی ہوچکی ہوئی ہیں، ہم اُن کو سنبھال لیں گے۔ یہ اِس قسم کی ترغیب دے کر بھی جماعتوں سے الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہا کہ **وَ مَا هُمۡ بِحٰمِلِيۡنَ مِنۡ خَطٰيٰهُمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ ؕ اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ** (29:12) یہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں، ان سے تو اپنی ہی لغزشوں کے نتائج نہیں بھگتے جائیں گے، یہ تمہاری لغزشوں سے تمہیں کس طرح معاف کرا سکتے ہیں۔ جو چیزیں بھی تباہی پیدا کرنے والی ہیں اُن کے متعلق تو قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ **اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ** (11:114) لغزشیں ہوجاتی ہیں لیکن لغزشوں

کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے یا جو تباہی آتی ہے' اُس کے ازالے کی شکل یہ ہے کہ جتنے نقصان دینے والی کوئی بات تم سے ہوگئی تو اُس سے زیادہ فائدہ دینے والی بات کرو۔''اوجنوں کیندے نیں کہ گھاٹا وی پورا ہوجائے گا' تے نال کچھ بچ وی جائے گا❶''۔طریق ہی یہ ہے کہ سیأت کی مدافعت حسنات سے کرو۔دورِ حاضرہ کی میکاؤلی سیاست تو یہ جانتی نہیں ہے' وہ تو مقابلے میں ردِ عمل ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ تخریبی بات ہوتی ہے۔وہ کہتا ہے کہ اِس طرح سے تخریب کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔حسنات سے سیأت کا ازالہ ہوسکتا ہے۔یہ بڑی بلند تعلیم ہے جو قرآن دیتا ہے۔یہی وہ چیز ہے جو قرآن نے یہ کہا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ اِس شخص نے دشمنی کی تھی' مخالفت کی تھی۔ایک ردِ عمل یہ ہے کہ تم اُس سے زیادہ اِس کے ساتھ مخالفت اور دشمنی کرو۔کہا کہ جی تو یہی چاہے گا لیکن اِس کی بجائے خلوصِ دل سے اِس کو گلے سے لگا لو تو دیکھو کہ کتنا جگری یار بن جاتا ہے۔یہ ہیں وہ اصول جو قرآن نے بتائے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ کہا ہے کہ یہ بات غلط ہے کہ تم سے اگر کوئی کوتاہیاں اور لغزشیں ہوئی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ آؤ ہماری طرف' ہم سنبھال لیں گے۔کہا کہ نہیں' یہ یوں سنبھالنے کی بات نہیں ہے بلکہ اِس سے زیادہ بہتر حسن کارانہ انداز کے کام کرو تو یہ ناہمواریاں ہمواریوں میں بدل جائیں گی اور کچھ اور زیادہ بھی بچ جائے گا' یہ منفعت کا سودا ہے۔قرآن نے دشمنوں کو دوست بنانے کا یہ طریقہ بتایا ہے۔کہا کہ **وَ لَيَحۡمِلُنَّ اَثۡقَالَهُمۡ وَ اَثۡقَالًا مَّعَ اَثۡقَالِهِمۡ ۫ وَ لَيُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ** (29:13) تخریبی نتیجہ پیدا کرنے والا کام کسی کی طرف سے ہو' کسی جماعت سے ہو' ایسا کام کرنے والا کسی کے ہاں جا کے مل جائے تو یہ کام تو اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں آؤ اور ہم ان چیزوں کے متعلق مواخذہ سے بچائیں گے۔ان کی تو اپنی یہ حالت ہوگی کہ اپنے جو اِس قسم کے تخریبی کام ہیں اُن کا بھی نتیجہ بھگتیں گے اور تم سے جو یہ وعدہ کر رہے ہیں اس کا بھی نتیجہ بھگتیں گے۔اگر دو تولے سنکھیا زہر ہے تو چار تولے سنکھیا تریاق تو نہیں بن جاتا بلکہ وہ تو اور شدت سے مہلک ہو جاتا ہے۔**وَ لَيُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ** (29:13) کتنا بڑا فریب ہے جو یہ دنیا کو دیتے ہیں! ظہورِ نتائج کے وقت یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ افتراء پردازی' فریب انگیزی' جھوٹے وعدے' غلط کوشیاں' کبھی بھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔یہ حسنات ہی ہیں جو تعمیری نتائج پیدا کریں گی۔

اقوامِ سابقہ کی داستانیں بیان کرنے کا مقصد نیز حضرت نوحؑ کی عمر کا اندازہ

یہ تمہید باندھنے کے بعد پھر جو قرآن کا انداز ہے' وہ یہ ہے کہ وہ انبیائے سابقہؑ اور اقوامِ گزشتہ کی داستانیں سامنے لاتا ہے کہ ہم نے یہ اصول بتایا ہے تو آؤ دیکھو! تاریخ کے اوراق سے پوچھو' وہ اِس کی شہادتیں دیں گے کہ یہ اصول واقعی بڑا محکم ہے۔تاریخی شواہد قرآن

---

❶ یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی اور کچھ بچ بھی جائے گا۔

کے ان دعووں کی صداقت کا ثبوت بنتے ہیں۔ اور یہ کچھ کہنے کے بعد کہا کہ **وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا** (29:14) حضرت نوح ◆ کو اپنی قوم کی طرف بھیجا۔ اس طرح پہلے نبی سے بات شروع کر دی۔ قرآن یہ کرتا ہے۔ اتفاق سے یہ ایک آیت سامنے آ گئی ہے جس کا ایک مفہوم ذہنوں میں الجھاؤ پیدا کرتا ہے اس لیے میں اُسے واضح کر دوں۔

قرآن نے کہا کہ **فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا** (29:14)۔ اس آیت کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ وہ اُن میں ایک ہزار سال سے پچاس برس کم رہا۔ تو عام طور پہ یہ مشہور ہے کہ حضرتِ نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ اور پھر اس پر مخالفین و معترضین اعتراض کرتے ہیں کہ تاریخ تو اس کی شہادت نہیں دیتی۔ حضرتِ نوحؑ کا زمانہ بھی متعین ہے۔ کوئی چھ ہزار سال قبل مسیح سمجھ لیجیے۔ اور یہ محقق لوگ کہتے ہیں کہ Anthropology (علم الانسان) کے اعتبار سے تو اس سے بھی پہلے زمانے سے انسان نے اپنی ابتدائی زندگی شروع کی ہے۔ وہاں سے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے تحقیق کی ہوئی ہے۔ وہاں تو ساڑھے نو سو سال کی عمر نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس میں دو باتیں یاد رکھیے۔ ایک تو یہ ہے کہ جسے کسی فلاں بڑے شخص کی عمر کہا جاتا ہے وہ اُس کی صرف طبعی زندگی (Physical Life) یعنی اپنی ذاتی عمر نہیں ہوتی بلکہ یہ اُس کی تعلیم کا' اُس کی بنائی ہوئی تہذیب کا' اُس کے تمدن کا' ایک دور ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ چیزیں کہی ہیں مثلاً دورِ ابراہیمیؑ' نبی اکرم ﷺ کا دورِ رسالت' قیامت تک' یہ ہمارے ہاں روز مذاکرے ہوتے ہیں' مناظرے ہوتے ہیں' بحثیں ہوتی ہیں' پھر سر پھٹول ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں یا نہیں؟ حیات النبی بھی آپ کو معلوم ہے کہ ایک مسئلہ ہے' میں اُس مسئلے میں نہیں جاتا۔ یہ جو اولوالعزم حضرات ہیں' وہ زندہ ہوتے ہیں جب تک اُن کا پیغام یا تعلیم روئے زمین پہ زندہ ہوتی ہے۔ اِس اعتبار سے وہ زندہ ہوتے ہیں۔ جب تک ان کے متبعین' جن کو اُن کی امت کہا جاتا ہے' جب تک اُن کا تسلسل ہوتا ہے تو وہ زندہ ہوتے ہیں۔ روحِ محمدی ﷺ امتِ محمد ﷺ کے اندر زندہ ہے' پیغامِ محمدی ﷺ کے اندر زندہ ہے' رسالتِ محمدیہ ﷺ کے اندر زندہ ہے' قیامت تک کے لیے زندہ ہے۔ تو یہ جو ہے اسے فلاں نبی کا زمانہ کہیے۔ **فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ** (29:14) وہ اُن کے اندر رہا' یہ اُس کا دور ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرتِ نوحؑ کا پیغام یا تعلیم وہی رہی جبکہ اور بھی انبیائے کرام آتے رہے۔ وہ اُس وقت تک رہا جب تک حضرتِ ابراہیمؑ کا دور نہیں آ گیا اور قرآن نے اس آیت کے بعد درمیان میں تمام انبیائے کا ذکر حذف کر دیا ہے۔ **وَ اِبۡرٰہِیۡمَ اِذۡ قَالَ** (29:16) اور حضرت ابراہیمؑ کا ذکر آ گے آ گیا۔ تاریخ کے اس اصول کے اعتبار سے یہ ہے کہ یہ کسی کی تعلیم کا یا تہذیب کا ایک دور ہوتا ہے۔ تو جو دورِ حضرتِ نوحؑ ہے وہ دورِ حضرتِ ابراہیمؑ کے آغاز تک رہا اور وہاں سے دورِ حضرتِ ابراہیم ◆ شروع ہوا۔

عزیزانِ من! میں عرض کروں گا کہ یہ جو دو ادوار ہیں' ان میں کیا فرق ہے؟ اُس دور کی بنیادی خصوصیت کیا تھی؟ اور دورِ ابراہیمؑ میں آ کر کیا فرق پڑا؟ بہر حال یہ یا تو دورِ حضرتِ نوحؑ ہے یعنی یہ اُن کی تعلیم کا زمانہ ہے اور اگر اس طبعی عمر کی طرف آنا ہے کہ وہ واقعی

Physical (طبعی) عمر ہے تو اُس میں بھی ایک بڑا عجیب نکتہ ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **اَلْفَ سَــــنَةٍ** (29:14) ۔اب آئی عربی زبان۔ ہم تو سن سال بھر کے لیے کہتے ہیں لیکن عربوں کے ہاں یہ جو سال میں چار فصلیں ہوتی ہیں تو اُن میں سے ہر فصل کو وہ سن کہتے تھے یعنی سال کا چوتھا حصہ۔تو جو ہزار فصلیں ہیں وہ اڑھائی سو سال ہوئیں۔اب آگے یہ ہے کہ **اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا** (29:14) پچاس اُس میں سے نکال دیئے۔غور کیجیے کہ یہاں سنة نہیں بلکہ **عامًا** کہا ہے کیونکہ **عامًا** سال ہوتا ہے۔ ہزار فصلوں میں سے پچاس سال نکال دیئے۔اس اعتبار سے یہ دوسو کے قریب بن جاتا ہے اور یہ ممکن ہے۔سوا سو سال اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال کی عمر کے کئی لوگ تو آج بھی ہمارے ہاں موجود ہوتے ہیں۔غدر کے زمانے [1] کے حالات سنانے والے لوگ ہمارے ہاں موجود تھے اور اب بھی ہوتے ہیں۔اس لیے اس کا امکان ہے۔اور پھر آیئے عربوں کی زبان کی طرف۔ان کے ہاں سَنَةٍ کو اور **عامًا** کو سال کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ اُس میں فرق کرتے ہیں۔**عامًا** اُن کے ہاں خوشحالی کا سال ہوتا ہے یعنی آرام کا' امن کا' سال ہوتا ہے۔**سنةٍ** سختیوں کا سال ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ اُسی مکے میں چالیس سال تک اُنہی قریش کے اندر رہے تو بڑے امن آمان میں رہے' امین حضور ﷺ کا لقب تھا۔یعنی بڑی خوشحالی کی زندگی' امن کی زندگی' سہولت کی زندگی' کوئی مخالفت نہیں' کوئی مزاحمت نہیں۔اس کو عرب **عـامًا** کہتے تھے یعنی نبی کی قبل از نبوت کی زندگی کسی تزاحم کی نہیں تھی۔ یہ **عامًا** ہوتا تھا۔اور اُس کے بعد جب یہ تزاحمات شروع ہوتے تھے تو اُس کو وہ **سنةٍ** کہتے تھے۔ اب یوں کہیں گے کہ اُنؑ کی پچاس سال کی زندگی قبل از نبوت کی تھی اور وہ آرام سے گزری اور اُس کے بعد **سنةٍ** کی زندگی آتی ہے جس میں سختیاں شروع ہوتی ہیں۔اسے یوں کہا جاسکتا ہے۔اس اعتبار سے یہ جو آگے اُن کا نبوت کا زمانہ آئے گا یہ اُن کی تعلیم کا زمانہ آئے گا۔ یہ ہے وہ دور جو ابراہیمؑ کے دور تک چلا آتا ہے۔ بہر حال اِس وقت تک اس مسئلے میں تحقیق کا رُخ اسی طرف کو گیا ہے کہ اگر اڑھائی سو سال کی عمر ہے تو پچاس سال زمانہ قبل از نبوت ہے جس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔اور اُس کے بعد دوسرا دورِ نبوت ہے جب اُنؑ کی زندگی کا شروع ہوتا ہے تو اپنے ہاں سے وہ ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے۔قرآن نے اِس کی تفصیل یہاں نہیں دی۔کہا ہے کہ **فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ** (29:14) وہ ظالم قوم تھی' اُنہوں نے اِس قدر مظالم کیے اور اُس کے بعد پھر خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل آ گیا۔وہ پوری کی پوری قوم کو لے ڈوبا تھا۔ظلم لے ڈوبتا ہے۔ **اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:21) یہ اُس کے قانونِ مکافات کا اصول ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی نہیں پنپ سکتی۔

لفظ فَلَح کا قرآنی مفہوم

یہ ''فَـلَـح'' عجیب لفظ ہے۔کھیتی اُگتی تو رہتی ہے اور نظر بھی آتی ہے کہ اُگ رہی ہے' بڑی بھی ہو رہی ہے۔فلاحت وہ ہوتی ہے

---

[1] یہ 1857ء کی طرف اشارہ ہے جو انگریز کے دورِ حکومت میں برپا ہوا۔

جب اُس کے اندر دانے پڑتے ہیں یعنی جب فصل پکتی ہے۔ کہتا ہے کہ ظالم کی کھیتی اُگتی ہوئی تو نظر آتی ہے' سرسبز و شاداب بھی وہ دکھائی دیتی ہے اس لیے وہ فریبِ نگاہ پیدا کرتی ہے اور انسان دھوکے میں آ جاتا ہے لیکن **اِنَّـهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:21) پکتی نہیں ہے یعنی بیچ میں قرآن جو ایک مہلت کا وقفہ کہتا ہے' اسی سے انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ حضرتِ نوحؑ کو اُن میں اتنا عرصہ تبلیغ کرتے ہوئے' اُن کی اصلاح کی کوششیں کرتے ہوئے' لگ گیا لیکن وہ اُس مقام پہ پہنچ چکی تھی جس میں بازیابی کی کوئی صورت نہیں رہی تھی' بازآفرینی کا امکان نہیں رہا تھا۔ انسان کے بعض اس قسم کے غلط کام بھی ہوتے ہیں جن میں بازآفرینی یا بازیابی کا امکان نہیں رہتا۔ بات تو وہ ایک سیکنڈ میں ختم ہوتی ہے۔ ایک شخص ایک چاقو لے کر اپنی آنکھ میں مار لیتا ہے تو ایک سیکنڈ میں یہ کام ہو گیا۔ اب ایسا اُس نے جرم کیا ہے کہ اِس میں بازیابی کی شکل باقی نہیں رہی اور ساری عمر اندھا رہے گا۔ اس قسم کے کام بھی ہوتے ہیں۔ جب اِس مقام پہ کوئی قوم پہنچ جاتی ہے تو قرآن نے کہا کہ پھر اُن کے اِس قسم کے جو ظلم آمیز اعمال تھے وہ اُنہیں لے ڈوبے مگر **فَاَنْجَیْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِیْنَةِ وَ جَعَلْنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ** (29:15) حضرتِ نوحؑ اور اُن کے وہ ساتھی جو اُس اصول پہ قائم تھے کہ خدا کے سوا کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے' وہ بچ گئے اور یہ جو داستان ہے اسے ہم نے آنے والے زمانے کے لیے' حقیقت تک پہنچنے کی ایک نشانی بنا دیا کہ غلط نظام' غلط کام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ظلم ہوتا ہے اور آخرالامر وہ ان لوگوں کو لے ڈوبتا ہے جو اِس نظام یا اِس قسم کی روشِ زندگی کے حامل ہوتے ہیں۔

کہا کہ تاریخ کی جو پہلی شہادت ہے وہ اِس اصولِ قرآنی کی صداقت کا ثبوت بنتی ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ حضرتِ نوحؑ سے بات شروع کی اور جیسا میں نے عرض کیا تھا یہاں ان کی عمر سے مراد اُس تعلیم کا دور ہی ہے۔ آگے ہے **وَ اِبْـرٰهِیْمَ** (29:16) یعنی حضرتِ ابراہیمؑ آ گئے۔ یہاں قرآن نے درمیان میں قومِ عاد اور قومِ ثمود وغیرہ کا ذکر نہیں کیا حالانکہ وہ حضرتِ نوحؑ کے بعد اور حضرتِ ابراہیمؑ سے پہلے کا دور ہے۔ **وَ اِبْـرٰهِیْمَ** (29:16) اور یہاں سے حضرت ابراہیمؑ کی بات شروع ہوئی ہے اور بڑی تفصیل سے وہ بات آئی ہے۔ یہ بات شروع کی ہے۔ یہ تسلسل سے بیان کی جائے گی' تو سمجھ میں آئے گی کیونکہ میں نے عرض کیا ہے قرآنِ کریم میں دو ہی شخصیتیں ہیں جن کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے' بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ وہ نمونے والی زندگی ہمارے سامنے تسلسل کے ساتھ آنی چاہیے لیکن اب درس کا وقت ختم ہوا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ العنکبوت کی آیت 15 تک آ گئے ہیں۔ 16 ویں سے آئندہ شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



چوتھا باب: **العنکبوت** (آیت 16: اسوۂ ابراھیمیؑ ابتدائیہ: بابل کی زندگی)



عزیزانِ من! آج اپریل 1979ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 16 سے ہو رہا ہے: (29:16)۔

حضرتِ ابراہیم ◆ کا تذکرۂ جلیلہ بطورِ ماڈل

بات حضرتِ ابراہیمؑ کے تذکرۂ جلیلہ کی ہو رہی ہے۔ سابقہ درس میں، میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے دو ہستیوں کی زندگی کو اُسوۂ حسنہ یا بہترین ماڈل قرار دیا ہے: ایک حضرتِ ابراہیم ◆ اور دوسری حضورِ نبی اکرم ﷺ۔ اس میں شبہ نہیں کہ منصبِ نبوت کے اعتبار سے تمام انبیائے کرامؑ ایک ہی مقام کے حامل ہوتے ہیں یعنی یکساں عزت وتکریم کے پیکر لیکن اُن کے دائرہ کار، تعلیم اور پروگرام کی نوعیت اور وسعت کے اعتبار سے اُن کے مدارج میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ اور اِسی اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے ان دو ہستیوں کی زندگی کو جو ماڈل قرار دیا ہے تو اِس لیے کہ انسانی زندگی کے مختلف گوشوں میں انہوں نے جس حسنِ کردار اور رفعتِ سیرت کا ثبوت دیا تھا، وہ واقعی ایک ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ماڈل بھی یہ ہے کہ حضرتِ ابراہیم ◆ کو امام للناس کہا یعنی وہ ہستی کسی خاص قوم یا قبیلہ کے لیے ہی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کے لیے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے اور نبی اکرم ﷺ بھی رحمۃ للعٰلمین ہیں۔ گویا یہ کوئی وقتی، مقامی یا زمانی اعتبار سے نہیں بلکہ وہ ایسے حسنِ سیرت کے علمبردار تھے کہ وہ سیرت، انسانیت کے لیے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ماڈل کے اعتبار سے ایک نکتہ تو پہلے سمجھ لینے کا ہے۔ فائن آرٹ یا یہ ڈرائنگ کی کلاس میں ایک شعبہ ماڈل ڈرائنگ کا بھی ہوتا ہے۔ اُس میں ڈرائنگ کا پروفیسر یا ماسٹر ایک ماڈل اسٹوڈنٹس کے سامنے رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اُس کے مطابق تم اپنے ہاں ڈرائنگ کرو۔ اب ظاہر ہے کہ ماڈل ڈرائنگ میں وہ ماڈل سامنے رکھا جائے گا تو اُس کے مطابق وہ اسٹوڈنٹس ڈرائنگ کریں گے۔ اگر وہ ٹیچر یہ کہے کہ اس ماڈل کے مطابق بناؤ اور ماڈل وہاں نہیں رکھے تو ظاہر ہے کہ وہ ڈرائنگ کر ہی نہیں سکیں گے اور اگر اُن سے کچھ کرایا جائے گا تو ہر طالبعلم

اپنے اپنے ذہن کے نقشے کے مطابق وہاں کچھ بنا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ کہا کہ ان کی زندگی تمہارے لیے ماڈل ہے تو یقیناً اُس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ ماڈل کو لوگوں کے سامنے رکھے کہ یہ ہے وہ ماڈل، جس کے مطابق تم نے اپنی زندگی کو ڈھالنا ہے ورنہ یہ تو عجیب بات ہوتی کہ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی کو تو ماڈل قرار دیتا اور اِس ماڈل کو کسی طبری اور بخاریؒ کے اوپر چھوڑ دیتا کہ تم متعین کرنا۔ پھر طبری اور بخاریؒ نے اپنے اپنے ذہن کے کتنے ہی ماڈل تراش کے وہاں رکھے۔ جس خدا نے کہا تھا کہ ان کی زندگی تمہارے لیے ماڈل ہے تو اُس نے ان کا ماڈل خود ہی متعین کر کے سامنے رکھ دیا تھا کہ یہ ہے وہ ماڈل جس کے مطابق تم نے اپنی زندگی کو ڈھالنا ہے۔ خدا نے ان دونوں ہستیوں کی زندگی کے ماڈل کے خدوخال خود واضح طور پر متعین کر کے قرآن میں رکھ دیئے تھے۔

عزیزانِ من! اُس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جب یہ ماڈل ان افسانہ نگاروں کی جنبشِ قلم کے رہینِ منت ہوئے تو پھر اِنہوں نے اُن میں کس کس قسم کی رنگ آمیزیاں کیں، کس کس قسم کی عجوبہ پرستیاں کیں۔ اصل تو یہ ہے کہ اُس ماڈل کو کیا سے کیا بنا دیا۔ ماڈل تو وہی قابلِ اعتماد ہوگا جو اُس کا دیا ہوا ماڈل ہو جس نے اِسے ماڈل قرار دیا ہے۔ وہ ماڈل قرآن کے اندر موجود ہے۔ ہم حضرتِ ابراہیمؑ اور والذین معہ کی زندگی کو لیتے ہیں۔ یہ دور وہ ہے جہاں بابل کی مملکت اُس زمانے کی تہذیب اور تمدن کا مرکز تھی۔ یہ تاریخِ انسانیت میں عجیب چیز آئی ہے کہ مختلف ادوار میں، مختلف اقوام، تہذیب وتمدن کی علمبردار قرار پائی ہیں۔ اُس دور میں یہ بابل کا خطہ تھا جو تہذیب کا مرکز تھا۔ یہ بڑی شاندار مملکت تھی، مملکت میں بادشاہت تھی۔ اُس دور میں ہوتی ہی بادشاہت تھی لیکن بادشاہ سے کہیں زیادہ صاحبِ اقتدار، مذہبی پیشوائیت کا سربراہ ہوتا تھا۔ قرآن کی داستان میں تو آپ نے دیکھا ہے کہ ہامان کو کیا مقام حاصل تھا۔ ہندوستان میں بھی جو راجے مہاراجے بھی تھے، جب تک انہیں برہمن کے ہاتھوں کا تلک نہیں لگ جاتا تھا وہ اُس وقت تک گدی پہ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ یہ برہمن، یہ پجاری، یہ پیشواء، یہ پریسٹ، بادشاہ گر ہوتے تھے۔ بابل کی مملکت کا جو ہیڈ پریسٹ تھا، آپ سمجھ لیجیے کہ اُس کا مقام کیا ہوگا۔ ہر قسم کی شان وشوکت، عظمت، قوت، اقتدار، دولت، یہ سب کچھ اُسے بادشاہ سے بھی زیادہ حاصل ہوتا تھا۔ بادشاہ کو تو اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لیے کسی نہ کسی فوج کی ضرورت ہوتی تھی، پولیس کی ضرورت ہوتی تھی، سی آئی ڈی کی ضرورت ہوتی تھی لیکن مذہبی پیشوائیت کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کمرے کی انتہائی تنہائیوں میں بیٹھے ہوئے آدمی کے دل میں اگر اُن کے خلاف کوئی خیال گزر جاتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے، گڑگڑاتا ہے اور روتا ہے۔ ان کا اقتدار تو قلب و دماغ اور اعصاب پر مسلط ہوتا ہے۔ اِس قسم کی مملکت کا ہیڈ پریسٹ اور پھر مذہبی پیشوائیت کے اعتبار سے قلوب واذہان پر اُس کا اقتدار، دولت اور حشمت، ساری حاصل تھی۔ بادشاہ گری بھی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ تو سوچیے کہ اِس اسقفِ اعظم (ہیڈ پریسٹ) کا جو ولی عہد ہوگا اُس کی کیا پوزیشن ہوگی۔ اور یہ پوزیشن تھی حضرتِ ابراہیمؑ کی۔ یہ اُس وقت کی پوزیشن تھی اور باپ کے بعد اِس منصب کے اوپر جس نے بیٹھنا تھا، تو اُس میں جو کچھ پوزیشن اُن کی ہوسکتی تھی وہ ظاہر ہے۔

اگلی بات وہ ہے جو میں نے پچھلے درس میں کہی تھی کہ دنیا کے ہر مذہب کا اور ضابطۂ اخلاق کا یہ مسلمہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ یہ ایک غلط مسلمہ ہے لیکن مسلمہ ایسا ہے جس پہ کبھی کسی نے تنقیدی نگاہ ہی نہیں ڈالی۔ اِس کو مانا گیا کہ یہ ہے ہی مسلمہ' اِس میں تو کسی قسم کا شک وشبہ ہی نہیں ہے۔ آغاز اس چیز سے ہوتا ہے کہ اِس باپ کا یہ بیٹا تھا' یہ اُس کا مستقبل ہے۔ پھر وہ باپ بھی ہے جس کے متعلق یہ چیز مسلمہ ہے کہ اُس کی اطاعت بھی فرض ہے۔ بُت پرستی اُس قوم کا شیوہ تھا۔ ہیڈ پریسٹ تو آپ جانتے ہیں کہ کس قسم کا بت تراش' بت گر' بت پرست ہوتا ہے۔ وہاں یہ اُس کا ولی عہد بیٹھا ہوا ہے۔ کہا کہ وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ لِاَبِيۡهِ [1] (6:74)۔ بات قرآن یہاں سے شروع کرتا ہے۔ ابراہیمؑ خود اپنے باپ سے یہ کہہ رہا ہے کہ اَتَتَّخِذُ اَصۡنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّىۡۤ اَرٰٮكَ وَ قَوۡمَكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ (6:74) قبلۂ من! ذرا سوچیے تو سہی کہ یہ کیا روشِ زندگی ہے کہ ایک پتھر کو تم اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو' اُسے خود ایک شکل دیتے ہو' ایک ہیئت دیتے ہو۔ اُس کی وہ شکل اور ہیئت تمہارے پیشے اور ہنر کی رہینِ منت ہے۔ ایک غلط ہاتھ اُس پہ لگا دو تو اُس کی ناک اڑ جائے۔ پھر اُس کا خدا بننا تو ایک طرف رہا اُس سے بُت کو تو دو ٹکے کا بھی کوئی نہ خریدے۔ یعنی اُس کی ہستی' اُس کی شکل وصورت' اُس کا بت ہونا' اُس کا خدا ہونا تمہارے ہاتھوں کا رہینِ منت ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اُس کو یہ کچھ بناتے ہو اور اُس کے سامنے پھر سجدہ ریز ہوتے ہو۔ تمہاری مت کو کیا ہو گیا ہے!! باپ سے بیٹا کہہ رہا ہے۔ آج اِس دور میں بھی آپ دیکھیے جہاں کہتے ہیں کہ اولاد بڑی سرکش ہو گئی ہے۔ اگر کوئی غلط بات کہے تو اُس کو بھی آپ نے ٹوکنا ہے۔ یہ مسلمہ غلط ہے کہ ماں بات کی اطاعت فرض ہے۔ اطاعت صحیح بات کی فرض ہے خواہ وہ ماں باپ کہے یا کوئی دوسرا کہے۔ غلط بات کی اطاعت قطعاً فرض نہیں ہے خواہ اُس کا کہنے والا کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ اِس اسوۂ حسنہ کے اندر پہلی بات تو یہ آ گئی۔

عزیزانِ من! حضرت ابراہیم ◆ نے اپنے باپ سے کہا کہ اِنِّىۡۤ اَرٰٮكَ وَ قَوۡمَكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ (6:74) تم ہی نہیں بلکہ یہ پوری کی پوری قوم ہے جس کو تم نے گمراہ کر رکھا ہے۔ تم کتنی بڑی گمراہی اور غلط بینی کے اندر مبتلا ہو! کیا ہو گیا ہے تمہاری مت کو؟ کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو؟ ساری قوم کو تم بدراہ کرتے چلے جا رہے ہو۔ یہ باپ سے کہا جا رہا ہے۔ یہ بات سمجھنے کے لیے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں ہے' ہر گھر میں باپ ہوتا ہے' ہر بیٹے کو اُس کا تجربہ ہو سکتا ہے۔ باپ کا جواب یہ ہے کہ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنۡتَ عَنۡ اٰلِهَتِىۡ يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ‌ (19:46) ابراہیم! زبان بند کرو' تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم میرے متعلق نہیں کہہ رہے بلکہ ان خداؤں کے متعلق کہہ رہے ہو اور ہمیں تم ورغلا رہے ہو کہ ہم ان خداؤں سے بیزار ہو جائیں اور ان کی پرستش چھوڑ دیں۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم کیا کر رہے ہو؟

---

[1] اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ (آزر) سے کہا۔

تم سوچو تو سہی۔ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (19:46) اگر تم ان باتوں سے باز نہ آئے تو یاد رکھو! تمہیں عاق کر دوں گا۔ وہی پہلی بات جو باپ کیا کرتا ہے: تمہیں یہاں سے نکال دونگا' اپنے آپ سے دور کر دوں گا۔ اور جب تک تم ان باتوں سے باز نہیں آتے میرے سامنے مت آؤ' یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ وہی جواب ہے جو آج کا باپ دیتا ہے' وہی جواب ہے جو اُس زمانے کا باپ دیتا تھا لیکن قرآن نے یہ کہا تھا کہ یہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ان کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے' اعصاب بھی کمزور ہو جاتے ہیں' مزاج بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ ان کی ان باتوں کے جواب میں تلخ نوائی سے کام نہ لیا کرو' ان کو جھڑکا نہ کرو' آرام سے ان سے بات کیا کرو۔ یہ تھی قرآن کی تعلیم کہ اطاعت تو صحیح بات کی کرنی ہے لیکن بدتمیز اور گستاخ نہیں ہونا کیونکہ ان کے بس کی بات نہیں رہی اور یہ کمزور ہو چکے ہوئے ہیں۔ پہلی بات تو ابراہیمؑ کی یہ آتی ہے کہ باپ بھی غلط روش پہ چل رہا ہے تو دھڑلے سے اُس سے کہہ رہا ہے اور معلوم ہے کہ اُس کا نتیجہ کیا ہونا ہے' عواقب کیا ہونے ہیں۔ واقعی وہ ٹھیک ہے اگر وہ اُس کو نہ بھی نکالے' اگر یہ خود اِس بت پرستی کے خلاف چلے اور اُس کو چھوڑ دے' تو جو کچھ وراثت میں ملنے والا تھا اُس سے انہوں نے خود اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ یہ بھی ہے' باپ کا جواب بھی سامنے آ گیا کہ اتنی سختی سے اُس نے جواب دیا ہے۔

اسوۂ ابراہیمی کا دوسرا گوشہ

اب اسوۂ ابراہیمی ◆ کا دوسرا گوشہ سامنے آتا ہے۔ کہا کہ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ (19:47) اباجان! اللہ تہاڈی خیر کرے۔ یہ ہے جو بات کہی ہے۔ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (19:47) میں اِس کے باوجود یہی کرتا رہونگا کہ میرا خدا تمہاری حفاظت کرے۔ تمہاری روش کا نتیجہ تو مجھے نظر آتا ہے کہ تباہی ہے لیکن میں اِس بات کی کوشش کرونگا کہ تم اس تباہی سے بچ جاؤ۔ میں آخر تک کوشش کرتا رہونگا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ یہ کچھ کیوں کہہ رہے ہیں۔ کوئی بات نہیں' اللہ خیر کرے گا۔ میں کوشش یہی کرونگا کہ آپ اس تباہی سے بچ جائیں۔ قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں اس باپ اور بیٹے کے یہ مکالمے آئے ہوئے ہیں کیونکہ میرے پیشِ نظر پوری کی پوری تفصیل بیان کرنا نہیں ہے۔ مجھے تو اس اسوہ کے اور اِس زندگی کے جو خدوخال ہیں' وہ پیش کرنے ہیں۔ اس لیے میں ایک ایک دو دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوا آگے بڑھ جاؤنگا ورنہ اِس کے لیے تو میں سمجھتا ہوں کہ دو تین مہینے بھی کافی نہیں ہونگے۔ جسے خدا نے ماڈل بنا کر پیش کیا ہے تو خدا نے تو اُس ماڈل کی تفصیلات تک دی ہوئی ہیں۔ ابھی آپ نے دیکھا کہ دو ہی آیتوں کے اندر زندگی کے دونوں رخ کس طرح سے اِس حسن و رعنائی سے قرآن نے پیش کر دیئے ہیں۔ غلطی کے خلاف احتجاج کرنا ہے خواہ سامنے باپ ہی کیوں نہ ہو۔ اُس کے بعد صورت یہ ہے کہ اُس باپ کی اس چیز پر بھی دھیان دیا گیا اور گستاخی نہیں ہونے دی' بدتمیزی نہیں ہونے دی' سرکشی نہیں ہونے دی۔

وہ قوم بت پرست بھی تھی اور اُس زمانے کی عام روش کے مطابق ستارہ پرست بھی تھی۔ ستارہ پرستی اُس دور میں عام تھی۔ اب حضرتِ ابراہیمؑ نے بت پرستی کے خلاف بڑی محسوس سی شکل میں ہی دلیل دی کہ تم اپنے ہاتھوں سے اس پتھر کو ایک خدا کی شکل دیتے ہو ''ورنہ ایہہ مٹی دا مادھو ہونداا ے [1]''۔ ایک پتھر کا ٹکڑا ہوتا ہے اور اُس میں سے بھی تم خود اُس کو تراش کر خدا بناتے ہو۔ اور اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے خدا کے سامنے جھکتے ہو۔ یہ بڑی محسوس سی چیز ہے لیکن یہ جو چاند ستارے تھے یا اجرامِ فلکی تھے' اُنہوں نے ان کو اپنا دیوتا بنایا ہوا تھا۔ وہ تو ان کا جو نظام ہے' اُس کو دیکھتے تھے۔ آج کے دور میں یہ بات آسان ہے اور ہم نے کبھی اِس پہ غور بھی نہیں کیا کہ یہ ستارے کس طرح اپنے وقت پہ طلوع ہوتے ہیں' کس طرح چمکتے ہیں' کس راستے سے یہ اپنے منازل طے کرتے ہیں' کس طرح سے غروب ہوتے ہیں' کونسا تارہ قطب کا ہے جو اپنا مقام ہی نہیں چھوڑتا' چاند کیسے منازل طے کرتا ہے' سورج کس طرح سے گرمیوں کی انتہا میں' جون میں' کہاں سے نکلتا ہے یا دسمبر میں وہ کہاں سے طلوع ہوتا ہے یا کن راستوں میں جاتا ہے؟ آج یہ چیز ہمارے ہاں کا چوتھی یا پانچویں جماعت کا طالبعلم جانتا ہے لیکن اُس دور کا تو بڑے سے بڑا دانشور بھی یہ بات نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ ہوتا کیا ہے؟ سیدھی سی بات ہے کہ وہ اِنہیں خدا نہ سمجھتا تو اور کیا سمجھتا۔ یہ تو وحی کی تعلیم تھی جو یہ بتا رہی تھی کہ یہ خدا نہیں ہو سکتے۔ اب یہ مقام آتا ہے کہ قوم کو یہ سمجھانا ہے کہ یہ خدا نہیں ہو سکتے۔

فہم وفراست کے میدان میں مقامِ نبوت

اب ہمارے ذہن میں تو یہ ہے کہ وہ آگ لینے کو جائیں اور خدا کی طرف سے پیغمبری مل جائے۔ یعنی نبی کے اپنے اندر اس قسم کی کوئی خصوصیت یا خوبی وغیرہ کچھ نہیں ہوتی' بس وہ تو ایک مشین ہوتی ہے' ایک روبوٹ سا ہوتا ہے' خدا اُس کو کوئی بات کہہ دیتا ہے اور وہ آگے پہنچا دیتا ہے۔ یہی بات نہیں ہوتی بلکہ یہ بہت بڑا معلم تھا۔ معلم کو تو خود تعلیم کے بلند ترین مقام کے اوپر ہونا چاہیے۔ اب دیکھیے کہ قرآن کس طرح سے بتاتا ہے کہ قبل اس کے کہ وہ نبی اُن کی اِس غلط روش کے خلاف احتجاج کرے یا اُنہیں سمجھائے کہ اِن کی کیا کیفیت ہے' خود اِس نبی کو یہ علم اتنا حاصل کرنا پڑتا تھا تبھی وہ دوسروں کے ساتھ بات کر سکتا ہے ورنہ اگر وحی کے بتائے ہوئے چار فقرے دہرا دے اور اگلے اُس کے خلاف کوئی دلیل دیدیں یا کوئی اعتراض کر دیں تو پھر یہ چپکے بیٹھ جائے گا کہ ''ٹھہر جاؤ میں گھروں پوچھ آواں [2]''۔ مقامِ

---

[1] ورنہ یہ تو مٹی کا ایک مادھو ہوتا ہے۔

[2] ٹھہر جاؤ' میں گھر سے پوچھ آؤں۔

نبوت عجیب چیز ہے۔ وحی تو اُس کی اپنی محنت' کاوش اور فکر کا نتیجہ نہیں ہوسکتی۔ وحی کو پیش کرنے کے لیے جس حکمت کی ضرورت ہوتی تھی' اِس مقامِ بلند کے اوپر نبی ہوتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے کہا کہ قبل اس کے کہ یہ اپنی قوم سے ان ستاروں کے متعلق کوئی گفتگو کرتا اور بتاتا کہ وہ خدا نہیں ہوسکتے' کہا کہ وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (6:76) اس کائنات کے اندر جتنے بھی یہ فطرت کے مظاہر کارفرما ہوتے ہیں یا جس طرح سے سرگرمِ عمل ہوتے ہیں' خود ابراہیمؑ نے ان چیزوں کے اوپر غور و فکر کیا اور یہ چیزیں اُن کے اوپر منکشف ہوئیں کہ یہ کس طرح سے کاروبار چل رہا ہے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد جب اُسے یقین ہو گیا کہ کیسے ہو رہا ہے تو پھر اُس نے اُن سے جا کر بات کی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کیسا ماڈل ہے۔ قبل اس کے کہ آپ دوسروں کی کسی غلطی کے اوپر احتجاج کریں یا اُس کی تصحیح کے لیے کوشش کرنا چاہیں یا اُس کے متعلق اعتراض کریں' آپ کو خود اُس Subject (مضمون) کے اوپر Competent (ماہر) ہونا چاہیے' تب آپ دوسرے سے بات کر سکتے ہیں لیکن آپ سمجھیے کہ بعد میں انہی انبیاء کے نام لینے والوں کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ نبی کی یہ صورت ہوتی ہے اور نبی جو اپنا اسوۂ حسنہ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اُس کے نام لینے والے جو اُس کے متبع ہیں' اپنی زندگی کو جب اُس ماڈل میں ڈھالیں گے تو اُن کے لیے ضروری ہے کہ جس Subject (مضمون) کے اوپر دوسرے سے بات کرنی ہے تو اُس Subject (مضمون) کے اوپر اُن کو Competent (ماہر) ہونا چاہیے۔ جب ہی وہ معلم ہوسکتا ہے' جب ہی وہ معترض ہوسکتا ہے' جب ہی وہ مصلح ہوسکتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ ابراہیمؑ نے پہلے خود ان چیزوں کے اوپر غور و فکر کیا اور معلوم کیا کہ یہ کارگہء کائنات کیسے چل رہا ہے۔ کہا کہ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (6:76)۔ یہ بڑی چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے کہ کوئی بات کرنے سے پہلے خود یقین ہونا چاہیے' پھر دوسرے سے بات کرنی چاہیے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد اب حضرت ابراہیمؑ قوم کے سامنے آئے۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا [1] (6:77)۔ قرآن نے آخر میں جا کر یہ کہا ہے کہ یہ وہ دلائل تھے جو ابراہیمؑ نے اُن لوگوں کے خلاف دیئے جن کا جواب اُن سے نہیں بن پڑا۔ عربی زبان میں ایک لفظ ہے جسے حجت کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں: ایسی دلیل جس کا جواب نہ بن پڑے۔ گویا یہ جو بات تھی' یہ دھاندلی سے منوانے کی نہیں تھی بلکہ یہ تو دلیل و برہان سے منوانے کی بات ہے۔ اُس اسوۂ حسنہ میں دوسری چیز ہمارے سامنے یہ آئی کہ جس پرابلم (Problem) یا مسئلہ کے متعلق آپ نے دوسروں کی اصلاح کرنا ہو' اُن سے بات کرنا ہو تو پہلے خود اُس کے اوپر Competent (ماہر) ہو جائیے۔ پھر دوسرے سے بات کیجیے۔ دھاندلی سے نہیں بلکہ دلیل و برہان کی رو سے بات کرنا ہوگی۔

---

[1] جب رات کے وقت ستارہ نمودار ہوتا۔

عزیزانِ من! آپ حضرت ابراہیمؑ کا سمجھانے کا طریقہ دیکھیے۔ رات ہوئی تو چمکتا ہوا' آنکھوں سے اشارے کرتا ہوا' اپنی تابانیوں اور رعنائیوں سے دلوں کو لبھاتا ہوا' ستارہ نکلا۔ وہ اُن ستاروں کی پرستش کرنے لگے تھے تو **قَالَ هٰذَا رَبِّيْ** (6:77) حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ اچھا! تم یہ کہتے ہو کہ یہ ہے میرا رب!! اُسی وقت کچھ نہیں کہا اور یونہی بحث میں نہیں الجھ گئے کہ ''تہاڈی ایسی دی تیسی ❶''۔ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ کہا کہ رک جائیے' ٹھہر جائیے۔ **فَلَمَّآ اَفَلَ** (6:77) جب وہ غروب ہو گیا تو کہا کہ بھئی! وہ جو تم کہتے تھے کہ یہ ہے وہ خدا تو وہ اب کہاں ہے؟ کسی خدائی کے مدعی کے لیے' یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تُو خدا نہیں ہو سکتا' انتظار کرنا پڑتا ہے کہ غروب ہو جائے تو پھر خود ہی اپنی خدائی کے خلاف دلیل ہو جائے گی۔ جب تک وہ تابانیوں کا مالک ہے اور چمکتا ہے تو آپ کی دلیل نہیں مانے گا۔ اُس کا غروب ہو جانا اُس کے خلاف خود دلیل بن جائے گا کہ تُو خدا نہیں ہو سکتا۔ **قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ** (6:77) کہا کہ اِس ستارے کی بات ہی میں نہیں کہہ رہا بلکہ ہر وہ شے' ہر وہ قوت' ہر وہ اقتدار جو آج چمکتا ہے اور کل غروب ہو جاتا ہے' میں اُسے خدا نہیں مان سکتا۔ یہ ہے اسوہ۔ آپ دیکھیے کہ اُسی ستارے کی بات ہو رہی تھی تو کہا کہ میں اسی ستارے کی بات ہی نہیں کرتا بلکہ کوئی بھی ایسی ہستی ہو جو ایک وقت میں چمک رہی ہو' اُس کی چمک آنکھوں کو چکا چوند کر رہی ہو' نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہو تو دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ اُس کی ابدیت برقرار ہے اور وہ ہمیشہ چمکتا ہوا رہتا ہے۔ اگر وہ غروب ہو جاتا ہے اور اُس کی یہ چیز چھن جاتی ہے تو اُس کو دعوائے خدائی جچتا نہیں ہے۔ کہا کہ میں ایسوں کو خدا نہیں مانتا۔

عزیزانِ من! آگے قرآن کہتا ہے کہ **فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ** (6:77) پھر چاند نمودار ہوا اور وہ تو ستارے سے کہیں زیادہ تابانیاں لیے ہوئے طلوع ہوتا ہے۔ چاند دیوتا کے سامنے تو کون نہیں جھکتا' نہ جھکنے والے بھی کم از کم اُس کو ماموں تو کہتے ہی ہیں۔ آج کے ہمارے نوجوان تو ماں ہی کے متعلق نہیں جانتے کہ وہ کتنے بڑے پیار کی بات ہوتی ہے تو یہ ماموں کے متعلق کیا جانیں گے۔ ہمارے ہاں ماموں کا اور بھانجے کا رشتہ بڑا پیار کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ بات بچوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جب بادل گرجتا ہے' بجلی چمکتی ہے تو بجلی پڑتی بھی ہے اور لوگ مر جاتے ہیں۔ ہمارے بچپن میں ہمارے ساتھ یہ بات تھی کہ ماموں اور بھانجے کو ایسے وقت میں اکٹھا نہیں جانے دیتے تھے کہ ''بجلی ویکھ نہیں پائے گی اے تہانوں فنا کر دے گی ❷''۔ ماموں بھانجے کا رشتہ ایسا ہوتا ہے۔ چاند کو خدا نہ ماننے والے بھی تو چندا ماموں ہی کہتے تھے۔ یہ جو چاند ہے یہ بہت اولیں دور سے دیوتا مانا جاتا تھا یا خدا مانا جاتا تھا۔ ہاں تو جب یہ چاند نمودار ہوا تو اِس کے متعلق یہاں **بَازِغًا** کہا ہے۔ یہاں ستارے کے متعلق یہ نہیں کہا۔ چاند کے متعلق کہا کہ اُس سے زیادہ

---

❶ آپ کی ایسی کی تیسی۔
❷ بجلی یہ برداشت نہیں کر سکے گی' یہ آپ فنا کر دے گی۔

چمک تھی‘ اُس کے اندر تابانیاں اور رعنائیں تھیں۔ وہ نمودار ہوا تو کہا کہ اچھا! تم یہ کہتے ہو کہ یہ ہے میرا رب اور اِس کے سامنے جھکنا چاہیے !! فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (7:78) جب وہ بھی غروب ہوا تو کہا کہ کہیے اگر میں تمہاری بات میں آ جاتا اور اِس کے سامنے جھک جاتا تو جب یہ سامنے باقی نہ رہتا تو پھر کیا ہوتا۔ یہ غنیمت ہے کہ مجھے اتنی فراست‘ نگاہ کے اندر اتنی نورانیت‘ عطا ہوگئی ہے کہ میں ڈوبنے والے اور نہ ڈوبنے والے کے اندر تمیز کر سکتا ہوں۔ یہ اُس کا بڑا فضل ہے جو مجھ پہ کیا ہے۔ تو فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ (6:79) جب سورج نکلا اُنہوں نے کہا کہ یہ تو اُن دونوں سے بہت زیادہ بڑا بھی ہے‘ بہت زیادہ چمکدار بھی ہے۔ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (6:79) اور وہ بھی ڈوبا۔ کہا کہ اے میری قوم! تمہارے ہاں اب اِس سے آگے اور تو کوئی خدا نہیں ہے۔ کہا کہ اب تمہاری خدائی کی اور تمہارے خداؤں کی انتہا ہوگئی ہے۔ اس کے بعد اب کوئی اور خدا تو تم نہیں مانو گے‘ اگر مانو گے اور اُس کی بھی یہ کیفیت ہے کہ اِس وقت ہے اور دوسرے وقت میں نہیں ہے تو اِس کے بعد تم کیا کہو گے۔ لہٰذا اب مجھے اعلان کرنے دیجیے کہ یہ شرک ہے اور یہ خدا نہیں ہو سکتے۔ ہر وہ جو اِس وقت ہے اور کل کو نہیں ہے‘ جو آج چمکتا ہے اور کل غائب ہو گیا ہے‘ تو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں تمہارے اِس شرک سے بری الذمہ ہوں اور اِس سے بیزار ہوں۔

دنیائے انسانیت میں لا الہ کا مقام اور اس کی اہمیت

اِس سے بیزار ہونا تو حصہء لا ہے کہ یہ بھی خدا نہیں‘ یہ بھی خدا نہیں اور وہ بھی خدا نہیں۔ پھر کیا اُس کے بعد آدمی کیمونسٹ (دہریہ) ہو جائے کہ خدا ہے ہی نہیں یعنی جو علامہ اقبالؒ (1938-1877) نے تین فقروں میں بڑی دور کی بات کہی تھی کہ

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ

لا سلاطین ‘ لا کلیسا ‘ لا الہ

اس میں وہ پورا پروگرام سامنے لے آیا ہے۔ یہ کرتے یہ ہیں کہ پہلے تو یہ بادشاہوں کے خلاف اُٹھتے ہیں کہ ایک شخص کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اتنے لوگوں کے اوپر اپنی حکومت جتائے اور دوسرے بھی اِس کے ساتھ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ مذہبی پیشوائیت بھی ساتھ ہو جاتی ہے کہ اِس کو نکال دینا چاہیے۔ وہ اِن کی مدد سے اِن کو نکال لیتے ہیں تو پھر یہ مذہب والے اِن کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور وہ اِن کو کہتے ہیں کہ میاں صاحب! آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ آپ بیٹھ کر کھاتے رہیں اور محنت کوئی دوسرا کرے۔ اب وہ ان کو بھی چلتا کر دیتے ہیں اور اُس کے بعد اب ایک اگلی چیز ہے کہ جہاں وہ ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ الہ کو بھی نہیں مانتے۔ اِس نہ ماننے سے زندگی میں ”لا“ یا

Vacuum (خلا) پیدا ہوتا ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) کہتا ہے کہ زندگی کبھی بھی Vacuum (خلا) میں جیتی نہیں ہے' انسان کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اگر خدا پہ ایمان چھوڑ دے تو شیطان پہ ایمان لے آتا ہے کیونکہ ایمان اِس نے لانا ہوتا ہے۔ اب انہوں نے یہ کہہ دیا کہ تمہارے ہاں کا سورج آخری خدا ہے جو آ گیا ہے اور اُس کے بعد ختم ہو گیا ہے۔ اب تو اِس سے بڑا کوئی اور آنے والا نہیں ہے۔ یہاں تم ختم کرتے ہو تو یہ ''لا'' کا حصہ ہو گیا۔ کہا کہ **اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ** (6:80) اِس ''لا'' کے بعد میں اپنی پوری توجہات کا مرکز اُسے بناتا ہوں۔

عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ کس ربط میں بات چلی آ رہی ہے۔ کہا کہ اُس خدا کو میں اپنی توجہات کا مرکز مانتا ہوں جس نے یہ ستارے بنائے' یہ چاند بنایا' یہ سورج بنایا اور یہ کائنات بنائی۔ اور ایسے بنائی کہ یہ نہیں تھا کہ پہلے سے کوئی Material (مواد) موجود تھا اور اُس سے اُس نے گھڑ کے بنا دی جیسے تمہارے پاس اگر پتھر نہ ہو تو تم اپنا بت نہیں بنا سکتے۔ یہاں فطر کہا ہے۔ یہ ہے قرآن' یہ ہیں دلائلِ ابراہیمیؑ کہ میں اُس خدا کو خدا مانتا ہوں جو کچھ ''نہ'' (Nothingness) سے یہ کچھ بنا سکتا ہے۔ اور یہ جو اِس وقت خدا بنے ہوئے ہیں اور دوسرے وقت میں ڈوب جاتے ہیں' ذرا میرے خدا سے ان کا مقابلہ تو کر کے دیکھو۔ حنیفًا کے معنی ہوتا ہے کہ ہر طرف سے منہ موڑ کر' رُخ موڑ کر جسے ناک کی سیدھ کہتے ہیں کہ انسان اِدھر اُدھر دیکھے ہی نہیں۔ کہا کہ اِس کے بعد تو اِس کی بھی ضرورت نہیں کہ میں کہیں کھڑا ہو کر دیکھوں کہ شاید یہ خدا ہو جائے اور شاید وہ خدا ہو جائے۔ میں اپنی توجہات کا مرکز اُس خدا کو' اُس ہستی کو' بنا رہا ہوں جو اِس پوری کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور ایسے ہے کہ کسی سابقہ Material (مواد) کے بغیر ان کو وجود میں لے آیا ہے۔ وہ ہے خدا کہلانے کے قابل۔ یہ ہے وہ چیز کہ بات ساری دلیل کی رو سے ہے' دلائل سے وہ اِس پہ پہنچا تا ہے اور دلیل وہ حجت ہے جس کے خلاف دلیل نہیں دی جا سکتی۔ وہ کیا دلیل دیں گے جب وہ دیکھیں گے کہ وہ واقعی اُس وقت تھا اور دوسرے وقت ڈوب گیا اور غروب ہو گیا۔ کیا دلیل دیں گے کہ جب وہ کہتا تھا کہ تمہارا آخری خدا جو سورج تھا وہ بھی طلوع ہوا اور غروب ہو گیا' اِس کے بعد کیا ہے؟ اِس کے بعد تو ان کا کوئی اور دیوتا تھا ہی نہیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے تین درجے بتائے ہیں۔ **لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ** (57:25) ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تو پہلی چیز یہ تھی کہ وہ دلائل کے ساتھ تھے۔ وہ لوگوں کو دلائل کی رو سے قائل کرتے تھے' غلط اور صحیح میں امتیاز سکھاتے تھے۔ **وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡکِتٰبَ** (57:25) پھر اُس کے بعد ہم نے ضابطہءِ قوانین دیا۔ دلائل سے قائل کرنے کے بعد قانون آتا ہے۔ جو قانون دلائل سے قائل کیے بغیر ہو گا تو وہ دھاندلی ہو گی۔ قانون وہ ہے جسے قلب و دماغ صحیح تسلیم کرے۔ تو پہلی چیز جو انبیائے کرامؑ کے مسلک یعنی حق کو پیش کرنے کے بارے میں آتی ہے وہ دلائل کا مسلک ہے۔

انبیائے کرام کا اندازِ گفتگو

عزیزانِ من! آپ بغیر دلائل و براہین کے کسی کو قائل نہیں کر سکتے۔ اور قائل ہونے یعنی دل و دماغ کا کسی بات کے اوپر رضا مند ہونے کو ہی تو ایمان کہتے ہیں۔ یہ کچھ دلائل کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اب یہاں سے بات کٹ گئی۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی جو اُنہوں نے کہی تھی۔ وہ جو بُت تھے اُن کے خلاف تو باپ سے بات شروع کر دی' جو ستارے تھے جن کی یہ پرستش کرتے تھے' ان دیوتاؤں (ستاروں) کے خلاف اُنہوںؑ نے دلائل و براہین سے قوم کو لا جواب کر دیا۔ چرچا تو ہونا تھا اور چرچا ہوا۔ پھر یہ پریسٹ (مذہبی پیشوا) تو بات کو انتہا تک پہنچاتے ہیں۔ بات بادشاہ سلامت تک پہنچی۔ مملکت کے اندر قیامت آ گئی' آپ نے کچھ سنا بھی ہے' کچھ معلوم بھی کیا ہے کہ ہو کیا رہا ہے؟ سب سے بڑے پروہت کا جو بیٹا ہے اُس نے پہلے تو ہمارے ان بتوں کے خلاف یہ کچھ کیا تھا اور اب یہ جو اجرامِ فلکی ہمارے دیوتا ہیں وہ اُن کے خلاف تبلیغ کرتا پھرتا ہے۔ وہ ایسی باتیں کرتا ہے کہ لا جواب کر دیتا ہے۔ اُس کو بلایئے۔

عزیزانِ من! بادشاہ وہ ہو جسے نمرود [1] کہا جاتا ہے۔ وہ تو فرعون [2] تھا جس نے کہا تھا کہ **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** (79:24) میں ہوں تمہارا اَن داتا۔ وہ بھی ایک دُکھتی ہوئی رگ تھی لیکن یہ تو اِس سے بھی آگے جاتا ہے۔ کہا کہ **اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ** (2:258) کیا تم نے اُس بادشاہ کی داستان پر بھی غور کیا ہے جس نے ابراہیم ◆ کے ساتھ یہ کچھ کیا؟ یہ ایک ٹکڑا ہے اور اِس میں چار الفاظ ہیں۔ ان چار لفظوں کے اندر اُس بات کی ساری جان ہے' جس کے لیے قرآن نے اِس کو دہرایا ہے۔ **اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ** (2:258) اُس نے پوچھا کہ تم ان کو خدا کیوں نہیں مانتے اور جس خدا کو تم خدا مانتے ہو اُس کی خصوصیت کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ خدا وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور جو موت دیتا ہے' جس کے اقتدار کے اندر زندگی اور موت ہے۔ یہ انتہائی بات کہی ہے کہ میں تو اُس کو خدا کہتا ہوں اور اُس کو منواتا ہوں جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔

عزیزانِ من! جواب سنیے! کہا کہ **قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ** (2:258) زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ ''اِنِّی'' کے معنی بھی وہی ہوتے ہیں لیکن اس اِنِّی میں تھوڑا سا انکسار ہوتا ہے۔ اور ''اِنَّا'' میں تکبر کا اظہار ہوتا ہے کہ ''ہم جانتے ہیں' ہم یہ کہتے ہیں''۔ دیکھا کہ یہ کیسی زبان ہے! کہا ہے کہ **اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ** (2:258) ہمارے ہاتھ میں افراد کی

---

1. نمرود کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ النور' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص۔216 (فٹ نوٹ 3)
2. فرعون اور فراعنہ مصر کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام' رجسٹرڈ' لاہور' 2005 ص۔119 (فٹ نوٹ 1)' نیز مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004 ص۔109 (فٹ نوٹ 1)۔
3. یہاں اقتدار کی قوت کا نشہ جھلک رہا ہے۔

موت اور زندگی ہے۔ اب وہ چار الفاظ آئے اور اُن میں قرآن نے ''تت کڈ کے رکھ دتا[1] ''یعنی ساری بات بیان کر دی۔ کہا کہ نمرود کو یہ نخوت' یہ تکبر' یہ تمرد کیوں تھا اور وہ کس دھڑلے پہ یہ کچھ کہتا تھا؟ کہا کہ اس لیے کہ اُسے بادشاہت حاصل تھی۔ یہ حکومت کا نشہ تھا۔

حکومت کے نشہ میں مدہوش نمرود کے مدِ مقابل حضرت ابراہیمؑ کے زندگی کے دوسرے کئی ایک پہلو

اب دیکھیے کہ وہ کسی دلیل کی بنا پہ نہیں کہہ رہا یا امرِ واقعہ نہیں بیان کر رہا بلکہ صرف یہ بات کہی ہے کہ ہمارے ہاتھ میں حکومت ہے۔ کہا کہ اِس اقتدار کے نشے میں مدہوش ہو کر اِس قسم کی باتیں کرتا ہے۔ اب اسوۂ ابراہیمیؑ دیکھیے۔ کیا کبھی آپ کو کسی شرابی سے گفتگو کرنے کا موقعہ ملا ہے؟ اُس سے اچھی بھلی معقول بات کہیے تو وہ آگے سے کہتا ہے کہ ''اوئے ساہنوں کون کہن والا ہیگا اے[2] ''۔ اب آپ اُس سے دلیل کے انداز سے بات شروع کریں تو وہ بے فائدہ چیز ہے۔ جو نشے میں مدہوش ہے' اُس کو اُس لائن کے اوپر اِس کا جواب دیا جا سکتا تھا لیکن یہ تو اسوۂ ابراہیمی ہے' یہاں مقصد مناظرہ جیتنا تو نہیں تھا بلکہ مقصد تو اُسے لاجواب کرنا تھا۔ اب وہ فوراً اُس لائن کو چھوڑتے ہیں جس کے متعلق وہ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا کہہ گیا ہے' کیا کہنا چاہتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ابھی ثابت کر کے بتا دے (مثلاً) حکم دے کہ اُس کو مار دے اور وہ تلوار سے اُس کو مار دوے۔ حضرت ابراہیمؑ وہاں کھڑے ہوئے' کہنے لگے کہ نشے میں باتیں کر رہا ہے۔ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ (2:258) کہا کہ میرا خدا وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے' اگر تمہاری خدائی ہے تو تم کل اِس کو مغرب سے نکال کر بتاؤ۔ یہ ثابت کرنا کہ موت قانونِ خداوندی سے وابستہ ہے' ایک نظری چیز ہے جو اُسے ہی سمجھائی جا سکتی ہے جو دلیل و حجت کو سمجھنا چاہے۔ یہ بات محسوسات میں نہیں آتی۔ محسوسات میں اُس کے حق میں جاتی تھی کہ وہ ابھی مروا دے گا۔ وہ یہ سمجھے کہ اِس کو محسوس دلیل دینی چاہیے کیونکہ یہ نظری اور تعلیمی بات نہیں مان سکتا۔ کہا کہ اگر آپ کی بادشاہی کا اقتدار اتنا بڑا ہے تو اس سورج کو ذرا مغرب سے نکال کے بتایئے۔ کہا کہ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (2:258) صحیح بات تو وہی مانتا ہے جس کے عقل و ہوش ٹھکانے پہ ہوں۔ جس کی عقل و ہوش ٹھکانے نہ ہو وہ صحیح بات کیا مانے بلکہ وہ یوں ووں کرنے لگ گیا۔

عزیزانِ من! آپ اسوۂ ابراہیمیؑ دیکھ رہے ہیں۔ اگر مولوی صاحب یا مناظر ہوتے تو اِس بات کے اوپر دلیلیں دیتے ہوئے رات سے صبح کر دیتے' اُس کا بھی وقت ضائع کرتے اور اپنا بھی وقت ضائع کرتے اور کسی بات کی تہہ تک پہنچتے ہی نہیں۔ یہ ہے فراستِ مومن کہ جب دیکھا کہ یہ شخص مدہوشی کی باتیں کر رہا ہے تو اُس کو اِس طرف لایئے جس کا جواب ہی نہ دے سکے۔ اور بات بھی وہ حق کی کر رہے ہیں' یہ نہیں ہے کہ غلط بات بنا کر غلط دلیل دی' بلکہ یہ تو حقیقت ہے۔

---

[1] جوہر نکال کر رکھ دیا۔

[2] او کمبخت! ہمیں کون کہنے والا ہے؟ کون پوچھنے والا ہے' کوئی بھی تو نہیں۔

آپؑ نے بُت پرستی کے خلاف اپنی مہم شروع رکھی ۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ اِس ماڈل کے وہ خدوخال ہیں جو خدا نے بیان کیے ہیں ۔ اس کی صحیح تصویر تب سامنے آئے گی جب میں ختم کرونگا ۔ یہی ماڈل جب افسانہ نگاروں کے ہتھے چڑھا ہے تو پوچھو نہیں کہ اُنہوں نے کس کس قسم کی رنگ آمیزیاں کی ہیں اور کس شکل میں پیش کیا ہوا ہے ۔

ملتِ اسلامیہ کے زوال کی وجۂ جواز

یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ خدا کا بتایا ہوا جو یہ ماڈل ہے' وہ تو معلوم نہیں کہ انہوں نے اسے کن پردوں کے پیچھے چھپا کر رکھا ہوا ہے ۔ اب ہمارے سامنے ان انبیائے کرام کی زندگی کا جو ماڈل ہے' وہ وہی ہے جو ان افسانہ نگاروں کا تراشیدہ ہے لیکن ابھی تو ہمیں اِسی تک محدود رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیا ماڈل پیش کیا ہے! پوری مملکت بُت کدہ تھی اور پھر اُس میں جو کیپٹل سٹی ہے' اُس میں وہ بادشاہ بھی سب سے بڑا بُت گر اور بُت پرست ہے ۔ اُس میں تو پھر بہت بڑے بڑے بُت ہونگے اور بہت تعداد میں بھی ہونگے ۔ اب اُنہیں دلائل و براہین سے سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ جیسے باپ سے کہا تھا کہ ان کی جو موجودہ شکل ہے وہ تمہارے ہی پیشے کی رہینِ منت ہے ۔ یہ بڑی عمدہ دلیل ہے لیکن عقیدت مندی تو دلیل کو نہیں ماننے دیتی ۔ یہ عقیدت مندی بھی نشہ ہوتا ہے' اگرچہ نشے اور نشے میں فرق ہوتا ہے ۔ حکومت کا نشہ تو شرابی کا نشہ ہوتا ہے' یہ جو عقیدت مندی کا نشہ ہے' یہ افیون کا نشہ ہوتا ہے ۔ نتیجے کے اعتبار سے دونوں ہی ایک جگہ ہوتے ہیں' نہ وہ دلیل مانتا ہے اور نہ یہ دلیل مانتا ہے ۔ نشے کے معنی ہی یہ ہیں کہ سمجھنے سوچنے اور دلیل و حجت کا سوئچ آف کیا جاتا ہے ۔ اب دو شکلیں ہیں ۔ شراب میں یہ ہوتا ہے: اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ (2:258) ۔ افیون کے نشے میں اگر چڑیا بھی اڑتی ہے' تو وہ کہتا ہے: او بڑی بڑی مرغیاں اڑ رہی ہیں ۔ اِس کو چڑیا بھی مرغی نظر آتی ہے ۔ حقیقت نہ اُس کے سامنے ہوتی ہے اور نہ اِس کے سامنے ہوتی ہے ۔ نشوں کی قسمیں ہوتی ہیں ۔ ارادت مندی کا' پیشوائیت کا' نشہ افیون کا نشہ ہوتا ہے ۔ یہ اُن پتھر کی مورتیوں کو خدا بنا بیٹھے ۔

حضرتِ ابراہیمؑ کا طریقہ استدلال

اب دلائل و براہین کے بعد محسوس شکل میں ان کو بتانا تھا کہ یہ بُت بے بس ہیں ۔ یہ بات تھی جو بتانی تھی ۔ اُنہوں نے چھپا کے بات نہیں رکھی کیونکہ یہ مومنانہ شیوہ نہیں ہے کہ کسی کو دھوکا دیا جائے ۔ کہا کہ تم یوں نہیں مانتے ۔ کوئی بات نہیں اگر تم نہیں مانتے ۔ تم کہہ رہے ہو کہ یہ بڑے صاحبِ اقتدار و قوت ہیں' یہ جس کے خلاف ہو جائیں تو یاد رکھو! یہ اسے بھسم کر دیتے ہیں' راکھ بنا دیتے ہیں ۔ اگر تم ان کے خلاف گستاخیاں کرتے ہو تو یہ تمہیں بھی بھسم کر دیں گے ۔ آپؑ نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہے' میں دیکھ لونگا کہ ان کی کتنی قوت ہے اور کتنی طاقت ہے اور کس طرح سے یہ مجھے راکھ بناتے ہیں ۔ سنو! یہ میں ایسے وقت میں کروں گا کہ وَتَاللّٰہِ لَاَکِیۡدَنَّ اَصۡنَامَکُمۡ بَعۡدَ اَنۡ تُوَلُّوۡا

مُدْبِرِیْنَ (21:57) ❶ جب تم نہ ہوں اور یہی ہوں جو تمہارے نزدیک اتنی بڑی قوتوں کے مالک ہیں اور جن کے دل میں ان کے خلاف گستاخی کا کلمہ آئے، وہ انہیں بھسم کر دیتے ہیں، اگر یہ ہوں اکیلے اور میں ہوں اکیلا تو پھر ہم طاقت آزما کے دیکھیں گے:

اِدھر آ پیارے ہنر آزمائیں
تُو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

اُس وقت میں دیکھونگا کہ ان کی قوت کہاں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں بُتوں کے "قتل" ہونے کی روئیداد اور اس کا نتیجہ

یہ بڑی چیز ہے کہ جب تم یہاں نہ ہوگے، وہ ہوں، تو پھر لڑتے تو یہ ہیں اور اُس کے بعد فتح اُن بتوں کی اُن خداؤں کی ہوتی ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ (21:57)۔ یہ اعلان کیا ہے، دھوکا نہیں دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ❶ (21:58) وہ کسی میلے میں اشنان کرنے کے لیے گئے، یہاں پیچھے کوئی ایسا نہیں تھا۔ یہ گئے اور یہ جو چھوٹے بُت تھے ان میں سے کسی کا بازو توڑا، کسی کی ٹانگ توڑی اور کسی کا سر توڑا، اور جو اُن کے ہاں کا سب سے بڑا بت تھا اُس کو اُسی طرح رہنے دیا یا وہ جو تیشہ تھا وہ اُس کے ہاتھ میں دیدیا۔ یہیں بات بتادی کہ یہ ایسا کیوں کیا تھا۔ چنانچہ جب لوگ معبد میں آئے تو اپنے معبودوں کا یہ حشر دیکھ کر قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ❷ (21:59) وہ کہنے لگے یعنی وہ آئے اور آ کر اُنہوں نے وہاں یہ حشر دیکھا۔ اگر وہ نشے میں نہ ہوتے تو بات سمجھ میں آ جاتی کہ جن کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ ہم اُن کی حفاظت کریں تو یہ محفوظ رہتے ہیں اور اگر ہم چوکیدار کہیں چلے گئے ہیں تو کوئی آیا ہے اور اُس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا ہے، یہ اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکے تو ہماری حفاظت کیا کریں گے۔ اگر وہ نشے میں نہ ہوتے تو یہ بات سمجھ میں آ جاتی۔ قرآن نے ایک جگہ حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں بتایا ہے کہ یہ جو سارا دھندہ ہوتا ہے، یہ سارا روٹی کا ہوتا ہے۔ اتنا بڑا اقتدار مملکت کے

---

❶ میں تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد انہیں ٹھکانے لگادوں گا۔ خدا گواہ ہے کہ میں اب ضرور کروں گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 738)۔

❶ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے تنہائی میں، ان بُتوں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ صرف ایک بُت کو، جو اِن میں سے بڑا تھا، چھوڑ دیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ (یعنی ان سے کہا جا سکے کہ یہ تمہارا سب سے بڑا "معبود" موجود ہے اس سے پوچھو کہ یہ کیا ہوا اور اس کی موجودگی میں کیسے ہوا؟ اگر اس بُت کو بھی توڑ دیا جاتا تو اس دلیل وحجّت کی گنجائش نہ رہتی)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص ص۔ 739-738)۔

❷ کہنے لگے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کچھ کس نے کیا ہے؟ جس کسی نے بھی کیا ہے، وہ بڑا ہی ظالم اور سرکش ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 739)۔

اندر حاصل ہے' ''چنگی چوکھی چوریاں کھان نوں''[1]' ساری دنیا کا بہترین کھانا ان کے ہاں جاتا ہے۔ اب بھی ہمارے ہاں یہ ہے کہ فصل کا پہلا پھل' پہلا دودھ' وہ سارا ان کے ہاں آتا ہے۔ تو چیزیں ہیں جن کے لیے اِنہوں نے ان بُتوں اور بُت کدوں کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ یہ اِن کی معیشت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ دہائی مچاتے ہیں کہ یہ کس نے کر دیا؟ جس نے یہ کیا وہ بڑا ظالم ہے۔ **قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ** (21:60) اُنہوں نے کہا کہ اِس کے لیے کسی سی آئی ڈی کی ضرورت نہیں' وہ جو باتیں کرتا تھا تو اُس نے اعلان کیا تھا کہ میں یہ کچھ کرونگا' وہ ابراہیمؑ ہی ہے۔ **قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ** (21:61) کہا کہ اُس کو پکڑ کے لاؤ' اُس کو عوام کے سامنے کھڑا کرو۔ یہ ہے سارا راز۔ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے میں ہی تو ان کی قوت کا راز ہوتا ہے۔ کہا کہ اُسے عوام کے سامنے لاؤ۔ وہ بھی ابراہیم ◆ تھے' اُنہوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ تفتیش تنہائی میں ہوگی۔ اُنہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے' یونہی ہونی چاہیے۔ **قَالُوْٓا ءَ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ** (21:62) کہا کہ اے ابراہیم! کیا تم نے یہ کچھ کیا ہے؟ اب دیکھیے کہ جس نکتے اور مقصد کی طرف لانا مقصود تھا' کس انداز سے ان کو اس طرف لایا جا رہا ہے۔ **قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ** (21:63) کہا کہ اِس بات کو مجھ سے تو بعد میں پوچھنا کہ کس نے یہ کیا ہے۔ **كَبِيْرُهُمْ هٰذَا** (21:63) یہ جو سب سے بڑا بت ہے یہ تو اسی طرح سے بیٹھا ہوا ہے۔ **فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ** ان سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں' ذرا اِس بڑے سے پوچھو کہ تیرے سامنے یہ سب کچھ ہوا ہے تو کس نے یہ کیا ہے؟ تمہیں سب سے بڑی شہادت مل جائے گی۔ کہا ہے کہ مجھ سے یا کسی اور سے تو بعد میں پوچھنا۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ آپؑ نے اُس بڑے بت کو کس لیے چھوڑ دیا تھا؟ اس لیے کہ معاملے کو اُس کی طرف ریفر کر دیا جائے۔

عزیزانِ من! یہ کس قدر صحیح منطق ہے کہ بابا! ان کے متعلق جو تمہارا ایمان ہے کہ یہ دلوں میں چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتے ہیں' آسمانوں کے احوال بتا دیتے ہیں' آنے والے واقعات کی پیشین گوئیاں کر دیتے ہیں' اِس بڑے کے سامنے یہ سارا واقعہ ہوا ہے تو اِس سے پوچھو کہ یہ کیسے ہوا؟ یہ سامنے بیٹھا ہے۔ تم نے لوگوں پہ دھاک بٹھا رکھی ہے کہ آج مہاراج دیوتا نے ہم سے یہ کہا ہے' آج دیوی جی نے یہ کچھ کہا ہے' یہ تو تم لوگوں سے روز کہتے ہو۔ اگر یہ واقعی کچھ کہتے ہیں تو آج تو ایسا وقت ہے کہ ان سے پوچھو اور یہ خود بتائیں تو بات صاف ہو جائے گی کہ کس نے ایسا کیا ہے؟ **فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ** (21:64) وہ اس سے

---

[1] کھانے کو سب سے اعلیٰ انواع واقسام کا پکوان موجود ہے۔

ہٹ کے آپس میں کہنے لگے کہ ''یار! گل تے اے ٹھیک کہندا اے [1] ''۔ اور ہماری جومت ماری گئی کہ ہم نے لوگوں کو اکٹھا کرلیا اور اُن کے سامنے مقدمہ پیش کردیا۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے ہونگے کہ تُو ہی دیکھ۔ **ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ** (21:65) یوں سرنگوں ہوکر بیٹھ گئے' عجیب مخمصے میں پھنس گئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا ہوگا کہ بھئی! آپ بات آگے کیوں نہیں چلاتے' کیونکہ مقدمے کی تفتیش ہورہی ہے۔ **لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ** (21:65) اے ابراہیمؑ! تمہیں تو پتہ ہے کہ یہ بولا نہیں کرتے۔ اس لیے بھی نہیں کہ تم اجنبی ہو' بلکہ تم تو اُس گھر کے بیٹے ہو جہاں یہ بنائے اور گھڑے جاتے ہیں۔ تمہارے تو سامنے یہ بُت بنتے ہیں۔ ابراہیمؑ! تمہیں تو پتہ ہے کہ یہ بولا نہیں کرتے۔ اُنہوںؑ نے کہا کہ مجھے تو پتہ ہے کہ یہ بولا نہیں کرتے لیکن جنہیں تم دھوکا دیتے ہو کہ یہ بولا کرتے ہیں' میں تو اُن کی خاطر یہ بات کہہ رہا ہوں۔ تم ذرا اُن کو سمجھاؤ کہ یہ نہیں بولا کرتے۔ کہا کہ تمہیں بھی پتہ ہے کہ یہ بولا نہیں کرتے۔ یہ جو تم نے ان کو اکٹھا کیا ہے تو بات تو ان تک پہنچانے کی ہے کہ یہ بولا نہیں کرتے۔

عزیزانِ من! سوچیے کہ اس مقام پہ لانے کے لیے اور عوام کو بتانے کے لیے یہ کیسا عجیب طریق ہے کہ یہ لوگ تم سے ان کی پرستش کرواتے ہیں۔ **قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّ لَا يَضُرُّكُمْ** (21:66) کہا کہ بتاؤ تو سہی کہ تمہیں نفع اور نقصان پہنچانا تو ایک طرف رہا' جو اپنی بھی حفاظت نہیں کرسکتا اور اُس کی کیفیت یہ ہے کہ اُس کے سامنے ایک واقعہ ہوتا ہے اور وہ بتا نہیں سکتا کہ یہ کس نے کیا ہے' او تمہارا ستیاناس! تم اُن کو اپنا خدا بنائے ہوئے ہو۔ ان سے تو عام انسان زیادہ افضل ہے کہ کم ازکم وہ چھوٹے درجے پہ ہی سہی یا ہاتھ سے ہی سہی' اپنی حفاظت تو کرسکتا ہے' ارے! بتاؤ کہ تیرے ساتھ یہ کچھ کس نے کیا ہے؟ تم میں سے ہر فرد وہ ادنیٰ سے ادنیٰ ہی کیوں نہ ہو' وہ اس بڑے سے بڑے دیوتا سے افضل ہے۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اِس کے سامنے جھکتے ہو۔ یہ ہے اسوۂ ابراہیمیؑ اور بات سمجھانے کا انداز۔ کہا کہ **اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (21:67) اس نشے سے نکلو' عقل وفکر کی دنیا میں آؤ اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' میں تم سے وہ زبردستی نہیں منوانا چاہتا بلکہ میں تمہاری عقل وفکر کو اپیل کرتا ہوں کہ ذرا غور وتدبر سے سوچو تو سہی کہ جو میں کہہ رہا ہوں' کیا تمہارے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟ یہ بات عوام کے سامنے ہو رہی ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ خدائی ہاتھوں سے نکلی جارہی ہے۔ اس کا جواب تو کوئی نہیں ہے۔ اِس کا ردِعمل وہی ہے جو ہر دور میں ہوتا ہے کہ **قَالُوْا حَرِّقُوْهُ** (21:68) عوام سے کہا کہ اٹھو اور اِس کو جلادو' بھسم کردو۔ یہ تمہارے دیوتا کے حق میں گستاخی کے

---

[1] ارے دوست! بات تو یہ صحیح کہتا ہے۔

الفاظ بول رہا ہے۔ یہی جواب ہوتا ہے: یہ کافر ہے' یہ مرتد ہے۔ ایک فقرہ قرآن نے کہا ہے اور اِس میں ساری بات کہہ گیا ہے۔ ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اٹھو! اِسے پکڑو' آگ میں جلادو' بھسم کردو' تباہ کردو اور اِس طرح سے اپنے دیوتاؤں کا بول بالا کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَ انۡصُرُوۡۤا اٰلِہَتَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ** (21:68) یعنی وہ دیوتا جو اپنی حفاظت نہیں کرسکتے تھے تو تم اِن کو آگ میں ڈال کے اُن کا بول بالا کرو۔ اوفٹے منہ تہاڈا[1]۔ وہ اپنا بول بالا کرانے کے لیے تمہاری اِس قوت کے محتاج ہیں۔ معاملہ یہاں تک آ پہنچا۔ قرآن کے مختلف مقامات میں یہ تفاصیل دی گئی ہیں۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ بے شمار آیات میں یہ چیز ہے۔ اگر زیادہ تفصیل چاہتے ہیں تو میری کتاب ''جوئے نور'' میں سارے انبیائے کرامؑ کے واقعات ہیں اور اُس میں یہ تفاصیل ہیں۔ یہاں میں ایک مقام آپ کے سامنے لا رہا ہوں اور اسی سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہاں تک معاملہ پہنچ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ پھر انبیائے کرامؑ کے پروگرام میں ایک اور بات آتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے خلاف آتشِ انتقام کا ماجرا

اُنہوں نے اُن کے جذبات کو بھڑکایا' آتشِ انتقام کی جو شعلہ باریاں تھیں' وہ بھڑکائیں۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ **قُلۡنَا یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ** (21:69)۔ میں آگے چل کر عرض کرونگا کہ جب روایات میں یہ قصے بیان ہوئے ہیں تو اِن کے متعلق کیا کہا جا رہا ہے۔ قرآن نے اتنا ہی کہا ہے کہ اُنہوں نے اُن کی آتشِ انتقام کو بھڑکایا اور ہم نے ایسا طریقہ کیا کہ وہ اُس سے ٹھنڈی ہوگئی۔ ابھی عرض کرتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جو کی گئی تھی کہ وہ آگ ٹھنڈی ہوگئی' وہ آگ سلامتی کی ہوئی' اُس سے ابراہیمؑ کا کچھ نہیں بگڑا۔ **وَ اَرَادُوۡا بِہٖ کَیۡدًا فَجَعَلۡنٰہُمُ الۡاَخۡسَرِیۡنَ** (21:70)۔ یہ ایک لفظ ہے جس میں ساری بات آ گئی ہے کہ وہاں یہ بیچ میں کے الاؤ نہیں دہکائے گئے تھے' لکڑیاں نہیں جلائی گئی تھیں' اُس میں ابراہیمؑ کو نہیں ڈالا گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ اُنہوں نے ایک Plan (منصوبہ) کیا۔ اور وہ بھی ''ارادوا'' ہے یعنی اُنہوں نے ابھی Actually (حقیقت میں) اُس کو Execute (نافذ) نہیں کیا تھا' عملاً وہ سامنے نہیں لائے تھے بلکہ انہوں سے ابھی صرف اس Plan (منصوبے) کا ارادہ کیا تھا۔ **فَجَعَلۡنٰہُمُ الۡاَخۡسَرِیۡنَ** (21:70) ابھی وہ Planning (منصوبہ بندی) اُن کے ارادے میں ہی تھی تو ہم نے وہیں سے اُس معاملے کو ختم کر دیا۔

---

[1] کم بختو! لعنت تم پر' تُف تم پر۔

ہجرت کا پروگرام ایک تعمیری مقصد کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے

قرآن کریم بتاتا ہے کہ وَ نَجَّيْنٰهُ (21:71) ہم ابراہیمؑ کو محفوظ نکال کر لے گئے۔ اور یہ نکالنا ہجرت کا مقام ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ مقامِ ہجرت ہے جو عام طور پر ہر نبی کے پروگرام میں آتا ہے۔ یہ جو ہجرت ہے یہ فرار نہیں ہوتا' جان بچا کر بھاگنے کا نام نہیں ہوتا۔ نبی کا پروگرام یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خطہء زمین میں خدا کا نظام قائم کرے۔ وہ جہاں پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہاں کی قوم اُس کی مخاطب ہوتی ہے اور اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہیں یہ نظام قائم ہو جائے۔ پہلی کوشش یہی ہوتی ہے اور یہ Natural (فطری) ہے۔ وہ کوشش کرتا رہتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہاں اب اِس کی کوئی امید نہیں ہے تو وہ اپنی باقی عمر اور اپنی باقی کوششیں یہ جانتے ہوئے کہ یہاں اِس کی امید نہیں ہے' وہ خواہ مخواہ کے لیے ضائع نہیں کرتا۔ اُس کے سامنے تو ایک مقصد ہوتا ہے کہ اِس کرۂ ارض کے کسی خطے میں نظامِ خداوندی قائم کیا جائے۔ وطن کی زنجیریں اتنی محکم نہیں ہوتیں کہ اُس کے پاؤں میں پڑ جائیں۔ وہ جانتا ہے کہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ وطن اُس کے نزدیک کوئی شے نہیں ہے۔ اُس کی حیثیت اتنی ہے کہ وہاں پیدا ہوتا ہے۔ جی چاہتا یہ ہے کہ یہیں یہ چیز ہو جائے تو اچھا ہے لیکن جب وہ اِس نتیجے پہ پہنچ جاتا ہے کہ یہاں اِس کا امکان نہیں ہے تو پھر وہ باقی عمر اور باقی وقت وہاں بیٹھ کر ضائع نہیں کرتا۔ اُس کا مقصد تو خدا کے نظام کو کسی بھی جگہ قائم کرنا ہوتا ہے۔ یہاں نہیں ہے تو جہاں امکان ہے وہ وہاں چلا جاتا ہے۔ نبی ایسے وقت پر اُس مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں اِس مقصد کے حصول کے امکانات زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ اسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ کتنے حسین الفاظ ہیں جن میں نبیؑ کے اس ارادے یا اس عمل یا اس اقدام کو بیان کیا گیا ہے!

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کفار کی ایک گہری سازش

قرآن دو لفظوں میں ساری بات کہہ جاتا ہے جو ہم صفحوں میں بھی بیان نہیں کر سکتے۔ کہا کہ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ (37:97) اُنہوں نے ارادے کیے کہ اِس کو پکڑلو' جلادو' بھسم کردو۔ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ (37:98) اُنہوں نے ایک خفیہ سازش کا ارادہ کیا اور ہم نے اُن کے اُس ارادے کو ہی پست کر دیا کہ وہ عمل میں آنے ہی نہ پائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ (37:99) میں اِس مدہوش نگری کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں۔ رب تو ہر جگہ موجود ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی خاص مقام تھا یا خاص ملک تھا یا خاص جگہ تھی جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تو ہمارے ذہن کے محدود نقشے ہیں جو اُس کو ہر دوار کہتے ہیں۔ اُس کا تو دوار کوئی نہیں ہوتا' وہ تو ہر جگہ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! یہ حضرت ابراہیمؑ نے کیا کہا ہے کہ میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں؟ یہ کہ میں اُس مقام کی طرف جا رہا ہوں جہاں

میرے خدا کے نظامِ ربوبیت کے قائم ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ وہاں جا رہا ہوں جہاں یہ نظام قائم ہوگا تو ساری دنیا دیکھے گی کہ ہاں رب کا نظام اِسے کہتے ہیں۔ یہاں رب مشہود شکل میں ان کے سامنے نہیں ہے۔ وہاں اُس رب کا نظام محسوس اور مشہود شکل میں سامنے آ جائے گا۔ کہا کہ میں اُس طرف جا رہا ہوں۔ وَقَالَ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ (37:99) ابھی تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں جا کر میرا پروگرام کیا ہوگا۔ مجھے نظر آتا ہے کہ یہاں کے مقابلے میں وہاں امکانات زیادہ ہیں۔ مجھے امید یہ ہے کہ وہاں میرا خدا مجھے ایسے راستے دکھا دے گا جن کی بنا پہ یہ پروگرام تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ وہاں جا کر راستے دکھائے جائیں گے۔ اس طرح سے وہ اس مقام کو، اس اپنے وطن کو، اپنے قبیلے کو چھوڑ کر یہاں سے چلے گئے۔ اسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ قریب قریب ہر نبی کے پروگرام میں یہ چیز آتی ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) نے چند شعروں میں ہجرت کا جو مفہوم ہے، اُسے واضح کیا ہے:

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است

ہجرت کا ایک پہلو تو یہ اپنا وطن، اپنا گھر بار چھوڑنا ہے۔ کہا کہ یہ کسی خاص نبی کا مسلک نہیں بلکہ آئینِ حیاتِ مسلم است یعنی جس کی زندگی کا بھی مقصد یہ ہو کہ ہم نے کہیں خدا کا نظام قائم کرنا ہے تو اب وہ پاؤں توڑ کر اُس مقام پہ بیٹھ نہیں جائے گا کہ جہاں وہ پیدا ہوا ہے اور جہاں اُس کا وطن ہے، وہ دیکھے گا کہ اِس کے لیے کہاں زیادہ امکانات ہیں۔ یہ جو وطنیت ہے، یہ جو اُنہوں نے کہا ہے کہ آج تو دنیا میں سب سے بڑا بُت وطن ہے، یہ وطنیت کوئی شے نہیں ہوتی۔ صرف اس اعتبار سے تو ہوتی ہے کہ جہاں پیدا ہوا ہے وہاں حفاظت سے رہنا چاہیے یا محفوظ رہنا چاہیے اور وہاں بھی اپنے اس پروگرام کو عام کرنا چاہیے لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ یہاں اس کے امکانات نہیں ہیں تو پھر اس لیے کہ یہ ''میرا وطن ہے اور میرا گھر بار ہے''، تو ٹھیک ہے اگر نہیں قائم ہوتا تو کوئی بات نہیں ہے اور یہیں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کرتے رہیں۔ یہ مسلم کی حیات کا آئین نہیں ہے، اُس کا آئین یہ ہے کہ جہاں وہ دیکھے کہ اس نظام کے قائم ہونے کا زیادہ امکان ہے تو وہاں اِس کو قائم کر لے۔ مقصد اس وطنیت سے نہیں بلکہ مقصد تو اُس خطۂ زمین سے تھا جہاں یہ نظام قائم ہو سکے۔

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

اصل چیز تو اس آئین کو Establish (ثبت) کرنا ہے۔ اُس Establish (ثبت) کرنے لیے جو مختلف اسباب اور ذرائع چاہئیں تو اُن میں سے یہ ایک ذریعہ ہوتا ہے۔

معنیٔ او از تنک آبی رم است

کہا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ نخلستان میں ایک چشمہ ہوتا ہے، وہاں تھوڑا سا پانی ہوتا ہے جیسے ہمارے ہاں کہیں کوئی گاؤں کے باہر پانی زیادہ نہ

ہو اور وہاں چھپڑ ہو یا چھوٹا سا تالاب ہو۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اگر وہاں کوئی مویشی ہوتے ہیں تو پانی پیتے ہیں اور وہاں رہتے ہیں۔ اگر اُس چشمے میں پانی ختم ہو جائے تو کہا کہ کیا وہ مویشی وہیں اُس کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں کہ نہیں جی! ہم جا تو نہیں سکتے' یہ تو ہمارا وطن ہے۔ کہا کہ وہ وطن نہیں ہے۔ وہ ثبات کا ایک ذریعہ تھا اور جب تک وہ ذریعہ یہاں تھا تو وہ وہاں تھے' یہاں وہ ذریعہ ختم ہو گیا ہے تو جہاں پانی ہے' وہ وہاں چلے جائیں گے۔ اِسے فرار (Escape) تو نہیں کہتے:

معنی ٔ او از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

یہ تو شبنم کو اس لیے چھوڑتے ہیں تا کہ سمندر کو تسخیر کر لیں۔ عزیزانِ من! اس شخص [1] کی بھی کیا بات تھی' کیا تشبیہیں تھیں! ہمارے ہاں ساری دنیا میں ہجرت کے معنی فرار (Escape) لیے جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جان بچا کر بھاگنا نہیں ہے۔

اب وہ مقام آیا ہے جو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ چھوڑنا صرف وطن کا چھوڑنا نہیں ہے بلکہ سارے علائق کا چھوڑنا ہے' عزیز رشتہ داروں کا چھوڑنا ہے' قوم کا چھوڑنا ہے' قبیلے کا چھوڑنا ہے' ہر چیز کا چھوڑنا ہے۔ **قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ** (60:4) ابراہیمؑ اور اُن کے ساتھیوں کی زندگی میں تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ عام زندگی تو یہ ہے کہ جس قسم کے عزیز رشتہ دار' شہری' تعلقدار' قبیلہ' برادری ہیں تو ٹھیک ہے اُن کے ساتھ بنا کر رکھتے ہیں۔ کہا کہ ابراہیمؑ اور اُن کے ساتھیوں کی زندگی تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ کیا مقام ہے جہاں کہا گیا ہے! **اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ** (60:4) جب اُنہوں نے اعلان کیا اور اپنی قوم سے کہا کہ **اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (60:4) تم اور جن کی تم معبودیت اختیار کیے ہو' ہم ان سب سے بیزار ہیں۔ تم سے بھی بیزار ہیں اور تمہارے معبودوں سے بھی بیزار ہیں۔ یہ ہے اسوہ کہ جس چیز کو باطل سمجھا ہے تو اُس کے خلاف پورے زور و شور سے اعلان کیا ہے اور اُن سے کہا ہے کہ تمہارے ساتھ ہمارا کوئی تعلق باقی نہیں رہ سکتا۔ **كَفَرْنَا بِكُمْ** (60:4) تمہارے اور ہمارے درمیان اسی طرح سے حد ہے' اسی طرح سے تعلقات کے انقطاع کی صورت ہے کہ جیسے کفر اور ایمان کے اندر انقطاع ہوتا ہے۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں' کوئی تعلق تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ **وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا** (60:4) یاد رکھو! تم میں اور ہم میں بغاوت ہے' دشمنی ہے' لاتعلقی ہے جو ابدی طور پہ ظاہر ہو گئی ہے اور یہ ہمیشہ کے لیے قائم رہے گی۔ **حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ** (60:4) تم بھی اگر اُس خدا کو ماننے لگے تو پھر ہم تمہیں گلے سے لگا لیں گے۔ میں نے دلائل و براہین سے سب کچھ

---

[1] یہ اشارہ حضرت ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

کر کے دیکھا' شہادتوں سے تمہیں قائل کرنے کی کوشش کی لیکن تم نہیں مانے بلکہ اُلٹا ہماری جان کے لاگو ہو گئے اور یہاں تک پہنچ گئے۔ ٹھیک ہے ہمیں بھلا اُن سے کام کیا ہے جو تجھ سے نا آشنا رہیں۔ اب تمہارے ہمارے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے' تمام تعلقات منقطع ہو گئے۔ یہاں ابدًا کہا ہے۔ اب ابدًا سے تو یہ ہوسکتا تھا کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہہ گئے۔ مگر نہیں' اس کے ساتھ ایک شرط رکھ دی۔

حضرت ابراہیم ◆ کا یہ عمل دوقومی نظریہ کی مکمل تفسیر ہے

یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ انسان کے اندر جو تغیر واقع ہونے کا امکان ہے' یہ کہہ کر اُس نے انکار نہیں کیا! وہ امید باقی رکھی ہے کہ بہر حال تم انسان ہو' اگر آج نہیں مان رہے' آج تمہارے ذہن کی یہ کیفیت ہے تو میں ہمیشہ کے لیے تم سے مایوس نہیں ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ کل کو وہ وقت آ جائے کہ تم بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لو' اُس وقت یہ ذہن میں نہ سمجھ لینا کہ ہم تو کہہ گئے ہیں کہ تمہارے اور ہمارے تعلقات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گئے۔ کہا کہ نہیں حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (60:4) تم بھی اگر اسی طرح سے خدا کو مان لو گے تو تم ہمارے اپنے ہو جاؤ گے۔ اب اپنے اور بیگانے کا معیار یہ ہو گیا کہ اگر باپ بھی اُس پر نہیں آتا ہے تو اُس سے قطع تعلق کر لیا۔ فلسطین کا چرواہا اگر اُسے مانتا ہے تو اُس کے ساتھ تعلقات ہیں۔ اور یہی تو دوقومی نظریہ ہے۔ یہ جو اعلان ہے' یہ قومیت کا معیار ہے' یہ بیگانگی اور یگانگی کا معیار ہے' اپنوں کا اور بیگانوں کا معیار ہے۔ ہم میں سے کون ہے اور ہم میں سے کون نہیں ہے۔ باپ میں بھی اگر اس نظریئے کا اشتراک نہیں ہے تو باپ دوسری قوم کا فرد ہے۔ نئی جگہ جا رہے ہیں' جن کے ساتھ نہ خون کا تعلق ہے' نہ وطن کا تعلق ہے' نہ رشتے داری کا تعلق ہے' نہ زبان کا تعلق ہے' کچھ تعلق پہلے سے نہیں ہے۔ نظر آتا ہے کہ وہاں نظامِ خداوندی کے قیام کا امکان تھا اور وہاں ایسے لوگ تھے' جو اس حقیقت کو مانتے تھے۔ اس حقیقت کو ماننے والے ہر بات میں ان سے مختلف ہیں لیکن اس باب میں وہ اپنے ہیں۔ یہ جو ہر بات میں اپنے تھے اور اس بات میں اختلاف تو یہ بیگانے ہوئے۔ تو یہی تو دوقومی نظریہ ہے۔ یہ تھی جس کی ابتدا یہاں ہوئی ہے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ تمہارے لیے ابراہیمؑ اور اُن کے ساتھیوں میں اسوۂ حسنہ ہے۔ ان مقامات سے گزرنے کے بعد یہ اعلان کہ اپنے اور بیگانے کا معیار یہ ہوتا ہے تو قومیت کی تشکیل کا مدار اِس کے اوپر ہے۔ یہ ہے جہاں تک ہم پہنچے اور اب یہاں سے حضرتِ ابراہیمؑ چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر چلے گئے اور فلسطین کے میدانوں کے اندر آ گئے۔ وہاں ان کی زندگی کی پھر ایک نئی منزل شروع ہوتی ہے۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (4:54) وہاں نبوت تھی' ضابطہء قوانین دیا' حکمت دی اور پھر ان کو بہت بڑی مملکت بھی دی۔ یہ ہے وہ چیز۔ وہ جو مسلم کا صراط ہے تو اُس کے لیے اپنی آزاد مملکت کا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ ہے اسوۂ ابراہیمیؑ۔ جہاں پیدا ہوئے ہیں تو وہاں پوری کوشش کریں' وہاں ناکامی ہوئی ہے اور اُن کے اندر امکانات نہیں ہیں تو وطن کی چار دیواریاں اُس کے لیے مہبط یا قید خانہ نہ بن جائے۔ وہاں چلا جائے جہاں اس نظامِ خداوندی کے قیام کے امکانات زیادہ روشن

ہیں۔ یہاں اِس قسم کے باطل پرستوں کے محکوم اور محتاج ہو کر رہنا تھا' وہاں سے گئے ہیں تو خدا کی کتاب اور خدا کی حکمت اور عظیم مملکت ملی۔ حضرت ابراہیمؑ کا جو اسوہ بتایا گیا ہے تو اسوہ کی تو ایک شق یہ ہے کہ اُن کے پاس اپنی مملکت ہونی چاہیے تب اسلام کا تمکن ہوتا ہے۔ یہ بھی اسوۂ ابراہیمی ہے۔

اب ہم اس مقام پہ پہنچے جہاں زندگی کی نئی منزل شروع ہوگئی۔ دوسری مملکت میں آ گئے' وہاں دین کا تمکن ہوا' ایک مملکتِ عظیم مل گئی' کتاب مل گئی' حکمت ملی اور اُس کے بعد بیٹے ملے' اولاد ملی۔ اب جو اگلی زندگی ہے اُسے ہم آئندہ درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ اگلا دور ہم اگلے درس میں دیکھیں گے کہ وہ کیا ہے اور اُس میں کن کن منازل میں سے حضرتِ ابراہیمؑ گزرتے ہیں اور اُس کے بعد کہا جاتا ہے کہ **وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى** (2:125) مقامِ ابراہیمؑ کو اپنے لیے نصب العین بناؤ۔ تو وہ جو اگلی منزل کا حصہ آئے گا اُس کے بعد اِس کی تکمیل ہو جائے گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



پانچواں باب: **العنکبوت** (آیت 16: اسوۂ ابراہیمؑ: تعمیر کعبہ سے پہلے تک: فلسطینی اور شامی دور)



عزیزانِ من! آج اپریل 1979ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 16 سے ہونا چاہیے تھا لیکن آپ کو یاد ہے کہ پچھلے درس میں بات اسوۂ ابراہیمؑ کی شروع ہوئی تھی اور میں نے عرض کیا تھا کہ داستانِ جلیل وجمیل ایسی تفصیلی ہے جو قرآن نے دی ہے کہ وہ ایک دو درسوں میں ختم نہیں ہوسکتی۔ اُس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ مہینوں تک بھی اس کے درس چلیں گے لیکن بہرحال پہلے [1] والے درس میں تو اُس کا صرف ابتدائی حصہ آیا تھا۔ بات میں نے یوں شروع کی تھی کہ قرآنِ کریم میں دو ہستیوں کے متعلق خصوصیت سے یہ کہا ہے کہ اُن کی زندگی تمہارے لیے، پوری انسانیت کے لیے، بہترین اور نہایت حسین ماڈل ہے۔

قرآن حکیم نے نبیوں میں سے نبی اکرمؐ اور حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کو نوعِ انسانی کے لیے بطور ماڈل پیش کیا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ جس زندگی کو خود خدائے خبیر وعلیم انسانیت کے لیے بہترین ماڈل قرار دے تو آپ خود سوچیے کہ اُس زندگی کی تفصیلات کس قدر اہم اور غور طلب ہوں گی اور ہمارے جادۂ حقیقت تک پہنچنے کے لیے کس قدر دلیلِ راہ بنیں گی! اور وہ دو ہستیاں یہ ہیں: ایک نبی اکرم m اور دوسرے حضرتِ ابراہیم ◆۔ میں نے یہ بھی گزارش کیا تھا کہ جب خدا نے انہیں ماڈل قرار دیا ہے تو ظاہر ہے کہ خود خدا کو ہی چاہیے تھا کہ یہ ماڈل اس طرح سے ہمارے سامنے رکھے اور اُس نے یہ کیا ہے کہ اُس کی جزئیات اور خدوخال تمام کے تمام ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا ورنہ اگر یہ کہا جائے کہ اِس ماڈل کے مطابق تصویر کھینچو اور ماڈل سامنے نہ دیا جائے یا نا تمام دیا

---

❶ یعنی اسی کتاب کا ''چوتھا باب''۔

جائے، تو وہ تصویر صحیح نہیں آ سکتی۔ اس لیے بڑی تفصیل سے قرآن نے ان دو ہستیوں کی زندگی کو اپنے ہاں قرآن کی دفتین میں محفوظ کر لیا ہے۔

حضرتِ ابراہیمؑ کی حیاتِ طیبہ کا بابل کی زندگی کا جو ابتدائی دور تھا وہ ہمارے سامنے [1] آ گیا اور ہم نے دیکھا کہ اُس زندگی میں آپؑ نے کیا نمونہ پیش کیا ہے۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ گھر میں باپ تھا اور وہ بھی ہیڈ پریسٹ (اُسقفِ اعلیٰ) تھا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ جیسا میں نے کہا تھا کہ اُس زمانے کے جو پریسٹ (مذہبی پیشوا) تھے اور اُن میں بھی جو سب سے بڑا پریسٹ (مذہبی پیشوا) تھا، اُس کی حیثیت اور اقتدار تو بادشاہ سے بھی زیادہ ہوا کرتا تھا۔ یہ لوگ بادشاہ گر ہوا کرتے تھے۔ وہ باپ تھا اور یہ اُن کا بیٹا تھا جسے یہ سارا کچھ وراثت میں مل جانا تھا۔ یہ پورا اقتدار، قوت، حشمت، دولت، عقیدت سب کچھ محض بیٹا ہونے کی حیثیت سے مل جانا تھا۔ پہلی چیز جو ہم وہاں دیکھتے ہیں یہ ہے کہ باپ بھی غلط روش پہ چل رہا ہے تو یہ چیز بھی ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے مگر وہ بیٹا اس کی تردید کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اطاعت تو صحیح بات ہی کی ہو سکتی، غلط کی نہیں ہو سکتی خواہ باپ ہی اُسے کیوں نہ کہے۔ پہلی چیز گھر سے یوں شروع ہوئی۔ باپ کی مخالفت کرنے سے باپ نے یہ کہہ دیا کہ یاد رکھو! اگر یہی خیالات تم نے رکھے تو یہ جو سب کچھ تمہیں ملنے والا ہے میں تمہیں اُس سے محروم کر دونگا۔ جواب یہی تھا کہ بس اتنی سی بات ہی ہے جو تم نے کہی ہے، اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہے۔ اس کی تو میرے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ اس سختی کے باوجود قرآن نے کہا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے ماں باپ کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں اس لیے ان کو ڈانٹا جھڑکا نہ کرو۔ حضرتِ ابراہیمؑ نے باپ سے یہ تو کہا اور اُس کے بعد کہا کہ بہر حال میرے دل میں تمہارے لیے نرم گوشہ ہے اور میں تمہاری سلامتی کے لیے خدا سے دعا کرونگا اور خدا سے آرزو کرونگا کہ وہ تمہیں محفوظ رکھے اور تباہ نہ ہونے دے ورنہ تمہاری روش تو ایسی ہے کہ تم اس تباہی سے بچ نہیں سکتے۔ اُنہوں نے انہیں نہایت نرمی اور محبت سے سمجھایا تھا۔

عزیزانِ من! تاریخ میں دو ہی بادشاہ ہیں جو استبداد کے مجسمے گنے جاتے ہیں: ایک فرعون اور دوسرا نمرود۔ یہاں نمرود تھا۔ آپ نے دیکھا کہ نمرود کے سامنے بھی آپؑ نے اُس کو ایسا لاجواب کیا ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ اُس کو کچھ سوجھی ہی نہیں، وہ نادم ہو گیا۔ بھرے دربار میں اُس کے ساتھ یہ کچھ ہوا۔ یہ کچھ کہنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔ یہ تھا ابراہیمؑ کا اسوہ کہ حق کہنا ہے اور نمرود جیسے بادشاہ کے ہاں کہنا ہے اور اس انداز سے کہنا ہے کہ وہ لاجواب ہو جائے اور بھرے دربار میں کہنا ہے۔ اُس کے بعد ساری قوم مقابلے میں ہے۔ پوری کی پوری قوم کا مقابلہ کر کے اُن کو بتایا کہ تم کس غلط روش پہ چلے جا رہے ہو۔ یہاں تک ہم سابقہ درس میں پہنچے تھے۔

---

[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بابل کی زندگی کا یہ ابتدائی دور اس کتاب کے ''چوتھے باب'' میں آ چکا ہے۔

عزیزانِ من! اُس کے بعد جب اُنہوں نے یہ دیکھا کہ یہ وہ زمین ہے جو بالکل بنجر ہے، اِس میں کسی روئیدگی کا امکان ہی نہیں ہے، کسی فصل کے اگنے کا امکان ہی نہیں ہے تو یہاں بیج ڈال کر بیج کو ضائع کرنے والی بات ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے سامنے تعمیری پروگرام ہو، وہ محض اپنے جذبات کی خاطر کسی مقام کے اوپر یونہی بیٹھا نہیں رہتا اور اپنے آپ کو بہلاتا نہیں رہتا کہ کوئی بات نہیں، میں اپنی طرف سے تو کوشش کرتا ہی رہونگا۔ اُسے جب یقین ہو جائے کہ یہ زمین ایسی نہیں ہے کہ اِس میں کچھ اُگے تو وہ خواہ مخواہ اُس میں ہل نہیں چلاتا رہتا۔ وہ کسی ایسی سرزمین کی طرف چلا جاتا ہے جہاں اُس کی کوششیں بار آور ہوں۔ اسی کو ہجرت کہا جاتا ہے۔

حضرتِ ابراہیم ◆ وہاں بابل کی سرزمین کو چھوڑ کر، ہجرت کر کے، فلسطین اور شام کے علاقے میں آ گئے۔ اب یہاں سے نیا دور شروع ہوتا ہے۔ فضا تو اس لیے سازگار تھی کہ یہاں وہ ہجومِ مخالفت نہیں تھا جو وہاں بابل میں تھا لیکن جہاں آئے تھے، وہ قوم تو بالکل نامانوس تھی۔ یہاں نیا علاقہ، نئی قوم، نئی فضا تھی۔ پھر وہ اجڈ جیسے لوگ تھے، وحشی جیسے لوگ تھے۔ آپؑ اُن کے اندر آئے ہیں۔ یہاں سے ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ یعنی پہلا جو ایک دور تھا اُس سے ایک نیا دور شروع ہوا ہے، یہاں ایک Raw Material (خام مال) ملا ہے، کمہار کو چاک کے اوپر مٹی ملی ہے تا کہ اُس کی صورت گری کرے۔ یہاں اِس Raw Material (خام مال) میں اُنہوں نے انسان پیدا کرنے ہیں۔ مُردوں کی بستی میں اُنہوں نے صورِ اسرافیل پھونکنا ہے کہ ان میں زندگی کی نمود ہو۔ یہ اُس انسان کی زندگی میں ایک نیا مرحلہ آتا ہے جس نے انقلاب برپا کرنا ہو۔ اُس کے لیے اُسے ایک خام مسالہ ملتا ہے۔ اُس خام مسالے میں سے اُس نے بہترین انسان پیدا کرنے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ ایک ہی آیت کے اندر قرآنِ کریم نے یہ کچھ کہا ہے کہ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (2:260)۔

حضرت ابراہیم ◆ کا اسوۂ حسنہ روایات اور تفاسیر کی روشنی میں

میں نے اپنے ذہن میں اسوۂ ابراہیمؑ کی داستان پیش کرنے کے لیے یہ رکھا تھا کہ پہلے تو قرآنِ کریم نے اُس زندگی کے جو نورانی خدوخال پیش کیے ہیں خالصتاً اُن کو آپ کے سامنے لاتا جاؤنگا۔ اور اُس کے بعد یہ عرض کرونگا کہ جب یہی ماڈل انسانوں کے ہتھے چڑھا تو اُن کی رنگ آمیزی نے اسے کیا سے کیا بنا دیا۔ یعنی ہماری روایات میں اسوۂ ابراہیمؑ کیا سامنے آتا ہے۔ میں نے چاہا یہ تھا اور اب بھی یہی میرا ارادہ ہے کہ یہ پوری داستان ختم کرنے کے بعد اِس کے مختلف ٹکڑوں کے متعلق جو کچھ ہمارے ہاں کتبِ روایات میں آیا ہے پھر میں وہ پیش کروں کیونکہ اُس کے بعد جب اِس امت نے قرآن چھوڑا ہے تو یہ جو دونوں کے اسوۂ تھے یعنی حضور اکرم ♏ کا اور حضرت

ابراہیمؑ کا' یہ وہی ہے جو ہمارے سامنے روایات کے ذریعے آیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ کچھ اپنا پروگرام میں ایسا ذہن میں رکھتا ہوں اور وہ کچھ مؤثر بھی ہے کہ یہ ساری چیز آپ کے سامنے آئے اور میں پھر بتاؤں کہ اس واقعہ کے متعلق ہماری روایات کیا کہتی ہیں لیکن اِس مقام پہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے اُس پروگرام سے مجھے تھوڑا سا Departure (انحراف) کرنا چاہیے۔

اس آیت (2:260) کے متعلق میں ذرا پہلے بتا دوں کہ آپ کے ہاں کے ترجموں میں' آپ کے ہاں کی تفسیروں میں اور آپ کے ہاں کی روایات میں' اس کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ آیت کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''ابراہیمؑ نے اپنے اللہ سے کہا کہ یا اللہ! تُو مجھے بتا کہ تُو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ خدا نے کہا کہ کیا تیرا ایمان ایسا نہیں ہے۔ اُنہوںؑ نے کہا کہ ایمان تو ہے لیکن میں اطمینانِ قلب کے لیے ایسا چاہتا ہوں''۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر یہ کی جاتی ہے۔ تو ''اللہ تعالیٰ نے کہا کہ چار پرندے لو اور اُن پرندوں کو ذبح کرو' پھر اُن کا قیمہ کرو' پھر ان کا قیمہ آپس میں Mix (مکس) کرو اور پھر اُس میں سے تھوڑا تھوڑا چار پہاڑیوں کی چوٹیوں کے اوپر جا کر رکھو۔ اور پھر تم اُن کو آواز دو تو وہ پھُر سے اڑ کے تمہارے پاس آ جائیں گے تو تمہارا اطمینان ہو جائے گا''۔ چنانچہ آپ کے ہاں یہ کتبِ روایات میں ہے اور وہ بھی کوئی وضعی روایات نہیں ہیں بلکہ ان کے معیار کے مطابق جو صحیح ترین کتابیں ہیں یعنی بخاری شریف وغیرہ کی روایات ہیں ان میں ہے۔ چنانچہ آپؑ نے وہ چار پرندے لیے۔

اب دیکھیے کہ زیبِ داستان کے لیے اُس کو خوبصورت تو بنانا پڑتا ہے' کیونکہ افسانہ تو ایسے نہیں بنتا' اگر اُس میں Reality (حقیقت) آ جائے تو وہ دلکش نہیں رہتا۔ پھر بحث شروع ہوگئی کہ وہ چار پرندے کونسے تھے۔ حضرتِ ابراہیمؑ کا ہزاروں سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اب ان میں آپس میں اختلاف شروع ہوا اور بحثیں شروع ہوئیں۔ کوئی کہتا تھا کہ کبوتر تھا' مرغ تھا' مور تھا' طیہوج[1] تھا' کسی نے کہا کہ نہیں فاختہ تھی[2]۔ بہرحال چار پرندے لے لیے' اُن کو ذبح کیا' قیمہ کیا' قیمہ Mix (آمیزش) کیا اور اُن کے سر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پاس رکھ لیے' پھر اُن کو پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر رکھ دیا۔ پھر جب آواز دی تو وہ پھُر سے کرتے ہوئے آئے۔ اب وہ جو آئے تو اُس کی صورت یہ تھی کہ حضرت ابراہیمؑ اگر غلط سر اُس کے اوپر رکھ دیتے تھے تو وہ اُس کو جھٹک دیتا تھا۔ یعنی وہ جو چار سِریاں اُن

---

1. طیہوج معرب ہے تیہو کا اور تیہو ایک پرندہ ہے مشابہ کبک سے جس کو چکور کہتے ہیں لیکن چکور سے چھوٹا ہوتا ہے اور بعضے کہتے ہیں کہ ہندی میں اس کو لوا کہتے ہیں جو مشہور پرندہ ہے تیتر کی قسم سے۔ طیہوج کو فارسی میں تیہوج بھی لکھا جاتا ہے۔ یہ بھی تیہو کا معرب ہے (حوالہ لغاتِ کشوری' ص ص 310' ۰۲۱)۔
2. مولانا رومیؒ نے اسے یوں شعر کا روپ دیا ہے۔

بط وطائرس وزاغست خروس　　　ایں مثال چار مرغ اندر نفوس

(These four birds like those in our body were duck, peacock, crow and cock)

کے پاس تھیں' اگر صحیح پرندے کا سر اُس کے اوپر لگتا تھا تو پھر وہ جیتا جاگتا پرندہ ہو جاتا تھا۔ اور اِس طرح سے چاروں کے چاروں پرندے ہو جاتے تھے۔ خدا نے ان کو یہ بتا دیا اور ان کا اطمینان ہو گیا۔ ہر تفسیر میں اور ہر ترجمے میں آپ کو یہ ملے گا۔ اسوۂ ابراہیمؑ آپ کے لیے ماڈل قرار دیا گیا ہے اور اُس ماڈل میں یہ بات آتی ہے۔

یہ بات تو ہم میں سے قریباً ہر ایک کے دل میں اُٹھتی ہو گی کہ یا اللہ! تُو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے؟ پھر تو ہمارے سامنے وہ کبوتر اور مور وغیرہ آنے چاہئیں' اُن کو ذبح بھی کرنا چاہیے۔ اسوہ تو جب بنے گا جب ہم یہ کریں گے۔ اسوہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمارے سامنے ماڈل ہیں' ہم نے اپنی زندگی کو اُس جیسا بنانا ہے۔ اب باقی چیزیں تو چھوڑ دیجیے۔ ان روایات میں سب سے زیادہ جگر خراش اور دل سوز یہ ہے کہ جب حضرتِ ابراہیمؑ نے یہ کہا تھا کہ خدا مجھے بتا کہ تُو کیسے زندہ کرتا ہے تو کہا گیا تھا کہ کیا تجھے ایمان نہیں ہے؟ اُنہوں نے کہا تھا کہ ایمان تو ہے۔ بخاری میں یہ ہے حضرتِ ابراہیمؑ کو شک گزرا کہ واقعی کرتا بھی ہے یا یونہی کہہ دیا ہے۔ اُس میں ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہمیں ابراہیمؑ سے زیادہ شک کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ یا اللہ! دو ہی زندگیاں ہیں جن کو ماڈل قرار دیا ہے۔ اب اُس ماڈل کو ہمارے سامنے یوں رکھا جا رہا ہے کہ ایک خدا کے نبی کو خدا کی اِس قدرت پر شک گزرتا ہے کہ واقعی مُردوں کو زندہ کر بھی سکتا ہے یا یونہی کہہ دیا اور دوسرے اولوالعزم نبی ﷺ وہ ہیں جن کی زندگی کو ماڈل قرار دیا ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں ابراہیمؑ سے بھی زیادہ شک کرنے کا حق ہے۔ اگر نبیوں کی زندگی بھی ایسی ہے کہ اُن کو بھی خدا کی ان صفات میں شک پیدا ہو سکتا ہے تو ہم امتّیوں کا کیا حال ہو گا۔ ہمیں تو انکاری ہی ہو جانا چاہیے۔ اس کو لیے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ ان چیزوں کے انکار سے اس ناچیز [1] کے اوپر کفر کے فتوے لگے تھے تو اُن میں یہ چیز بھی تھی۔ اگر انبیائے کرامؑ کے دل میں بھی شک گزرنا شروع ہو جائے تو میں نے لکھا تھا کہ اس آسمان کے نیچے ہم یتیم کہاں حقیقت تلاش کریں گے۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں موت وحیات کے الفاظ کے استعمال کی ایک مثال

اب آیئے قرآن کی طرف کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ ہجرت کر کے حضرت ابراہیمؑ ایک نئی فضا میں آئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں اُنہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ہم یہ روزمرہ الفاظ بولتے ہیں کہ قوم مُردہ ہو چکی ہے۔ نبی کی تعلیم مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک کر اُن میں حیاتِ تازہ پیدا کر دیتی ہے۔ یہ روز کی باتیں ہیں اور ہم روز کرتے ہیں کہ قوم بالکل مُردہ ہو چکی ہے۔ وہاں وہ دیکھتے ہیں کہ میں اُس بستی کو چھوڑ کر آ تو گیا ہوں' یہاں مخالفت اور مزاحمت تو نہیں ہے لیکن یہاں تو زندگی کے آثار نہیں ملتے۔ ان کو بلاتا

---

[1] یہ جی۔ اے پرویزؒ (1903-1985ء) کا اشارہ اپنی طرف ہے۔

ہوں تو بھاگ جاتے ہیں۔ اب یہ چیز جو میں نے قوموں کی زندگی اور قوموں کی موت کہی ہے قرآنِ کریم نے اس کو موت اور حیات کے الفاظ سے خود تعبیر کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے کہ اے نبی اکرم ﷺ! ٹھیک ہے تم اپنا پیغام پہنچاتے چلے جاؤ اور ان سے برگشتہ نہ ہو، افسردہ خاطر نہ ہو کہ یہ دھیان نہیں دیتے یا یہ غور سے نہیں سنتے۔ کہا گیا کہ **اِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی** (27:80) تُو مُردوں کو سنا نہیں سکتا۔ وہ لوگ سامنے مخاطب بیٹھے ہوئے ہیں۔ **وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ** (27:80) نہ ہی تُو اُنہیں سنا سکتا ہے جو بہرے ہوں، بہرے بھی ہوں اور تُو بات کرے تو وہ پیٹھ موڑ کے چل دیں، تُو ایسے شخص کو کیسے سنا سکتا ہے۔ یہ مُردے ہیں، سامنے بیٹھے ہیں، اٹھتے ہیں، سن رہے ہیں، چل رہے ہیں، پیٹھ موڑ رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ مُردے ہیں ان مُردوں کو تو کیا سنا سکتا ہے۔ تو کیا سمجھا جائے گا کہ ایک لاش کے کنارے یا قبر کے اوپر آپ ﷺ کھڑے ہوئے وعظ کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تُو کیا کر رہا ہے، تُو مُردوں کو سنا رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ ایسے مُردے ہیں کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ تُو ان سے بات کرتا ہے تو یہ منہ موڑ کے چل دیتے ہیں، تو کیا تو ان مُردوں کو سنا رہا ہے۔ سمجھ آیا کہ قرآنِ کریم نے مُردے کس کو کہا ہے۔ اور پھر دوسری جگہ تو قرآنِ کریم نے واضح ہی کر دیا ہے۔ **لِیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا** (36:70) تو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے صرف اُنہیں آگاہ کر سکتا ہے جو زندہ ہیں، تو ان لوگوں کو کیا آگاہ کر سکتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ بہت بڑی چیز ہے کہ قرآن تو صرف زندوں کے لیے ہے۔ جس میں زندگی کی نمود نہیں ہے، زندگی کا امکان نہیں ہے، اُسے یہ کیا فائدہ دے گا۔ رسول اللہؐ جیسا آگاہ کرنے والا، قرآن جیسی چیز اور خدا کہہ رہا ہے کہ تُو اس سے صرف زندوں کو آگاہ کر سکتا ہے۔

قرآنِ حکیم کا پیغام کوئی شاعری نہیں ہے

دیکھنے کی پہلی چیز یہی ہے کہ وہ قوم بالکل مُردہ تو نہیں ہو چکی؟ کیا اُس میں زندگی کا امکان ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ زندگی کسے کہتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ پیغامِ انقلاب جو رسولؐ تمہیں دے رہا ہے: **وَمَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ وَمَا یَنۡۢبَغِیۡ لَهٗ** (36:69) یہ شاعری نہیں ہے۔ ایک انقلاب کی دعوت دینے والے انسان کے شایانِ شان ہی نہیں ہے کہ وہ شاعری کرتا پھرے۔ شاعری خالص جذبات کا نام ہوتا ہے۔ وہ تو زندوں کو بھی سلا دینے والی چیز ہے۔ تم کیا جانتے ہو کہ یہ کیا ہے؟ **اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ وَّ قُرۡاٰنٌ مُّبِیۡنٌ** (36:69) یہ تو فراموش کردہ حقیقتوں کی یاددہانی ہے، یہ دنیا کے اندر ایک Proclamation (اعلامیہ) ہے کہ آؤ اور ایک نئی زندگی کے لیے اُٹھو۔ قرآن کے معنی اعلامیہ ہوتا ہے، جسے Proclamation کہتے ہیں۔ ایک عام اعلان کیا جاتا ہے۔ قرآن بڑا واضح ہے جو یہ کہتا ہے لیکن **لِیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا** (36:70) یہ صرف اُنہی کو تباہیوں سے آگاہ کر سکے گا جو زندہ ہیں اور زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جن میں

زندگی کی رمق اور کچھ شنوائی ابھی باقی ہے یہ ان کے لیے ہے۔

صورت گری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی!

رسول کا اور ہر انقلابی کا یہ پیغام اُس مُردہ قوم کے لیے ہوتا ہے جس میں ابھی زندہ رہنے کی صلاحیت ہو‘ وہ صلاحیت مرنہ چکی ہو۔ یہ چیز اُن کے لیے ہے۔ یہ زندگی کیسے ملتی ہے؟ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبارؓ ہجرت کرکے مدینے آ گئے۔ مخالفین نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا اور یورش کرکے ادھر چلے آ رہے ہیں۔ پہلا محاذ ہے جو یہاں قائم ہونا ہے۔ دیکھیے! قرآن زندگی اور موت کی تشبیہہ کہاں لاتا ہے؟ کہا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (8:24) ۔ اربابِ ایمان سے یہ کہا جا رہا ہے‘ صحابہؓ سے کہا جا رہا ہے‘ اُن سے کہا جا رہا ہے جو سب کچھ چھوڑ کر یہاں ایک نئی دنیا بسانے کے لیے آ گئے ہیں۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ (8:24) خدا کا رسول آواز دے رہا ہے‘ خدا کی آواز تم تک پہنچا رہا ہے۔ اس آواز پر لبیک کہو۔ یہ کونسی آواز ہے؟ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (8:24) یہ وہ آواز ہے جو تمہیں زندگی عطا کردے گی۔ یہ جیتے جاگتے لوگوں سے خطاب ہو رہا ہے اور وہ سامنے کھڑے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ اُس کی آواز پہ لبیک کہو‘ یہ تمہیں زندگی عطا کردے گی۔ آپ نے دیکھا کہ یہ زندگی اور موت کے الفاظ قرآن کن معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ اور پھر یہ جو یہاں کہا ہے کہ اِس کی آواز پہ لبیک کہو تو یہ تمہیں زندگی عطا کردے گی۔ آواز یہ تھی کہ میدانِ جنگ میں چلو اور وہاں جان دیدو تو تمہیں زندگی عطا ہو جائے گی۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کا تعلق نفس شُماری سے نہیں‘ نفس گُدازی سے ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے موت اور حیات کے الفاظ ان معنوں میں استعمال کیے ہیں۔ مُردہ قوموں کو حیاتِ تازہ عطا کرنا‘ ہر ایک رسول کا مسلک اور پروگرام تھا۔ ہر رسول یہی کرتا تھا اور حضرت ابراہیمؑ کی زندگی میں وہ منزل آ گئی ہے جہاں ایک خوابیدہ قوم اُن کے سامنے ہے‘ ناتربیت یافتہ قوم ہے‘ اجڑسی قوم ہے‘ زندگی سے ناآشنا ہے۔ طبعی زندگی تو ہے اور وہ اُن میں جیتے جاگتے کھڑے ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ قرآن کے نزدیک سانس لینے والی زندگی کا نام زندگی نہیں ہے:

تیرا دین نفس شماری‘ میرا دین نفس گدازی

یہ نفس شُماری کی زندگی تھی جو قوم سامنے تھی۔ وہ حیات جسے قرآن حیات کہتا ہے وہ نفس گدازی[1] کی زندگی ہوتی ہے۔ ایک انقلابی کا

---

[1] نرمی‘ ملائمت

پیغام کرتا یہ ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ تو جان دینے کا مقام ہے۔ کہا یہ ہے کہ نفس شُماری کی جان دے کر نفس گدازی کی زندگی لے لو۔ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ (8:24) اٹھو اور اِس رسول کی آواز پہ لبیک کہو جو تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہیں زندگی عطا کر دے۔

عزیزانِ من! حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ کی طرف آجایئے۔ وہ قوم سامنے آگئی ہے۔ آواز دیتے ہیں اور وہ آواز پہ لبیک نہیں کہتی' زندہ تو ہیں لیکن جو زندگی اِنہوں نے عطا کرنی ہے وہ اُنہیں حاصل نہیں ہے۔ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اب تم نئی منزل میں داخل ہو گئے ہو تو تم نے ان مُردوں کو زندہ کرنا ہے اور وہ پوچھتے ہیں کہ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (2:260) ۔

حضرت ابراہیمؑ نے شک کا اظہار نہیں کیا تھا

عزیزانِ من! میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ بات میں ہی سمجھا اور کوئی نہیں سمجھا۔ سیدھی سی عربی زبان سامنے ہے۔ ابراہیمؑ نے یہ نہیں کہا تھا کہ یا اللہ! مجھے اس میں شبہ ہے کہ تُو مُردوں کو زندہ کرسکتا ہے یا نہیں کرسکتا' تُو مجھے بتا تو دے' اگر کرسکتا ہے۔ تھوڑی سی عربی جاننے والے بھی جانتے ہیں کہ بات یہ ہے کہ مجھے یہ تو یقین ہے کہ مُردہ قومیں زندہ ہو جاتی ہیں لیکن میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اُس کا طریقہ کیا ہے۔ کیف کے لفظ میں ساری کہانی سامنے رکھ دی۔ وہ طریقہ پوچھ رہے ہیں کہ میں ان کے لیے کیا کروں؟ اس وقت تو ان کی صورت یہ ہے کہ میں آواز دیتا ہوں اور یہ سنتے ہی نہیں ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ کیف کے اندر اصل لِم ہے' وہ تالا کھولنے کا وہ ہے جسے حرف کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ یا اللہ! مجھے ایمان نہیں ہے کہ تُو مُردوں کو زندہ کرسکتا ہے۔ مُردوں کو زندہ کرنے والی بات تو ہمارے ایمان میں داخل ہے اور یہ پہلی چیز ہے۔ عزیزانِ من! سیدھی سی بات ہے کہ کیا ابراہیمؑ کو اس پہ ایمان نہیں تھا کہ تُو مُردوں کو زندہ کرسکتا ہے یا نہیں کرسکتا؟ سورۃ البقرہ کی 258 ویں آیت میں بادشاہ کے ساتھ مناظرہ ہو رہا ہے اور اُس مناظرے میں حضرت ابراہیمؑ نے یہی کہا تھا کہ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ (2:258) اُس نے کہا تھا کہ تمہارا رب کون ہے؟ اور اُنہوں نے کہا تھا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں موت اور زندگی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ تو ابھی ابھی اُس مناظرے میں یہ کہہ کر آئے ہیں کہ موت اور زندگی اُس کے ہاتھ میں ہے۔ تو کیا ابراہیمؑ کو اسی میں شبہ تھا کہ خدا زندہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ یہ ابھی تو اُن کو قائل کر کے آئے ہیں۔ اور ایک ہی آیت کے بعد یہ آیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ تُو کرسکتا ہے یا نہیں کرسکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (2:260) ۔ اس پہ تو مجھے یقین ہے کہ تو جب کہتا ہے تو یہ ہو تو سکتا ہے لیکن میں جو اپنے طور پہ کچھ سوچتا ہوں تو اُس پہ میرا دل نہیں ٹکتا' مجھے یقین نہیں آتا کہ اس سے ہو جائے گا۔ تو مجھے وہ بتا دے کہ میں کیا طریقہ اختیار کروں کہ یہ مجھ سے مانوس ہو جائیں۔ اصل میں بات یہ ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ قَالَ اَوَ لَمۡ تُؤۡمِنۡ (2:260) پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہیں اس پہ یقین ہے یا نہیں کہ یہ ہوسکتا ہے۔ اگر اِس پہ یقین نہیں ہے تو پھر اس قصے کو چھوڑ۔ پھر آگے بات چل ہی نہیں سکتی۔ اگر تجھے یقین ہی نہیں ہے کہ یہ ممکن ہے تو پھر

آگے بات ہی نہیں ہے۔

دراصل حضرت ابراہیمؑ کی سوچ Trial&Error (سعی وخطا) کے راستے سے گریز کی خواہاں تھی

اُنہوں نے کہا کہ بَلٰی (2:260) مجھے اس پہ یقین ہے لیکن میں پوچھتا یہ ہوں کہ مجھے وہ طریقہ بتادے تا کہ میں اطمینانِ قلب سے اُس راستے کے اوپر چلوں۔ میں یہ نہ کروں کہ اپنے طور پہ ایک طریق اختیار کروں' ایک راستہ اختیار کروں۔ دل میں ہو کہ پتہ نہیں کہ یہ ٹھیک طریقہ ہے یا نہیں۔ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے' اسے اس کا یقین نہیں ہوتا کہ یہ واقعی صحیح طریقہ ہے' وہ تو Trial & Error (سعی وخطا) کا تجرباتی طریقہ ہوتا ہے یعنی Let us try[1] ۔ Let us try کے ساتھ جو بات شروع کی جاتی ہے تو اُس میں استقامت اور دل کا اطمینان ویقین نہیں ہوتا کہ پتہ نہیں یہ صحیح ہے یا نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ میں بات یوں نہیں کرنا چاہتا کہ اپنے طور پہ ایک طریقہ اختیار کروں اور پھر کہوں کہ اچھا آزما کے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر نہ ہوا تو پھر کچھ اور دیکھ لیں گے بلکہ پہلا قدم اٹھانے سے پہلے مجھے یہ یقین ہونا چاہیے' یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ یہ راستہ صحیح ہے جو میں اختیار کر رہا ہوں۔ یہ تو میرا یقین ہے کہ مُردہ قوم میں زندگی پیدا ہوسکتی ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ معلوم کرلوں کہ اُس کا طریقہ کیا ہے۔

عزیزانِ من! دیکھیے کہ قرآن کا ایک لفظ کیسے ساری بات صاف کر دیتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ ان کو سمجھا تا ہے۔ اب یہ تو نہیں تھا کہ اُس مُردہ قوم کو اللہ تعالیٰ یونہی معجزے کے طور پر صحیح راستے کے اوپر لے آئے کہ لو یہ صحابہ کبار بھی ہو گئے اور یہ مجاہد بھی ہو گئے اور یہ شہید بھی ہوجائیں گے۔ یہ تو بڑا لمبا پروسیس (عمل) ہوتا ہے۔ کہا کہ ابراہیمؑ! تمہیں یہ شکایت ہے کہ تم آواز دیتے ہو اور یہ آتے ہی نہیں ہیں' اگر آتے ہیں' تم بات کرتے ہو تو یہ پھر سے اڑ جاتے ہیں' بیٹھتے نہیں ہیں' مانوس نہیں ہیں۔ یہ جو چیز ہے اس سے ہی ایک پیغامبرِ انقلاب یا رسول کی زندگی میں اتباع ہوتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی مخاطب قوم کی حالت

نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن نے سورۃ الجمعۃ میں یہ بتادیا کہ تو افسردہ خاطر نہ ہو کیونکہ یہ بیچارے ابھی ناتربیت یافتہ ہیں' کندۂ ناتراش ہیں۔ قرآن نے بتایا یہ ہے کہ کیفیت یہ ہے کہ ان کا اجتماع ہے اور تو ان کو Address (خطاب) کر رہا ہے اور یہ بیٹھے ہیں۔ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (62:11) اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر انہوں نے باہر دیکھا کہ کوئی تجارت کا قافلہ آیا ہے یعنی اُس دور میں تجارت کے قافلے آتے تھے اور یہ سامانِ تجارت خریدتے تھے' تو جو پہلے آگے بڑھ کر انتخاب کرلے تجارت

---

[1] آؤ کوشش کر دیکھیں۔

اسی کی تھی۔ تو ان کی کیفیت یہ ہے کہ تُو ان کو اتنے اہم معاملات کے بارے میں Address (خطاب) کر رہا ہوتا ہے اور یہ باہر کسی کارواں کے اونٹ کی گھنٹی سن کر وہاں بھاگ جاتے ہیں۔ نبی کو رسول کو اس قسم کی قوم سے واسطہ پڑتا تھا۔

اس الجھن کا حل قوم کو اپنے ساتھ مانوس کرنے میں تھا

حضرتِ ابراہیمؑ یہ بات پوچھ رہے تھے کہ ان کی کیفیت تو یہ ہے۔ اب میں کیا کروں؟ کہا کہ ابراہیمؑ! تم نے ان پرندوں کو سدھانے والوں کو کبھی دیکھا ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ وحشی پرندہ ہوتا ہے' نامانوس ہوتا ہے' ذرا سی آہٹ پا کر پھُر سے اڑ جاتا ہے۔ یہ سدھانے والے اُسی پرندے کو لیتے ہیں اور پھر اُس پرندے کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ وہ اُس کو جنگل میں لیے جاتے ہیں۔ ہاتھ میں خالی پنجرہ ہوتا ہے اور یہ آزاد چھوڑا ہوا ہوتا ہے۔ جنگل کے پرندے اُسے آوازیں دے رہے ہوتے ہیں کہ آزادی یہاں ہے' تُو کہاں ہے' وہ اُن کی سنتا نہیں ہے اور اُس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہوتا ہے۔ وہاں وہ پنجرہ رکھتا ہے تو وہ اڑ کر بھاگتا نہیں ہے بلکہ پنجرے پہ بیٹھ کر اُس کا دروازہ چونچ سے کھولتا ہے۔ کہا کہ یہ وہی پرندہ تھا جو اس کی آہٹ کے اوپر اڑ جاتا تھا' اس نے اس پرندے کے ساتھ کیا کیا؟ یہ کہ اس پرندے کو اِس نے سدھایا ہے لیکن سدھانا ایک دن کی بات نہیں ہے' اس کے لیے بڑا من مارنا پڑتا ہے' بڑی استقامت کی ضرورت ہے۔ کہا کہ **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ** (2:129) کتاب وحکمت کی تعلیم دینی پڑتی ہے' ان کی تربیت کرنی پڑتی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ان کو مانوس کرنا پڑتا ہے۔ وحشی پرندوں کو سدھانے والا پہلے ان کو اپنے ساتھ مانوس کرتا ہے تو اُس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ آزادی کی فضاؤں میں آواز دینے والوں کی طرف نہیں جاتے بلکہ اس پنجرے میں ڈالنے والے کی طرف بھاگ کر آتے ہیں۔ یہ مانوس کر دینا تو کچھ کرنا ہے۔ کہا کہ مثال کے طور پہ باہر جنگل سے چار پرندے لے آؤ اور انہیں لا کر وہ کچھ کرو جو پرندوں کو سدھانے والا ہمارے ہاں کرتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہندو ہوتے تھے۔ ان کے پاس صبح کے وقت تیتر یا چکور ہوتا تھا۔ وہ آگے آگے جاتے تھے تو وہ اُن کے پیچھے پیچھے جایا کرتا تھا۔ کہا کہ یہ جو پرندے ہیں جو فطرتاً بھاگنے والے ہیں' اڑنے والے ہیں' انسانوں سے دور جانے والے ہیں' ابراہیم! ان کو سدھایا جائے تو ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ یہ تو بہرحال انسان ہیں جن سے تمہارا واسطہ ہے اور انسان تو اُنس سے نکلا ہے' محبت تو ان کے دل کے اندر ہوتی ہے۔ یہ مل جل کر رہنے والے ہوتے ہیں' یہ مانوس ہو سکتے ہیں لیکن یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے' انسان اس چیز سے تنگ پڑ جاتا ہے۔ اور یہ ٹھیک ہے کہ یہ واقعی بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے لیکن اس کا طریقہ یہی ہے۔

کسی تعمیری انقلاب کے لیے داعیٔ انقلاب کا مشفق ہونا شرطِ اوّل ہے

یہ جو چیز ہے کہ من مار کے' محبت سے' ان کو سدھایا جائے' مانوس کیا جائے' ان کی تربیت کی جائے' ان کی تعلیم ایسی کی جائے' یہ ہے

انقلاب برپا کرنے والے کا طریقہ۔ فساد برپا کرنے والا تو ایک آواز سے ان کو لے جاتا ہے' دوسرے ہی دن وہ اُس سے بھاگ گئے ہوتے ہیں' اگر بھاگ نہیں گئے ہوتے تو وہی اُس کی جان لے لیتے ہیں۔ یہ مانوس پرندے نہیں ہوتے۔ اس قسم کے جانور شیر اور بھیڑیئے اکٹھے کر کے فساد تو برپا کیا جاسکتا ہے لیکن انقلاب تو قلب سے ہے' اس میں تو قلبی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جو چیز ہے' یہ ہوتی ہے نبی کی یا رسول یا پیغامبر کے انقلاب لانے کے مرحلے کی۔ اُس میں پہلی منزل یہ ہوتی ہے کہ ان کی اس طرح تعلیم اور تربیت کی جائے کہ یہ تمہارے ساتھ اس قدر مانوس ہو جائیں کہ پھر تم انہیں میدانِ جنگ میں جان دینے کے لیے اشارہ بھی کرو تو بھاگتے ہوئے تمہارے پاس آئیں۔ اور اِس کے لیے خود اس داعیٔ انقلاب کا نہایت مشفق باپ ہونا' محبت والا ایک رفیق ہونا' بڑا ضروری ہے۔ یہی چیز ہے جس کے لیے قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ ایک چیز کہی کہ **فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ** (3:159) اے رسول! یہ خدا کی رحمت تھی' اِسے خدا نے اپنی طرف سے رحمت کہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ رحمت کا لفظ تو انتہا درجے کی لوچ اور لچک اور محبت کے لیے آتا ہے۔ کہا کہ یہ خدا کی رحمت تھی کہ **لِنْتَ لَهُمْ** (3:159) تُو اتنا محبت والا واقع ہوا ہے' اتنا مشفق باپ واقع ہوا ہے' اتنا رقیق القلب واقع ہوا ہے۔ یہ خدا کی رحمت ہے' اُس کی رحمت کا صدقہ ہے کہ یہ واقع ہوا ہے۔ **وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ** (3:159) اگر تُو کہیں سخت دل ہوتا' شقی القلب ہوتا' خودغرض ہوتا' تو ان میں سے ایک بھی تمہارے پاس نہ رہتا اور سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاتے۔ یہ خدا کی رحمت تھی۔ رحمتِ خداوندی یہ ہے کہ **لِنْتَ لَهُمْ** اُس کو بڑا محبت بھرا دل رکھنا چاہیے۔ یہاں یہ جو لفظ فظّا کہا ہے تو اس میں Selfishness (خودغرضی) کی انتہا ہے۔

لفظ فظاً کا قرآنی مفہوم

عرب صحراؤں میں سفر کیا کرتے تھے' اونٹ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اونٹ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ صحیح ہے کہ وہ ایک دفعہ بہت پانی پی لیتا ہے اور پھر اپنے اندر اُس پانی کو جمع رکھتا ہے' پھر آٹھ آٹھ دن وہ ریگستان میں سفر کرتا ہے۔ اگر پانی نہیں ملتا تو وہ اپنے اِس اسٹور میں سے تھوڑا تھوڑا پانی لیتا جاتا ہے۔ یہ جو کاروان ہے' اُس کا تو کام یہ ہے کہ کہیں سے اُس کے لیے اور پانی تلاش کرے تا کہ اُس کے اسٹور میں کمی نہ ہونے پائے۔ کارواں کا اس قسم کا خودغرض' سنگ دل سالار بھی ہوتا تھا کہ جب خود پیاس کی شدت سے تڑپتا تھا تو اونٹ کا پیٹ چاک کر کے اُس میں سے پانی نکال کر پی لیتا تھا۔ عرب اسے خودغرضی (Selfishness) کی انتہا کہتے تھے کہ ایسا ساتھی جو اپنی پیاس کے لیے اُس کا پیٹ چاک کر کے اُس میں پانی نکال کے پی جائے۔ اِسے عربی زبان میں فظّا کہتے تھے۔

عزیزانِ من! جنہیں ہم نے دیکھا ہے' جو ہمارے ہاں کے ہنگامے برپا کرنے والے کارواں کے سالار ہوتے ہیں' اُن میں سے

ہر ایک **فظًا غلیظ القلب** ہوتا ہے۔ اُس کی نگاہ اُس پہ ہوتی ہے کہ اس کے پاس اسٹور میں کتنا پانی جمع ہے۔ جب بھی اُسے پیاس ستاتی ہے تو وہ جو قریب ترین ہوتا ہے اُس کا پیٹ چاک کر کے وہاں سے پانی نکال کے پینے کی کرتا ہے۔ انقلاب برپا کرنے والا تو خود تنگی ترشی میں گزارا کرتا ہے اور اپنی ضرورت کے اوپر ان کی ضروریات کو ترجیح دیتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ خود غرض نہیں ہوتا اور اتنی سی بات ہی نہیں ہے کیونکہ یہ تو صرف Negative (منفی) پہلو ہے کہ اُن کا چھینتا نہیں ہے۔ Positive (مثبت) ہونا دوسری بات ہے۔ کہا کہ اگر تُو تنگ دل، خود غرض ہوتا تو یہ سب تیرے پاس سے بھاگ جاتے۔ **فَاعْفُ عَنْهُمْ** (3:159) ان سے چھوٹی موٹی لغزشیں بھی ہو جائیں گی، کوئی بات نہیں، ایسا ہو جائے تو درگزر کر دیا کرو۔ ایک خوبی حلیم ہونا بتائی گئی ہے۔ یہ خدا کے متعلق بھی ہے، رسولوں کے متعلق بھی ہے، حضرتِ ابراہیمؑ کے متعلق بھی ہے، رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی ہے۔

عربوں کے ہاں حلیم کا مفہوم

میں پہلے عرض کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں تو حلیم کا مطلب کبھی سمجھ میں آیا کرتا تھا: ''اوتراویاں اچ جیہڑا ایکا ندے ہوندے سن [1]''۔ اب خدا اور رسول کے متعلق یہ کہنا کہ وہ حلیم ہے، یہ تو بات نہیں ہے۔ خدا تو شدید العقاب بھی ہے۔ یہ صرف حلیم کی طرح ہو جائے جیسا ہمارے ہاں کا حلیم ہوتا ہے تو پھر ''ہو جا ککھ مسیت دا'' پھر تو جس کا جی چاہے اُس کو پاؤں کے نیچے روندتا ہوا چلا جائے۔ یہ بات نہیں ہے۔ ان عربوں کے ہاں سے معنی سمجھنے چاہئیں۔ جو کمزور قسم کا مویشی یا جانور ہوتا ہے تو چونکہ اُس میں Inferiority Complex (احساسِ کمتری) ہوتا ہے، اگر اُس کے پاس سے بھی کوئی گزرے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے مارنے آیا ہے اور مجھے خطرہ ہے تو وہ اُس کو سینگ مار دیتا ہے۔ اور اگر اُس میں پوری بھرپور توانائی ہو، Self Confidence (خود اعتمادی) ہو تو ایسا اونٹ جس کی یہ کیفیت ہو کہ بھرپور جوانیوں میں خود اعتمادی کے اندر بیٹھا ہوا مست ہو تو ایک بچہ آیا اور اُس کی گردن پہ سوار ہو گیا، دوسرا آیا اور اُس نے اُس کا کان پکڑ لیا، تیسرا اُس کی کمر کے اوپر آ گیا، یہ سب کچھ کرتے ہیں اور وہ مزے میں بیٹھا جگالی کرتا چلا جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہ بچے ہیں اور چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرتے ہیں، وہ ان چیزوں سے بھڑک نہیں اُٹھتا۔ اسے عرب حلیم کہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سی کوتاہیاں، چھوٹی چھوٹی سی لغزشیں تو ہو جاتی ہیں۔ وہ ان کوتاہیوں پہ بھڑک نہیں اٹھتا تھا کہ تیری ایسی کی تیسی! رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ **فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ** (3:159) ایسا انتظام کر کہ یہ چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں سے جو کچھ تھوڑا بہت نقصان ہو سکتا ہے، تو اُس نقصان سے حفاظت ہو جائے۔ بس ان کی حفاظت کا یہ انتظام کرتا رہا کر۔

---

[1] وہ جو زمانہ تراویح میں (حلیم) پکایا کرتے تھے۔

اسوۂ حسنہ کی ایک اور مثال

عزیزانِ من! حفاظت کا انتظام کس طرح سے ہے؟ قرآن کی کیا تشبیہیں ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ کبھی تم نے دیکھا ہے کہ یہ مرغی اپنے چھوٹے چھوٹے چوزوں کو لیے ہوئے کُٹ کُٹ کرتی ہوئی ان کو دانہ وانہ کھلاتی پھرتی ہے۔ اگر کہیں وہ دیکھتی ہے کہ چیل کا سایہ بھی آ کر پڑا تو وہ چوزے بھی ماں کی طرف بھاگتے ہیں اور یہ پر پھیلا کے ان کو اپنے اندر لے لیتی ہے۔ یہ جو انداز ہوتا ہے، قرآن نے کہا ہے کہ ایک انقلاب لانے والے یا تربیت کرنے والے رسول کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ **وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ** (26:215) یہ جو چھوٹے چھوٹے چوزے ہیں، ان کو کہیں خطرہ ہو تو اپنے پر پھیلا کر مرغی کی طرح ان کو اپنے پروں کے نیچے لے لیا کر۔

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسوۂ حسنہ پیش ہو رہا ہے اور انقلاب کی طرف دعوت دینے والے کی کیا زندگی ہے! ٹھیک ہے کہ اُس کو سخت بھی ہونا پڑتا ہے۔ قرآنِ کریم نے **مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ** (48:29) کہا ہے۔ خدا رسول اللہ اور آپؐ کے ساتھیوں پر کس طرح تحسین و آفریں کہہ رہا ہے کہ دیکھو! محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کی کیا کیفیت ہے کہ مخالفین آتے ہیں تو ان کے سامنے چٹان کی طرح سخت ہو جاتے ہیں، آپس میں ملتے ہیں تو ریشم کی طرح نرم ہو جاتے ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جُوئے نغمہ خواں ہوجا

(اقبالؒ: بانگ درا)

کہا کہ نبی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مخالفین آئے ہیں تو چٹان کی طرح سخت ہو۔ اور یہ جو تیرے ساتھی ہیں، ان کو اگر کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو جیسے مرغی اپنے چوزوں کو اپنے پروں کے نیچے لیتی ہے، اس طرح سے ان کی حفاظت کیا کر۔ **فَاعۡفُ عَنۡہُمۡ** (3:159) کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ایسی چھوٹی سی بات کو دیکھ کر ایسے گزر جانا کہ جیسے میں نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ ان کی ان لغزشوں سے کوئی تھوڑا تھوڑا نقصان تو پہنچ جاتا ہے اس لیے تُو ان کا انتظام کرتا رہ کہ اُس سے حفاظت ہوتی چلی جائے۔ اُس نے بتایا کہ سیات سے جو نقصان ہوتا ہے تو اُس کی تلافی

کا طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ حسنات کرو یعنی زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کرتا چلا جا۔ پھر اس قسم کی چیز تمہارے ساتھ ہوگی کہ **شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** (3:159) پھر ان سے کام میں مشورہ کیا کر۔ ٹھیک ہے تُو نبی ہے، تو رسول ہے، یہ تجھ پہ ایمان بھی لائے ہیں، تمہاری ہر بات کی تعمیل بھی انہوں نے کرنی ہے، اطاعت بھی انہوں نے کرنی ہے۔ تو اب یہ نہیں ہے کہ تُو ڈکٹیٹر بن جا۔

عزیزانِ من! رسول کو حکم دیا جاتا ہے کہ **شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** (3:159) ان کے ساتھ مشورہ کیا کر۔ ان رفقا کے قلب کی حالت سوچیے کہ جب اُن سے کہا جائے کہ آپ تو میری مجلسِ مشاورت کے ممبر ہیں، رسول کے مشیر ہیں۔

شاید کہ خود را باز آفرینی!

یہ باز آفرینی تھی رسول کی۔ یہ تھی مُردوں کی بستی کہ جس میں اُنہوں نے زندگی پیدا کی تھی۔ اس قسم کے انسان پیدا کیے کہ حکم ہوتا ہے کہ ان سے مشاورت کیا کر، ان کو اپنے مشیر بنا۔ کہا کہ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو **لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ** (3:159) کوئی تیرا ساتھ نہ دیتا، تم کو چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ یہی چیز ہے جس کے متعلق اُس [1] نے کہا ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے؟ کہتا ہے کہ ہوا یہ ہے کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خُوئے دل نوازی

''دل نوازی'' کیا خوب لفظ ہے یہاں! کیا بات تھی اُس [1] شخص کی! کہا کہ اگر یہی اسلام ہے تو پھر صاحب! اس کے اندر رکھا کیا ہے۔ وہ جماعت کو چھوڑ کے الگ ہو گیا، کوئی پارٹی سے استعفٰی دے رہا ہے، کوئی اپنی الگ پارٹی بنا رہا ہے، کوئی سرے سے نبوت سے ہی انکار کر رہا ہے۔ اور بات اتنی سی تھی:

کہ امیرِ کارواں میں نہیں خُوئے دل نوازی

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

قائداعظم دلنوازی اور دور اندیشی کی پیکر شخصیت تھے

عزیزانِ من! راہی کو کبھی کھوئی ہوئی منزل بھی یاد آ جاتی ہے۔ میں کیا کہوں کہ میں نے تو جو منزلیں دیکھی ہیں، وہ دلنوازیاں بھی میں نے دیکھی ہیں کہ کس کس قسم کی تھیں۔ ذہنوں میں قائدِ اعظمؒ [2] کے متعلق یہ ہے کہ وہ بڑا ڈکٹیٹر تھا، ہر وقت پیشانی پہ تیوری رہتی تھی۔ یہ اُن

---

[1] یہ اشارہ مفکرِ قرآن، ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

[2] قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948)

کے متعلق بڑا غلط تصور ہے ۔ اُن کی کیفیت یہ تھی کہ شاید پٹنہ کا سیشن تھا' تو اُس کے اندر یہ(ابوالحسن) اصفہانی ' (مرزا) (1902-1981) تھے اور ان کے ساتھ کوئی دوسرے دوست تھے۔ اُنہیں اُس سیشن کے لیے President (صدر) چنا گیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ کے ہاں یہ ٹھہرے ہوئے تھے اور یہ اکٹھے ہی چلے آ رہے تھے۔ آپ سوچیے کہ اُس دور کے جو قائدِ اعظمؒ تھے وہ جلسے میں چلے آ رہے تھے۔ یہ دونوں ساتھ تھے اور یہ ان کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ اصفہانی کو جلسے کو Preside (صدارت) کرنے کے لیے انتخاب کیا گیا تھا اور وہ جو دوسرے تھے وہ اسٹیج سیکرٹری کی پوزیشن پر تھے۔ جب جلسے کے قریب آئے تو قائدِ اعظمؒ پیچھے ہٹ گئے اور ان دونوں کو یوں ہاتھ میں لے کر آگے کر دیا۔ کہنے لگے کہ جلسے کے صدر تم ہو' میں تو سامعین میں سے ہوں۔ اور اس انداز سے وہ آ رہے ہیں کہ آگے آگے یہ آ رہے ہیں اور وہ پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں اور اصفہانی [1] کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ آپؒ کیا کر رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ بالکل نہیں' یہ مقام تمہارا ہی ہے' میرا مقام آج یہ نہیں ہے۔ وہ پیچھے چلے اور انہیں آگے چلایا۔ اسے کہتے ہیں خوئے دلنوازی۔ آج کمیٹیاں بٹھائی جاتی ہیں کہ اتنی بڑی کامیابی کس طرح سے ہوگئی تھی۔ قائدِ اعظمؒ کو صحیح طور پہ ان لوگوں نے سامنے آنے ہی نہیں دیا۔ یاد ہے کہ وہ ایک فوجی نوجوان تھا' اُس نے آ کر یہ چیز کہی تھی کہ جو پاکستان بن رہا ہے' اس کی اکنامک (Economic) پوزیشن کیا ہوگی؟ معاشی حالت کیا ہوگی؟ کیا یہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو سکے گا؟ آپؒ نے کہا کہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہو سکے گا۔ پھر آپؒ نے اس سے پوچھا کہ برخوردار! تم اس کے متعلق کیا کہتے ہو؟ کہنے لگا: جی ہاں ہو سکے گا۔ آپؒ نے کہا کہ تمہارے پاس اس کے لیے کیا دلیل ہے؟ اُس نے کہا کہ جی! آپؒ نے جو فرمایا ہے۔ اس پر غصے سے آپؒ کا چہرہ تمتما اٹھا' کہنے لگے کہ عزیز! اس وقت تو میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ اگر پاکستان بن گیا اور تم سروس میں ہوئے تو سب سے پہلے میں تمہیں سروس سے نکال دونگا۔ جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دلیل یہ دیتا ہے کہ میں نے یہ کہہ دیا ہے تو وہ ڈکٹیٹروں کے پیچھے چلے گا وہ اپنی رائے نہیں رکھتا۔ یہ ہوتے ہیں جن کے پیچھے قوم ہوتی ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ ابراہیمؑ نے یہ بات کہی کہ میرا ایمان ہے کہ تُو کر سکتا ہے' یہ ہوسکتا ہے لیکن میں وہ طریقہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اور یہ اس لیے کہ لِّيَطۡمَئِنَّ قَلۡبِىۡ (2:260) ۔ روایات میں لمبی چوڑی بحثیں کرتے ہوئے ایک مفسر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اصل میں "قلبی" ان کے ایک دوست کا نام تھا تو کہا تھا کہ مجھے تو یقین ہے لیکن وہ نہیں مانتا۔ عزیزانِ من! ایمان تو اس چیز کا نام ہے کہ یہ ٹھیک ہے' قادرِ مطلق ہے' وہ سب کچھ کر سکتا ہے لیکن جب مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس مُردہ قوم کو تم نے حیاتِ تازہ عطا کرنا ہے تو مجھے اس کا اطمینان چاہیے کہ وہ طریقہ کونسا اختیار کروں جس سے حیاتِ تازہ عطا ہو جائے۔ اس اطمینان کے بغیر نبی بھی قدم نہیں اٹھاتا۔ اور آپ کو تو معلوم ہے کہ

---

[1] انہیں ایم اے ایچ اصفہانی (1902-1981ء) بھی کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین کے متعلق کیا کہا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ ہے کہ ہم نے ایمان کا ترجمہ Faith کرلیا اور Faith کے معنی ہیں کہ'' Blindly (بغیر سوچے سمجھے) کسی بات کو مان لینا یا تسلیم کرلینا' چوں چراں نہ کرنا' اور کوئی بات نہ پوچھنا' اور کوئی بات بس سر جھکا دینا اور مان لینا''۔ قرآن کہتا ہے کہ مومن وہ ہیں کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ (25:73) اور تو اور خدا کی آیات بھی اگر اُن کے سامنے پیش کی جائیں تو لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (25:73) وہ اُن کے سامنے بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں جھکتے۔

عزیزانِ من! حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں کہ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ (2:260) اطمینان چاہتا ہوں۔ جو ایمان اس طرح سے حاصل ہوتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی قوت اُس میں شبہ اور شک پیدا نہیں کرسکتی۔ یہ شک اور شبہ پیدا کرنے والی چیزیں تو دلیل وفکر اور عقل و شعور کی یہی چیزیں تھیں۔ جب آپ نے ان کو مطمئن کرلیا تو پھر کونسی بات آپ کو اپنے ایمان سے ہلا سکے گی۔ ایمان سے تو آدمی اُس وقت ہلتا ہے جب وہ ان کے بغیر کسی چیز کو مانے اور اس پر آکر کوئی دلیل دے اور اُس دلیل کے بعد کچھ سوچے ہی نہیں۔ اُس کے بعد دل میں تذبذب پیدا ہوگا۔ اور جب دلائل کی رو سے ایمان لایا ہوا ہے تو پھر کونسی چیز ہے جو اِس کو اس ایمان سے ہٹا سکے گی یا اس میں لغزش پیدا کرسکے گی۔ ابراہیم ◆ نے یہی کہا تھا کہ میرا ایمان ہے کہ تُو کرسکتا ہے لیکن میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ کیا طریق ہے جس سے یہ ہوگا۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ یہ خدا ہے جس کے متعلق یہ ہے کہ وہ اتنا بڑا ڈکٹیٹر ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں اطمینان چاہتا ہوں تو خدا نے یہ نہیں کہا کہ ابراہیم ◆! تم کیا کہتے ہو؟ جب ایمان ہے تو اُس کے بعد کیوں اطمینان چاہتے ہو اور کیوں ہم سے یہ پوچھتے ہو؟

ذاتِ خداوندی بھی بغیر اطمینان کرائے ایمان لانے کا تقاضا نہیں کرتی

عزیزانِ من! ابراہیم ◆ جیسا نبی کہنے والا ہے کہ اطمینان چاہتا ہوں اور خدا جیسے قادرِ مطلق نے کہا ہے کہ میں تمہارا اطمینان کر دیتا ہوں۔ یہ ہے قرآن کا خدا کہ وہ اطمینان کرائے بغیر اپنی بات نہیں منواتا۔ یہ ہے قرآن کا مومن کہ اطمینان حاصل نہیں ہوتا تو وہ کہتا ہے کہ میرا ایمان پختہ نہیں ہوسکتا۔ یہ اطمینان مانگتا ہے اور وہ اطمینان کراتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ان زندگیوں کو آپ کے لیے اسوۂ حسنہ کیوں کہا گیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان کی زندگی سے ہمیں قدم قدم پر راہنمائی ملتی چلی جارہی ہے بشرطیکہ اُسی کے دیئے ہوئے ماڈل کو سامنے رکھ کر آدمی دیکھے۔ یہ تھی چیز جو کہا تھا کہ دیکھتے ہو کہ نامانوس پرندوں کو کس طرح سے مانوس کیا جاتا ہے' کس طرح سدھایا جاتا ہے۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے' یہ مرحلہ بڑی استقامت چاہتا ہے۔ کہا کہ یہ کچھ کرنا ہوگا۔ اس طرح سے یہ کچھ کرو۔ پھر اقبالؒ (1877-1938) یاد آ گیا' کیا تشبیہہ دیتا ہے!

اگر یک قطرہ خوں داری

اگر جسم کے اندر سے خون بالکل ختم ہو گیا ہو تو پھر آدمی مردہ ہو جاتا ہے۔

اگر یک قطرہ خوں داری، اگر مشتِ پرے داری

جن میں زندہ رہنے کا یا زندگی کا امکان ہو یا تھوڑی سی چنگاری ہی کیوں نہ ہو اور پھر اگر اڑنے کے لیے بال و پر ہیں تو:

بیا من با تو آموزم طریقِ شہبازی را

تمہیں اڑنا ہی نہیں سکھاؤں گا بلکہ شہباز بننا سکھاؤں گا' تم دوسروں کو دبوچ لو گے۔ اگر ایک قطرہ بھی خون کا ہے' ارے اتنا سا بھی اگر تیرے پاس خون ہے تو آ' میں تجھے طریقِ شہبازی سکھاتا ہوں۔

عزیزانِ من! پیغامبرِ انقلاب یہ کچھ کرتا ہے۔ وہ اُنہیں تلاش کرتا ہے جن کے سینے میں ایک قطرہ ہی خون ہو۔ بس اُس کے بعد پھر وہ اس طرح سے ان کو سکھاتا ہے کہ یہ جو ممولے ہیں شہباز سے لڑ جاتے ہیں۔ یہ ہے یہ (2:260) آیہ جلیلہ کہ جسے حضرتِ ابراہیمؑ کی زندگی میں اسوہ قرار دیا ہے اور جس کے غلط ترجمے اور روایات نے کیا سے کیا بنا کے رکھ دیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ یہ کر کے دیکھو۔ اور اُس کے بعد کہا کہ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (2:260)۔ یہ دو چیزیں بڑی ضروری ہیں: خدا کے متعلق یہ چیز کہ وہ اتنا غلبہ اور قوت اور اقتدار رکھتا ہے کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے لیکن اُس کے ساتھ حکیم ہے کہ یہ سارا کچھ ایک حکمت سے کرنا ہوتا ہے' Rationally کرنا ہوتا ہے' تدبیر سے کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ابراہیم ◆! تجھے "عزیز" بھی ہونا پڑے گا اور تجھے "حکیم" بھی ہونا پڑے گا۔ سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ ہے' ایثار ہے' جانفشانی ہے' ہر وقت ذہن کے اندر یہ چیز سمائی ہوئی ہے کہ اُس کے راستے میں ہر چیز قربان کر دینا ہے۔

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے واقعہ کی حقیقت

اب وہ واقعہ آ جاتا ہے جسے حضرتِ اسماعیل ◆ کی قربانی کہا جاتا ہے۔ اور اِس کے غلط مفاہیم نے بھی بڑے بڑے شکوک و شبہات کی اور توہم پرستی کی باتیں ذہنوں میں پیدا کر دی ہیں۔ پہلی چیز اس میں یہ سمجھ لیجیے کہ خدا نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر لو۔ پہلے میں اس بیٹے کی بات تو سنا دوں۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرتِ ابراہیم ◆ کو ابھی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ بڑھاپے میں' کبر سنی میں' حضرتِ اسماعیل ◆ پیدا ہوئے اور پھر اُس کے بعد حضرتِ اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ آپ سوچیے کہ ان بچوں کی کس طرح کی تربیت ہوئی ہوگی! یہ بچے بھی کس قدر پیارے ہونگے!

حضرت ابراہیم ◆ کا ورثہ

حضرت ابراہیم ◆ کی جتنی بھی تعلیم تھی، اسی کو تو پیغمبر کا ورثہ کہتے ہیں۔ وہ جائیدادیں نہیں بناتا، جائیدادیں چھوڑ کر نہیں مرتا۔ وہ تو صحیح تربیت یافتہ اولاد کو، ذریت کو، مومنین کو اور جماعتوں کو چھوڑتا ہے۔ یہی اُس کی وراثت ہوتی ہے۔ اپنے بیٹوں کو اِس طرح اُنہوں نے تربیت دی اور وہ جو فدویت کا جذبہ تھا کہ ہر چیز خدا کے راستے میں قربان کرنی چاہیے اور اُس دور کے اندر یہ چیز عام بھی تھی کہ جو پہلوٹھے ہوتے تھے یعنی جو پہلے پیدا ہوئے ہوتے تھے تو اُن کو خدا کے نام پر قربان کر دیتے تھے۔ یہ پہلا بچہ مویشیوں کا بھی دیتے تھے، یہ فصل کی چیزیں، مویشیوں کا پہلا دودھ تو اب بھی ہمارے ہاں گاؤں میں ہوا کرتا تھا اور یہ سب کچھ دیتے تھے۔

عزیزانِ من! اس سے پہلے تو یہ دے دینے والی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ہمارے دور میں Dreams (خوابوں) کے متعلق Psychologists (ماہرینِ نفسیات) نے بڑی تحقیق کی ہے۔ اُنہوں نے یہ بتایا ہے کہ انسان کی ایسی خواہشیں اور ایسی آرزوئیں ہیں جو مستقل طور پر دل میں تو ابھرتی رہیں لیکن وہ محسوس شکل میں باہر نہ آئیں تو وہ انسان کے Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کے اسٹور ہاؤس کے اندر جا کر دفن ہو جاتی ہیں۔ اور جب آدمی سوتا ہے تو اُس کا جو شعور ہوتا ہے وہ معطل (Suspend) ہو جاتا ہے۔ جب وہ Suspend (معطل) ہوتا ہے تو لاشعور کو اوپر آنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ جو دبی ہوئی حسرتیں ہیں، ناتمام آرزوئیں اور خواہشیں جو دل کے اندر ہوتی ہیں، وہ اس طرح سے اُس کے ذہن کے اندر آتی ہیں اور خواب بن کر وہ نظر آتا ہے کہ جیسے سینما کی فلم دکھائی جا رہی ہو لیکن اُس میں ربط نہیں ہوتا۔ وہ ایسے ہے کہ جیسے سینما کی کسی فلم کو کاٹ کر اُس کو گڈمڈ کر دیا اور ان میں سے کوئی کوئی ٹکڑے سامنے لگائے جائیں۔ اُس میں آپ دیکھیں گے کہ ابھی گھوڑا آ جاتا ہے، ابھی سمندر آ جاتا ہے، پھر آسمان آ جاتا ہے، پھر بادشاہ آ جاتا ہے۔ یہ ملے جلے ہوئے ٹکڑے ہوتے ہیں اسی لیے اُس میں ربط نہیں ہوتا لیکن ہوتی یہی چیز ہے۔

قرآنِ کریم میں ہے کہ یہ بیٹا سب سے زیادہ پیارا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں فدویت کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ اور اِسے ذہن میں رکھیے کہ قرآنِ کریم نے انبیائے کرام کو بھی بشر مثلکم کہا ہے کہ وحی تو خدا کی طرف سے آتی ہے لیکن باقی چیزیں یعنی یہ جذبات وغیرہ، یہ انسانی ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتے، جذبات سے عاری نہیں ہوتے۔ اپنے چھوٹے سے بچے کی وفات پر رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے۔ جب اُس بدو نے کہا کہ حضورؐ! آپ کا دل بہت کمزور واقع ہوا ہے، میں نے تو اپنے ہاتھوں اپنی کتنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیا، میری آنکھ میں تو ذرا سی نمی تک بھی نہیں آئی، حضور ﷺ نے کہا کہ اگر تیرے دل میں دل کی جگہ برف کی قاش رکھی ہوئی ہو تو میں اُس کا کیا علاج کروں۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں

ان کے سینوں کے اندر بھی دل ہوتا ہے جو درد سے بھر آتا ہے۔ یہ جو چیز تھی کہ اُس کے راستے کے اندر میری عزیز ترین متاع کو قربان کرنا چاہیے، یہ جذبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں بڑی شدت اختیار کر گیا۔ قرآن نے کہا ہے کہ **فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ** (37:102) بیٹے سے کہا کہ رات کو میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، قربان کر رہا ہوں۔ باپ ہوا ابراہیمؑ، بیٹا ہوا اسماعیلؑ تو کہا کہ **فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی** بیٹا! کہو تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میری تو یہی صورت ہے کہ اگر یہ چیز خدا کی طرف سے ہے تو میں تو تیار ہوں، لیکن ذبح تو تم نے ہونا ہے۔ بیٹے کا جواب یہ ہے کہ **قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ** (37:102) اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ واقعی خدا کا ہی حکم ہے تو میں کون ہوں انکار کرنے والا، ٹھیک ہے پھر میں اس کے لیے تیار ہوں۔ **سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ** (37:102) تم دیکھو گے کہ میں کبھی نہیں گھبراؤں گا، کبھی نہیں تڑپوں گا، مجھ پہ اضطراب نہیں پیدا ہوگا، استقامت سے یہ سب کچھ برداشت کروں گا۔ یہ تھا اُس بیٹے کا جواب۔ اقبالؒ (1938-1877) نے کہا ہے:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

لیکن یہ نہ تو فیضانِ نظر تھا۔ فیضانِ نظر تو آپ سمجھتے ہیں کہ وہ تصوف کی اصطلاح ہے کہ حضرت صاحب نے یوں آنکھ میں آنکھ ملائی اور کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اور نہ ہی یہ مکتب کی کرامت تھی، وہ مکتب میں تو پہنچے ہی نہیں تھے۔ یہ ابراہیم ◆ جیسے باپ کی تربیت کا اثر تھا کہ اسماعیلؑ جیسا بیٹا یہ جواب دے رہا ہے۔ کہا کہ وہ سچ مچ ہی خواب کو سچا سمجھ کر ابراہیم ◆ تو اس پہ آمادہ ہی ہوگیا۔ یوں کہیے کہ خدا دیکھتا رہا کہ یہ کہاں تک جاتا ہے۔ وہ چلا گیا اور **فَلَمَّاۤ اَسۡلَمَا وَتَلَّہٗ لِلۡجَبِیۡنِ** (37:103) باپ اور بیٹے دونوں نے اس خواب کو خدا کا حکم سمجھ کر اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور باپ نے بیٹے کو ایک اونچی جگہ، کن پٹی کے بل لٹا دیا۔ **وَنَادَیۡنٰہُ اَنۡ یّٰۤاِبۡرٰہِیۡمُ - قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡیَا** (37:104-05) او! وہ تو خواب کی بات تھی اور تُو سچ مچ ہی کر رہا ہے۔ چونکہ زندگی صحیح خدائی اقدار کے مطابق بسر ہو رہی تھی، **اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ** (37:105) جن کی زندگی کے اندر حسن کارانہ اعتدال ہوتا ہے تو ان کو اتنے جذبات کی شدت میں بھی کہا جاتا ہے کہ رک جاؤ تو وہ یہ نہیں کہتے کہ میں چھری چلا ہی دوں گا۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ کہا کہ **اِنَّ ہٰذَا لَہُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِیۡنُ** (37:106) اور یہ بہت بڑی گردش کی بات تھی، بہت بڑی آزمائش کی بات تھی جو تم نے یہ کر دکھایا۔ یہ بالکل نہیں ہے، یہ تو سوال ہی نہیں ہے کہ انسان کی قربانی دی جائے۔ آگے ہے کہ **وَفَدَیۡنٰہُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ** (37:107)۔ اور یہاں پہنچ کر اب پھر مجھے وہی روایات کی طرف آنا چاہیے۔

قربانی کے سلسلے میں تورات کا بیان کردہ قصہ

ہماری یہ روایات تورات پر منحصر ہیں' بائبل (Bible) میں جو کچھ لکھا ہوا ہے' وہاں سے اُنہوں نے یہ کچھ لیا ہوا ہے۔ وہاں یہ بات ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے بیٹے کو لٹا دیا اور اپنی آنکھوں پہ پٹی باندھ لی۔ اور کہا کہ بیٹے کو دیکھ کے میرا ہاتھ نہ کانپ جائے۔ یعنی یہاں تک وہ لے آئے اور ہاتھ میں چھری بھی ہے اور آنکھوں پہ پٹی باندھ لی۔ بہر حال یہ تورات کا افسانہ تھا۔ اور پھر آپ نے چھری بھی چلا دی اور اُس کے بعد جب آنکھوں سے پٹی کھولی تو دیکھا کہ بیٹا تو اُسی طرح سے ہنستا مسکرا رہا ہے اور ایک دنبہ ہے جو ذبح ہو گیا ہوا ہے۔ سواد آیا افسانے کا۔ ہمارے ہاں یہ چیز ہے کہ بہر حال وہ ذبح نہیں ہوا تھا۔ جب آپؑ نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایک دنبہ تھا اور اُس کے سینگ جھاڑیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ یعنی وہ بھاگنا چاہتا تھا لیکن انتظام ایسا کر دیا کہ وہ جھاڑی میں پھنس گیا۔ حضرتِ ابراہیمؑ نے اُس کو پکڑ لیا۔ کہا کہ دنبہ آ گیا۔ کہنے لگے کہ وہ جبریل نے جنت سے اُسی مقصد کے لیے شروع سے دس ہزار سال سے پالنا شروع کیا تھا۔ یہ تورات کے افسانے ہمارے ہاں روایتوں میں آ گئے۔ اور وہاں سے یہ آپ کے ہاں جو قربانی ہے' یہ آ گئی اور یہ سنتِ ابراہیمیؑ ہو گئی۔ یہ سند ہے۔ بھئی! اگر وہ سنت ہے تو آخری حصے میں سے کیوں شروع کرتے ہو۔ سنتِ ابراہیمیؑ تو یہ ہے کہ بیٹے کو لٹا کے اُس پہ چھری چلاؤ۔ خدا دنبہ بھیجے تو وہ ذبح ہو جائے گا ورنہ بیٹا ذبح ہو جائے گا۔

عزیزانِ من! ایک نبی کا اسوۂ حسنہ پیش ہو رہا ہے اور کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ بہر حال قرآن نے کہا کہ ابراہیمؑ! تم نے واقعی اسماعیلؑ کو ہماری راہ میں قربان کرنا چاہا تھا۔ یہ قربانی ایک منٹ میں ختم ہو جاتی تھی۔ ہم نے اس کو بچا لیا کہ ہم نے اس کو بڑی بھاری لمبی قربانی کے لیے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ ابراہیمؑ! اس بچے کی بڑی لمبی قربانی چاہیے' یہی ختم ہو جانے والی قربانی نہیں۔ اور وہ قربانی یہ ہے کہ شام اور فلسطین کے اس قدر سبزہ زار زمینوں' ملکِ عظیم کی بادشاہت' اس قدر حشمت و دولت' وقار' یہ ساری اسماعیل کے حصے میں آنی تھیں۔ کہا کہ تم نے اس کو ہمارے لیے وقف کیا تھا تو ابراہیمؑ! ہم تمہاری قربانی کو قبول کرتے ہیں۔ جاؤ اس کو عرب کے ریگستان میں لے جاؤ جہاں وادیٔ غیر ذی زرع ہے' جہاں کوئی کونپل تک نہیں پھوٹتی۔ جاؤ وہاں جا کے اس کو بساؤ اور وہاں ہمارا گھر بناؤ اور اُس کی تولیت و نگہداشت کرو۔ اسماعیل ◆! تم بھی کرو اور آگے تمہاری اولاد بھی کرے۔ وادیٔ غیر ذی زرع کے اندر ایک گھر بنا کر اُس گھر کی تولیت اور حفاظت کرو۔ کیوں ابراہیم ◆! یہ قربانی ہے یا وہ جو تم دے رہے تھے! اسماعیلؑ کو ہی قربان نہیں کر دیا بلکہ ذریتِ اسماعیلی کو بھی قربان کر دیا۔ اُس کے بعد پوری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ جسے بنی اسرائیل کہتے ہیں وہ مملکت حضرتِ اسحاقؑ کے حصے میں آئی۔ ان کی جو اولاد تھی وہ بنی اسرائیل تھی۔ وہ سب وہاں بادشاہتیں کرتے تھے۔

حضرت اسماعیل ◆ اور اُن کے بعد ان کی نسل در نسل قربانی

حضرت اسماعیل ◆ اس وادئ غیر ذی زرع کے اندر آ کر بسا اور اُن کی اولاد بھی یہاں آ کر بسی۔ کل تک جب تک یہ تیل نہیں نکلا تھا تو یہ سارے کے سارے بیچارے کھجوروں کی گٹھلیوں پہ گزارا کرتے تھے۔ یہ ہے ذبح عظیم۔ کہا کہ **وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ** (37:108) یہ ہے وہ مثال جس کو ہم نے آنے والی نسلوں تک رکھا کہ یہ دیکھیے' قربانی اس کو کہتے ہیں۔ اس طرح **سَلٰمٌ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ** (37:109) ابراہیمؑ سلامت سے بھی رہا' خیریت سے بھی رہا اور قربانی بھی دیدی۔ **كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ - اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ** (37:110-111) اس طرح سے اللہ تعالیٰ ایسے مقام پہ سلامتی کے پھول' ان کے اوپر نچھاور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جو ہمارے قوانین کی صداقت پر محکم یقین رکھتے ہیں۔

جیسا میں نے عرض کیا کہ یہ حکم ہوگیا کہ یہ سرسبز و شاداب وادیاں بھی چھوڑ دو' بادشاہت بھی چھوڑ دو' بستی ہوئی دنیا بھی چھوڑ دو۔ وادئ غیر ذی زرع کا جو لفظ آیا ہے تو یہاں میں وہ بات کرتا ہوں۔ **رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ** (14:37) یا اللہ! تُو نے وہ ذبحِ عظیم جو مانگی تھی میں نے تو وہ تعمیلِ ارشاد کر دی' میں نے بھی کی اور میرے بیٹے نے بھی کی۔ وادئ غیر ذی زرع خود قرآن نے کہا ہے۔ شام و فلسطین کی ان وادیوں سے نکال کر' ریگستانِ حجاز میں آ کر جو غیر ذی زرع ہے اور جہاں کچھ ہوتا ہی نہیں ہے' لیجیے میں نے اُس کو لا کر یہاں بسا دیا ہے۔ ایک ہی کشش ہے کہ تُو نے کہا کہ یہ ہمارا گھر ہے' یہ اُس کی رکھوالی کرے۔ تیرا گھر بھی ہم دونوں نے بنایا ہے اور اُس گھر کی حفاظت کے لیۓ چوکیداری کے لیۓ' یہ بیٹا بھی یہاں ہے اور اس کی ذریت بھی یہاں رہے گی۔ اور یہ وہ قربانی ہے جو قیامت تک کے لیے ذریتِ ابراہیمؑ کے اندر رہے گی۔ کہا کہ **سَلٰمٌ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ** (37:109) ابراہیم خوش رہو' اللہ تعالیٰ خود کہہ رہا ہے کہ ہم تمہیں سلامت رکھیں۔ واقعی تُو نے بہت بڑی ذبحِ عظیم کا ثبوت دیا ہے' تُو نے بھی دیا ہے اور بیٹے نے بھی دیا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق کہا کہ **وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ** (37:108) یہ چیز وہ قربانی ہے جو آخر تک باقی رہے گی۔ تاریخ بتائے گی کہ ابراہیمؑ نے اور اسماعیلؑ نے کتنی بڑی قربانی کی تھی!

عزیزانِ من! اس مقام تک ہم پہنچ گئے ہیں۔ اب تعمیرِ کعبہ سے لے کر جو اس داستانِ جمیل کا اگلا حصہ ہے' وہ آئندہ جمعہ کو ہم بیان کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ



چھٹا باب: **العنکبوت** (آیت 16: اسوۂ ابراہیمی: وادئ حجاز اور تعمیرِ کعبہ)



عزیزانِ من! آج اپریل 1979ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز تو سورۃ العنکبوت کی آیت 16 سے ہونا چاہیے تھا لیکن آپ کو یاد ہے کہ پچھلے دو درسوں میں ہمارے زیرِ نظر حضرتِ ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ آیا ہے۔ اُن دو درسوں کی دونوں کڑیاں اُسی داستانِ جلیلہ کی نظر ہوئیں اور ابھی وہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ آج بھی اُسی سلسلے کی تیسری کڑی ہمارے سامنے آئے گی۔

حضرت ابراہیم ◆ کے دور تک معاشرتی زندگی کا محدود تصور اور قرآنِ کریم کا نظامِ عالمگیریت

بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ حضرتِ ابراہیم ◆ اپنے وطن بابل سے ہجرت کر کے شام اور فلسطین کے سبزہ زاروں میں آ گئے۔ وہاں قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق اُنہیں ملکِ عظیم عطا ہوا۔ حضرتِ اسماعیل ◆ اُس زمانے کے رواج کے مطابق بادشاہت کے وارث ہونے تھے۔ حضرتِ اسحاقؑ چھوٹے بیٹے تھے۔ آپ کو یاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیم ◆ سے کہا کہ یہ وقتی قربانی جو تمہارے ذہن میں ہے، یہ تو ابھی ختم ہو جانے والی بات ہے۔ ہم نے اسماعیلؑ کو ایک بڑی عظیم اور لمبی قربانی کے لیے بچا لیا اور اُس عظیم قربانی کا وہ ذکر اب ہوتا ہے۔

حضرتِ ابراہیم ◆ کے زمانے تک انسانوں کا ابھی ابتدائی دور تھا، ابھی اُن کے ذہن میں عالمگیریت یا Universalism یا انسانیت یا Humanity نہیں آئی تھی۔ پہلے وہ خاندانوں میں، پھر قبیلوں میں، پھر زیادہ سے زیادہ وہ قومیت کے اندر بٹے ہوئے تھے۔ دین بھی اُس وقت تک قومیت کے دائروں میں ہی محدود ہوتا تھا۔ قرآنِ کریم نے حضرتِ نوحؑ، حضرتِ صالحؑ، حضرتِ ھودؑ کے متعلق یہی کہا کہ وہ اپنی قوم کی طرف آئے۔ وہ دین اُس زمانے تک اُس قوم ہی کی طرف تھا لیکن دین نے تو قیامت تک کے لیے انسانوں کا ضابطۂ حیات رہنا تھا اس لیے اب یہ قومی حدود سے آگے بڑھ کر انسانیت تک آیا۔ اور یہ ہے حضرتِ ابراہیمؑ کی وہ امتیازی خصوصیت جس کی ابتدا ان کے دور میں، دین کی قومیت کے دائروں سے نکل کر، عالمگیریت کی طرف بڑھنے کے لیے ہوئی ہے۔ یہ تو نہیں

تھا کہ اُسی زمانے میں Universalism آجاتی یا عالمگیر انسانیت آجاتی لیکن اس کی بنیاد رکھی گئی۔ اور یہ فطرت کا پروگرام تھا' یہ خود ان کا اپنا فیصلہ نہیں تھا بلکہ یہ خدا کا فیصلہ تھا۔ اور خدا تو بہت دور تک دیکھ کر فیصلے کیا کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک اس آج اور کل کا امتیاز ہی نہیں ہے' تفریق ہی نہیں ہے۔ جسے آپ Future (کل) کہتے ہیں' وہ اُس کے لیے Present (آج) ہی ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! اب یہ ہے کہ عالمگیر انسانیت کے لیے جب یہ دین بننا تھا تو اُس کا ایک محسوس مرکز بھی ہونا چاہیے تھا۔ اب اُس محسوس مرکز کے لیے' جہاں حضرت ابراہیمؑ تھے وہاں بھی یہ مرکز قائم ہوسکتا تھا لیکن حضرتِ ابراہیمؑ کی ذریت جو آگے چل رہی تھی' وہ حضرتِ اسحاقؑ سے بنی اسرائیل تھے۔ اور بنی اسرائیل کا ہی سلسلہ حضرتِ عیسیٰؑ تک چلا آیا ہے۔ تو وہ دین قومی رہا تھا' وہ بنی اسرائیل کا تھا۔ اور جب اسے عالمگیریت حاصل ہونی تھی تو اس میں فطرت کا' اللہ تعالیٰ کی مشیت کا' پروگرام یہ ہوا کہ وہ جو حضرتِ ابراہیمؑ کی دوسری شاخ تھی یعنی اسماعیلی شاخ' تو یہ جو عالمگیریت ہے اُس شاخ کے ہاتھوں عمل میں آئے۔ اور یہی بات ہے کہ شاخِ اسماعیلی میں سب سے پہلے اور آخری رسول' نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے۔ وہ جو حضرتِ ابراہیمؑ کے ہاتھوں کعبے کی بنیاد رکھی گئی تھی تو اُس کی عملی شکل اتنا عرصہ بعد جا کر' جب وہ نبوت اور حکومت بنی اسرائیل کی طرف سے اِدھر بنی اسماعیل کی طرف منتقل ہوئی ہے' تو نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں عملاً وہ نظام تشکیل پایا جو عالمگیر انسانیت کا نظام تھا' کسی ایک قوم کا نظام نہیں تھا۔ یہاں آنے کے بعد خدا نے عملاً جو رحمۃ للعالمینی تھی اور کتاب کا جو ذکر للعالمین تھا' وہ کسی قوم کی طرف نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے' تو اُس کا آغاز نبی اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں ہی ہوا۔ جس کا آغاز یہاں آ کے ہونا تھا' اُس کی بنیاد حضرتِ ابراہیمؑ کے ہاتھوں اور حضرتِ اسماعیل ◆ کے ہاتھوں رکھی جا رہی ہے' وہاں شام اور فلسطین کے سبزہ زاروں میں نہیں بلکہ حجاز کے ریگستان میں جسے قرآنِ کریم میں خود وادیٔ غیر ذی زرع کہا ہے' وہ وادی کہ جس میں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت ابراہیم ◆ کے دور میں اہلِ عرب کی معاشی حالت

اُس وادی میں' اُس ملک میں' اِس کی بنیاد رکھی گئی۔ وہاں اِس قسم کی کوئی طبعی یا جسے آپ دنیاوی کشش کہتے ہیں' کوئی بھی نہیں تھی۔ یہ تو ہمارے دیکھنے کی بات ہے کہ وہاں یہ جو تیل کے چشمے نکلے ہیں' یہ بہتا ہوا سونا زمین سے نکل آیا ہے تو وہاں خوشحالی آ گئی' فارغ البالی آ گئی بلکہ بڑی افراط آئی ورنہ اس سے پیشتر تو اس عرب سے ہمارے بچپن کے زمانے میں بھیک مانگنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ یہ غریب تھے' کھجوروں کی گٹھلیوں کے اوپر گزارہ کرنے والی یہ قوم تھی۔ اتنی صدیوں سے یہ قوم اسی طرح سے چلی آ رہی تھی۔ وہاں حضرتِ ابراہیمؑ نے اپنی اس ذریتِ اسماعیلؑ کو جا بسایا جنہوں نے وہاں فلسطین کے ملکِ عظیم کا مالک ہونا تھا۔ یہ بہت بڑی قربانی تھی جو دی گئی ہے۔ یہ ذبحِ عظیم تھی۔

اب ہم بات وہاں سے شروع کرتے ہیں جو حضرتِ ابراہیم ◆ نے کہا کہ رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ

زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ (14:37) اے میرے نشوونما دینے والے! میں نے اپنی اولاد کے ایک حصے کو اس مقام میں بسا دیا ہے جو ایسی وادی ہے جس میں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تیرا واجب الاحترام مکان ہے۔ ویسے تو ساری دنیا خدا کی ہے لیکن اُس میں ایک گھر کو خدا کا گھر کہہ کر مخصوص کیا جا رہا ہے۔ اور یہ اختصاص اس لیے ہے کہ اس کی نسبت کسی قبیلے' قوم' خاندان' شخص' وطنیت یا کسی کی بھی طرف نہیں کی جاسکتی۔

خدا کے اس گھر کی نسبت النّاس کے لیے مختص ہے

بنی اسرائیل کا گھر کہنا تو ایک طرف رہا' اسے بنی اسماعیل کا بھی گھر نہیں کہا۔ ساری انسانوں کی نسبتیں کاٹ دیں' خواہ وہ انفرادی ہوں اور خواہ وہ اجتماعی ہوں۔ نہ یہ ابراہیمؑ کا گھر کہلایا' نہ اسماعیل کی شاخ کا گھر کہلایا اور نہ عربوں کا گھر کہلایا۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ جہاں جہاں بھی کعبے کے متعلق قرآنِ کریم میں ذکر آیا ہے تو وہاں للناس آیا ہے کہ یہ نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ جسے نوعِ انسانی کا گھر کہنا تھا' اُسے خدا نے کہا کہ یہ ہمارا گھر ہے۔ چونکہ ہم تمام نوعِ انسانی کے رب ہیں' اس لیے ہمارا گھر پوری انسانیت کا گھر ہے۔ یاد رکھیے! جس چیز کو بھی خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے' اُس کے معنی یہ ہیں کہ اُس پہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ وہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوتا ہے۔ کہا کہ تیرے گھر کے قریب' میں نے اس وادیٔ غیر ذی زرع میں' اپنی اولاد کے ایک حصے کو' ایک شاخ کو' بسا دیا ہے۔ رَبَّـنَـا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (14:37)۔ اس کا ترجمہ تو یہی ہے کہ تا کہ وہ صلوٰۃ کو قائم کریں۔

الصلوٰۃ کا وسیع تر قرآنی مفہوم

میں نے آپ کو عرض کیا تھا کہ یہ جو الصلوٰۃ ہے' یہ حقیقت میں دین کا پورا نظام ہے۔ اُس کی سمٹی ہوئی شکل وہ ہے جسے ہم نماز کہتے ہیں ورنہ آپ سوچیے کہ شام اور فلسطین کی وادیوں سے' خوشگوار سبزہ زاروں سے' ایک حصہ وادیٔ غیر ذی زرع میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ اتنا اہم کام ہے جس کے لیے خدا نے کہا کہ ہم نے اسماعیلؑ کو قربانی کے لیے بچا لیا۔ اگر اِس کے معنی یہ کیے جائیں تا کہ یا اللہ! یہ تیری نماز پڑھ سکیں تو کیا یہ وہاں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے؟ یعنی کیا اس مقصد کے لیے یہ اتنا بڑا پروگرام ہے تا کہ یہ نماز پڑھ سکیں؟ یہ نماز پڑھنا نہیں ہے۔ نماز پڑھنا تو اُس کی ایک سمٹی ہوئی شکل ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ' نظامِ خداوندی کا قائم کرنا ہے۔ کہا کہ میں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا ہے کہ تیری مشیت کے مطابق تیرا جو نظام ہے' وہ دنیا میں قائم ہو۔ وہ نظام کسی قوم کا نظام نہیں ہوسکتا' کسی ملک کا نہیں ہوسکتا' کسی خاندان کا نہیں ہوسکتا بلکہ وہ نوعِ انسانی کا نظام ہونا ہے جسے نظامِ خداوندی کہا جائے گا۔ اِ قِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ کے یہ معنی ہیں تا کہ وہ تیرا نظام قائم کرسکیں۔ آگے ہے کہ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ (14:37) میں نے اتنا کر دیا ہے تا کہ نوعِ انسانی کے دلوں میں

تیرے اس مرکز کی کشش پیدا ہو جائے۔ جو کچھ میرے ذمہ تھا میں نے تو اُس کی تکمیل کر دی۔ اب اس کے بعد جو اگلی بات ہے وہ یہی ہے کہ یہ پوری نوعِ انسانی کا مرکز بن جائے تو اس کے لیے تُو اس کا انتظام یہ کر دے۔

اب دیکھیے کہ یہاں سے وہ قومیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ بنی اسماعیل کی ذریت کے دل اس طرف مائل کر دے‘ بلکہ کہا کہ الناس کے دل اس کی طرف مائل کر دے۔ اس لیے میں نے یہ کیا ہے۔ اس آیت کے جو اگلے دو الفاظ ہیں‘ وہ میں ابھی چھوڑتا ہوں اس لیے کہ یہ جو ذکر ہے‘ ذرا اور محاکاتی انداز میں بڑے حسین انداز میں سورۃ البقرہ میں ہے۔ قرآن اس انداز میں بات کر رہا ہے جیسے صبح نور کے تڑکے دن روشن ہونے سے بھی پہلے‘ اُس وادئ غیر ذی زرع میں کھجوروں کے جھنڈ کے کنارے ایک نبی اینٹ اور گارا لا رہا ہے‘ دوسرے الوالعزم نبی حضرت ابراہیمؑ دیواریں کھڑی کر رہے ہیں۔

تعمیرِ کعبہ کے دوران دو نبیوں کے لبوں پر آنے والی دعائیں

ہوتا یہ ہے کہ مزدور کام میں تھوڑا سا ستانے کے لیے کچھ گنگناتے رہتے ہیں۔ اس گنگنانے سے وہ جو تکان ہوتی ہے‘ وہ کم ہوتی ہے‘ توجہ تھوڑی سی دوسری طرف چلی جاتی ہے۔ وہ عام طور پر یہ گنگناتے ہیں۔ یہ دو نبی معمارانِ بیت اللہ ہیں۔ اب یہ بھی وہ چیز ہے کہ گنگنانا بھی ہے‘ لیکن ان کا گنگنانا کیا ہے؟ قرآن کس انداز میں بات کرتا ہے؟ کہتا ہے کہ وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰھٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ (2:127) ابراہیم ◆ اور اسماعیل ◆ دونوں ہمارے گھر کی دیواروں کو اونچا کر رہے ہیں‘ اُس کے اوپر ردے رکھ رہے ہیں۔ دیواریں اونچی ہو رہی ہیں اور اس طرح سے مٹی گارا ڈھو رہے ہیں‘ یہ کام بھی کر رہے ہیں اور لب پر یہ حسین تمنائیں اور دعائیں ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا (2:127) اے ہمارے پروردگار! تیرے ارشاد کے مطابق ہم نے یہ کیا ہے‘ اب ہمیں معلوم نہیں ہے کہ تیرے نقشے کے مطابق ہم اس کو کر سکے ہیں یا نہیں کر سکے۔ ہم جو کر سکے تھے وہ خلوص سے کر دیا‘ تیری بارگاہ میں یہ نذرانہ پیش کیا ہوا ہے‘ اے ہمارے پروردگار! اسے قبول فرما۔ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127) جو زبان سے ہم کہہ رہے ہیں تُو وہ بھی سننے والا ہے لیکن اِس کے بعد تُو دلوں کے حالات کو بھی جانتا ہے کہ یہ نذرانہ ہم کس خلوص کے ساتھ تیری بارگاہ میں پیش کر رہے ہیں۔ رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ (2:128) اس کے معاوضے میں ہم تم سے کیا مانگتے ہیں؟ مزدوری کیا مانگتے ہیں؟ صرف اتنا کہ ہمیں ایسا بنا دے کہ ہم صرف تیرے قوانین کے سامنے جھکیں اور دنیا میں کسی کے سامنے نہ جھکیں۔ کیا حسین دعائیں ہیں! ابھی کعبے کی تکمیل بھی نہیں ہوئی ہے‘ وہ زیرِ تکمیل ہے اور یہ دعائیں مانگے چلے جا رہے ہیں۔ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً (2:128) ہم اپنے لیے ہی نہیں چاہتے‘ ہماری جو اولاد بھی آگے چاہے اُس کو بھی ایسا بنا دے کہ وہ تیرے ہی سامنے جھکے‘ دنیا میں کسی اور کے سامنے نہ

جھکے۔ یہ دعا کی انتہا ہے۔ اور کچھ نہیں مانگا جا رہا۔ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا (2:128) زندگی کے طور طریقے ہم کو سکھا دے کہ ہم اس دنیا کے اندر کیسے رہیں۔ کہیں ہم سے لغزش ہو جائے تو ہم سے منہ موڑ کر نہ چل دینا' یوں ناراض نہ ہو جانا' اپنی توجہ قائم رکھنا۔ ہم انسان ہیں ہم سے لغزش ہو سکتی ہے' سہو ہو سکتا ہے' خطا ہو سکتی ہے۔ تیرا دل تو بہت بڑا ہے' تُو بڑا غفور واقع ہوا ہے۔ اس لیے ایسی باتوں کے اوپر وَتُبْ عَلَیْنَا (2:128) ہم سے بے رخی نہ برتنا' منہ موڑ کر نہ چل دینا۔ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْم (2:128)۔ قرآنِ کریم نے انسانوں کے متعلق تو کہا ہے کہ وہ تائب ہوتا ہے یعنی جب بھی کبھی اُس کا قدم دوسری طرف اٹھ جاتا ہے' اُس کا رُخ دوسری طرف ہو جاتا ہے تو جب بھی اُسے احساس ہوتا ہے' تو وہ پلٹ کے ہماری ہی طرف آتا ہے۔ دیکھیے قرآن کا انداز! کہ وہ ایک قدم ہماری طرف پلٹ کر آتا ہے تو ہم دو قدم پلٹ کر اُس کی طرف جاتے ہیں۔ ''تائب'' اور ''تواب'' میں عربی قاعدے کی رو سے یہ فرق ہے۔ یہ زبان ہی عجیب ہے۔ اور پھر یہ ہے خدا' ''اینوں بچڑا اے رب ہونا۔ جی چاہندا اے ناچھا پان نوں [1]''۔ کہ اے بندے! کوئی بات نہیں' اگر تجھ سے لغزش ہو گئی ہے' ندامت ہے اور احساس ہے' تمہاری پیشانی کے اوپر قطراتِ انفعال ہیں' تو تُو آ تو سہی اور پھر دیکھ کہ تو ایک قدم آ اور ہم دو قدم تیری طرف بڑھ کے جائیں گے۔ اِس لیے کہ ہم تو رحیم واقع ہوئے ہیں' ہم نے تو تمہاری نشو و نما کرنی ہے۔ وہ ماں جو بچے کو پہلے تھپڑ مارتی ہے اور اُس کے بعد جھٹ سے گلے کے ساتھ لگا لیتی ہے۔ یہ ہے وہ چیز۔ وہ تھپڑ مارنا بھی بجا ہوتا ہے غیر صرف تھپڑ مارتا ہے' لیکن ماں تھپڑ مارنے کے بعد کلیجے سے لگا لیتی ہے۔

تعمیرِ کعبہ کی غایت اور منتہیٰ

اب نظر آتا ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کو بتا دیا گیا تھا کہ اس جگہ تعمیرِ کعبہ کی غایت اور منتہیٰ کیا ہے۔ کہا کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ یُزَکِّیْھِمْ ؕ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (2:129) اے نشو و نما دینے والے! اس ذریت میں آخر الامر پھر ان میں سے وہ نبی پیدا کر۔ نظر آتا ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ کو بتا دیا گیا تھا کہ اس پروگرام کی آخری کڑی کیا ہوگی۔ تُو ان میں سے وہ رسول پیدا کر جو اس قوم کو تیرے قوانین کی تعلیم دے' اُن کی غرض و غایت بتائے' Rationally (دلائل و براہین سے) ان چیزوں کو Explain (واضح) کرے' اس طرح سے ان کی فکر کی' قلب کی' دماغ کی' تطہیر کرے اور اس خلوص کے ساتھ وہ امت تیری طرف آئے اس لیے کہ تُو جہاں قادرِ مطلق ہے' تو توں کا مالک ہے' اُس کے ساتھ تو حکیم بھی

---

[1] رب ہونا اسے ہی جچتا ہے۔ دل میں امنگ اٹھتی ہے کہ اس سے بے ساختہ بغل گیر ہو جاؤں۔

ہے' تُو دھاندلی سے اپنی بات نہیں منوایا کرتا' تُو دلائل و براہین کی رو سے بات منواتا ہے۔ تیرے پروگرام میں غلبہ ہی نہیں ہے بلکہ تیرے پروگرام میں حکمت بھی ہے۔ اس لیے جب یہ کعبے کی دیواروں کو کھڑا کر رہے تھے' ان کے لب پر یہ دعائیں ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ وہاں سورۃ ابراہیم میں بھی' میں نے اس دعا کا ایک ٹکڑا چھوڑ دیا ہے' یہاں بھی وہ دعا ہے۔ اب نظر آ رہا ہے کہ دنیا کے بُت کدے میں خدا کے پہلے گھر کی تعمیر ہو رہی ہے اور دو نبی تعمیر کر رہے ہیں اور یہ دعائیں ان کے لبوں کے اوپر ہیں۔ اب ان دعاؤں میں' ان تمام تمناؤں میں' ان آرزؤں میں' دنیا والی بات کوئی نہیں آئی ہے۔ ہمارے ہاں جو مذہب والے ہیں وہ تو کہتے ہیں کہ جی! وہ اللہ والے ہیں اور اُنہوں نے یہی کچھ مانگا۔

دین میں رزق کی اہمیت اور غایت

عزیزانِ من! یہ دین تھا' یہ مذہب نہیں تھا' یہ تصوف نہیں تھا۔ یہ دعائیں ذہن میں رکھیے۔ دنیا کے بُت کدے میں خدا کا پہلا گھر تعمیر ہو رہا ہے اور دو پیغمبرؑ بنانے والے ہیں' یہ ابھی تکمیل تک بھی نہیں پہنچا کہ دعائیں کر رہے ہیں۔ اُن دعاؤں کے اندر یہ کچھ ہے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور ان دعاؤں کے ساتھ یہ ہے کہ **رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ** (2:126) یا اللہ! اس مقام کو اس کی جگہ بنا دے اور ان کی روٹی کا بھی انتظام کر دینا۔ یہ ہے دین' یہ ہے رزقِ حلال کی اہمیت۔ پھر دہرا دوں کہ یہ دعا کونسی ہے' کونسا لفظ ہے' کون مانگ رہے ہیں اور کس سے مانگ رہے ہیں؟ اب آپ کے ذہن میں آ گیا۔ میں کہتا ہوں کہ تاریخِ انسانیت میں اس سے زیادہ مقصد' غایتِ دعا کے لیے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ کعبہ کے بن جانے کے بعد بھی وہاں جا کر آپ دعا مانگیں گے تو یہ بات نہیں ہوگی جو وہ بات تھی۔ پہلا گھر تعمیر ہو رہا ہے' وہاں ابھی اور کوئی گھر نہیں ہے' یہ دونوں پیغمبر معمار ہیں' باپ بیٹا محنت کر کے گھر بنا رہے ہیں۔ گھر بنا بھی نہیں ہے اور نبی آخر الزماں کے متعلق دعا مانگ رہے ہیں اور درمیان میں کہہ رہے ہیں کہ مولا! ان کے لیے رزقِ حلال کا بھی انتظام کر دینا۔ یہ ہے دین۔ اس قسم کی قلب و نگاہ کی کامل توجہ کے زمانے میں بھی رزقِ حلال کا خیال ذہن سے نہیں جاتا۔ یہ دعا ہے۔

عزیزانِ من! یہ دعا خصوصیت سے کیوں ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ دین میں رزق کو اس قدر اہمیت حاصل ہے۔ یہ اہمیت کیوں ہے؟ یہ خود ہی بتا دیا کہ **وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ** (14:37) ان کے لیے رزق کا انتظام کر دینا۔ کیوں رزق کا یہ انتظام ہوتا ہے؟ کیا یہ مقصود بالذات ہے کہ کھایا پیا اور اُس کے بعد اونگھ آ گئی اور سو گئے' سو کے اٹھے تو کچھ ٹہل لیا اور پھر اُس کے بعد کچھ کھا لیا؟ تو یہ مقصود بالذات ہو گیا۔ کہا کہ نہیں' یہ نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' اس وقت اُس میں یہ دعا لکھی ہے۔ اُس کو عام مذہب اور روحانیت

سے الگ کر دیا۔ روٹی کی دعا ہو رہی ہے اور وہیں یہ بتایا ہے کہ یہ روٹی مقصود بالذات نہ سمجھ لی جائے۔ **وَ ارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ** (14:37) ان کے لیے رزق کا انتظام کر دینا تا کہ ان کی محنتیں بھر پور نتائج پیدا کریں۔ ان کا پیٹ بھرنا مقصود بالذات نہیں ہے کہ صرف پیٹ بھرنا ہے بلکہ پیٹ اس لیے بھرا جائے کہ وہ جوان کے ذمہ کام لگایا گیا ہے' اُس کام کے بھر پور نتائج مرتب ہوں اس لیے میں روٹی کے لیے کہہ رہا ہوں۔ عزیزانِ من! یہ ہے قرآن۔

شکر کا قرآنی مفہوم اور روٹی کے لیے مجاوری پیشہ

اس نے کہا ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہونا چاہیے۔ سوچنا چاہیے کہ قرآن یہاں یہ لفظ کیوں لایا ہے۔ اور ہمارے ہاں **لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ** کو کہہ دیا کہ تا کہ اے اللہ! تیرا شکر ادا کریں۔ مقصد ذہن سے نکل گیا۔ ان عربوں سے پوچھو جن کی زبان میں یہ قرآن نازل ہوا ہے کہ شکر کے معنی کیا تھے۔ اس کے معنی تھے: ''بھر پور نتائج'' ہونا' اتنے بھر پور ہونا کہ جس طرح بکری کے تھنوں سے چلتے ہوئے بھی دودھ ٹپکتا تھا اور اتنا فراوانی سے اُس کے اندر آتا تھا کہ وہ ٹپکتا چلا جاتا تھا۔ اِس کو وہ شکر کہتے تھے۔ اب اگلی بات اور ہے کہ جو کہا ہے کہ یہ اپنی طرف سے روٹی کا کچھ انتظام کر دینا۔ جہاں جہاں خدا کے نام پہ دنیا میں کچھ بنا ہے: وہ یہودیوں کا ہیکل ہو' عیسائیوں کا گرجا ہو' ہندوؤں کا مندر ہو' ہمارے ہاں کی خانقاہ یا مسجد ہو' وہاں جو بھی بیٹھتا ہے وہ لوگوں سے روٹی مانگ کر کھاتا ہے۔ کہا کہ ہم اتنا بڑا مرکز بنا رہے ہیں تو کہیں یہ صورت نہ پیدا ہو جائے کہ یہ میری اولاد مجاور بن کر بیٹھ جائے اور وہاں لوگوں کی روٹیاں توڑے۔ خدا کے لیے ایسا نہ کرنا' اپنی طرف سے ان کی روٹی کا انتظام کر دینا۔ یہ بڑی چیز تھی۔

یہ جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ جو احبار و رھبان یعنی علماء و مشائخ ہیں **يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ** (9:34) ان کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی تعمیری کام کیے بغیر یہ لوگوں کی محنت کی کمائی ہوئی روٹی کھاتے ہیں۔ قرآن نے اُس روٹی کو باطل کہا ہے جو خود کوئی تعمیری کام کر کے کماتا نہیں ہے۔ جو بھی اُس روٹی کا انداز ہے تو قرآن اُسے باطل کہتا ہے' سب سے بڑا تو احبار و رھبان یعنی علماء و مشائخ کی روٹی کے متعلق قرآن نے کہا ہے۔ اسے کیوں رزقِ باطل کہا ہے؟ کیونکہ **يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ** (9:34) لوگوں کی کمائی کی روٹی کھاتے ہیں' آپ کچھ نہیں کرتے۔ یہ ہے وہ ظلم کہ جہاں جہاں بھی خدا کی عبادت یا پرستش کے نام پہ کوئی مرکز بنے ہیں' وہ مرکز دنیا بھر کی خرابیوں کا موجب ہوتے ہیں۔ اُس کی بنیاد یہی ہوتی ہے کہ وہاں والے خود کما کر کھانا نہیں جانتے۔ ایک وقت کی روٹی نہیں کما سکتے۔ اور جو خود نہ کما سکے تو اُسے پھر روٹی کے لیے جس قسم کے دھندے کرنے پڑتے ہیں' وہ ظاہر ہے۔ اگر جرأت ہے' دلیری ہے' تو ڈاکو ہے' ایسا کچھ نہیں ہے تو جواری ہے اور اُس سے بھی نیچے ہے تو تعویذ لکھ رہا ہے۔ یعنی وہ ساری ظلم یہ ہے کہ وہ خود کما کر نہیں کھا سکتا۔

یہاں یہ کہا ہے کہ یہ جو میں دنیا میں بہت بڑا مرکز بنا رہا ہوں' یہ ساری دنیا کے لیے ایک مرکز ہے۔ یہاں کے چڑھاوے تو پوچھو نہیں کتنے ہوں گے! اے میرے پروردگار! ایسی صورت نہ پیدا کر دینا۔ یہاں کچھ زراعت (Agriculture) نہیں ہے' اس گھر کی حفاظت کے لیے میں نے ان کو یہاں بسا دیا ہے' اگر رزق کی ایسی صورت نہ ہوئی تو یہ تو شاید مجبوراً بھی چڑھاوے لینے لگ جائیں۔ کوئی چھوٹی سی خانقاہ یا درگاہ کا چڑھاوا بھی کم نہیں ہوتا' یہ ساری دنیا کے لیے خدا کا ایک مرکز بنانا ہے تو اُس کا تو پوچھو نہیں کہ کتنا چڑھاوا ہو سکتا ہے! اب جا کے دیکھیے کہ وہاں کے جو چڑھاوے ہیں' وہ جو کعبے کے دروازے کا تالا کھولنے والا ہے تو پوچھو نہیں کہ اُس کی فیس کتنی ہے۔ کہا کہ یہ روٹی کا انتظام اپنی طرف سے کر دینا کیونکہ روٹی کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ کہیں یہ اس کے مجاور نہ بن کر بیٹھ جائیں اور کہیں مجبوراً ہی لوگوں سے روٹی مانگ کر نہ کھانا پڑے۔ ایسی روٹی دینا جو ان کی محنتوں میں بھرپور نتائج پیدا کر سکے۔

مقامِ ابراہیمی ◆ کی عظمت کا راز

عزیزانِ من! یہ اس دعا کی لم ہے۔ ان دعاؤں کے ساتھ کعبہ کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اب وہ اسوۂ حسنہ ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اب اُس کی آخری کڑی آ گئی۔ اس آخری کڑی میں قرآنِ کریم نے دو الفاظ میں Sum up کر کے رکھ دیا ہے' نچوڑ نکال دیا ہے' ''تت کڈ کے رکھ دتا''۔ کہا کہ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (2:130). ابراہیم ◆ کی زندگی اتنا بڑا مقام ہے۔ ''اس دنیا کے اندر بھی ہم نے اسے اپنا منتخب بنا لیا تھا' آخرت کے اندر بھی وہ صالحین میں سے ہوگا۔ تو کہا کہ اُس نے یہ کیا کیا جس کے لیے یہ کچھ اُن کے لیے ہو گیا؟ عزیزانِ من! سوچیے کہ کہنے کے لیے پتہ نہیں کتنی وضاحت کی ضرورت ہوتی۔ اُس نے دو الفاظ کہے ہیں۔ کہا ہوا یہ تھا کہ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ (2:131) جب اُس کے رب نے کہا کہ ہمارے قوانین کے سامنے جھک جا تو قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (2:131) اُس نے کہا کہ لیجیے! میں جھک گیا۔ کہنے لگے کہ بس یہ بات تھی۔ آپ نے دیکھا کہ دو الفاظ میں کس طرح قرآن ساری کہانی کہہ گیا ہے۔ بے ساختہ یہ شعر کبھی کبھی یاد آ جاتا ہے:

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اٹھو' سلام کرو

یہ ہے ساری بات' یہ ہے اسوۂ ابراہیمؑ۔ وہ جاں نثاروں کو پوچھتے ہیں کہ بتائیے کون کون ہے جو ہمارے لیے جان دینے والا ہے؟ تو کیا اُٹھ کے وہ اس طرح سے وعظ شروع کر دے کہ حضور ﷺ نے اس طرح دعوت دی ہے اور اس دعوت کو ہم نے یوں سمجھا ہے اور اِس کے لیے ہم نے عمر بھر غور و فکر کیا ہے' ہم نے ایک تنظیم بنائی ہے' ایک پارٹی بنائی ہے اور ہم اُس کے لیے یہ کریں گے؟ تم بھی حسرت اُٹھو' 'سلام

کرو' میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر

اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

بس یہ کہا ہے قرآن نے! سب کچھ کہہ دیا۔ بس اتنی سی چیز ہی ہے لیکن یہ وقتی بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ** (2:132) یہ تو زندگی کا جو آخری سانس ہے' اُس سانس تک **اَسْلَمْتُ** ہے:

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

پوری زندگی **اَسْلَمْتُ** ہو۔ عزیزانِ من! یہ سب کچھ ہوا۔ اب آپ نے دیکھا کہ شروع سے آخر تک کن کن مراحل سے یہ گزرے ہیں' ایسے مراحل جن میں سے ایک مرحلہ بھی انسان کی فِدویت اور جاںنثاری کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ یہ سب بڑے بڑے مراحل تھے۔

حضرت ابراہیم ◆ کے اسوۂ حسنہ کی بازگشت

عزیزانِ من! میں چند لفظوں میں پھر دہرا دوں کہ گھر میں باپ کے سامنے یہ کچھ کہنا اور باپ بھی وہ جو سب سے بڑا منتری ہے' بادشاہ سے زیادہ اقتدار کا مالک ہے' صاحبِ ثروت واقتدار ہے اور صاحبِ دولت بھی ہے۔ یہ سب کچھ اِنؑ کو وراثت میں آنے والا تھا لیکن باپ سے کہتے ہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنے ہاتھوں سے بُت تراشتے ہو اور پھر اُس کے سامنے خود ہی سجدہ ریز ہو جاتے ہو' آپ کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ پہلی چیز ہے۔ باپ نے کہا کہ یاد رکھو! اگر تم ان باتوں سے باز نہ آئے تو میں گھر سے نکال دونگا' عاق کر دونگا' ملک بدر کرا دونگا۔ اُنہوںؑ نے کہا کہ شکریہ! آپ یہ کچھ کرتے رہیے اور میں اس کے باوجود خدا سے دعا مانگوں گا کہ اللہ تمہیں صحیح راستہ دکھا دے۔ پھر بادشاہ جسے نمرود کہا جاتا ہے' اس میں تمرد کی انتہا ہے۔ وہ فرعون تو صرف **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** (79:24) کہتا تھا کہ میں تمہاری روٹی کا مالک ہوں۔ یہ نمرود کہتا تھا کہ **اَنَا اُحْيٖ وَ اُمِيْتُ** (2:258) تمہاری موت اور زندگی میرے ہاتھ میں ہے۔ آپؑ اُس بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر کہہ رہے ہیں کہ تم کس مسلک کے اوپر کھڑے ہوئے ہو۔ یہ بات جو تم نے کہدی کہ **اَنَا اُحْيٖ وَ اُمِيْتُ** (2:258) . وہ اس لیے ہے کہ تم حکومت کے نشے میں ہو۔ میں تمہارا نشہ ابھی اتارتا ہوں۔ میرا خدا سورج کو مشرق سے نکالتا ہے' اگر کائنات میں تمہارا اختیار ہے تو اُس کو مغرب سے نکال کر بتاؤ[1]۔ پوری کی پوری کائنات سامنے ہے اور وہ ''بھیڑا پے گیا[2]''۔ اُس کا

---

[1] دیکھیے (2:258)

[2] ڈھیلا وزرد پڑ گیا۔

ہر خدا جس کو اُس نے کہا ہے کہ ہم اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں یعنی وہ چاند اور وہ سورج سامنے ہے۔ آپؑ نے ایک ایک کے متعلق دلیل دی کہ ذرا ٹھہر جائیے! جونہی وہ غروب ہوا تو اُنہوںؑ نے کہا کہ کیا یہ خدا ہوسکتا ہے جو آج اس قدر درخشندہ ہے اور تھوڑے ہی وقت کے بعد وہ غروب ہو جاتا ہے اور اُس کا وجود ختم ہو جاتا ہے' تم اُسے خدا بنا رہے ہو۔ ان کے بُت کدے میں پہنچ رہے ہیں' تو ایک ایک بُت کے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ پھر ایک کو اُسی حالت میں چھوڑ کر اُنہی سے منواتے ہیں کہ ان سے پوچھو کہ کس نے انہیں توڑا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ابراہیم ◆! تمہیں تو پتہ ہے کہ یہ بولا نہیں کرتے۔ پوری کی پوری قوم نے کہا کہ اِسؑ کو پکڑ؛ آگ میں ڈالو۔ آپؑ کو ملک چھوڑ دینا پڑا۔ یہاں (وادیٔ حجاز میں) آنے کے بعد اپنے چہیتے بیٹے حضرت اسماعیل ◆ کو وادیٔ غیر ذی زرع میں بسا رہے ہیں اور خود کہہ رہے ہیں کہ یہاں تو ان بیچاروں کو کچھ کھانے کو نہیں ملے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کیا کچھ تھا اور ابراہیمؑ کن مراحل میں سے گزر رہے ہیں۔ کہا کہ وَ اِذِابۡتَـلٰٓی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (2:124) بڑی بڑی جانگداز وادیوں میں سے ابراہیمؑ کو گزرنا پڑا لیکن ہر مرحلے میں یہ امتحان پہ پورا اترا' اس کسوٹی پہ پورا اترتا چلا گیا۔ قَـالَ اِنِّـیۡ جَـاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124) ہم نے تمہیں پوری انسانیت کے لیے لیڈر بنا کر بھیج دیا' امام بنا دیا۔

عزیزانِ من! یہ بڑی چیز ہے لیکن بڑی چیز ایسے تو نہیں مل جاتی۔ یہ اسوۂ ابراہیمی ◆ آپ نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے کیوں کہا ہے؟ اس لیے کہ یہ ساری انسانیت کے لیے اسوہ ہے۔ ان مقامات میں سے گزرنا پڑتا ہے پھر اُس کے بعد کہیں یہ مقام آتا ہے۔ چھوٹے سے پیمانے کے اوپر امام بننا ہو تو چھوٹے پیمانے کے اوپر یہی ابتلا آئیں گی اور بڑے پیمانے پہ بننا ہو تو بڑے پیمانے پہ ابتلا آجائیں گے لیکن ایک لیڈر شپ وہ بھی ہے جو آج کل ہمارے ہاں ملتی ہے۔ ان مراحل میں سے' ان کٹھالیوں میں سے نکلنے کے بعد جب یہ ہوا ہے تو کہا ہے کہ ہاں ابراہیمؑ! اب تم ان تمام Tests (امتحانات) میں پورے اُترے اور اس کے بعد تم نے ثابت کر دیا کہ تم انسانیت کی امامت کے قابل ہو۔ عزیزانِ من! یہ کسوٹی اور معیار آپ کے پاس ہونا چاہیے' یہ دیکھنے کے لیے کہ ووٹ کس کو دیا جائے۔ آپ امامت کے لیے کچھ طے کرتے ہیں' لیڈر شپ کے لیے طے کرتے ہیں۔ آپ نے اسوۂ ابراہیمیؑ اگر سامنے رکھنا ہے تو دیکھیے کہ کس مقام پہ اُس نے یہ کہا ہے۔

راحت اور وقار کا حصول ذریت کی بجائے جانفشانی اور استقامت کا متقاضی ہوتا ہے

اب آگے ایک بات اور آتی ہے اور وہ بڑی اہم ہے۔ قَـالَ وَ مِـنۡ ذُرِّيَّتِیۡ (2:124) کہا کہ میرے متعلق تو یہ کہہ دیا' یہ میری جو آل اولاد آگے آ رہی ہے' اس کے متعلق بھی تو کچھ وعدہ دید یجیے۔ کہا کہ جَـاعِلُکَ (2:124) صرف تجھے بنایا ہے۔ اُنہوں نے

کہا کہ سرکار! یہ تو میرے ہی متعلق کہا گیا ہے لیکن آگے جو اولاد آئے گی اُس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ کہا کہ **لَا يَـنَـالُ عَهۡـدِی الظّٰلِمِيۡنَ** (2:124) نہیں بھئی، یہ چیزیں وراثت میں نہیں آیا کرتیں۔ کہ ''دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست''۔ اگر تیری اولاد میں سے بھی کوئی صالحین میں ہوگا تو وہ یہ کچھ اِس بنا پہ لے جائے گا کہ اُس کا ذاتی کردار ہے۔ اگر وہ اُس مقام پہ نہیں رہا تو پھر یاد رکھو! ہم وعدہ نہیں کرتے۔ عزیزانِ من! اُس کے بعد ساری دنیا میں ہر چیز وراثت میں چلی آ رہی ہے۔ آپ نے دیکھا تھا کہ کیسے دوٹوک جواب مل رہا ہے کہ یہ وراثت کی چیز نہیں ہے۔ انسانیت کے جوہر وراثت میں نہیں ملتے، باپ ایم اے ہو اور بیٹا پیدا ہو تو اُس کو الف ب بھی نئے سرے سے پڑھانی پڑتی ہے۔ وہ ذرا سی چیز بھی اپنی وراثت میں نہیں لے کر آتا۔ وہ طبعی خصوصیات تو اور بات ہے کہ بکری کا بچہ بکری ہوتی ہے اور انسان کا بچہ اسی طرح کا ہوتا ہے لیکن جو انسانیت کی صلاحیتیں ہیں وہ وراثت میں نہیں ملتیں چہ جائیکہ کردار کی صلاحیتیں وراثت میں مل جائیں۔ میں نے کہا ہے کہ وہاں سے دین کے اندر Universalism (عالمگیریت) آ گئی ہوئی تھی، انسانیت آ گئی تھی، حضرتِ ابراہیم ◆ نے قومیت کا معیار پلٹ کر رکھ دیا۔ کہا کہ **وَمَنۡ تَبِـعَنِىۡ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡ** (14:36) تم کہتے ہو کہ ہم ابراہیم ◆ کے ساتھی اور ابراہیم کی قوم میں سے ہیں، اس کے ساتھ والے ہیں، اس کے گروہ میں سے ہیں۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ ''جو خدا کے راستے میں میرا اتباع کرے گا تو وہ میرا ہے''۔ اگر وہ نہیں کرتا تو میرا بیٹا بھی میرا نہیں ہے۔ یہ ہے اسلام۔

ایک امام کی شخصیت پوری قوم کی عکاسی کرتی ہے

اتنا کچھ بیان کرنے کے بعد آپ دیکھیے کہ خود ذاتِ باری تعالیٰ کس قدر جذب و کیف کے ساتھ یہ داستان بیان کرتے ہیں۔ یہ کچھ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ابراہیمؑ! اس قسم کے کردار کے مجسمے کو تم سمجھتے ہو کہ وہ کوئی ایک فرد تھا۔ تم کیا کہہ رہے ہو!! اس قسم کے جامع صفات کے جو افراد ہوتے ہیں، وہ فرد نہیں ہوتے۔ کہا کہ **اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيۡفًا** ❶ (16:120) وہ تو ایک پوری کی پوری قوم تھا۔ اتنی صفات کا مالک جو امام ہو یا لیڈر ہو، وہ تنہا نہیں ہوتا، وہ پوری قوم کا عکس ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ پوری قوم کو اُس کا عکس ہونا چاہیے۔ اُس کی ذات کے اندر پوری قوم سموئی ہوئی ہوتی ہے۔ اُس کے کردار کا عکس قوم کے افراد پہ پڑتا ہے۔ کہا کہ کیا ابراہیمؑ کو تم ایک فرد سمجھ رہے ہو؟ کہا کہ نہیں **كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيۡفًا** ❶ (16:120)۔ ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ وہ کیا خصوصیات تھیں۔ یہی نہ سمجھ لو کہ ہم ذریتِ ابراہیمیؑ میں سے ہیں تو سب کچھ آ گیا۔

---

❶ ابراہیمؑ یوں تو ایک فرد تھا لیکن اپنی جامع شخصیت کی بناء پر، پوری کی پوری قوم تھا جو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکی ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔624)۔

خداداد انسانی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا اصول

آپ نے دیکھا ہوگا کہ میونسپل کمیٹی کی پانی کی ٹینکی جاتی ہے۔ اُس کے پیچھے چھید ہوتے ہیں۔ جہاں چھڑکاؤ کی ضرورت ہوتی ہے' وہاں اُن کو کھولتے ہیں۔ ٹینکی بھری ہوئی ہوتی ہے اور چلی جا رہی ہوتی ہے۔ تو ایسے نظر آتا ہے کہ اِس میں کچھ نہیں ہے' خالی ہے اور چلی جا رہی ہے۔ بے ضرورت اُس میں سے ایک قطرہ نہیں ٹپکتا' جہاں ضرورت ہوتی ہے' وہاں پورے کا پورا منہ کھل جاتا ہے۔ ان عربوں کے ہاں وہ ٹینکیاں تو نہیں ہوتی تھیں البتہ مشکیزے ہوتے تھے۔ مشکیزے میں وہ پانی بھر لیتے تھے' پھر اِس قسم کا ایسا مشکیزہ ہوتا تھا کہ جس کا منہ اس طرح سے بند کیا جائے کہ پانی کا ایک قطرہ بھی اُس جگہ نہ ٹپکے جہاں اُس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ سفر میں جائیں اور ان کا مشکیزہ ایسا ہو کہ جیسے وہ چھڑکاؤ کرتا ہوا جا رہا ہو' تو اس پر لڑکے نے کہا تھا کہ ''بھائی وے بھائی! تیری ٹینکی تے چوندی ہپگی اے۔ ایہدے وچوں تے سارا پانی وگدا ہیگا اے[1] ''۔ اگر ٹینکی ایسی ہو کہ وہ خود ہی چوندی جائے تو جہاں پانی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں پہنچنے تک تو سارا پانی ختم ہو جائے گا۔ اُن کے مشکیزے میں سے وہ تھوڑا سا پانی بھی راستے میں ضائع ہو جائے تو پوچھو نہیں کہ قیامت آ جائے گی۔ یہ جو مشکیزہ ہوتا تھا جس میں بھرا ہوا پانی امانت کی طرح محفوظ رہے لیکن جہاں ضرورت ہو' وہاں وہ اپنا منہ کھول دے تو اس کو عرب **قانتًا** کہتے تھے۔ کہا کہ ابراہیمؑ اتنی خصوصیات کا مالک ہے' بے جا' ذرا سی صلاحیت بھی ضائع نہیں ہوتی تھی لیکن جہاں ضرورت ہوتی تھی' وہاں وہ ان کا منہ کھول دیتا تھا۔ کاہے کے لیے منہ کھول دیتا تھا؟ **لـلـــہ** وہ اتنا وسیع الظرف تھا کہ خدا کے مقرر کیے ہوئے مقاصد کے لیے' جو ہیروں سے بھرے ہوئے اپنے اس مشکیزے کا منہ جہاں ضرورت ہوتی تھی کھول دیتا تھا۔ یہ تھا ابراہیمؑ۔ اور خدا کے مقرر کیے ہوئے مقاصد کے سوا اس کا کوئی مقصدِ زندگی نہیں تھا۔ **حـنـیـفًـا** کے معنی ہوتے ہیں ''نک دی سیدھ اچ تریا جانا[2] ''۔ یعنی وہ ادھر اُدھر دیکھے ہی نہیں اور اپنے مقصد کے اوپر اُس کی نگاہ ہو اور سیدھا اُس کی طرف جائے۔ کہا کہ **وَ لَمۡ یَکُ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ** (16:120) یہ مشرک نہیں تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ بُتوں کی پوجا نہیں کرتا تھا' یہ شرک تو بڑا محسوس درجے کا ہے' یہ تو بات ہی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اُن مقاصد کے سوا زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو جو خدا نے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ کسی جگہ بھی اپنی صلاحیتوں کو صرف نہ کرے بجز ان مقامات کے جن کے لیے خدا نے کہا ہے کہ یہ کرو۔ یہ ہوتی ہے توحید۔ کہا کہ وہ مشرک نہیں تھا۔ یہ ہے **اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيۡفًا** (16:120)۔ اقبالؒ (1877-1938) کیا خوب کہہ گیا ہے کہ

بچشمِ کم مبیں تنہائیم را

---

[1] ارے بھائی! تمہاری ٹنکی میں سے تو پانی بہے جا رہا ہے۔ اس سے تو سارا ہی پانی بہہ جائے گا۔

[2] ناک کی سیدھ چلے جانا۔

میں تنہا بیٹھا ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ میں تنہا ہوں۔

کہ من صد کارواں گل در کنارم

میرے آغوش میں تو پھولوں کے ہزاروں کارواں سمائے ہوئے ہیں اور تم مجھے تنہا سمجھ رہے ہو۔ ابراہیمؑ کے آغوش میں تو سینکڑوں کاروانِ گل سمائے ہوئے تھے' جب جا کر امامت کا مقام آتا ہے۔ کہا کہ یہ تھا وہ ملتِ ابراہیمی ◆ جس کے لیے کہا کہ **ثُمَّ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ** (16:123) اے رسول! تیری طرف ہم یہ وحی کر رہے ہیں۔ اب نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہیں۔ یہ وحی ہے کہ **اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا** (16:123) اس ابراہیم ◆ کے مسلک کا اتباع کرو۔ **وَ مَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ** (16:123) جو مشرکین میں سے نہیں ہے۔ اس ملت کا اتباع کرو۔

آج کے مسلمانوں کے متعلق علامہ اقبالؒ کا تبصرہ اور قرآنِ حکیم کا پیغام نوع انسانی کے نام

پھر یاد آ گیا اقبالؒ (1877-1938):

چہ گویمت زِ مسلمان نا مسلمانے

اُس مسلمان کے متعلق میں کیا کہوں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے حالانکہ نا مسلمان ہے۔ اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہوں۔

جز ایں کہ پورِ خلیل است و آزری داند

ابراہیم ◆ کا بیٹا تو یہ ہے لیکن بت پرستی کر رہا ہے۔ اور یہ جو پھر اس کے اوپر ان کے نام لیوا مجاور ہیں' آپ کے ہاں کے بڑے بڑے ملتِ ابراہیمی ◆ کے مدعی ہیں' ان کے متعلق جو کچھ کہہ گیا ہے تو اُس سے نظر آتا ہے کہ آج بھی غالباً وہ دوررس نگاہ رکھ کر کہنے والا ہے۔ کیا نگاہ تھی اُس کی! بڑے غور سے سننے کی بات ہے جو کچھ وہ کہہ گیا ہے:

پسر را گفت پیرے خرقہ بازے

یہ جو ہمارے ہاں کے فرقہ وارانہ مذہبی عالم ہیں' یہ بڑے بڑے فقیہہ بنے پھرتے ہیں' یہ پیر خرقہ باز ہیں۔ پسر را گفت' بیٹے سے کہا کہ بیٹا! ادھر آؤ' تمہیں ایک کام کی بات بتاؤں۔

ترا ایں نکتہ باید حرزِ جاں کرد

جو بات میں تمہیں کہہ رہا ہوں ''اینوں پلے بنھ لے [1]''۔ اس کو اچھی طرح سے حرزِ جان بنالو' یہ بڑے پتے کی بات تمہیں کہہ رہا ہوں۔

---

[1] اسے گوشِ ہوش سے سنو (اور اس پر عمل کرو)۔

بہ نمرودانِ ایں دوآشنا باش
زفیضِ شاں براہیمی تواں کرد

اس دور کے نمرودوں سے آشنا ہو جا اور پھر جو کچھ ان کی طرف سے ملتا ہے تو اُس کو لے کر''براہیمی تواں کرد''۔قرآن نے یہ کہا تھا کہ ملتِ ابراہیمی ◆ کا اتباع کرو تو اُس کے لیے ایک اور لفظ بھی تھا۔ان سے یہ کہا تھا کہ ملتِ ابراہیمؑ کا اتباع کرو اور **وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى** (2:125) مقامِ ابراہیمؑ کو مصلی بناؤ۔

ہمارے ہاں ملتِ ابراہیمی ◆ کے اتباع کی عملی شکل اور مقامِ ابراہیمی ◆ کا مفہوم

مقامِ ابراہیمؑ کو تو آپ نے دیکھ لیا کہ وہ پیدا ہوتے ہی' گھر میں آنکھ کھولتے ہی' کن مشکلات کی وادیوں میں سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں اور کہا ہے کہ ان کا اتباع کرو۔اُس کے بعد یہ کہا کہ اُس کی ملت کا اتباع کرو اور پھر کہا کہ مقامِ ابراہیمی ◆ کو مصلی بناؤ۔میں بتاؤں گا کہ قرآن کے ان الفاظ کے کیا معنی ہیں۔میں عرض کر رہا ہوں کہ جن کے متعلق بنمرودانِ ایں دور کہا ہے' ان چیزوں کے متعلق ہمارے ہاں عمل کیسے ہو رہا ہے۔کعبے کے باہر وہ جسے حریم کعبہ کہا جاتا ہے' وہاں ایک پتھر رکھا ہوا ہے۔کہا کہ یہاں حضرتِ ابراہیمؑ کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے' یہ مقامِ ابراہیمؑ ہو گیا' تو اس پتھر کو تم مصلی بناؤ کہ جو بھی یہاں حج کرنے آئے تو یہاں دو نفل پڑھو ''تے اتباعِ ابراہیمیؑ ہو گیا'' مقامِ ابراہیمی ◆ کو مصلی بنا لیا۔آپ نے دیکھا کہ یہ ملتِ ابراہیمی کی پیروی اور اتباع ہو رہا ہے' مقامِ ابراہیمیؑ کو مصلی بنایا جا رہا ہے۔یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور مطمئن بھی ہیں کہ قرآن نے یہ کہا ہے۔

عزیزانِ من! ''مقام'' کا یہ لفظ تو آپ کے ہاں ہے۔مقامِ ابراہیمؑ کیا تھا؟ انسانیت میں مقامِ ابراہیمیؑ کیا تھا؟ اب مقامِ ابراہیمیؑ کو مصلی بنانا ہے۔اب وہ آ گیا ہمارے ہاں کا پنجابی والا مصلی۔''اے تو شکر ہے کہ ایناں نے مصلی ای کہیا اے۔جے مصلی کہہ دیندے تے اسی کی وگاڑ لیندے اوناں دا[1]''۔یہ جو لائل پور[2] اور منٹگمری[3] کی بار[4] کہلاتی ہے تو یہ پہلے جنگلی سا علاقہ ہوتا تھا' اُس کے بعد اس کو بسایا گیا اور وہاں بڑی محنت کی گئی۔وہاں کے کچھ لوگ وہی اس قسم کے خانہ بدوش یا پرانے زمانے کے لوگ تھے' وہ یونہی سمجھے کہ جیسے وہ مسلمان کچھ ہو ہی گئے۔وہ ان کو اپنے میں سے نہیں سمجھتے تھے' شودر ہی سمجھتے تھے۔تو وہ جو لوگ ہیں کہ ان کو اس طرح سے

---

[1] یہ تو شکر ہے کہ انہوں نے مصلی ہی کہا ہے۔اگر مصلّی کہہ دیتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے۔
[2] پنجاب کا شہر جس کا آج نام فیصل آباد ہے۔
[3] پنجاب کا شہر جس کا آج نام ساہیوال ہے۔
[4] علاقہ۔

اپنے معاشرے میں عزت کا مقام نہ ملے تو وہ زیادہ مذہب پرست ہو جاتے ہیں اور وہ زیادہ نمازیں پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ وہ وہاں کے پرائے خانہ بدوش سے لوگ نمازیں وغیرہ پڑھنے لگ گئے۔ اِس طرح سے کچھ تھوڑا سا مقام ہو جاتا ہے۔ وہ مصلے والے زیادہ ہو گئے' ان لوگوں نے ان کا نام مصلی رکھ لیا۔ یعنی وہ شودر کے شودر ہی رہے' ان کو قابلِ نفرت سمجھا جاتا تھا۔ پوچھا جاتا تھا کہ ''ایہہ کون ہوندا اے؟ جی اے راجپوت ہیگے نیں' تے ایہہ جیہڑے ہیگے نے تے اے مصلی ہوندا اے [1]''۔ یعنی اس کے معنی یہ کہ یہ چوہڑا چمار ہوتا ہے۔ یہ بات آپ کے ہاں یہاں تک پہنچ گئی۔

لفظ مصلّی کا قرآنی مفہوم اور اس کی عملی شکل

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰہٖمَ مُصَلًّی (2:125)۔ مقامِ ابراہیمی کو مصلی بناؤ۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ ایک سیکنڈ میں آپ کے ذہن میں آ گیا کہ قرآن نے کیا کہا ہے۔ اب یہ رہا کہ مصلی ہوتا کیا ہے؟ یہ عربوں سے پوچھو۔ یہ جو ریس کورس ہے' اس میں وہ جو گھوڑوں کا ٹریک ہوتا ہے' وہ ٹریک اُن عربوں کے ہاں مصلی کہلاتا تھا۔ اس لیے ان کے ہاں جو نمبر ایک گھوڑا تھا' اُس کے پیچھے دوسرے نمبر پہ جو گھوڑا ہے وہ اس طرح چلے کہ وہ اس کنوتیوں کے پیچھے پیچھے تو رہے لیکن آگے نہ جائے' اُس کے اور اس کے درمیان فاصلہ بھی نہ رہے۔ یہ جو دوسرے نمبر کا گھوڑا ہوتا تھا تو ان کے ہاں اُسے مصلی کہتے تھے۔ کہا کہ وہ خدا کا اتباع اس طرح کرنے والا ہے کہ اُس سے آگے تو نہیں بڑھتا لیکن اُس میں اور اپنے اندر فاصلہ بھی نہیں رکھتا۔ کہا ہے کہ مقامِ ابراہیمی ◆ کو اپنی منزل رکھو' اس ٹریک کے اوپر چلو اور چلو اس طرح سے کہ یہ تمہارے سامنے تمہارا ٹارگٹ رہے' یہ تمہارا نصب العین رہے۔ یہ ٹھیک بات ہے کہ اُس کے پاس نبوت ہے اور اُس نبوت میں تم نہیں پہنچ سکتے لیکن اتنا بھی پیچھے نہ ہٹ جاؤ کہ ابراہیم ◆ میں اور تم میں درمیان میں فاصلہ آ جائے' یوں چلو جیسے دو نمبر کا گھوڑا ریس کورس میں چلا جاتا ہے۔ یہ ہے وَ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰہٖمَ مُصَلًّی (2:125)۔ یہ تو جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو پھر بڑا آسان ہو جاتا ہے۔

اب ذہن میں آیا کہ نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ ان کی زندگی کو ہم نے اسوۂ حسنہ بنایا ہے' آپ کے لیے بہترین ماڈل بنایا ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ وہ ماڈل کس قسم کا ہے اور پورے ماڈل کی تفصیل خدا نے خود دی ہے۔ پورے خد و خال بھی' پوری رنگینیاں بھی' جلال بھی' جمال بھی' یہ سب کچھ اُس کے اندر آ گیا ہے۔ اس قسم کا حسین ماڈل سامنے رکھ دیا تھا اور کہا ہے کہ یہ تمہارے لیے ماڈل ہے۔

---

[1] یہ کون لوگ ہیں؟ جی! یہ راجپوت ہیں اور یہ جو ہیں یہ مصلّی ہوتے ہیں۔

اس حسین وجمیل ماڈل کے برعکس روایات کی شکل میں پیش کردہ ماڈل کی تصویر

میں نے کہا تھا کہ میں بعد میں یہ عرض کرونگا کہ یہی ماڈل جب ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت کے ہتھے چڑھ گیا' جب یہ ماڈل روایات میں آ گیا' تو اب دیکھیے کہ ان کی رو سے ابراہیم ◆ کا یہ ماڈل کیسا ہمارے سامنے آتا ہے۔ میں یہ عرض کردوں کہ یہ روایات نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ میرا مسلک یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کی نہیں ہوسکتیں' یہ وضعی ہیں' بعد کی بنائی ہوئی ہیں۔ ظلم یہ کیا ہے کہ یہ وضع خود کی ہیں اور ان کی تقدیس قائم کرنے کے لیے انہیں حضورِ نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ دو ہی شخصیتیں ہیں جن کی زندگی کو اسوۂ حسنہ بنایا ہے۔ وہ بات ہمارے سامنے آ گئی تھی کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے خدا سے یہ پوچھا تھا کہ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ❶ (2:260)۔ یہ بات میں نے پوری وضاحت سے سمجھا دی تھی کہ ابراہیمؑ کو اُس میں شک نہیں تھا کہ خدا زندہ نہیں کرسکتا۔ خدا نے کہا تھا کہ تمہارا ایمان ہے یا نہیں؟ تو اُنہوںؑ نے کہا تھا کہ میرا ایمان ہے کہ یہ ہوتو سکتا ہے لیکن میں پوچھتا یہ ہوں کہ اس کا طریقہ کیا ہے تا کہ میں وہ طریقہ اختیار کروں کہ اُس سے یہ قومِ مُردہ زندہ ہو۔ بات اتنی تھی۔ اس بات پر اتنا بڑا یقین ہے کہ خدا زندہ کرسکتا ہے۔ ابھی دو آیات پہلے (2:258) میں تو بادشاہ کے ساتھ مناظرے میں حضرت ابراہیمؑ نے دلیل یہ دی تھی کہ میرا خدا وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ کو اس سے بڑا یقین تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

اب روایات کے اندر آیئے کہ اسوۂ ابراہیمی کیا پیش کیا جا رہا ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرتِ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ ہم شک کرنے میں ابراہیمؑ سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں کہ جب اُنہوںؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار! تُو مجھے دکھا کہ تُو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ جب ابراہیمؑ نے یہ کہا اور اُس میں شک کیا تو ایک اتنے بڑے جلیل القدر نبی نے تو شک کیا اور دوسرا اُس سے بڑا عظیم المرتبت نبی ﷺ یہ کہہ رہا ہے کہ ہمیں ابراہیمؑ سے بھی زیادہ شک کرنے کا حق حاصل ہے (معاذ اللہ)۔ عزیزانِ من! اگر ان انبیائے کرام کو بھی شک پیدا ہوتا ہے تو ہم اس آسمان کے نیچے کہاں یقین ڈھونڈنے جائیں گے۔ قرآن میں ان دونوں شخصیتوں کو ہمارے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا جا رہا ہے۔ (معاذ اللہ) ایک کو شک ہوا اور دوسرے نے کہا کہ ہم شک کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں اور ان دونوں کا اسوہ ہمارے لیے نمونہ ہے تو ہمارا تو ایمان ہی کہیں نہیں رہ سکتا۔

عزیزانِ من! بتایئے! جس کے نزدیک حضرتِ ابراہیم ◆ اور اُن کے بعد حضورِ خاتم النبیین ﷺ کا ایک ایک نقشِ قدم ستاروں کی طرح جگمگا رہا ہے' اُنہی کے اوپر چلنے کے بعد ہم مقصدِ انسانیت کے اوپر پہنچ سکتے ہیں' اُن کے متعلق میں کیسے مان لوں کہ یہ بات رسول

---

❶ مجھے بتا دیجیے کہ مُردہ قوم کے ازسرِ نو زندہ ہونے کے لیے کیا طریق اختیار کیا جائے؟ (ماخوذ پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 102 تا 103)۔

اللہ ﷺ نے فرمائی تھی۔عزیزانِ من! آپ تو کفر کہتے ہیں' میں کہتا ہوں کہ مجھے پھانسی پہ لٹکا دیجیے' میں اپنے لیے سب کچھ برداشت کرونگا لیکن نبی اکرم ﷺ کے متعلق کبھی یہ چیز برداشت نہیں کرسکتا کہ آپؐ نے یہ بات کہی تھی۔عزیزانِ من! وہ تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ماڈل ہیں اور زندگی تو یقین سے چلتی ہے:

سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی
(اقبالؒ: بالِ جبریل)

حضرت ابراہیمؑ شیطان کے نرغے میں (معاذ اللہ' معاذ اللہ)

یہیں ان روایات کا معاملہ ختم نہیں ہوگیا تھا۔سوال پیدا ہوا کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے کیسے شک کرلیا۔اُسی روایت کے آگے ہے کہ حضرتِ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ ابراہیمؑ نے یہ خود نہیں کیا تھا بلکہ شیطان نے ان کو وسوسہ دیدیا تھا۔یہ اُن کی طرف سے Defence (دفاع) کیا جارہا ہے۔ابلیس نے خدا سے کہا تھا کہ ذرا مجھے چھٹی دے اور یہ نہ کرنا کہ میں آدم کے ساتھ کچھ کروں اور تُو درمیان میں میرا ٹینٹوا دبادے۔خدا نے کہا کہ میں چھٹی تو دیتا ہوں۔کہنے لگا کہ چھٹی تو دے' پھر دیکھ کہ میں اسے کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔خدا یہ کہہ رہا ہے کہ ٹھیک ہے تُو جو جی میں آئے کرکے دیکھ لے لیکن میرے مخلص بندوں کے اوپر تیرا کسی قسم کا غلبہ نہیں ہوسکے گا۔چل تیری اور میری یہی شرط رہی اور چیلنج رہا کہ

تُو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

میرے مخلص بندوں کے اوپر تیرا کبھی غلبہ نہیں ہوگا۔خدا ابلیس کو چیلنج دے رہا ہے۔اور یہاں روایت میں کہا جارہا ہے کہ ابراہیمؑ جیسے مخلص بندوں کے اوپر اُس کا غلبہ یہ تھا کہ اُس نے وسوسہ ڈالا اور وہ خدا کے متعلق شک کرنے لگ گئے (معاذ اللہ)۔عزیزانِ من! یوں میں منکرِ حدیث ہوں۔اور آگے چلیے لیکن کلیجہ تھام لیجیے۔کہا کہ ایک دفعہ اُس قوم نے حضرتِ ابراہیمؑ سے کہا کہ چلو باہر' وہاں ستارہ پرستی کا جشن منایا جارہا ہے۔اُنہوںؑ نے کہا تھا کہ نہیں بھئی' میں بیمار ہوں۔اُس کے بعد روایت میں یہ آیا کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے جھوٹ بولا تھا' وہ بیمار ویمار کچھ نہیں تھے۔تھوڑی سی عربی جاننے والا جانتا ہے کہ محاورے کے اندر سقیم کا لفظ ہے جس کو آپ انگریزی میں No, I am sick of it.[1] کہتے ہیں۔بعینہٖ عربی زبان میں یہ چیز ہوتی ہے کہ میں تمہارے ان معبودوں سے بیزار ہوں۔خود ابراہیمؑ نے یہ کہا ہے کہ I am sick of it. یہ عربی محاورہ ہے یعنی وہ کہتے ہیں کہ او بابا! میں تمہارے ان معبودوں سے بیزار ہوں' جاؤ تم اپنے تہواروں کے اندر' میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ میں تو ان کو مانتا ہی نہیں۔

---

[1] نہیں' میں اس سے بیزار ہوں۔

اب جبکہ روایت کی رو سے یہ کہتے ہیں کہ اُنہوں نے کہا تھا کہ میں بیمار ہوں۔ چلو اچھا اگر کہا بھی تھا تو ہوسکتا ہے کہ بیمار ہی ہوں۔ یہ بھی بخاری کی حدیث ہے کہ وہ بیمار و بیمار کچھ نہیں تھے' پھر اُنہوں نے اُس بت کدے کے اندر وہ بُت توڑے اور ایک بڑے بُت کو چھوڑ دیا تھا۔ اُنہوں نے آ کر پوچھا تھا کہ کیا تم نے ایسا کیا؟ تو کہا تھا کہ نہیں' میں نے تو نہیں کیا' اس سے پوچھو حالانکہ یہ بات نہیں تھی۔ عزیزانِ من! یہ واقعہ میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ اُنہوں نے یہ کہا تھا کہ تم اس کو تو بعد میں لینا کہ یہ کس نے کیا ہے' یہ جو ایک بڑا بت سلامت ہے' جس کے متعلق تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ غیب کی باتیں بھی بتایا کرتا ہے تو اِس کے سامنے یہ سب کچھ ہوا ہے' تم اس سے کیوں نہیں پوچھتے کہ کیا ہوا ہے اور کس نے کیا ہے؟ قرآن میں یہ ہے کہ اُس پہ اُنہوں نے ایک طرف لے جا کر کہا تھا کہ ابراہیمؑ! کیوں لوگوں کے سامنے ہمارے پیچھے پڑ گئے ہو؟ تمہیں تو پتہ ہے کہ بُت بولا نہیں کرتے۔ اُس پہ اُنہوںؑ نے کہا تھا کہ لعنت ہے تم پہ اور تمہارے بتوں کے اوپر' یہ جانتے ہوا ور لوگوں کو دھوکا دیتے ہو۔ لیکن روایت میں کہہ رہے ہیں کہ یہ ابراہیمؑ کا دوسرا جھوٹ تھا اور ایک تیسرا جھوٹ بھی بولا۔ کہنے لگے کہ جب آپؑ ہجرت کر کے گئے ہیں تو اپنی بیوی حضرتِ سارہ ساتھ تھیں' مصر میں سے آپ گزرے' وہاں کا بادشاہ بڑا مستبد تھا۔ سنا یہ تھا کہ جو بھی اُس راستے سے گزرتا ہے' وہ اُس کی بیوی کو پکڑ لیتا ہے۔ اُنہیں وہاں پتہ چلا تو اُنہوںؑ نے کہا کہ اب کیا کیا جائے؟ اِنہوں نے بیوی سے کہا کہ اگر وہ تمہیں پکڑیں اور تم سے پوچھیں تو کہہ دینا کہ میں تو ان کی بہن ہوں۔ اس افسانے میں یہ بھی ہے کہ اُس بادشاہ نے ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ پتھر کا ہو گیا' پھر ہاتھ بڑھایا تو پھر پتھر کا ہو گیا۔ یہ جو کچھ بھی ہے لیکن جھوٹ بلوانا تو ضروری تھا۔ اس لیے روایت میں ہے کہ کہا کہ میں تو ان کی بہن ہوں۔ کہنے لگے کہ یہ تیسرا جھوٹ ہو گیا۔ اب بخاری شریف کے اندر یہ چیز موجود ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا۔

خود قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم ◆ کو صدیق کے لقب سے نوازا ہے

خدا کا ایک اتنا بڑا نبی ہے جس کے لیے ویسے بھی ضرورت نہیں ہے لیکن ان کے لیے خاص طور سے قرآن نے کہا ہے کہ یہ **صِدِّيْقًا نَّبِيًّا** (19:41) ہے یعنی صادق ہی نہیں' خدا نے صدیق کہا ہے کہ جو کبھی جھوٹ نہ بولے اور ہمیشہ سچ بولے۔ عزیزانِ من! اگر یہ نہ بھی ہوتو بھی نبی کا سچے ہونے پر ہمارا ایمان ہے' ہم اِس کو مانتے ہیں کہ اُس پر وحی آتی ہے ورنہ وحی کا تو ثبوت ہی اور کوئی نہیں ہوتا۔ جب تک رسول کی صداقت پر ایمان نہ لایا جائے اُس کی نبوت پر ایمان لایا ہی نہیں جاسکتا۔ اُس کی اور کوئی دلیل ہی نہیں ہوتی۔ دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اور ہم کہتے ہیں کہ تُو سچ بولتا ہے۔ اور اگر نبی کے متعلق بھی یہ ہو جائے کہ وہ جھوٹ بول سکتا ہے تو پھر پتہ نہیں وہ کن کن باتوں میں جھوٹ بولتا ہے۔ آپ سوچیے کہ ایک نبی حضرت ابراہیمؑ جیسا (معاذ اللہ) تین دفعہ جھوٹ بولتا ہے اور

رسول اللہ ﷺ جیسا نبیؐ صادق کہتا ہے کہ اُنہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ بخاری شریف میں ہے۔ ارے بھئی! یہ کیا جھوٹ بولا؟ تو کہنے لگے کہ وہ جو پہلے دو جھوٹ تھے، وہ دین کی خاطر تھے لیکن یہ آخری جھوٹ اپنی بیوی کی عزت بچانے کے لیے بولا تھا۔ یہ اس میں نظریۂ ضرورت (Law of Necessity) آ گیا۔ عزیزانِ من! یہ جتنی بھی بخاری شریف کی شرحیں آگے لکھی ہوئی ہیں ان میں یہ Defence (دفاع) اور شرح پیش کی جاتی ہے۔

روزِ قیامت خدا کے حضور حضرت ابراہیمؑ کی پریشانی کی کیفیت

وہ جو کہتے ہیں کہ چور سے کہیں نہ کہیں کوئی کمی رہ جاتی ہے جس سے وہ پکڑا جاتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو پاؤں کا نشان ہی سہی، کہیں ہاتھ کا نشان لگ جاتا ہے۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ ارے اگر دین کی خاطر تھا تو آپ کو اس پہ فخر ہونا چاہیے۔ اسی بخاری شریف میں یہ بات ہے کہ قیامت میں یہ گناہگار انسان جو جہنم کی طرف جانے والے ہونگے، وہ اپنے سفارشی ڈھونڈنے کے لیے مارے مارے پھریں گے۔ حضرتِ آدمؑ سے شروع کرتے ہیں اور ایک ایک نبی کے پاس جاتے ہیں اور وہ یہ کہتا ہے کہ بابا! تم اپنی سفارش کے لیے کہتے ہو میں تو خود اتنا بڑا گناہگار ہوں کہ خدا کے ہاں جاتے ہوئے شرماتا ہوں۔ وہ ایک ایک نبی کا گناتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ حضرتِ ابراہیمؑ کے پاس آتے ہیں کہ آپ تو خدا کے منتخب کردہ اور مجتبیٰ اور خلیل ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ چلا تو جاتا لیکن میں نے وہ جو جھوٹ بول دیئے ہیں تو اُس کی وجہ سے مجھے شرم آتی ہے۔ یعنی بجائے اِس کے کہ وہ فخر کریں کہ دین کی خاطر جھوٹ بولے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کے سامنے جاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کیا اسوہ پیش کر رہے ہیں۔ یقیناً ہر معقول آدمی کے ذہن میں یہ سوال ہوگا کہ بابا! اتنی کھلی سی بات ہے، یہ بات نہیں ہے کہ پرویز نے یہ بتایا ہے۔ ارے بخاری وغیرہ کی کتابوں کے اندر تیرہ سو سال سے یہ موجود چلی آ رہی ہیں۔ قرآنِ شریف تو ان کے ہاں پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ بخاری شریف کا اتنا دور ہوتا ہے، اتنے ختم ہوتے ہیں اور اُس کے اندر یہ کچھ ہے تو پھر یہ کیا بات ہے کہ ان کو یہ Strike نہیں ہوتا کہ کیوں نہ اُس میں سے یہ کہہ کے انہیں نکال دیں کہ یہ روایات رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتیں۔

اس قسم کی چیزوں کو کیونکر بیان کیا اور رکھا جاتا ہے

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اُس میں پہلے نہ بھی ہوتیں تو بھی یہ خود داخل کر دیتے۔ اس بات کے کہنے کی یہی تو سند ہے جو آج کہا جا رہا ہے کہ دین میں صداقت تو بہت بڑی چیز ہے لیکن زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی آ جاتی ہیں کہ جن میں جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ ارے! تم کیسے کہہ رہے ہو۔ کہنے لگے کہ حضرت ابراہیم ◆ نے جو بولا تھا۔ اپنے جھوٹ کی تائید اور سند کے لیے خدا کے اتنے جلیل القدر نبیؑ اور

حضورؐ کی طرف یہ منسوب کر رہے ہیں کہ آپؐ نے یہ فرمایا تھا۔ یہ جتنی وضعی روایات بنائی ہوئی ہیں' آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے اپنی اپنی کرتوتوں کی تائید یں لینے کے لیے یہ چیزیں رکھی ہیں کہ شک بھی پیدا ہو رہا ہے اور جھوٹ بھی بولا جا رہا ہے۔

حضرت ابراہیم ◆ کو آگ میں جلانے کا افسانہ

درمیان میں ایک بات بڑی دلچسپ آتی ہے کہ اُنہوں نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم ◆ کو پکڑو' اس کو آگ میں ڈال دو' اس کو جلاؤ۔ وہ تو سیدھی سی بات ہے' قرآن نے خود کہا تھا کہ وہ آتشِ انتقام تھی جس کو وہ اس طرح سے بھڑکا رہے تھے اور ہم نے اُن کی سازش کو کامیاب ہونے ہی نہیں دیا' اور اُس سے پہلے ہی ہم ابراہیمؑ کو وہاں سے نکال کے لے گئے۔ قرآن یہ بات کہہ رہا ہے لیکن اس میں تو اِن کے لیے کوئی مزے کی بات ہوئی ہی نہیں' وہ زیبِ داستاں والی بات تو ہوئی نہیں۔ اب آیا افسانہ کہ اُنہوں نے جلانے کے لیے یہ کچھ اکٹھا کیا' پتہ نہیں وہ غالبًا آج کے حساب سے لیا جائے تو ایک میل لمبا اور ایک میل چوڑا اور آدھا میل اونچا الاؤ تھا۔ یعنی ایک آدمی کو جلانا ہے اور یہ سارا کچھ کیا جا رہا ہے۔ اور پتہ نہیں کتنا عرصہ تک ساری قوم اور ساری قوم کی عورتیں بھی باہر سے لکڑیاں اکٹھی کر کے اُس میں ڈالتی گئیں۔ اب اُس کے بعد اُس کو جب جلانے لگے تو اُسے آگ نہ لگے۔ وہ لکڑیاں جل نہیں رہی تھیں' آخر میں یہ بیچارے لوگ مجبور ہو گئے۔ یہ جسے ہم گرگٹ کہتے ہیں تو کہنے لگے کہ یہ آیا اور اُس نے آکر پھونکیں ماریں تو اُس کی پھونکوں سے آگ لگی۔ حدیث میں ہے کہ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہیں کہیں یہ گرگٹ نظر آئے تو اسے فوراً مار دینا۔ حضرتِ عائشہؓ نے گھر کے اندر ایک نیزہ رکھا ہوا تھا۔ پوچھا کہ یہ کاہے کے لیے ہے؟ کہنے لگیںؓ کہ گرگٹ مارنے کے لیے ہے کیونکہ اس نے وہ آگ مشتعل کی تھی اور یہ حضرت ابراہیم ◆ کو جلانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

عزیزانِ من! میں ان چیزوں کے اوپر کیا عرض کروں' نہ ہنسیے بلکہ روئیے۔ یہ ہیں جسے مثلہ معہ کہا جاتا ہے یعنی قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل۔ یہ اسوۂ حسنہ پیش کیا جا رہا ہے۔ بہرحال وہ بھی کیا اور اُس کے بعد وہ اونچا سا الاؤ بنا دیا۔ کہا کہ اب اِس میں آپ ◆ کو ڈالیں کیسے۔ کہنے لگے کہ کیسے ڈالیں گے؟ پتہ نہیں ایران کا کوئی چلا آ رہا تھا۔ اُس کے پاس یہ' جیسے کرین ہوتی ہے' اس قسم کی چیز تھی' اُس میں آپ کو لٹکا کر پھر اُس میں ایسے ڈالا تھا۔ آپؑ اُس آگ کے اندر چالیس دن رہے تھے اور وہ پھول بن گئی تھی۔ ہمارے لیے یہ اسوہ ہوا کہ اگر ایسا ہو جائے تو کوئی بات نہیں ہے' آگ میں ڈالے بھی جاؤ تو کیا وہ آگ پھول بنے گی؟

اب آ گیا تعمیرِ کعبہ کا ذکر' یہ بڑا اہم واقعہ ہے جس کے لیے قرآن نے ذبحِ عظیم کہا ہے کہ اُس کے لیے حضرت اسماعیلؑ کو رکھا ہے۔ وہ بیٹے کو لے کر آ گئے۔ قرآن خود یہ کہہ رہا ہے کہ جب وہ بیٹا اتنا بڑا ہوا کہ باپ کے ساتھ کام کاج میں ہاتھ بڑھانے لگ گیا تو فطرت

کے پروگرام کے مطابق وہ اُدھر لے کر آئے اور یہاں آ کر بسایا۔ یہ وہ مقام ہے جس کے بعد خدا نے کہا ہے کہ او ابراہیمؑ! تجھ پہ شاباش' تُو تو ہر آزمائش میں پورا اترا ہے۔ یہ کتنی بڑی آزمائش تھی جو تو نے کیا ہے!

حضرت ہاجرہ کنیز اور حضرت سارہ بحیثیت بیوی کی باہمی رقابت کا افسانہ

اب یہ دیکھیے کہ وہ اس آزمائش میں کیسے پورے اترتے ہیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ اول اول جس عورت نے گھا گھرا پہنا' وہ والدۂ اسماعیل ◆ ہیں۔ اُنہوں نے گھا گھرا اس لیے پہنا کہ اُن کے نشانِ پا کا راستہ سارہ کو پتہ نہ لگے۔ اِس کی تشریح ''فتح الباری'' میں یہ کی گئی ہے کہ حضرتِ ابراہیم ◆ کی پہلی منکوحہ بیوی حضرتِ سارہ تھیں اور یہ جو حضرتِ ہاجرہ ہیں یہ اُن کی کنیز تھیں جو حضرتِ سارہ نے ہی اُن کو تُحفہ میں دی تھی۔ حضرتِ سارہ سے اولاد نہیں تھی' حضرتِ ہاجرہ سے اولاد ہوتی تھی۔ اولاد ہوئی تو جسے سوکن کہتے ہیں تو سوکن کا رقابت کا جذبہ تھا' اُنہوں نے ابراہیم ◆ سے کہا کہ اس کو باہر نکال دو۔ حضرتِ ہاجرہ کے ہاں حضرتِ اسماعیلؑ پیدا ہو گئے۔ اس سے وہ رقابت و انتقام کا جذبہ اور زیادہ تیز ہو گیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اسے باہر نہ نکالو۔ اُس نے قسم کھالی کہ میں ضرور ہاجرہ کے تین اعضاء کاٹ ڈالوں گی یعنی ناک اور دو کان۔ پس ہاجرہ نے ایک گھا گھرا لیا اور کس کر اُس کو اپنی کمر میں باندھ لیا' بھاگ نکلی اور اُس کا دامن گھسیٹتی گئی تا کہ اُس کے آثارِ پا کا سارہ کو پتہ نہ لگے۔ یعنی اگر ویسے چلتی تو صرف پاؤں کے ہی نشان پتہ چلتے۔ تو اب جو اُس کے بعد گھا گھرے کے ساتھ مٹانا شروع کیا ہے تو پاؤں کے نشان تو مٹ گئے' گھا گھرے کا نشان تو باقی رہا ہوگا۔ اب ملاحظہ فرماؤ کہ وہ کرنے والی بی بی اور یہ بتانے والے شارح پاؤں کا نشان مٹا رہے ہیں لیکن وہ پکڑی گئی۔ ابراہیمؑ لے آئے۔ سارہ نے کہا کہ میں نے تو قسم کھائی ہوئی ہے۔ کہنے لگے کہ بی بی! خدا کا نام مانو' کیوں ایسا کرتی ہو؟ کہا کہ یوں کر واس کے دونوں کانوں میں تم یہ چھوٹی چھوٹی بالیاں ڈال دو اور ناک میں چھوٹی سی نتھ ڈال دو اس طرح تیری قسم پوری ہو جائے گی۔ قسم تو پوری کی لیکن کہا کہ میں اس کو یہاں رہنے نہیں دونگی اس لیے تو اس کو نکال دے۔

بی بی ہاجرہ' چھ ماہ کی عمر کے اسماعیل ◆' صحرا کا سفر اور پانی کی تلاش کا افسانہ

حضرت سارہ کی رقابت کی وجہ سے ابراہیمؑ مجبور ہو گئے اور وہ ہاجرہ کو اور چھ مہینے کے بچے اسماعیل ◆ کو لے کر وہاں سے چل پڑے۔ حضرت سارہ نے کہا تھا کہ ان کو وہاں چھوڑنا جہاں نہ آدم' نہ آدم زاد' کہیں دور دور نظر نہ آئے۔ وہاں وہ لے کر آئے اور اس مقام پر دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی اور یہاں لا کر اپنی بیوی اور چھ مہینے کے بچے کو اُس مقام پہ جہاں کوئی سبزی کا نام و نشان تک نہیں تھا' کوئی انسان قریب قریب نہیں تھا' ایک جھاڑی کے پاس اُن کو لا کر بٹھا دیا' پانی کا ایک چھوٹا سا مشکیزہ اور تھوڑی سی کھجوریں دیدیں۔ پھر ابراہیمؑ

پیچھے کو چل پڑے' والدۂ اسماعیل ان کے پیچھے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں کہ اے ابراہیم ◆! آپ ◆ ہم کو اس وادی میں چھوڑ کر کہاں جاتے ہیں کہ جس میں نہ کوئی غمخوار نہ کوئی انسان اور نہ کوئی چیز ہے؟ عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ اسوۂ حسنہ پیش ہو رہا ہے' بیوی ہے اور چھ مہینے کا بچہ ہے اور اُس جگہ چھوڑ رہے ہیں جہاں کوئی نشان نہیں ہے' کوئی آدمی نہیں ہے' کوئی آبادی نہیں ہے اور کوئی کھانے پینے کی چیز نہیں ہے۔ تھوڑی سی کھجوریں اور پانی کا اتنا سا مشکیزہ جو دو دن میں ختم ہو جائے گا۔ بیوی پیچھے پیچھے جا کر یہ کہہ رہی ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آج کسی شخص کے متعلق یہ کہیے کہ اُس نے اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ یہ کیا تھا تو دیکھیے کہ کیا اسوہ بنتا ہے۔ میری تو زبان زیب نہیں دیتی اور میں یہ کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ کہہ رہی ہے کہ ابراہیم ◆! ہمیں یہاں کس کے حوالے کر کے چھوڑ رہے ہو؟ اب وہاں جواب تو کوئی نہیں بن پڑتا' وہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ کا حکم ہے اس لیے میں یہ کر رہا ہوں۔ ابھی تک تو یہ ابراہیمؑ ہی تھے اور اب یہ درمیان میں اُن کو بھی لے آئے کہ خدا یہ حکم دے رہا ہے۔ وہ خدا کہ جس نے ربوبیتِ عالمینی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ اور پھر وہ جو پانی ختم ہوا تو پھر وہ بیچاری بچے کو جھاڑی کے سائے میں لٹاتی تھی اور بھاگی بھاگی اُس ٹیلے پہ جاتی تھی کہ دور دور دیکھوں کہ کہیں پانی ملے اور پھر بچہ روتا تھا تو بھاگی ہوئی آتی تھی۔ اس طرح سے وہ بار بار جاتی تھی۔ وہ جو صفا اور مروہ میں کہتے ہیں کہ یہ سنتِ ہاجرہ ہے' جو وہ بھاگ بھاگ کر پوری کرتے ہیں۔ پانی نہیں ملا تو وہ وہاں آئیں اور وہاں جبرئیل فرشتہ آیا اور اُس نے بتایا۔ اُنہوں نے جب ایڑیاں رگڑی تھیں تو پھر وہاں سے پانی کا چشمہ اُبلا اور وہ جو چشمہ تھا اُسے زم زم کا کنواں کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! اسوۂ ابراہیمی ◆ بیان ہو رہا ہے۔ کعبے کی تعمیر مشیت کا پروگرام ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرتِ اسماعیلؑ جب اتنے بڑے ہو گئے کہ وہ باپ کے ساتھ کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گئے' کہا کہ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْىَ [1] (37:101) ان باپ بیٹوں نے اس طرح سے وہ تعمیرِ کعبہ کی۔ یہ روایت کی رو سے کہہ رہے ہیں کہ وہ چھ مہینے کے بچے کو یہاں چھوڑ گئے۔

حضرت ابراہیم ◆ کا حضرت اسماعیل ◆ کو گھر کی چوکھٹ بدلنے کا حکم

اب اگلی بات یہ ہے کہ حضرت اسماعیل ◆ نے شادی بھی کی تھی اور حضرت ابراہیمؑ کبھی کبھی ملنے کے لیے آتے تھے۔ بیوی حضرت سارہ نے یہ حکم لگا دیا تھا کہ آپ جاتے ہیں تو سواری کے اوپر بیٹھے بیٹھے ان کو مل کر آ جانا اور سواری سے اترنا نہیں۔ اندازہ لگائیے کہ یہ اسوہ ہے' یہ بیوی کا حکم ہے کہ بیٹے کو اور بہو کو ملنے جا رہے ہو تو سواری سے نہیں اترنا اور کھڑے کھڑے مل کر آ جانا۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ اس خاوند کے متعلق بیوی کے لیے کیا چیز تھی (معاذ اللہ)' بہو کے پاس جا رہے ہیں' بیٹی کے پاس جا رہے ہیں' چنانچہ وہ آئے تو اسماعیلؑ گھر پہ

---

[1] جب وہ بیٹا بڑا ہوا اور باپ کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1043)۔

نہیں تھے۔ بیٹی نے دیکھا کہ آپؑ کا سر الجھا ہوا ہے' دھویا ہوا نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ آیئے' میں آپ کا سر دھو دوں۔ اُنہوںؑ نے کہا کہ بیٹی! میں ایک طرف سر جھکا تا ہوں' تم نیچے پتھر رکھو۔ اُنہوں نے سواری پہ بیٹھے بیٹھے پہلے ادھر سر دھویا اور پھر اُدھر سر دھویا' پھر یہ کہہ کے چلے گئے کہ اسماعیلؑ آتا ہے تو اُس سے کہنا کہ اپنی چوکھٹ کو بدل دو۔ وہ چلے گئے۔ اُنہوں نے کہا کہ والد صاحب تشریف لائے تھے اور میں نے اس طرح اُن کا سر دھویا اور اُنہوں نے کہا کہ اپنی چوکھٹ کو بدل دو۔ اُنہوںؑ نے بیوی سے کہا کہ طلاق طلاق طلاق۔

سینہ تمام داغ داغ ' پنبہ کجا کجا نہم

روایات کی بنا پر حضرت ابراہیم ◆ کو کن بڑے ابتلا کو سر کرنا تھا؟

قرآن کہتا ہے کہ اسوۂ ابراہیمیؑ تمہارے لیے ماڈل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ ابراہیمؑ کے سامنے بڑے بڑے ابتلا آئے اور وہ ہر ایک میں پورا اترا۔ جب پورا اترا تو ہم نے کہا کہ شاباش' ابراہیم ◆ تمہاری کیا بات ہے! یہ ہیں وہ تمہارے جوہر' جن کی وجہ سے تمہیں ہم نے امام للناس بنایا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ ابتلا اور یہ آزمائشیں ہیں جن پہ پورا اترنے کے بعد یہ اس مقام پہ پہنچے ہیں اور خدا نے امام للناس بنایا ہے۔ یہ کیا چیز تھی؟ سنیے کہ روایات میں کیا ہے؟ کہنے لگے کہ یہ بڑے اہم معاملے تھے جن کا حکم دیا اور اُنہوں نے مانا۔ ابنِ کثیر کی تفسیر میں ہے کہ حکم یہ تھا کہ مونچھیں سامنے سے ترشوانا' کُلی کرنا' ناک صاف کرنا' مسواک کرنا' سر کے بال منڈانا یا ذرا لمبے چھوڑنا' ناخن ترشوانا' بغل کے بال لینا' استنجا کرنا' جمعہ کے دن غسل کرنا۔ یہ احکاماتِ خداوندی تھے جب ابراہیمؑ نے ان کی تعمیل کی تو خدا نے کہا کہ شاباش ابراہیم ◆ ! اب تمہیں دنیا کا امام بنا دیا گیا ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے وہ اسوہ جو ان روایات کی رو سے پیش ہوتا ہے۔ میں جرأت نہیں کر سکونگا کہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کا اسوہ روایات سے پیش کر سکوں۔ بات حضرتِ ابراہیمؑ کی ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہیں وہ روایات جن سے انکار کرنے پر میرے اوپر ہزار علما نے کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ عزیزانِ من! اگر یہ کفر ہے تو ان انبیائے کرامؑ کی شان کی مدافعت میں' میں ان سے انکار کرونگا' چاہے دس ہزار دفعہ کفر کا فتویٰ لگا دیجیے۔ میں ان کے دامن میں پناہ لے لونگا اور کہونگا کہ یا اللہ! میں نے تو حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو داغدار ہونے سے بچانے کے لیے یہ کچھ کیا تھا اگر یہ کفر ہے تو ہوا کرے۔ جو بھی کچھ کرتا ہے کہ ان داغوں کو کسی طرح سے مٹا دے' تو اس سے بڑا ثواب کا کام دنیا میں نہیں ہو سکتا۔



❁ ...... ❁ ❁ ❁ ...... ❁

ساتواں باب: **العنکبوت** (آیات 16 تا 18)



عزیزانِ من! آج مئی 1979ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 16 سے ہو رہا ہے: (29:16)۔ آپ کو یاد ہے کہ اس آیہء مبارکہ سے درس کا آغاز تو چار درس پہلے ہو جانا چاہیے تھا لیکن درمیان میں حضرتِ ابراہیمؑ کے اسوۂ حسنہ کی جو داستانِ جلیلہ سامنے آئی، تو تین ❶ درس اُس میں لگ گئے، اگرچہ میرے نزدیک اور قرآن کی رو سے بھی وہ تشنۂ تکمیل ہی رہی لیکن بہرحال آگے آئیں گے تو اُس کے اور ٹکڑے بھی قرآن میں آتے جائیں گے۔

قرآنِ حکیم کے کسی ایک لفظ کا متبادل یا ترجمہ قرآنی تعلیم کی روح کو مسخ کر دیتا ہے

آج بھی جو درس اب شروع ہو رہا ہے، وہ اُسی آیت سے ہے کہ وَ اِبۡـرٰهِيۡـمَ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهِ اعۡبُدُوا (29:16)۔ یہیں سے ہم نے بات شروع کی تھی اور ہم پورے اسوہ کو سامنے لے کر آئے تھے تاکہ ایک دفعہ پورا نقشہ سامنے آ جائے۔ جسے قرآن نے نوعِ

---

❶ (1) چوتھا باب آیت 16: اسوۂ ابراہیمیؑ (ابتدائیہ بابل کی زندگی)

(2) پانچواں باب آیت 16: اسوۂ ابراہیمیؑ (تعمیر کعبہ سے پہلے تک)

(3) چھٹا باب آیت 16: اسوۂ ابراہیمیؑ (وادیٔ حجاز اور تعمیرِ کعبہ)

انسانی کے لیے بہترین ماڈل قرار دیا ہے' وہ تین درسوں میں ہمارے سامنے آ گیا تھا۔ اب وہ آیت شروع کرتے ہیں جہاں سے بات اسوہ کی طرف گئی تھی۔ کہا کہ **وَ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ** (29:16) ابراہیم ◆ نے اپنی قوم سے کہا کہ اطاعت اور محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کے ذرا ترجمے بدل لیے اور ترجمہ ہی نہیں بلکہ وہ تو اردو زبان میں بھی ترجمہ بدل جاتا ہے۔ عربی میں بھی ان الفاظ کا اُنہوں نے جو مفہوم لیا تو اُس سارے مفاہیم اور جتنے تراجم اور جتنی تفسیریں ہیں اُن میں ایک لفظ کا ترجمہ ذرا سا یوں بدل دیجیے تو زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ **اعْبُدُوا اللّٰهَ** کا ترجمہ' پرستش اور پوجا کیا' تو اِس ایک لفظ کے ترجمے سے دین سے مذہب پہ آ گئے' ہدف ہی بدل گئے' مقاصد بدل گئے' زندگی کے معارف بدل گئے۔ اُنہوں نے یہ کہا کہ صاحب! اللہ کی پرستش کیا کرو تو کیا کسی کو اعتراض ہو سکتا ہے!!

پوجا یا پرستش پر تو کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا

پرستش تو اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے ہوتی ہے یعنی تسبیح' ورد' وظائف' زیادہ سے زیادہ کچھ نوافل' کچھ نمازیں اور کچھ روزے۔ تو اس کی مخالفت کون کرتا ہے۔ مخالفت کو ہم اسوہ حسنہ میں دیکھ چکے ہیں کہ باپ [1] سے کہا تو اُس نے مخالفت کی ورنہ وہ کہتا کہ اچھا' تمہیں یہ پسند نہیں ہے جو میں کہتا ہوں تو تم اپنے طور پہ کوئی دو چار سجدے کر لیا کرو۔ یہاں مخالفت کی اتنی اہم بات تھی کہ جا کر بادشاہ [2] سے ٹکر لی۔ عزیزانِ من! پوجا اور پرستش کے لیے تو کسی بادشاہ سے ٹکر نہیں لینی پڑتی۔ وہ تو سات سمندر پار سے یہ جو انگریز آئے تھے' اُنہوں نے آپ کو غلام اور محکوم بنایا تھا تو اُن کا پہلا اعلان یہ تھا کہ آپ کو نماز روزے کی آزادی دی جاتی ہے۔ کیا یہ کوئی ٹکر تھی؟ نہیں' انہوں [3] نے ساری قوم سے ٹکر لی۔ پوجا اور پرستش میں تو کوئی بھی مزاحمت نہیں کرتا۔ یہ کیا چیز ہوئی؟ اُس کے بعد پھر آپ کے ہاں ہزار برس سے اس کے معنی پرستش چلے آ رہے ہیں کہ خدا کی پرستش کیجیے۔ کسی نے اپنے طور پر کسی بُت کی پرستش کی' کسی کو اپنا خدا بنایا' کسی نے نبی کی کی' کسی نے بت کی کی۔ آپ نے اپنے تصور کے مطابق ایک خدا ذہن میں رکھا اور اُس کی پرستش کی۔ یہ کیا چیز ہے کہ وہ [3] اتنی سی بات کہتے ہیں اور ساری دنیا اُن کے پیچھے اٹھ کھڑی ہوتی ہے؟ کوئی قتل کا حکم دیتا ہے' کوئی کہتا ہے کہ ان کو جلا دو' باپ تک گھر سے دھکے دے دیتا ہے' وطن چھوڑنا پڑتا ہے' قوم چھوڑنی پڑتی ہے۔ آخر یہ سب کچھ کس بنا پر؟

---

[1] یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا۔

[2] یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بادشاہ نمرود سے ٹکر لی۔

[3] حضرت ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں اطاعت کا لفظ خدا کی محکومیت کے معنوں میں استعمال کیا ہے

عزیزانِ من! یہ کیا چیز تھی؟ یہ پرستش نہیں ہے' یہ تو اعلانِ انقلاب ہے۔ یہ کسی انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت ومحکومیت نہیں ہے۔ اب آپ بات سمجھیے کہ کیوں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ کون اس کو برداشت کرے گا؟ محکومیت اختیار کرنی ہے تو صرف قوانینِ خداوندی کی اختیار کی جائے گی۔ آگے کہا کہ وَ اتَّقُوْهُ (29:16) اگر کسی سے خوف کھانا ہے تو اس سے خوف کھاؤ کہ ان قوانین کی عدمِ اطاعت سے' سرکشی سے' نافرمانی سے جو نقصان تمہیں پہنچے گا اُس کا خیال رکھو' اس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔ یہ ہے تقویٰ۔ کہا کہ اطاعت صرف اُس کی کرو۔ باقی رہی بات کہ وہ ہر وقت کا دعویٰ اور ہر وقت کا خوف ہوتا ہے کہ جب بھی آپ بادشاہوں کی اطاعت کرتے ہیں' دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں ان کی اطاعت کرتے ہیں' تو خوف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اُس اطاعت میں اُن کا مفاد مضمر ہوتا ہے جن کی آپ اطاعت کرتے ہیں۔ یہ دو الفاظ ہیں کہ اطاعت اور محکومیت صرف اُس کے قوانین کی ہے اور کسی سے ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ جسے ڈرنا کہتے ہیں کہ اللہ سے ڈرو' تو اللہ سے بھی ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ وہ تو رحیم ہے' وہ تو رحمٰن ہے۔ اُس نے تو مومنین کے متعلق کہا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) مومن ہوتا ہی وہ ہے جس کے دل میں خوف وحزن نہ ہو۔ اگر آپ کی جان پہ ہی گزرتی ہے تو یہ کاہے کا ایمان ہے اور یہ کاہے کی مومنیت ہے۔ وَ اتَّقُوْهُ کے معنی یہ ہیں کہ ان قوانین کی نافرمانی سے' عدمِ اطاعت سے' ان کی خلاف ورزی سے' جو نقصان تمہیں پہنچے گا اُس سے خائف رہو۔ قانونِ خداوندی یہ ہے کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے' تو اس قانون کی خلاف ورزی کا جو نتیجہ نکلے گا' اُس سے خائف رہو۔ قانون یہ ہے کہ انگلی آگ میں ڈالو گے تو جل جائے گی تو اِس قانون کی خلاف ورزی کا جو نتیجہ نکلنا ہے' اُس سے ڈرو۔

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اور خدا کے مقرر کردہ قوانین میں ایک بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! اگلے دو الفاظ ہیں اور میرا کام تو یہ چیزیں کہے جانا ہے' اللہ تعالیٰ آپ کے نصیب بھی یہ چیز کرے۔ آپ قرآن پہ آیئے' بڑی دلچسپ بات ہے' دو دو لفظوں میں وہ بات کہہ جاتا ہے۔ اب یہاں یہ چیز آئی کہ صرف اُسی کی محکومیت اختیار کرو اور کسی سے نہیں ڈرنا' اُس کے قوانین کی نافرمانی سے اور اُس کی خلاف ورزی سے جو نقصان دہ نتائج ہونگے تو ان نقصانات سے خائف رہو۔ اگلے دو لفظوں میں دنیا کے انسانوں کی اطاعت ومحکومیت اور خدا کے قانون کی محکومیت ساری بات واضح کر کے رکھ دی۔ کہا کہ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ (29:16) میں اپنے بھلے کی کوئی بات نہیں کر رہا' اس میں میرا فائدہ نہیں بلکہ تمہارا فائدہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ خدا کہہ رہا ہے کہ

تمہارا فائدہ ہے اس میں میرا فائدہ نہیں ہے۔ ''میں کوئی تہاڈا دتا کھاناں ہیگاں [1]''۔ **ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ** ۔اب **وَ اتَّقُوْهُ** کی بات بھی سمجھ میں آ گئی اور **اُعْبُدُوْا اللّٰهَ** کی بات بھی سمجھ میں آ گئی۔ ہمارے ہاں ترجمہ یہ ہے کہ ہم تیری پرستش کرتے ہیں، تیری پوجا کرتے ہیں۔ او بابا! یہ صورت نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ** (29:16) یہ تمہارے بھلے کی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اس سارے نظام میں جس میں ان قوانین کی اطاعت کے لیے وہ آپ سے کہہ رہا ہے، اِس میں اُس کا کچھ نہیں ہے، وہ تمام کائنات سے مستغنی ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے، جو چلا رہا ہے، جو مالک ہے، کیا وہ تمہارا محتاج ہو جائے گا؟ آپ دیکھتے ہیں کہ کس خوبصورتی سے بات چلی آ رہی ہے! **اعْبُدُوا اللّٰهَ** کے معنی کیا ہوئے اور **واتقوه** کے معنی کیا ہو گئے؟ کہ **ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ** (29:16) تمہارے بھلے کی بات ہے۔ اب جب دین مذہب میں آ جاتا ہے تو پھر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تقسیم ہوتی ہے۔ یعنی اُس کے کچھ حقوق ہمارے اوپر وارد ہوتے ہیں اور وہ یہی ہیں جو نماز روزہ ہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تفریق مذہب کی پیدا کردہ ہے، دین کی نہیں ہے

کہا کہ یہ ہم اُس کے لیے کرتے ہیں، اس میں ہمارا اپنا کچھ نہیں ہے۔ اگر آپ نے زکوٰۃ دینی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ حقوق اللہ ہے۔ اُس کا کیا حق ہے جس کا یہ سب کچھ ہے؟ وہ تو کہتا ہے کہ **ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ** (29:16) او بابا! میرا اس میں کچھ نہیں ہے۔ یہ جتنے آپ قوانینِ فطرت کی اطاعت کرتے ہیں تو کیا آپ کسی سائنٹسٹ کا حق ادا کر رہے ہوتے ہیں؟ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ یہ **خَيْرٌ لَّكُمْ** ہے لیکن اُس کے ساتھ ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ **اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (29:16) بشرطیکہ تم علم و بصیرت سے کام لو تو یہ بات سمجھ میں آئے گی۔ اندھی تقلید پہ چلو گے تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی، پھر وہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ کی پرستش کرو اور اس واسطے کرو کہ اُس سے ڈرتے رہو، اس واسطے کرو کہ یہ حقوق اللہ ہے۔ یہ تو **اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (29:16) والی بات نہیں ہے۔ علم و بصیرت کیوں کا جواب دیتی ہے کہ کیوں کیا جائے۔ قانون کی اطاعت یا قانون ''کیوں'' کا جواب دیتا ہے۔ اور جب آپ کے پاس ''کیوں'' کا جواب نہ ہو کہ Why should I do it?[2] کا جواب نہ ہو تو اُس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ صاحب! یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اُس کا حکم ہے۔ یہ اس لیے کہتے ہو کہ تمہارے پاس ''کیوں'' کا جواب نہیں ہے۔ اور وہ ہر حکم کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ **لَعَلَّكُمْ** تا کہ تمہارا یہ ہو۔ وہ تو خود بتاتا ہے کہ جو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ایسا کرو تو وہ اس لیے ہے کہ **لَعَلَّكُمْ** تا کہ تمہارا اس میں یوں بھلا ہو۔ اب چونکہ یہ تو نہ سمجھا سکتے ہیں کہ ایسا کرنے

---

[1] میں تمہارے گھر سے نہیں کھاتا۔

[2] میں یہ کیوں کروں؟

سے ہمارا کیا بھلا ہوگا‘ ہم کیوں ایسا کریں۔تو سیدھی سی بات ہے کہ اُس کے لیے ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ یہ حقوق اللہ ہیں اور وہ ادا کرنا ہیں۔قرض خواہ کا حق ہوتا ہے کہ وہ انسٹالمنٹ (قسط) لینے کے لیے آتا ہے اور اُس نے لینا ہوتا ہے مگر یہاں کہا ہے کہ **ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ** (29:16) اس میں تمہارا بھلا ہے۔

اطاعت وہی اطاعت ہے جس میں انسان کا بھلا ہو

عزیزانِ من! جس اطاعت میں ہمارا بھلا نہیں ہوتا تو وہ خدا کی اطاعت نہیں ہے:

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

اُس کا بھلا تو ہوا‘ اُس کی خدائی تو قائم رہی‘ اس لیے وہ بندگی مجھ سے کراتا تھا کہ اُس کی خدائی قائم رہے۔نمرودوں کی خدائی یہ ہوتی ہے کہ بندگی میں میرا بھلا نہ ہو۔دور ایسا تھا کہ ان لوگوں کو اشاروں میں ہی بات کرنا پڑتی تھی۔اب پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کس استبداد میں گزر رہے تھے۔بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا‘ تو وہ بندگی ہی کیا؟ کہ جس میں مرا بھلا نہیں ہوتا۔کہا کہ **ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (29:16) اس میں تمہارا بھلا ہے بشرطیکہ تم علم وبصیرت سے کام لو۔پھر اگلی ہی آیت میں کہا کہ **اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا** (29:17) ۔اب میں پہلے اس کا عام ترجمہ کروں گا کہ ایک لفظ **تعبدون** کا یہ ترجمہ کرنے سے بات کہاں چلی گئی۔کہا کہ تم خدا سے ورے بتوں کی پرستش کرتے ہو تو اُس کے معنی یہاں پرستش ہی ہونگے۔انہوں نے وثن کا ترجمہ بت کیا۔بتوں کی تو محکومیت اختیار نہیں کی جاتی‘ اطاعت نہیں کی جاتی کیونکہ وہ تو کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔اُن کی تو پرستش کی جاتی ہے۔اب یہ **تَعْبُدُوْنَ** کا ترجمہ پرستش Fit بیٹھ گیا کہ جب اوثانًا کا ترجمہ بُت کرلیا گیا۔

عزیزانِ من! کائنات کی چند اتنی عظیم حقیقتیں ہیں جن میں سے یہ ایک حقیقت ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ ’’وثن‘‘ کی اطاعت نہیں ہے۔اور اس کو پست ترین درجے پہ لے آئے‘ اس کا ہم نے ترجمہ کردیا کہ بتوں کی پرستش نہیں ہے۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہم مطمئن ہوگئے کہ ہمیں جو خدا نے فرمایا تھا کہ بتوں کی پرستش نہیں کرنا تو وہ دیکھیے ہم بتوں کی پرستش نہیں کرتے۔یہ جو حکمِ خداوندی ہے تو اُس کی تعمیل ہوگئی۔میں نے عرض کیا ہے کہ وہ جو کائنات کے چند عظیم حقائق ہیں‘ یہ اُن میں سے ایک چیز ہے۔

لفظ وثن کا قرآنی مفہوم

عربوں کے ہاں ’’وثن‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ ’’ہر وہ شے جو جامد ہو کر رہ جائے‘ اُس میں حرکت نہ رہے‘ وہ آگے نہ بڑھے اور اُس میں

جمود ہو تو'' وہ وثن ہے۔ یہ بعد کی بات تھی کہ اُنہوں نے ان قوموں کے ہاں جا کر دیکھا کہ وہ پتھر کی مورتی تھی تو چونکہ وہ تو ایک جگہ جمی رہتی ہے اور ہلتی نہیں ہے' اس واسطے اُنہوں نے مجازی طور پہ ہر اُس شے کو جس میں ایک مقام کے اوپر جمود ہوا اور وہ جمی رہے اور اُس کے اندر حرکت نہ ہو' تو اُس کو وثن کہنا شروع کیا ورنہ اس کے یہ بنیادی معنیٰ نہیں ہیں۔ بنیادی معنیٰ ''جمود'' کے ہیں کہ جس میں حرکت نہ ہو۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ زندگی کی چند اہم بنیادی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ زندگی تحرک چاہتی ہے' حرکت چاہتی ہے' نمود چاہتی ہے' ارتقا چاہتی ہے۔ کائنات کی ہر شے کے اندر یہ چیز ہے۔ جہاں جمود پیدا ہوا تو سمجھ لو کہ زندگی ختم ہو گئی۔ کسی ایک درخت کے اندر بھی اگر خزاں کے بعد پتے نہیں نکلتے تو سمجھ لیجیے کہ اُس کی جڑوں کو کیڑا لگ گیا' اس کا تنا کھوکھلا ہو گیا' اُس میں زندگی کی رمق باقی نہیں رہی' اُس کی ابھی تھوڑی سی شکل تنے جیسی ہے لیکن اُس کے بعد

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے یقین یاں رہ گیا' واں رہ گیا

(آتش لکھنوی)

اس لیے کہ اُس میں حرکت' نمود' تحرک' تبدیلی' تغیر' ارتقا کی صلاحیت نہیں رہی۔ کائنات کی تمام اشیا' جتنی بھی ہیں' وہ اس لیے اس نظم و نسق کے ساتھ چل رہی ہیں کہ اُن کے اندر ارتقا ہے' اُن کے اندر حرکت ہے۔ سورۃ الرحمٰن کے اندر یہی عظیم حقیقت ہے جو اُس نے کہی ہے کہ **يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ** (55:29) اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ارض اور سما میں جو کچھ بھی ہے وہ خدا سے ہی مانگتے ہیں اور خدا تو ہر آن ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ یعنی (معاذ اللہ) خدا کے لیے تغیر کہہ رہے ہیں۔ خدا ہی تو ایک ایسی ذات ہے جو تغیرات سے بلند ہے۔

ہمارے ہاں کے تراجمِ قرآن میں خدا کی ایک صفت کا غلط ترجمہ

خدا میں ارتقائی چیز نہیں ہے کہ وہ دس ہزار سال پہلے کا جو ایک خدا تھا' وہ بچہ تھا اور وہ بڑھتے بڑھتے ہمارے زمانے میں جوانی تک پہنچ گیا اور اُس کے بعد پھر بوڑھا ہو جائے گا۔ وہ ایک خدا ہے اور اُس خدا کے اندر سوال ہی یہ ہے کہ اُس نے ہر شے کو **فَانٍ** (55:26) اور **هَالِكٌ** (28:88) کہا ہے اور سورۃ القصص میں تو یہ ہے کہ **كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ** (28:88) ہے۔ سوائے خدا کی ذات کے۔ یعنی خدا نے اپنے متعلق یہ بتایا ہے کہ یہ ایک ہے جس کے اندر استثنیٰ ہے اور وہ ہے خدا کی ذات جس میں تغیر نہیں ہوتا۔ **هَالِكٌ** (28:88) اور **فَانٍ** (55:26) کے لیے میں نے بتایا تھا کہ جس شے کے اندر تغیر واقع ہوتا رہے تو وہ **هَالِكٌ** (28:88)

اور فَانٍ (55:26) ہوتی ہیں لیکن وَّیَبۡقٰی وَجۡهُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ (55:27) [1] ہے۔ یہ ہے استثنٰی۔ ذرا توجہ سے سنیے کیونکہ بات کچھ مشکل سی آ گئی ہے۔ پہلا ذرا سا جرثومہ ہے جسے آپ ابتدائی لائف سیل کہتے ہیں۔ یہ وہی جرثومہ ہے جواب انسان کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ پتہ نہیں کہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں مراحل میں سے گزر کر اس پیکر کے اندر آیا ہے۔ ان میں سے جس میں کسی مرحلے کے اندر حرکت اور حرارت اور آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی تو وہ یا وہیں جامد ہو گیا تھا یا فنا ہو گیا تھا۔ آگے وہ زندگی چلی ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی۔ ''تغیر'' کے معنی یہ نہیں کہ پیچھے جانے والی بات ہے بلکہ یہ تو ارتقا ہے۔ منزل تک تو وہی پہنچے گا جو سفر کرے گا' جو قدم اٹھائے گا' جو چلے گا' جو چورا ہے پہ کھڑا رہے گا وہ کیسے پہنچے گا۔ زندگی کی بنیادی حقیقت یہ ہے کہ اس میں حرکت ہو' حرارت ہو' آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو' ارتقا ہو' تغیر ہو' تبدل ہو۔ اور جہاں زندگی کسی جگہ آ کر جامد ہوئی تو وہیں موت ہے۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ

مگر کوتاہئ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

دین یہ ہے کہ وہ قوانین یا اقدار جو فطرت نے' قدرت نے' خدا تعالٰی نے بنائے ہیں وہ غیر متبدل ہیں' ان کے مطابق کائنات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اُن کے حدود کے اندر رہتے ہوئے حرکت' حرارت' ارتقا' تحرک' آگے بڑھنا زندگی ہے۔ اور اگر کوئی آگے بڑھنے سے رک جائے' کہیں کھڑا ہو جائے تو یہ مذہب اور موت ہے۔ دین اور مذہب میں یہ فرق ہوتا ہے۔ دین میں ہر قدم آگے اٹھتا ہے۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ ایک تو یہ ہے کہ فطرت کے اندر جو قوانین ہیں' اُن کی اطاعت بھی قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے کیونکہ وہ خدا کے ہی قوانین ہیں' وہ کسی انسان کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ اُن کا (دائرہ کار) صرف Physical Life ' (طبعی زندگی) ہے اور انسانوں کے متعلق جو قوانین خدا نے دیئے ہیں' وہ بھی اُسی کے دیئے ہوئے قوانین ہیں' انہی پر چلنے سے انسانی صلاحیتوں میں نمود پیدا ہوتی ہے۔ اگر کسی نے طبعی زندگی کے اندر حرکت اور حرارت چھوڑ دی ہے تو وہ قوم وہیں کی وہیں اٹکی ہوئی ہے۔ جنہوں نے اُس کے ساتھ اپنے اندر ارتقا کی صلاحیتوں میں نمود پیدا کی اور آگے بڑھنے شروع ہوئے تو وہ کہیں سے کہیں چلی گئی:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح وشام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

(اقبالؒ: ارمغان حجاز)

---

[1] یہ قوانین اس خدا کے ہیں جو تغیرات سے ماوراء ہے اور ہر قسم کی عظمت وتکریم کا مالک (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1259)۔

کائنات کی ہر شے ہر آن تغیر پرور واقعہ ہوئی ہے

معاف رکھیے گا! میں وہاں سورۃ الرحمٰن کی آیت کو سامنے لانا بھول گیا اور میں دوسری طرف نکل گیا۔ کہا ہے کہ **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ . وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ** (55:26-27)۔ میں نے کہا تھا کہ اُس نے صرف خدا کی Exception (استثنیٰ) کہی جس کے اندر تغیر نہیں ہے۔ اور کائنات کی ہستی، انسانوں کی زندگی، قوموں کی زندگی میں یہ ہے کہ ان میں حرکت اور تغیر ہو۔ تغیر آگے بڑھنے کے لیے ہو۔ اور کہا ہے کہ صرف خدا کی ذات ہے جس میں تغیر نہیں ہے۔ **يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (55:28)۔ اِنہوں نے اس کا یہ ترجمہ کیا کہ کائنات کی ہر شے اُس سے مانگتی ہے۔ **كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ** (55:28) اور وہ ہر نئے دن ایک نئی شان میں ہوتا ہے یا روز اُس کی شان بدلتی رہتی ہے جبکہ اُس نے کہا تھا کہ **وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ** (55:27) ہر شے میں تغیر ہے اور خدا کی ذات میں نہیں ہے۔ اور یہ اُس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ ہر شے اُس سے مانگتی ہے اور وہ ہر روز ایک نئی آن میں، نئی شان میں، ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ بڑی عظیم آیات ہیں۔ ان میں کہا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی نشو ونما کے لیے اُس کی محتاج ہے۔ اس کی یہ صورت نہیں ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک مقام کے اوپر جامد ہے کہ جو ایک وقت میں، ایک دن میں، ایک دفعہ جس چیز کی اُس کو ضرورت ہے بس وہ اُس کو دیدی جائے تو وہ ٹھیک ہے۔ کہا کہ یہ غلط ہے۔ کائنات کی ہر شے کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر آن میں اپنے نئے تقاضے رکھتی ہے اور ہم اُس کے تقاضے کے مطابق اُس کو دیئے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کائنات کی ہر شے کے متعلق ہے جو کہا ہے کہ **كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ** (55:29)۔ جب اُس میں حرکت نہیں رہتی تو اِس کے اندر وہ مُردہ ہوتا ہے۔ مُردے کا تو اپنا تقاضا ہی نہیں ہوتا بلکہ ہمارا ہوتا ہے کہ جلدی سے اُس کو دفن کریں کہ اُس کے اندر سے سڑاند نہ آئے۔ جو شے بدلتی ہی نہیں ہے تو اُس کا تقاضا ہی کچھ نہیں رہتا۔ یہ ہے اُس کی ربوبیت۔ کہا ہے کہ **يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (55:29) کائنات کی ہر شے اپنی زندگی، نشو ونما اور ارتقا کے لیے اُس کی محتاج ہے۔ کائنات کی اشیا کی کیفیت یہ ہے کہ ایک جگہ جامد نہیں بیٹھ گئیں کہ ایک دفعہ ہم نے نسخہ لکھ دیا اور اُس کے مطابق ہوتا رہا۔ وہ تو ہر آن بدلتی رہتی ہیں۔ وہ بدلتی ہیں، اُن کا تقاضا بدلتا ہے اور ہم اُس کے مطابق دیتے ہیں۔ قوموں کے متعلق میں نے یہ عرض کیا ہے کہ

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

جو قوم کسی بھی ایک مقام پہ کھڑی ہوگئی تو جس کا جی چاہے اُس کو آ کر دبوچ لے۔ یوں زندگی میں تحرک کے لیے، حرکت کے لیے،

نمود کے لیۓ ارتقا کے لیۓ یہ قوانین وہ دیتا ہے۔قدم قدم پہ کہتا ہے کہ سوچو' سمجھو' تدبر کرو' شعور رکھو' تفکر کرو' علم وبصیرت سے آ گے بڑھو۔ ہر مقام پر وہ کہتا ہے کہ آ گے بڑھو۔

ملت اسلامیہ ہزار سال سے اپنے ہاں عملی طور پر وثن کا ثبوت فراہم کر رہی ہے

عزیزانِ من! وثن وہ تھا جس میں حرکت باقی نہ رہے۔ٹھیک ہے کہ پتھر کے بتوں کی تو ہم نے پرستش نہ کی لیکن مذہب تو خالصتاً وثن کی پرستش ہوتی ہے۔ ہزار سال پہلے جو کہا گیا تھا' آج اُس کی اطاعت کی جاۓ گی۔ یہ وثن نہیں ہے تو کیا ہے؟ اور پھر اس پہ فخر کیا جاتا ہے کہ سلفِ صالحین کا اتباع کیا جار ہا ہے' اسلاف کا اتباع کیا جار ہا ہے۔ یہ ایک اصطلاح ہی ہے۔ جمود کا یہ نام وثن رکھ لیا گیا ہے۔ اس سے عوام کے جذبات کو ذرا سی اپیل ہو جاتی ہے کہ سلفِ صالحین کے نام کے ساتھ علیہ الرحمۃ' امام' مفسر وغیرہ لکھتے ہیں۔ٹھیک ہے' وہ اپنے وقت میں ہونگے' ان کا احترام ہمارے دل میں ہے لیکن اُن کا یہ اتباع وثن نہیں تو اور کیا ہے؟ ہزار سال پہلے کے انسانوں نے اپنے وقت کے' اپنے زمانے کے مطابق زندگی کے لیے کچھ تمدنی قوانین بنائے۔ٹھیک ہے' وہ اُس زمانے کے لیے ٹھیک ہونگے' فٹ بیٹھتے ہونگے۔ ہزار سال کے بعد اب کہا یہ جاتا ہے کہ وہ قوانین اُسی طرح سے آج نافذ ہونگے اور تم کو ماننا پڑے گا چاہے وہ فٹ آئیں یا نہ آئیں۔ انہیں فقہ کے قوانین کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! فقہ کے قوانین تو یہ کہے جاتے ہیں جو ہزار سال پہلے بنے تھے اور آج اُسی طرح سے اُن کو وہ نافذ کیا جاۓ گا' اُن پہ عمل کیا جاۓ گا' اُس میں ''کیوں'' نہیں پوچھا جاۓ گا جبکہ فقہ کے معنی ہی غور و فکر کے ہیں۔تفقہ آپ نے سنا ہوگا یہ اسی سے ہے۔ بات یوں ہوئی کہ یہ فقہ کے قوانین ہیں جن میں فقہ اور تفقہ کی اجازت نہیں ہے۔ اُنہوں نے اپنے زمانے میں غور و فکر سے کام لیا تو وہ تو سچے تھے کہ اُنہوں نے کہا کہ فقہ ہے' یہ ہمارے تفقہ کا نتیجہ ہے۔ اُس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ ہزار سال سے تفقہ حرام ہے۔ آپ پہ فقہ کے قانون نافذ کیے جاتے ہیں' آپ اُن پہ عمل کرتے ہیں' ان کی تعمیل کرتے ہیں اور ان کی محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ یہ وہ قانونِ فقہ ہیں' جن میں تفقہ ہے ہی نہیں۔ اگر وہ تفقہ آیا تو اُنہوں نے کہا کہ جس نے سب سے پہلے دلیل مانگی تھی یا تفقہ کی بات کہی تھی وہ تو ابلیس تھا۔ اور اُن کا نام قانونِ فقہ ہی ہے یعنی جیسا اسلاف نے کیا۔ اُنہوں نے اپنے ہاں کے کسی تقاضے کے مطابق اگر پاجامہ ٹخنوں سے اونچا رکھا ہے تو اُس کو اونچا ہی رکھا' نہ ذرا سا اوپر کر سکتے ہیں اور نہ نیچے کر سکتے ہیں۔ اگر مسواک اُنہوں نے اتنی لمبی بتائی تھی تو وہ اتنی ہی لمبی ہو سکتی ہے۔ اگر اُن میں سے ایک نے یہاں ہاتھ باندھا تھا تو یہیں باندھا جاۓ گا۔ دوسرے کی فقہ جو تھی تو اُس نے نیچے باندھا ہے تو نیچے باندھا جاۓ گا۔ یہ قوانین جو آپ کے ہاں آئے ہیں' وہ اُسی طرح سے ہیں جیسے ہزار سال پہلے اُنہوں نے بنا دیئے تھے' اُسی طرح سے نافذ کیے

جائیں گے۔اس کا نام اسلامی ہے اس کی سند سلفِ صالحین کی پیروی ہے اس کا نام فقہ ہے سب سے بڑی چیز اسلاف کی پیروی ہے۔ غنیمت ہے کہ ہمارے اسلاف تو ہزار برس تک جا کر رک گئے جو انسان غاروں میں رہتے تھے تو کیا وہ ہمارے اسلاف نہیں تھے؟ اُن کا اتباع کیوں نہیں ہے؟ حضرتِ نوحؑ کے زمانے میں بھی تو قومیں تھیں وہ بھی تو نبی تھے اُن کی زندگی میں بھی تو ایک تمدن تھا۔ وہ دور تھا جس میں کشتی بنانی نہیں آتی تھی وہ بھی خدا نے وحی کے ذریعے سے کشتی بنانا سکھایا تھا وہ اسلاف کیوں نہیں ہیں؟ وہ تو غنیمت ہے کہ وہاں تک نہیں پہنچ پائے اور رک گئے ورنہ اسلاف کا مسلک تو یہ تھا کہ غاروں میں رہیے۔ یہ ہے وثن ۔

زندگی اور موت میں فرق

عزیزانِ من! حرکت نمود ارتقا بڑھنا مُردے میں نہیں ہوتا۔ زندگی اور موت میں فرق ہی یہ ہے کہ زندگی میں ہر آن آگے بڑھنے کے لیے ایک تغیر ہوتا ہے۔ مُردہ وہ ہوتا ہے جو اپنے مقام کے اوپر ویسے کا ویسا جامد رہتا ہے۔ اگر اُس کو تھوڑی سی ممی کر دیا جائے یعنی وہ جسے حنوط کہتے ہیں تو اُس کی شکل وصورت ویسی ہی رہتی ہے۔ مصر کے تہ خانوں میں سے اہرام میں سے وہ Mummies (ممیاں) نکلی ہیں اُن کی شکل وصورت انسانوں جیسی ہے آپ اُن کو انسان کہہ سکتے ہیں ۔ ہزار سال پہلے کے جتنے بھی یہ مسالک اور قوانین آپ کہتے ہیں اُن کی شکل وصورت تو دین کے قانوں جیسی ہوتی تھی لیکن وہ ممی شدہ لاشیں ہوتی ہیں اُن میں حرکت ہی نہیں ہوتی:

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست

آپ کے ہاں کا درخت اگر خزاں پہ آ کر ٹھہر جائے تو آپ غور کیجیے کہ صحنِ کائنات کی کیا شکل ہوگی۔

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

نبی اکرم ﷺ کا فرمان

اگر آپ کا آج آپ کے گزرے ہوئے کل کا فوٹو ہو تو تُو راکھ کا ڈھیر ہے۔ اُس میں زندگی کی حرارت نہیں ہے کیونکہ زندگی تو دمادم

نقش ہائے تازہ ریزد۔عزیزانِ من! یہ ہے دین۔اور وہی جو میں کئی دفعہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کی وہ حدیث دہرا چکا ہوں' وہ چمکتے ہوئے جوہر کی طرح نظر آ جاتی ہے کہ من استویٰ یومه فهو مغمون جس کا کل اور آج ایک جیسے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ تباہ ہو گیا۔ یہاں ہزار سال کے کل اور آج میں اگر ذرا برابر کہیں آپ نے فرق ڈال دیا ہے یعنی اگر آپ نے مسواک کی پیمائش میں ذرا فرق کر دیا تو پھر آپ ختم۔حضورِ سرورِ کائنات ﷺ کہہ رہے ہیں کہ جس کے دو دن ایک جیسے گزرے اور وہ آگے نہیں بڑھا تو سمجھ لو کہ وہ تباہ ہوا۔

ارتقا کا عمل تو جنت میں بھی نہیں رکتا

ہمارے ہاں عام طور پہ تصور یہ ہے کہ یہ جو زندگی کی مسافت ہے یعنی سفرِ حیات ہے' جنت اُس کا آخری مقام ہے۔ اگر یہ تصور ہو' اگر یہاں آ کر رک جانا' ٹھہر جانا ہو' یہ کسی ایک مقام پہ موت ہے' تو جنت بھی کیوں نہ ہو' وہاں ٹھہر جانا بھی تو موت ہے۔ وہاں کے متعلق جو قرآن نے کہا ہے کہ اُس میں موت نہیں ہے تو اس کے معنی کیا ہیں؟ اگر زندگی ہے تو زندگی کے معنی تو ''نمو ہیں' ارتقا ہے' آگے بڑھنا ہے' آگے چلنا ہے''۔ اگر وہاں کے متعلق تصور یہ ہو کہ وہاں آگے نہیں چلنا ہے بلکہ وہیں رہ جانا ہے تو وہ تو حیات نہیں ہے۔ عزیزانِ من! حیات تو جنبش کا نام ہوتا ہے۔ زندگی کا ان عربوں سے پوچھیے۔ کیا بات ہے ان لوگوں کی! دیکھیے کہ انہوں نے حیات کا لفظ کہاں سے لیا؟ سانپ کو دیکھیے کہ وہ بظاہر کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا ہوتا ہے' نظر آتا ہے کہ یوں ساکت ہی ہے۔ ذرا سا کہیں آہٹ آئے یا تنکا ذرا یوں کیجیے تو ایک دم سے اُس میں جنبش پیدا ہوتی ہے' ایک دم سے اس میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے۔ تو ''حَيَّةٌ'' اُس سانپ کو کہتے ہیں۔ سانپ کی حرکت تو آپ دیکھتے ہیں کہ کیسی تیز ہوتی ہے۔ وہاں سے اِنہوں نے ''حیات'' کا لفظ بنا لیا ہے۔ کیا بات ہے اس قوم کی! قرآن انہی کی زبان میں آ سکتا تھا۔ جنت میں حیات ہے اور حیاتِ جاوید ہے۔ ہماری حیات میں پھر بھی وہ مقام آتا ہے جہاں ہماری اس طبعی زندگی میں ایک موت آ جاتی ہے لیکن اِس میں یہ ہے کہ زندگی آگے بڑھتی ہے:

زندگی جوے رواں است و رواں خواہد بود

ایں مے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

(پیامِ مشرق' ص۔202)

شراب جتنی پرانی ہوتی ہے اُتنی تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہاں کی زندگی میں تو یہ موت بھی نہیں کہ جس میں ایک دفعہ ٹھوکر کھا کر تیزی سے آگے بڑھنا ہے۔ وہاں کے متعلق ہمارے ہاں یہ ہے کہ صاحب! بس ایک ہی مقام ہے' صبح شام اٹھو' وہی دودھ کی نہریں' وہی درخت' وہی پرندے تو تیسرے دن ہی آدمی بور ہو جاتا ہے۔ آپ ذرا آٹھ دن مرغی صبح شام کھا کر تو بتایئے' تیسرے دن آدمی پلیٹ اُٹھا کر پھینک

دیتا ہے۔ زندگی تغیر چاہتی ہے۔ جس کی کیفیت یہ نہیں ہے، تو وہ آخری منزل نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھنے کا ایک مقام ہے۔

جنت کی کہانی اقبالؒ کی زبانی

قرآن نے کہا ہے کہ وہاں اہلِ جنت کی پیشانی کا نور اُن کو صراطِ حمید کی راہنمائی کرے گا۔ آخری مقام پہ آ جانا اور اُس کو بہشت کہنا ہے تو صاحب! سنیے کہ اقبالؒ (1877-1938) کیا کہتا ہے۔ ''پیامِ مشرق'' میں اُس نے خود کہا ہے کہ بہشت میں جا پہنچا تو وہاں وہ حور کہتی ہے کہ تم عجیب قسم کے یہاں جنّتی آ گئے ہو، میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا جی ہی کسی چیز پہ نہیں لگتا۔ یعنی وہاں حسن و رعنائی اپنے کمال کے اوپر پہنچا ہوا ہے۔ حور تو ہمارے ہاں ضرب المثل ہے۔ وہ خود کہہ رہی ہے کہ تم تو مائل ہی نہیں ہوتے، کہیں بیٹھتے ہی نہیں، کوئی چار باتیں ہی نہیں کرتے۔ یہ پہلے اشعار ہیں۔

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی
عجب ایں کہ تو ندانی رہ و رسم آشنائی

کیا بات ہے کہ نہ کسی شراب کی طرف آتے ہو اور نہ میرے ساتھ کچھ تھوڑا بہت بات وات کرتے ہو، تم کس قسم کے انسان ہو، تم بیٹھ کے چار باتیں کیوں نہیں کرتے؟ بات میں اس شخص کی کر رہا تھا جو جنت میں پہنچ کر بھی کہتا ہے کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد

تُو سچی ہے جو کہہ رہی ہے لیکن میں بھی کیا کروں کہ میری فطرت ایک مقام پہ کھڑا ہونا، ایک مقام پر قیام کرنا پسند نہیں کرتی۔

دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

باغ میں جب بادِ صبا یا ہوا آتی ہے تو وہ کسی ایک پھول کا منہ چوم کے وہیں نہیں رک جاتی۔ وہ لالہ کے پھول کے چمن میں سرسراتی ہے۔ میں اس بادِ صبا کی طرح بیقرار رہتا ہوں کیونکہ میرا دل صبر کرنے والا نہیں ہے۔ میں ایک مقام سے دوسرے مقام پہ جانے کے لیے مجبور ہوں۔

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے

کوئی بہت اچھا خوبرو حسن و رعنائیوں کا مجسمہ سامنے آتا ہے تو اُس پہ میری نظر پڑتی ہے، ٹکنا چاہتی ہے۔

تپد آں زماں دل من پئے خوبتر نگارے

نگاہ تو چاہتی ہے کہ ذرا تھوڑا سا رک جاؤں لیکن دل تڑپ اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں، اس سے بھی زیادہ کوئی حسین ہونی چاہیے۔

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے

سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

وہ حسین کسی مقام پہ بھی کیوں نہ ہو' وہ آفتاب ہی کیوں نہ ہو' بلند تریں ہی کیوں نہ ہو' اگر میں وہاں بھی رک گیا تو میری موت ہے۔ طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد۔ میں اس آخری منزل کی آرزو رکھتا ہوں۔ مجھ میں یہ تڑپ یہ خلش ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ

تپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد

خوشا کسے کہ بدنبال محمل است ہنوز

لیلیٰ کا محمل ہے اور اُس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ کہنے لگے کہ اگر جا کر محمل کو ہاتھ لگا دیا اور پکڑ لیا تو معاملہ ختم ہو گیا۔ یہ تو زندگی ہے اور اس میں لذت ہے کہ اُس کے پیچھے تڑپتے تڑپتے ہوئے چلے جائیے اور اُس کو ہاتھ نہ لگائیے۔ یہ ہے زندگی۔ اس کے اندر کوئی منزل نہیں ہے' زندگی کے اندر کوئی قرار نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ پھر یہ کیسے ممکن ہو گا کہ حرکت ہی رہے' سفر ہی رہے' آگے بڑھنا ہی رہے؟ کہیں تو منزل ہونی چاہیے۔ عزیزانِ من! خدا توفیق دے تو اسے قرآن کی روشنی میں پڑھا کیجیے۔ سنیے! کہ کیسے ممکن بتاتا ہے؟

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد

میں نے اپنے سامنے وہ منزل رکھ لی ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے' سیدھی سی بات ہے کہ میری زندگی تو اسی تڑپ اور مسافرت میں گزرے گی:

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد

بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

(کلیات اقبالؒ ص۔134)

اگر ہاتھ نہیں پہنچتا' اُس کو پکڑا نہیں جاتا تو کہا کہ اس سے تو ناامیدی پیدا ہو جائے گی کہ صاحب! میں تو اُس تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ کہنے لگے کہ اس کے لیے میں اپنی بیقرار نگاہ اور امید رکھنے والے دل کے ساتھ ہوں۔

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے

تیری ہمیشہ کی جنت میں قیام سے عاشقوں کا دل زندہ نہیں رہتا' مر جاتا ہے۔ اسے تو یوں سمجھ کہ ایک ہی جیسی زندگی اور بور ہونے والی زندگی تو موت ہے۔

نہ نوائے دردمندے نہ غمے' نہ غمگسارے

نہ یہاں کوئی درد بھری صدا سنائی دیتی ہے' نہ یہاں عشق یا فراق کا غم ہے اور نہ کوئی اس غم کو بانٹنے والا ہے۔ اس لیے اے حور! میں تیری ایسی جنت میں تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

جناب پرویزؒ کی دلی تمنا ان کے اپنے الفاظ میں

عزیزانِ من! پتہ نہیں کہ تمنائیں برآئیں گی یا نہیں۔ بہت جی چاہتا تھا کہ یہ جو قوم کے نوجوان اس وقت برگشتہ ہو رہے ہیں ان کو کہیں لے کر بیٹھ جاؤں' انہیں اقبالؒ (1877-1938) کی روشنی میں قرآن پڑھاؤں' اقبالؒ سمجھاؤں قرآن کی روشنی میں۔

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے
نہ نوائے درد مندے نہ غمے' نہ غمگسارے

(کلیاتِ اقبالؒ: ص 627)

یہ اوثان ہیں' یہ وثن ہے۔ وہ بہشتِ جاوداں بھی کیوں نہ ہو۔ آپ نے سن لیا کہ کیا کہا ہے؟ وثن پہ جم کے بیٹھ جانے سے ہوتا کیا ہے؟ جن لوگوں کے سامنے زندگی اور اُس کی حقیقتیں ہیں' وہ ان چیزوں پہ پہنچتے ہیں جو قرآن کہتا ہے۔ براہِ راست قرآن پہ نگاہ نہ رکھنے کے باوجود پہنچتے ہیں۔ اگر انسانی فکر اور انسانی عقل' تجسس اور تحقیق کی طرف چلتی رہے تو اُس میں Trial & Error (سعی وخطا) تو ہوتا ہے' وہ غلطیاں تو کرتی ہے' ٹھوکریں کھاتی ہے لیکن یہ کچھ کرنے کے بعد اگر آگے بڑھتی چلی جاتی ہے تو وہ وہاں پہنچ جاتی ہے جہاں قرآن پہنچانا چاہتا ہے:

ہر دو بمنزلے رواں' ہر دو امیرِ کارواں
عقل بحیلہ می برد' عشق برد کشاں کشاں

عقل کا مقام کوئی چھوٹا مقام نہیں ہے۔ یہ بھی امیرِ کارواں ہے۔ یہ بھی منزل کی طرف لے جائے گی۔ بس فرق اتنا ہے کہ یہ ذرا سہاروں کو ساتھ لے کر جائے گی لیکن

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

عشق (وحی) کی ایک جست ہوتی ہے۔ ایمان اس طرح لے جاتا ہے اور عقل منزل بمنزل لے جاتی ہے۔ تو یہ جو خالص عقل کی رو سے بھی جن لوگوں نے یعنی مغرب کے فلاسفرز نے سوچا تو وہ ان حقائق پہ پہنچے ہیں۔ اور یہ سب وہ ہیں جنہوں نے مذہب کی گرفت سے آزادی حاصل کر لی تھی ورنہ وہاں کے جو مذہب کے چنگل میں تھے وہ اُسی طرح سے سڑے ہوئے رومن کیتھولک کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔

مذہب کسی جگہ بھی ہو' اُس میں جمود ہوتا ہے' وثن ہوتا ہے' مذہب وثن کی پرستش سکھاتا ہے یعنی ہر چیز جو جامد ہو' جو آگے نہ بڑھے' اُس کے لیے سلفِ صالحین کی نگاہ فریب سی اصطلاحیں ہوتی ہیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میں اپنی قوم کے نوجوان طالبعلموں سے خاص طور پہ مخاطب ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے تو اِس قسم کی کتابیں پڑھا کیجیے' اگر کہیں وقت آئے تو جب تک میں موجود ہوں تو میرے پاس آیئے۔ میں آپ کی مشکلیں حل کرونگا۔ یہ ان لوگوں کی چیزیں ہیں' اس لیے میں ان کی Recommendation (سفارش) کر رہا ہوں کہ یہ جو قرآن کے حقائق ہیں' یہ عقل کے تجسس کے طریقے سے اس پر پہنچے ہیں۔

وائٹ ہیڈ کے الفاظ میں بت پرستی کی کیفیت اور اصلیت

میرے سامنے وائٹ ہیڈ (1861-1974) کی ایک کتاب ہے۔ اس کا نام ہے: "Adventures of Ideas"[1]۔ حالانکہ آئیڈیا (Idea) عام طور پہ جامد ہوتا ہے' لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ غلط بات ہے ۔ اس کتاب کے مصنف وائٹ ہیڈ (1861-1974) کا ہمارے دور کے فلاسفرز میں سب سے اونچا مقام ہے۔ سنیے! جو کچھ میں اقبالؒ (1877-1938) اور قرآن کے ریفرنس (حوالے) سے بتا رہا تھا' یہ لوگ اسے کیسے بتاتے ہیں۔ جس لفظِ وثنیت ترجمہ ہم بت پرستی کرتے ہیں' وہ کہتا ہے کہ

The key note of idolatry is contentment with the prevelent gods.[2]

کہتا ہے کہ جسے یہ وثنیت کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ بُت پرستی کر لیا گیا ہے' یہ اصل میں کیا ہے؟ کہتا ہے کہ

''مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کے بیٹھ جانے کو بت پرستی کہتے ہیں''۔ اب آپ نے دیکھا کہ ''وثن'' کا ترجمہ اس نے کیا کیا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سمجھے ہیں۔ اس نے پتھر کا بت نہیں کہا۔ وہ ہوتا کیا ہے؟

اسلاف کے کارناموں کو ہی یاد کرتے رہنے سے خیالات وتصورات میں جمود واقعہ ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! یہ بڑی دلچسپ چیزیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اِس میں شبہ نہیں ہے کہ جو ماضی ہے یعنی جو اسلاف کی زندگی ہے وہاں بھی آپ کو اچھے اچھے کارنامے ملیں گے' وہاں سے تمہارے سامنے قابلِ تعریف باتیں بھی آئیں گی۔

But it is really not sufficient to direct attention to the best that has been said and done in the ancient world

---

[1] Whitehead, Alfred North (1967). Adventures of Ideas. New York: The Free Press.

[2] بُت پرستی کی بنیاد یہ ہے کہ تم اپنے پیش پا افتادہ دیوتاؤں سے مطمئن ہو جاتے ہو۔

یہی کافی نہیں ہے کہ تم ماضی کے قصیدے پڑھتے رہو کہ ہمارے اسلاف نے یہ کیا' ہمارے بزرگوں نے یہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے اُنہوں نے کیا لیکن یہی کافی نہیں ہے۔ کیوں؟ اگر تم انہی کارناموں کی ستائش گری کرتے چلے گئے تو اُس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ عزیزانِ من! یہ چار الفاظ سنیے:

The result is static and promote a decadent habit of mind.

جمود ہوگا' Repressiveness ہوگا' خیالات اور جذبات کا دبا دینا ہوگا' استبداد ہوگا۔ تمہاری حریتِ فکر کے اوپر استبداد ہوگا' اُس سے آگے نہیں جا سکتے جن کے قصیدے تم بیان کر رہے ہو۔ اور دل میں زوال آمادہ رجحانات کی پرورش ہوتی ہے کہ پیچھے کی طرف چلو۔ جونہی آپ نے پیچھے کی طرف جانا شروع کیا تو یہی تو زوال ہوتا ہے۔ دنیا میں جس کا نام ہمارے ہاں اسلاف کے کارنامے رکھا گیا ہے کہ ہمارا ماضی درخشندہ ہے' وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے' ہوگا' میں انکار نہیں کرتا لیکن اگر اُنہی کو دہراتے چلے گئے تو آپ اُس سطح سے آگے نہیں بڑھ سکتے' اونچے ہو ہی نہیں سکتے۔ ذرا آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

The foundation of all understanding of sociological theory is to say of all understanding of human life.

انسانی زندگی کا جو ماحصل اور ملخص ہے' کہتا ہے کہ ٹھیک ہے' ایک چیز تم اپنے ذہن میں سمجھتے ہو کہ Perfection (تکمیل) تک پہنچ گئی تو اُس کے بعد تم مطمئن ہو جاتے ہو کہ Perfection (تکمیل) تک پہنچ گئی تو بس ٹھیک ہے' اُس کے بعد تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو! زندگی اور زندہ رہنے کا جو ملخص ہے وہ یہ ہے کہ

That no static maintenance of perfection is possible.

اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ تکمیل کے جمود کو برقرار رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

This exhume is not rooted in the nature of things.

کائنات کی ہر شے میں آپ دیکھیے کہ یہ جو چیز ہے کہ کوئی شے بھی مکمل ہو کر اپنے مقام کے اوپر کھڑی نہیں ہے' وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اندر غور کرو۔ تم جو کہتے ہو کہ ایک شے تکمیل تک پہنچ کر اپنے مقام کے اوپر کھڑی ہو گئی ہے' یہ غلط ہے۔

Advance or decadence are the only choices offered to mankind.

یا عروج ہوگا یا زوال ہوگا' ایک مقام کے اوپر کھڑے ہی نہیں ہو سکتے۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو وہ فریبِ نفس ہے۔ اور اگر یہ سمجھو کہ صاحب! یہ معاملہ تکمیل تک پہنچ گیا تھا تو وہ کہتا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے۔ انسان کے سامنے یا ارتقا ہے یعنی عروج ہے یا پھر زوال ہے۔ زندگی ایک مقام

یہ کھڑی ہی نہیں رہ سکتی۔

قدامت پرستی کا حقیقی مفہوم

وہ ذرا آگے چل کر لکھتا ہے کہ:

The pure conservative is fighting against the essence of the Universe.

قدامت پرستی میں ایک مقام پہ تمہارے جہاں بزعمِ خویش کوئی بھی چیز کسی تکمیل تک پہنچ گئی تھی تو اُس کو گلے سے لگا کر جو وہیں کھڑے ہو جاتا ہے وہ فطرت کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ لوگ حقائقِ کائنات کے اندر کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ جو چیز ہے کہ کسی زمانے میں تم کہتے ہو کہ کوئی چیز Perfection (تکمیل) تک پہنچی ہے تو ٹھیک ہے کہ اُس زمانے کے رسوم، رواج، مسالک ہوتے ہیں، ایک تو آئیڈیاز (Ideas) ہوتے ہیں اور ایک اُن کے آئیڈیاز کو محسوس شکل میں پیش کرنے کے لیے ایک محسوس فارم (Concerete Form) ہوتی ہے۔ یہ جو رسوم، رواج، شعائر وغیرہ آپ کہتے ہیں تو یہ وہ شے ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کسی ایک مقام پہ خواہ کوئی چیز Perfection (تکمیل) پہ پہنچ گئی ہو تو وہ جن مظاہر میں، جن محسوس شکلوں کے اندر رسوم، مسالک اور شعار کے اندر سامنے آتی ہے تو

The prolongation of out worn forms of life means a slow decadence in which there is repetition without any merit in the reaping of value.

اگر وہ شے جس نے ایک شکل اختیار کر لی تھی، وہ خواہ کتنے ہی مکمل ترین زمانے میں کی ہو، آپ اُس کو اُسی طرح سے آگے بڑھاتے جاتے ہیں تو یہ اپنے آپ کو فریب نہ دیجیے کہ یہ وہی قوت جو اس کے اندر اُس زمانے میں تھی وہ باقی رہتی ہے۔ یہ چیز زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد آہستہ آہستہ یہ صرف Repetition (تکرار) ہوتی ہے، جسے آپ Cycle (دائرے) کے اندر دہراتے چلے جاتے ہیں اور آگے نہیں بڑھ رہے ہوتے۔ Repetition (تکرار) میں تو Advancement (ترقی) نہیں ہوتی۔ ایک Cycle (دائرے) کے اندر یا ایک دائرے کے اندر اگر آپ ہمیشہ چلتے بھی رہیں تو آپ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ دین کے حقائق جن مظاہر میں، جن شکلوں کے اندر، کسی ایک دور کے اندر، جن کی نمود ہوئی تھی، اُن کو بھی اگر آپ اُسی طرح سے دہراتے چلے جاتے ہیں، تو یہ Repetition (اعادہ) ہے، یہ ایک دائرے کے اندر سفر ہے، اس میں آپ نے آگے نہیں بڑھنا۔ اور قرآن نے تو صراطِ مستقیم کہا تھا، اُس نے تو دائرہ نہیں کہا تھا۔ یہ Cyclic Order (آواگون) تو یونان کا فلسفہ تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ ایک سوئی تک بنانا نہیں جانتے تھے، وہ زندگی میں آگے آئے ہی نہیں حالانکہ فکر کی دنیا میں وہ ڈھائی ہزار سال سے بھی زیادہ، بہت تابانیوں پر تھے لیکن

پھر اُس کے بعد Repetition (اعادہ وتکرار) ہوگئی' اُنہوں نے زندگی کا Cyclic Order (دائروی نظم) بنایا۔ قرآن نے آ کر یہ کہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ قرآن کے زمانے تک زندگی دائرے کے حلقے میں چلتی تھی۔ یہ جس کو آپ تناسخ کہتے ہیں' جس کو آواگون کہتے ہیں' وہ یہ ہے کہ زندگی پھر سے لوٹ لوٹ کر یہاں آتی رہتی ہے۔ قرآن نے آ کر کہا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ زندگی Cycle (دائرے) میں نہیں چلتی۔ یہ **الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ** ہے۔ Dedadence کس کو کہتے ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ ہے' جس کو زوال کہتے ہیں یعنی

Undisturbed by originality or by external forces is a slow process.

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی دور کے رسوم' مناسک' شعار اُسی طرح سے Repeat (اعادہ) کیے چلے جاتے ہیں تو سنو:

They remain the show of civilization without any of its reality.

وہ صرف Show (نمائش) ہوتی ہے' اُس کے اندر حقیقت نہیں ہوتی۔ کہتا ہے کہ پرانے زمانے میں اسلاف کے دور کے اندر' ماضی کے اندر' درخشندہ ماضی ہی سہی' تو ان لوگوں نے وہاں بڑے کارنامے کیے' ان لوگوں نے یہ کچھ کیا' کہتا ہے کہ

It is for this reason that the definition of culture as the knowledge of the best that has been said and done is so dangerous by reason of its prudence.

کہتا ہے کہ کلچر کے معنی یہ کرنا کہ ہمارے ہاں کے زمانے کی جو تہذیب و تمدن تھی' آپ دیکھیے کہ کس قدر درخشندہ تھا' کہنے لگے کہ یہ Definition کرنا کہ کلچر کی انتہا وہ ہے جو ہارون رشید کے زمانے (786-809A.D) کی ہے تو قوموں کی زندگی میں سب سے خطرناک بات یہ ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ انسان یہ کچھ کہنے کے بعد اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔

کسی دَور کے کارناموں کو شاندار قرار دینے کا معیار

وہ کہتا ہے کہ:

It omits great facts that in their day that great acheivements of the past were the adventures of the past.

جو کہتے ہو کہ اُس زمانے میں ان لوگوں نے بہت بڑے کارنامے سرانجام دیئے' وہ وہ تھے جو اُنہوں نے اپنے ماضی سے آگے بڑھ کے کچھ کیا تھا ورنہ اُن کا وہ دور شاندار نہ کہلاتا۔ کہتا ہے کہ Definition (تعریف) تو تم صحیح کرتے ہو کہ ان کے دور کے اندر بڑے شاندار کارنامے تھے لیکن تم یہ کہنا Omit (فراموش) کر جاتے ہو کہ اُن کے وہ کارنامے اس لیے شاندار تھے کہ اُنہوں نے اپنے ماضی کے کارناموں سے آگے بڑھ کر کچھ کر کے دکھایا تھا ورنہ ان کا وہ دور بھی اُسی قسم کا ہوتا تو اُن کا عہد شاندار نہ ہوتا اور ان کے پیچھے کوئی اور عہد ہوتا جو شاندار رہوتا۔

ہمارے ہاں کے دارالعلوموں میں دی جانے والی تعلیم کا معیار

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ:

A passive knowledge of the past looses the whole value of its message.

اب میں Passive کا کیا ترجمہ کروں۔ اگر ماضی کا علم تمہارے اندر آگے بڑھنے کے لیے کوئی رمق نہیں پیدا کرتا تو سنو:

It looses the whole value of its message.

تو وہ اُس پیغام کی قدر و قیمت کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ دین کی جو Value (قدر و قیمت) تھی وہ یوں ختم ہو گئی۔ یہ تھی اُس کی وجہ۔ یہ آپ کے ہاں کے سارے دارالعلوموں کے اندر' وہ سات اور دس سال کے اندر' جو کچھ رٹایا جاتا ہے اور پڑھایا جاتا ہے' وہ سارا Passive Knowledge of the Past (ماضی کا بلاحرکت علم) ہوتا ہے۔ یعنی بخاری شریف میں یہ لکھا ہے' مسلم میں یہ آیا ہے' امام رازی نے یہ کہا ہے' بیضاوی نے یہ فرمایا ہے' ابنِ کثیر میں یہ ہے۔ یہ سارے کا سارا علم جس کو کہتے ہیں یہ علم نہیں ہوتا۔ یہ تو میں کہا کرتا ہوں کہ یہ تو لائبریرین ہوتے ہیں جن کو پتہ ہے کہ اس کتاب میں یہ لکھا ہے اور اس میں یہ لکھا ہے۔ یہ علم نہیں ہے بلکہ یہ معلومات ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ Passive Knowledge of the past (ماضی کا بلاحرکت علم) ہے۔ وہ تو صرف آپ کو معلومات ہوں اور آپ کے اندر اُس سے کوئی حرکت' حرارت یا آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا نہ ہو اس لیے وہ برملا کہتا ہے کہ یاد رکھیے:

It looses the whole value of its message.

وہ اُس پیغام کی پوری قدر و قیمت ضائع کر دیتا ہے۔ یہ آپ کے ہاں ضائع ہو گئی ہوئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ

A living civilization requires learning, but it lives beyond it.

ایک زندہ تہذیب کے لیے علم کی بھی ضرورت ہے لیکن یاد رکھو! وہ ان معلومات سے آگے کی بات ہوتی ہے جسے تہذیب کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ خالص تفقہ کے زور پہ کہاں پہنچے ہیں۔ اب میں نے تفقہ اصلی معنی میں لیا ہے۔ یعنی تفقہ کے زور پر' عقل و بصیرت کے زور پر' یہ لوگ کیا حقائق بیان کرتے ہیں! اور وہ قومیں ہیں جو ان مفکرین کے اس قسم کے افکار کی روشنی لے کر آگے بڑھ رہی ہیں۔ قرآن نے جو کہا تھا کہ یاد رکھو وثن کی معبودیت اختیار نہ کر لینا تو اُس کے یہ معنی تھے کہ جمود اور تعطّل خواہ وہ کسی دور کا کیوں نہ ہو' اُسے چھوڑ دو۔ میری کتاب ''انسان نے کیا سوچا'' میں اس کا رواں ترجمہ ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ وائٹ ہیڈ (1861-1974) نے یہ کہا ہے کہ یہ قطعاً نا کافی ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ زمانہء سابقہ میں کون کونسی اچھی باتیں کی گئیں اور کون کونسے اچھے کام کیے گئے۔ اس اسلوبِ زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی جامد بن جاتی ہے' اُس میں فطری صلاحیتیں دب جاتی ہیں اور دل کو پستی

کی طرف جانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ یہ میں عرض کر دوں کہ میرے نزدیک بھی میری کتابوں میں بھی اس کا مقام بہت اونچا تھا۔ ان لوگوں کے اس طرح سے یہ جو ان کے اقوال ہیں یا عبارتیں ہیں ان کا اردو میں ترجمہ بڑا مشکل ہے۔ میں نے یہ اڑھائی ہزار سال یونان کے حکما سے لے کر اس دور تک کے فلاسفر سائنٹسٹ مورخین مذہب کے علما جو بڑے بڑے آئمہ ہیں کی جو سب سے بڑی کتابیں ہیں ان کے اقوال اردو میں ترجمہ کر کے اس کے اندر دیئے ہوئے ہیں۔

کائنات میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شے ایک مقام پر کھڑی رہے

وہ کہتا ہے کہ یاد رکھیے کہ فلسفۂ معاشرت کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ کوئی مکمل شے بھی جمود کی حالت میں مکمل نہیں رہ سکتی۔ یہ اصول تمام اشیائے فطرت کی جڑوں میں کارفرما ہے۔ انسان کے سامنے دو راستے ہیں: آگے بڑھو یا پیچھے ہٹو۔ ایک مقام پر کھڑے رہنا روحِ کائنات سے جنگ کرنا ہے۔ جو آگے نہیں بڑھ رہا تو سمجھ لیجیے کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے۔ زندگی کے فرسودہ پیکروں کو گلے سے لگائے رکھنا تنزل اور تسفّل ہے۔ ایسی زندگی دن تو پورے کر لیتی ہے لیکن کبھی پھل نہیں لا سکتی اس میں تہذیب کی نمائش تو رہ جاتی ہے لیکن اس کی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ جو تہذیب ہمت کر کے آگے نہیں بڑھتی وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ ماضی کی عظمت کو بھی وہی صحیح طور پر پہچان سکتا ہے جس کا مستقبل روشن ہو۔ ماضی کا علم بلا حرکت ماضی کے پیغام کی قیمت کو کھو دیتا ہے۔ ایک زندہ تہذیب کے لیے علم کی ضرورت یقینی ہے لیکن اُسی علم کی جو اُسے آگے لے جائے۔ یہ میں نے وائیٹ ہیڈ (1974-1861) کے افکار کا رواں سا ترجمہ [1] عرض کیا ہے۔

---

[1] قارئین کی دل چسپی کے لیے وائٹ ہیڈ (1974-1861) کی اس کتاب (Adventures of Ideas) کے تقلید کی تباہ کاریوں کے کچھ اقتباسات کا رواں ترجمہ دیا جا رہا ہے: تہذیب کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ انسان آگے دیکھے۔ تہذیبی ترقی کے لیے یہ قطعاً ناکافی ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ زمانۂ سابقہ میں کون کون سی اچھی باتیں کی گئیں اور کون کون سے اچھے کام کیے گئے۔ اس اسلوبِ زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی جامد بن جاتی ہے فطری صلاحیتیں دب جاتی ہیں اور دل کو پستی کی طرف جانے کی عادت پڑ جاتی ہے...... یاد رکھیے! فلسفۂ معاشرت کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ کوئی مکمل شے بھی جمود کی حالت میں مکمل نہیں رہ سکتی۔ یہ اصول تمام اشیائے فطرت کی جڑوں میں کارفرما ہے۔ انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں: آگے بڑھو یا پیچھے ہٹو۔ ایک مقام پر کھڑے رہنا روحِ کائنات سے جنگ کرنا ہے۔ (جو آگے نہیں بڑھ رہا سمجھ لیجیے کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے) زندگی کے فرسودہ پیکروں کو گلے سے لگائے رکھنا تنزل و تسفّل ہے۔ ایسی زندگی دن تو پورے کر دیتی ہے لیکن کچھ پھل نہیں لا سکتی...... اس میں تہذیب کی نمائش تو رہ جاتی ہے لیکن اس کی حقیقت باقی نہیں رہتی...... جو تہذیب ہمت کر کے آگے نہیں بڑھتی وہ تباہ ہو جاتی ہے...... ماضی کی عظمت کو بھی وہی صحیح طور پر پہنچان سکتا ہے جس کا مستقبل روشن ہو۔ ماضی کا علم بلا حرکت ماضی کے پیغام کی قیمت کھو دیتا ہے۔ ایک تہذیب کے لیے علم کی ضرورت یقینی ہے لیکن اسی علم کی جو آگے لے جائے۔

(Whitehead, Alfred North: Adventures of Ideas, The Tree Press, New York, 1967, pp.12,360,352).

بحوالہ پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ لاہور 2002 ص۔ 395۔

صدیوں سے سوچ کے میدان میں ہماری حالت زار

عزیزانِ من! بات وثن سے چلی تھی۔ کہا کہ اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا (29:17) تم لوگ وثن کے اوپر جم کر بیٹھ جاتے ہو' یہ زندگی نہیں ہے' موت ہے۔ اب یہ بات ہے کہ اتنے پیچھے کا جو ماضی ہے تو کس طرح سے جی چاہے گا کہ اُس کے اوپر جم کر بیٹھ جائے۔ محسوس چیزوں میں تو آپ یہ نہیں کرتے۔ آج آپ گدھے کی سواری تو کبھی نہیں کرتے' آپ نے اُس کو Discard (ردّ) کر دیا ہوا ہے' آپ ہوائی جہاز تک پہنچ چکے ہوئے ہو لیکن فکری طور پر مذہب کی دنیا میں آپ ان رسوم و مناسک کے اندر اُسی گدھے کے اوپر چڑھتے ہیں' خواہ آپ کے سامنے ہزار ہوائی جہاز ہوں۔ ہوائی جہاز کا ذکر آئے تو خطبے کے اندر ہوتا ہے کہ و کـــل بـدعة ضـللة و کل ضللة فی النار ہر نئی چیز جو ہے گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جائے گی۔ ہر خطبے میں آپ کے ہاں یہ ہوتا ہے۔ اور وہ جمعہ کا ہی خطبہ نہیں' وہ تو غنیمت ہے کہ آپ لوگ سمجھتے نہیں ہیں' آپ کے نکاح کے خطبے میں بھی یہی ہے۔ ہر خطبے میں یہ فقرہ آجاتا ہے۔ آج آپ ہوائی جہاز کے مقابلے میں گڈے [2] کی تعریف نہیں کرتے۔ اُس گڈے کو تم اتنا شاندار بناتے ہو' اُس کے لیے کیسے مطمئن ہو جاتے ہو۔ سنیئے! قرآن کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ تمہیں پتہ ہے کہ ہوتا کیا ہے؟ وَّ تَـخۡـلُـقُوۡنَ اِفۡكًا (29:17) یہ اس ماضی کے پرستار بنانے والے اُس کے متعلق افسانے وضع کرتے ہیں کہ جی' آہاہا! حضرت صاحب نے کیا فرما دیا ہے! ورنہ کوئی قوم اور کوئی فرد بھی وثـــن کے اوپر جم کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اُس کے متعلق ایسے افسانے بنا کر بتاتے ہیں کہ صاحب! ان اسلاف جیسا اب مومن یا مرد بننا ناممکن ہے۔

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا کچھ کہہ جاتا ہے' کس طرح دین اور مذہب کے اندر فرق کرتا ہوا چلا جاتا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ سارے مل جل کر یہ کیوں کرتے ہیں' ان کا کیا مقصد ہوتا ہے؟ اب میں اسی سورۃ کی 25ویں آیت پہ آ گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ دور سے دیکھ لیتے ہیں کہ جس نے یہاں ہاتھ باندھے ہوئے ہوتے ہیں تو آپ سمجھ لیتے ہیں کہ اہلحدیث ہے۔ ہاتھ ذرا نیچے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حنفی ہے۔ اگر چھوڑے ہوئے ہیں تو پھر تو پوچھو ہی نہیں۔ یہ جو چیزیں ہیں کہ اپنی مسجد میں وہ اُس کو نماز نہیں پڑھنے دیتے جو ہاتھ ذرا نیچے کر کے باندھے۔ اور یہ جو یہاں اوپر ہاتھ باندھنے والے ہوتے ہیں تو پوچھو نہیں کہ ان کی کتنی عزت ہوتی ہے کہ آجاؤ میاں صاحب! تشریف لے آؤ۔ یہ ہاتھ ذرا نیچے رکھنے والا محلے کا کتنا ہی شریف انسان ہو' پڑھا لکھا بھی ہو لیکن محض یہ کہ یہ یہاں اوپر ہاتھ نہیں باندھتا' وہ ان کے جتھے میں سے نہیں ہوتا۔ کیا آپ نے اس بات پہ غور کیا؟

---

[2] بیل گاڑی

فرقہ بندی کی بنیادی وجہ دنیاوی مفادات کا حصول ہے

اس تمہید کے بعد دیکھیے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ جو سارا قصہ ہے جو تم ان لوگوں سے وثن کی پرستش کراتے ہو تو اُس کے لیے پھر افسانے وضع کرتے ہو۔ کہا ہے کہ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا (29:25) اللہ جو حرکت اور حرارت کی تعلیم دینے والا ہے، زندگی کے ارتقا کی طرف لے جانے والا ہے، تم اُس کو چھوڑ کر جمود اور تعطل کو خدا بنا کر ان کے سامنے پیش کرتے ہو۔ کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ یہ آپس میں اس طرح کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (29:25) یہ دنیاوی زندگی کے جو مفاد ہیں، وہ اس سے وابستہ ہوتے ہیں کہ یہ اس پہ اپنے گروہ کو پکار کھیں کہ دیکھنا ہاتھ ذرا نیچے نہ چلا جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہے اس کی وجہ۔ آپس میں ایک فرقہ ایک جتھہ ہے، وہ جھاڑو کے جو تنکے ہیں وہ ایک رسی سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں، یہ جو وثن ہے اس لیے وہ فرقہ ایک جتھہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ تم اِس لیے اس کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جاتے ہو کہ یہ تنکے اکٹھے رہیں اور مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (29:25) اور مقصد سارا دنیاوی زندگی کے مفاد ہوتے ہیں۔ یہ ساری بات اتنی ہی ہے۔

کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا (29:17) وہ روٹی کی خاطر ہی یہ سارا کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ کیا روٹی ہے جو تم لیتے ہو؟ کہا کہ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (9:34) قرآن ان مذہبی پیشواؤں کو باطل کہتا ہے کہ وہ علما ہوں یا مشائخ ہوں، یہ کمائی کرنے والوں کا مال تخریبی طور پہ کھا جاتے ہیں۔ کہتا ہے کہ ان کے لیے رزق کی خاطر یہ سارے پاپڑ بیلتے ہو، یہ سارے جھوٹ بولتے ہو، ان لوگوں کو فریب میں رکھتے ہو۔ فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ (29:17) اس کو چھوڑو اور رزقِ حلال کی طرف آؤ، خدا کے قوانین کے مطابق رزق حاصل کرنے کی کوشش کرو جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہوتا۔ تمہیں پھر جتھے بنانے کی ضرورت نہیں ہے، پھر تمہیں ان اسلاف کے Past (ماضی) کے لیے افسانے گھڑنے کی ضرورت نہیں ہوگی، پھر اس قدر تعصب اور عصبیت تمہارے اندر نہیں پیدا ہوگی کہ ذرا سا ہاتھ کسی نے نیچے کیا تو قیامت آ گئی۔ یہ سب کچھ تم رزق کی خاطر کرتے ہو، روٹی کی خاطر کرتے ہو۔ کہا کہ دوسرا رزق وہی ہے جو خدا کے قانون کے مطابق ملتا ہے۔ وَ اعْبُدُوْهُ (29:17) اُس کی اطاعت اختیار کرو، اُس کی محکومیت اختیار کرو۔ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ (29:17) تا کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ یہاں محنت کرنا پڑتی ہے لیکن وہ محنت ایسی ہو جو بھرپور نتائج پیدا کرتی ہے۔ اوکدھر بھاگے بھاگے پھر رہے ہو؟ یاد رکھو! اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (29:17) یاد رکھو! جتنا جی چاہے تم اِدھر اُدھر بھاگ کر دیکھ لو، ذلت و خواری اور پستی کی زندگی بسر کر لو، آخر الامر انسانیت نے اس کی طرف آنا ہے۔

دنیائے انسانیت میں مذہب پرست قوم سب سے پیچھے ہوتی ہے

یہ کہتے ہیں کہ جی' یہ قیامت کے بعد کی بات ہے کہ وہاں آنا ہے۔قرآن اسی دنیا کی بات کرتا ہے کہ انسانیت نے اس کی طرف آنا ہے۔انسانیت اس کی طرف نکلتی جارہی ہے۔ جو تفقہ سے کام لے رہی ہے وہ قومیں اس طرف نکلتی جارہی ہیں۔انسانیت نے اس کی طرف آنا ہے۔یہی چیز ہے کہ جو مذہب پرست قوم ہے وہ سب سے آخر میں آتی ہے یا وہ ختم ہوجاتی ہے۔قرآن یہی ہمیں بتاتا ہے کہ اگر وہ اپنی اس چیز کے اوپر ضد کرتی ہے تو فطرت کے تھپیڑے بڑے سخت ہوتے ہیں' بڑے بڑے تناور درخت ایک آندھی کے جھکڑ میں سرنگوں ہوجاتے ہیں' بڑی بڑی قومیں جتنی بھی دنیا کے اندر تھیں' جنہوں نے اسی طرح سے اوثان کو نہیں چھوڑا' زندگی کے اندر قدم آگے نہیں بڑھایا' ایک مقام پہ کھڑی رہیں تو وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔قرآن کہتا ہے کہ ان کی صرف داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔جن میں یہ صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے وہ زندہ بھی رہتی ہیں اور آگے بھی بڑھتی ہیں اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ (29:17) اُس کی طرف لوٹ کر آتی ہیں۔ وَ اِنۡ تُكَذِّبُوۡا فَقَدۡ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ (29:18) حضرت ابراہیمؑ یا رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ اگر اس کے باوجود یہ تمہاری تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غلط کہتا ہے' دوسری جگہ رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے بلکہ یہ کمبخت ہمارے قوانین کے متعلق کہتے ہیں کہ غلط ہیں' رسول سے کہا گیا کہ یہ پہلی بات نہیں ہے' جہاں جہاں بھی مذہب کے ساتھ دین کی ٹکر ہوئی ہے اور دین پیغام لے کر آیا ہے تو مذہب پرست طبقے نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور ہمیشہ یہی کیا ہے۔وہ اپنی ماضی پرستی کو چھوڑتا نہیں ہے۔یہ اُس کے لیے پیغامِ انقلاب لے کر آتا ہے' یہ تو ہمیشہ شروع سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ وَ مَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ (29:18) اور تمہارے ذمے یہ بات نہیں ہے کہ تم ضرور ان کے اندر انقلاب لاکر رہو گے' تمہارا کام تو اس بات کو پہنچائے چلے جانا ہے۔اگر یہ عقل و فکر سے کام لیں گے تو خود اس کی صداقت کے معترف ہوجائیں گے۔اگر ایسا نہیں کریں گے اور اپنے جمود کے اوپر قائم رہیں گے تو چند دنوں کے لیے یہ جو مُردہ ہے تو اس کی ایسی شکل باقی رہے گی' پھر اِس میں سڑاند پیدا ہوجائے گی۔تم Worry (دل گرفتگی) ہی نہ کرو۔

قرآنِ حکیم اپنی صداقتوں کے لیے خارجی کائنات اور نوعِ انسانی کی تاریخ کو پیش کرتا ہے

اس کے بعد اگلی بات یہ ہے کہ واقعی زندگی اور کائنات تغیرات میں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔بات یہ ہے جو چلی آرہی ہے۔داستان حضرتِ ابراہیمؑ کی بیان ہورہی ہے۔آپ دیکھیے کہ کیا حقائق بیان کیے جارہے ہیں! ان حقائق میں یہ کہا ہے کہ جو وثن ہے' جو جمود ہے تو یہ موت ہے' یہ زندگی نہیں ہے۔اور اُس کے بعد کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں اور اس کی شہادت دیں۔آپ کو معلوم ہے کہ وہ شہادت کیا دیا کرتا ہے؟ یا تو وہ خارجی کائنات کی شہادت دیتا ہے یا اممِ سابقہ کی تاریخ اور شواہد پیش کرتا ہے۔اب یہ بات کہ زندگی ایک

مقام پہ کھڑی نہیں ہوتی، ہمیشہ آگے بڑھنے کی بات ہے۔ یہ چیز اگلی آیت میں ہے۔عزیزانِ من! آپ حیران ہونگے کہ جس کو سائنس کی دنیا کا اس دور کا عظیم تریں انکشاف کہتے ہیں تو قرآن چودہ سو سال پیشتر اُس کو لاتا ہے لیکن قرآن سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ بات اُس نے یہ کہنی ہے کہ جو ایک مقام پہ کھڑا رہتا ہے، وہ تباہ ہو جاتا ہے۔زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے۔اور اِس کی شہادت Theory of Evolution (نظریۂ ارتقا) سے پیش کرتا ہے جسے اس دور کا معرکہ آراء انکشاف کہا جاتا ہے لیکن اِسے ہم آئندہ لیں گے کیونکہ آج وقت ہو گیا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ العنکبوت کی آیت 18 تک ہم آگئے۔ 19ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



آ ٹھواں باب: **العنکبوت** (آیات 19 تا 25)



عزیزانِ من! آج مئی 1979ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 19 سے ہو رہا ہے: (29:19)-

آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلے کئی درسوں میں ہمارے سامنے حضرتِ ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ تھا جسے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے خود یہ کہا ہے کہ وہ نوعِ انسان کے لیے بہترین ماڈل ہے۔ اُس اسوۂ حسنہ کے بعد سابقہ درس میں وہ پیغام تھا یا تعلیم تھی جو حضرتِ ابراہیمؑ اپنی قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ اُس تعلیم کے سلسلے میں پچھلے درس میں یہ بنیادی حقیقت سامنے آئی تھی کہ زندگی پیہم حرکت کا نام ہے' آگے بڑھنے کا نام ہے۔

لفظ ثواب کے متعلق ایک دلچسپ جواب

جہاں زندگی میں جمود طاری ہو جائے تو وہ زندگی نہیں رہتی بلکہ موت ہوتی ہے۔ انسان کی شکل میں سانس تو آتا ہے' جسے آپ طبعی زندگی کہتے ہیں' وہ تو رہتی ہے لیکن انسانیت کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اور جو کچھ افراد میں ہوتا ہے وہی کچھ بلکہ اُس سے زیادہ شدت کے ساتھ' اقوام کی زندگی میں ہوتا ہے۔ جہاں کوئی قوم پہلے آگے بڑھنے والی قوموں سے پیچھے رہ جائے' اسے ہم گناہ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ان الفاظ کا بس ترجمہ ہی ایک ہو گیا۔ اُدھر ایک لفظ ثواب آ گیا اور اِدھر ایک لفظ گناہ آ گیا۔ اس کے متعلق اپنے اپنے ذہن میں ہی کچھ سمجھا جا سکتا ہے لیکن محسوس طور پر نہ بتایا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس سے ہوتا کیا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ اس تسبیح کے دانے پورے کر لیجیے تو اس سے آپ کو ثواب ہوگا تو وہ تسبیح بھی پوری کر لیتے ہیں اور نوافل بھی پڑھ لیتے ہیں۔ کیا اُس کے بعد آپ کو بھی کچھ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ہوا کیا ہے؟ جسے اُنہوں نے کہا تھا کہ ثواب ہوتا ہے تو اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ کو پھر ہوا کیا ہے تو آپ بھی نہیں بتا سکتے۔ اُن سے پوچھا جائے کہ صاحب! آپ ہی بتا دیجیے کہ اس کے بعد ہوتا کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ کہہ تو دیا ہے کہ ثواب ہوتا ہے اب اور کیا بتائیں آپ کو؟ میرے ایک دوست نے اُن سے پوچھ لیا کہ صاحب! یہ عربی کا لفظ ہے تو میری سمجھ میں نہیں آیا' آپ مجھے اردو یا پنجابی میں بتا دیجیے کہ ہوتا کیا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ ہوتا ہی عربی میں ہے' اردو پنجابی میں تو ہوتا ہی نہیں ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جو قرآن نے کہا تھا کہ ان لوگوں سے تم کیا بات کرو گے۔ تم کوئی بھی بات کرو گے تو ان کے ہاں اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ (7:71) کچھ الفاظ ہیں جو ان کے بڑے بوڑھوں نے وضع کیے اور کچھ اِنہوں نے اُن کو وضع کر دیا ہے۔ جب بھی کوئی بات پوچھو گے تو وہ لفظ بول دیں گے' اگر لفظ کی بات آگے کرو گے تو وہ کہیں گے کہ صاحب! یہ تو مذہب کا معاملہ ہے اور تم منطق چھانٹنے لگے ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اصطلاحات ہیں' چند اسما ہیں' چند الفاظ ہیں جو ان کے ہاں چلے آ رہے ہیں اور اُنہیں یہ دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ ضرورت پڑتی ہے تو اُن میں ایک آدھ کا خود بھی اضافہ کر لیتے ہیں۔ اُن کا جو مقصود و مفہوم ہے وہ نہ اُنہیں معلوم ہوتا ہے اور نہ آگے بتا سکتے ہیں۔ کرنے والے بھی تقلیداً کر لیتے ہیں کہ صاحب! اُنہوں نے کہا ہے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے تو ثواب ہوتا ہی ہے۔ جو پوچھا جائے کہ صاحب! پتہ کیسے چلے کہ ثواب ہوا ہے یا نہیں؟ تو وہ کہنے لگے کہ یہ تمہیں قیامت میں جا کر پتہ چلے گا۔ بس تم وہ کرتے چلے جاؤ جو ہم کہہ رہے ہیں۔ یہ ثواب بھی ایسے ہی ہوتا ہے اور گناہ بھی ایسی ہی بات ہے۔

گناہ کا قرآنی مفہوم

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ جو قوم زندگی کی اس دوڑ میں' اس مصافِ حیات میں' اس جنگاہ میں' اس سفر میں' باقی قوموں سے پیچھے

رہ جائے اُس کے لیے قرآنِ کریم نے ایک لفظ ''اثــم'' استعمال کیا ہے۔ اُس کا ترجمہ ہم نے گناہ ہی کر لیا کہ اُس سے گناہ ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ عرب ناقہ آثمہ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جو تھک کر' اپنی باقی اونٹیوں کی قطار سے' پیچھے رہ جائے اور اُس میں تکان کی وجہ سے آگے بڑھنے کی سکت نہ رہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جو قوم اس طرح سے' ان اقدار کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتی' ان کی خلاف ورزی کرتی ہے تو وہ قوم ہے جو ''اثیــم'' ہوتی ہے۔ ترجمہ ہم نے کیا کہ گناہگار ہوتی ہے جبکہ وہ کہتا ہے کہ وہ قوم زندگی کی دوڑ میں باقی اقوام سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ پہلا ''اثم'' تو یہ ہے۔ اب سمجھ لیا کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔ اس اثیم قوم میں تو پھر بھی کچھ لڑھکتے ہوئے چلنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن اگر وہ کسی ایک مقام پہ کھڑی ہو جاتی ہے تو قرآن اسے کیا کہتا ہے؟

جہنم یا جحیم کا قرآنی مفہوم

آپ کو معلوم ہے کہ جہنم کے لیے قرآن میں ایک لفظ جحیم بھی آیا ہے۔ جحیم اُس مقام کو کہتے ہیں جس میں حرکت نہ ہو اور وہ قوم جامد ہو کر وہاں کھڑی ہو جائے۔ جحیم تو اُس کی وہ کیفیت ہے جس میں حرکت رک جانے سے اُس پہ جمود آ جاتا ہے' آگے نہیں بڑھتی' اُس کے نزدیک ہزار سال پیچھے کی زندگی سب سے زیادہ خوشگوار زندگی ہوتی ہے۔ کسی مقام پہ رک جانا جحیم ہے' اُس رک جانے سے جو ہوتا ہے اُسے جہنم کہتے ہیں۔ جہنم کے معنی یہ ہیں کہ جہاں انسانوں کو جلا دیا جائے' جہاں انسانیت جل جائے' جہاں کسی کی انسانیت سوز کیفیت ہو جائے۔ یہ طبعی زندگی کی بات نہیں بلکہ انسانیت کی بات ہے۔ جمود کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کی طبعی زندگی تو باقی رہتی ہے لیکن اُس کی انسانیت راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہے۔ یہ چیز پچھلے درس میں آئی تھی کہ جب حضرتِ ابراہیمؑ نے اُن کو کہا تھا کہ تم جو مجھے یہ کہتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ تم خدا کے قوانین کی طرف آ ؤ اور زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھو' ارتقا کی میزان میں اوپر چڑھو اور تم کہتے ہو کہ نہیں' جو کچھ ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے تھے ہم اُسی کے مطابق کرتے چلے جائیں گے۔ آپؑ نے کہا تھا کہ یہ جمود ہے' یہ وثن ہے۔ اور اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر زوال آ جاتا ہے اور اُس کا جو اگلا نتیجہ ہے وہ انسانیت کی موت ہے۔ زندگی حرکت کا نام ہے' حرارت کا نام ہے' آگے بڑھنے کا نام ہے:

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہ چار پانچ ہزار سال پیشتر کی بات ہے جو قرآنِ کریم حضرتِ ابراہیمؑ کا وعظ یا اُن کی تلقین بیان کرتا ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ اُنہوں نے فی الواقعہ ایسی بات کی تھی۔ وحی کے تو معنی یہ ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ چودہ سو سال پیشتر قرآن نے' نبی اکرم ﷺ نے' خود

حضرتِ ابراہیمؑ کا یہ وعظ یا یہ تلقین یا یہ پیغام اپنی طرف سے بیان کر دیا ہو۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ قرآن میں ہے کہ یہ وہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہیں بذریعہ وحی دے رہے ہیں' ابراہیمؑ نے قوم سے یہی کہا تھا۔ تو یہ بڑی بات ہوگئی۔ ہمارے سامنے بات یہ آ گئی کہ چار پانچ ہزار سال پیشتر بھی جب وحی آئی تھی تو اُس نے وہی بات کہی تھی۔

عزیزانِ من! آگے بات آتی ہے جس کو قرآن نے عظیم کہا ہے بلکہ خدا نے دعویٰ کیا ہے کہ اس قرآن کی مثل چار آیات بھی لا کر بتاؤ۔ سنیے! آگے کیا بات کہی جا رہی ہے؟ پچھلی دفعہ میں نے کہا تھا کہ بعض مقامات ایسے ہیں جو زیادہ غور و فکر سے سمجھنے کے ہیں۔ اور یہاں اُسی قسم کا ایک مقام آ رہا ہے۔ پھر سمجھ لیجیے کہ کہا یہ جا رہا ہے کہ زندگی نام ہے پیہم حرکت کا' مسلسل چلنے کا' مسلسل آگے بڑھنے کا۔ جہاں کوئی شے رک جاتی ہے تو وہاں زندگی نہیں رہتی' وہاں موت رہتی ہے۔ اُس کے بعد یا تو وہ کیفیت Repetition (اعادہ) کی ہوتی ہے' اُسی طرح سے زندگی اپنے آپ کو Repeat (دہراتی) کرتی چلی جاتی ہے یعنی دائرے کے اندر چلتی چلی جاتی ہے اور یا پھر وہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بات حضرتِ ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے اتنے قبل مسیح کے زمانے میں کہی۔ اب اس کے لیے وہ دلیل مانگتے ہیں' ثبوت مانگتے ہیں۔ اور یہاں میں یہ عرض کرونگا کہ غور و فکر کی بات ہے۔ ہم آج بیسویں صدی میں آ کر کہیں علمی تحقیقات اور انکشافات کی رو سے اسے سمجھے ہیں جسے آپ Life (زندگی) کہتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ میں زندہ ہوں' میری زندگی ہے۔ ایک وہ ہے جس کا نام زندگی ہے' اُس کے متعلق جو اِس دور میں تحقیقات ہوئیں یا انکشافات ہوئے اُن کو سامنے رکھیے۔ یہ کوئی چار پانچ ہزار سال پہلے کی باتیں ہیں۔ اُس دور میں یہ بات کہی جا رہی ہے۔ یہ بات ذرا غور سے سمجھنے کی ہے اور ایسی ہے کہ واقعی اگر خدا کی طرف سے یہ بات نہ ہو کہ ہم تمہیں یہ وحی کی رو سے بتاتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے کہا تھا تو آج کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ یا عالم بھی یہ بات نہ کہے کہ واقعی یہ بات اُس زمانے میں کہی تھی۔ اور یہ وہ بات ہے جس پہ میں نے کہا تھا کہ Maurice Bucaille[1] (مورس بوکائے) نے قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لیے جس ثبوت کی بنا پہ کہا کہ یہ انسان کی کتاب نہیں ہوسکتی' وہ یہی مقامات ہیں جہاں وہ کہتا ہے کہ یہ بات تو ہم پچھلی صدی

---

[1] یہ فرانس کے ڈاکٹر مورس بوکائے (Maurice Bucaille: 1911-1989) ہیں۔ ان کی اس کتاب کا نام 'The Bible, The Qur`an And Science' ہے۔ ان کی دوسری کتب حسبِ ذیل ہیں جو دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے دی جا رہی ہیں:

1- Mummies of the Pharaohs-Modern Medical Investigation (St. Martin Press, 1990)

2- What is the Origin of Man (Seghers, 1988)

3- Moses and Pharaoh, the Hebrews in Egypt (NTT Mediascope Inc., 1994)

4- Reflexions sur le Coran (Mohammed Talbi & Maurice Bucaille, Seghers, 1989)

میں ابھی نہیں کہہ سکتے تھے اور یہ چودہ سو سال پہلے قرآن نے کہی ہے۔ اور ہمارے ایمان کی رو سے یہ چھ ہزار سال پیشتر وحی نے کہی ہے۔ آپ دلیل سنیے کہ زندگی حرکت کا نام ہے' جہاں حرکت رکتی ہے وہاں یا تو جمود آ جاتا ہے یا زوال ہوتا ہے یا پھر موت ہوتی ہے۔ اس کا کیا ثبوت ہے؟

میں نے کہا ہوا ہے کہ قرآن کا کوئی مقام بھی ایسا نہیں ہے جہاں آپ یونہی سرسری طور پر گزر جائیں۔ یہ کچھ آپ ثواب کے لیے یا تلاوت کے لیے تو کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ سمجھنا چاہیں گے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے تو پھر تو کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ یہاں وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے تمہیں کہا ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے۔ تم کہتے ہو کہ زندگی اسلاف کی اطاعت کا نام ہے' جمود کا نام ہے' سنو! یہ کھڑے ہو جانے کا نام ہے' جو تم کہتے ہو یہ موت ہے' یہ زوال ہے۔ کہا کہ **اَوَ لَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰہُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنْشِئُ النَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ ط اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ** (29:19-20)۔ پہلے عام الفاظ میں بات سن لیجیے۔

تخلیق کائنات کا ہر مرحلہ حرکت کے عمل کا رہینِ منت ہے

کہا ہے کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم اس بات پہ غور نہیں کرتے' کیا یہ لوگ اس چیز پہ غور نہیں کرتے؟ کہ زندگی حرکت کا نام ہے' کسی مقام پہ کھڑے ہونے کا نام نہیں ہے' جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اُس کی تقلید کا نام نہیں ہے۔ زندگی حرکت کا نام ہے' اسی طرح سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔ اور کہا یہ ہے کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے؟ یہاں لفظ ''یروا'' آیا ہے یعنی غور صرف ذہنی نہیں ہے بلکہ یہ تو ایسی چیز ہوتی ہے جسے آنکھوں سے بھی دیکھا جائے۔ تو گویا یہ ایک چیز محسوسات کی دنیا کی کہی جا رہی ہے۔ یعنی یہ Purely Theoretical نہیں ہے' نظری نہیں ہے' صرف Academic نہیں ہے' بلکہ یہ یروا ہے۔ عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ یہ بات وہ کہہ رہا ہے جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ کہا کہ تم نے کبھی اس کو دیکھا ہے یا اس پہ غور کیا ہے کہ خدا نے جو کچھ تخلیق کیا ہے' جو کچھ Create (پیدا) کیا ہے' کیا کبھی تم نے اِس پہ غور کیا ہے' سوچا ہے' دیکھا ہے' Examine کیا ہے کہ خدا نے یہ جو کچھ Create (پیدا) کیا ہے' تخلیق کیا ہے' پیدا کیا ہے' اُس کی ابتدا کیسے ہوئی اور کس شکل میں ہوئی؟ اور اُس کے بعد وہی جو پہلی تخلیقی چیز تھی وہ اس موجودہ شکل میں کس طرح سے آئی؟ کیا کبھی اس پہ غور کیا ہے؟ کہا کہ یہ مسلسل حرکت کا نتیجہ ہے۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ قرآن اس میں کیا کچھ کہہ گیا ہے۔ کہا کہ ان سے کہو کہ یہاں بیٹھے ہوئے کیا سوچ رہے ہو؟ یہاں شاید تمہیں یہ کچھ نہ نظر آئے؟ اس کرۂ ارض کے اوپر چلو پھرو' اس کی ریسرچ کرو' تحقیقات کرو اور اُس کے بعد یہ دیکھو کہ جو چیز Create (پیدا) کی گئی تھی اُس کی ابتدائی شکل کیا تھی۔ اور

پھر سائنس کی رو سے غور کرو کہ وہ کن کن مراحل سے گزری اور ہر مرحلے میں کس طرح وہ پہلے سے زیادہ بہتر اور بلند ہوتی چلی گئی تا آنکہ وہ اس شکل میں آ گئی ہے جس شکل میں ہئیت انسانی ہے یا پیکرِ انسانی ہے۔ کہا کہ جاؤ اور سِیۡـرُوۡا فِـی الۡاَرۡضِ (29:20)۔ سنیے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ پہلی چیز تو اِس میں یہ ہے کہ یہ کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ (29:19) اور کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ (29:20) کیا ہے؟

امر اور خلق کے لحاظ سے عربی زبان کی اہمیت

ایک بہت مشہور فلاسفر ہے اور سائنٹسٹ بھی ہے۔ اس کا نام پرنگل پٹیسن ❶ ہے۔ اُس نے یہ کہا ہے کہ عربی زبان یا عربی زبان کے کوائف کو جاننے والے بڑے Advantageous Position (فائدہ مند حیثیت) میں ہیں کہ اُن کے پاس Creation (تخلیق) کے لیے دو الفاظ ہیں۔ ایک امر ہے اور ایک خلق ہے۔ قرآن میں یہ دونوں آئے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہماری زبان میں ایک ہی لفظ "Creation" ہے۔ حالانکہ جو Creation ہے وہ اُس مرحلے کو کہتے ہیں جہاں کوئی شے محسوسات کے دائرے میں آ جائے۔ اِسے تخلیق کہتے ہیں، خلق کہتے ہیں۔ تخلیقی اسٹیج وہ ہوتی ہے جہاں کوئی شے محسوسات کے دائرے میں آ جائے۔ وہ کہتا ہے کہ جو چیز محسوسات کے دائرے میں آتی ہے، اُس سے پیشتر کتنی Stages (منازل) ایسی ہوتی ہیں جو وہ انسانی محسوسات کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتیں لیکن وہ شے ان منازل میں سے بھی گزر رہی ہوتی ہے۔ کہا کہ قرآن نے اُس کے لیے ''عالمِ امر'' کہا ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں Direction ہے، یعنی Directive Energy of God۔ آپ نے کوئی بلڈنگ بنانی ہو اور اُس سے پیشتر آپ کا جو آرکیٹکٹ ہے، وہ پہلے اپنے ذہن میں اُس بلڈنگ کا تصور کرتا ہے جو اُس نے بنانی ہوتی ہے۔ پھر اُس کے لیے وہ Calculation کرتا ہے، پھر اُس کے لیے وہ ڈرائنگ کرتا ہے، پھر Plan بناتا ہے، لکیریں کھینچتا ہے۔ ابھی آپ کے سامنے بلڈنگ نہیں آ رہی۔ یہ سارے مراحل سے گزرنے کے بعد پھر وہ پہلی اینٹ رکھی جاتی ہے۔ یہاں سے خلق (Creation) کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ چیزیں تو وہ ہیں جو محسوسات میں ہیں اور میں اس کے علاوہ کیسے سمجھا سکتا ہوں۔ لیکن یہ جو ابتدائی مراحل ہیں، اِن میں ابھی بلڈنگ کی شکل تو سامنے نہیں آئی۔ اور ان مراحل میں سے اس پروگرام کو گزارنے کے بغیر کیا بلڈنگ بن سکتی تھی؟ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ابھی اُس کے ذہن میں نقشہ تھا۔ اور اگر اچھا آرکیٹکٹ ہے تو اُس نے تو وہیں تکمیل کر لی تھی کہ جو بننے والی بات ہے۔ اُس کے ذہن میں تو محسوس شکل میں جیسے آ جاتی ہے تو ایسے آ گئی ہوئی تھی۔ لیکن وہ ابھی محسوسات کے دائرے میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ

---

❶ Pringle-Pattison, Andrew Seth (1856-1931)

کریم نے یہ کہا ہے کہ یہ جو محسوس کائنات (This Physical Universe) ہے' یہ جو تمہارے سامنے ہر شے محسوسات کے دائرے میں نظر آئی ہے' تو اس سے بہت پہلے اس کے پیچھے ایک ایسا بھی دور گزرا ہے جس میں یہ ابھی Creation کے مرحلے میں نہیں آئی تھی' یہ ابھی تخلیق کے مرحلے میں نہیں آئی تھی' بلکہ یہ ابھی Direction کے مرحلے کے اندر تھی۔ اس کے متعلق ابھی وہ Sketch (خاکے) بن رہے تھے۔ اُس کے لیے قرآنِ کریم کا لفظ امر ہے۔ کہا کہ **بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ** (2:117)۔ پہلے تو امر کا معاملہ ہوتا ہے اور وہ صرف خدا کی ذات تک ہوتا ہے۔ میں یہاں انسانی الفاظ کے علاوہ اور کوئی الفاظ استعمال ہی نہیں کرسکتا کیونکہ ہمارے ہاں یہی الفاظ ہیں۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر [1]

خدا کا ایک ارادہ ہوتا ہے' پہلے خدا کے ذہن میں ایک تصور آتا ہے' نقشہ بنتا ہے' ڈیزائن بنتے ہیں۔ اور یہاں ابھی صرف ارادہ ہے۔ جب وہ تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے ''امر'' کے مراحل میں سے وہ بات گزرتی ہے۔ جب یہ مراحل طے پا چکتے ہیں تو پھر وہ یہ بات کہتا ہے کہ ہاں اب یہ چیز عالمِ خلق میں آجائے۔ وہ کہتا ہے کہ جب وہ شے یہاں آتی ہے تو وہ ہے جسے آپ Creative کہتے ہیں' Creation کہتے ہیں' خلق کہتے ہیں۔ پھر یہ تمہارے محسوسات کے دائرے میں آسکتی ہے۔ پرنگل پیٹیسن (1856-1931) کہتا ہے کہ اس عربی زبان کی کیا بات ہے! ہمارے ہاں انگریزی میں عالم امر کے لیے دوسرا لفظ ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں امر کا لفظ ہی نہیں ہے بلکہ Creation کا ہی لفظ ہے۔ قرآنِ کریم نے تخلیق کی یہ دو Stages (منازل) بتائی ہیں۔

اب آگے چلیے۔ یہ جو پہلا ڈیزائن کا' ارادے کا' Direction کا' امر تھا تو اس کے گزرنے کے بعد یہ نمود میں آئی' ظہور میں آئی' اس شکل میں آئی۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کے لیے پہلے کوئی Material (مواد) تو تھا ہی نہیں۔ وہ Material (مواد) تو عالمِ امر میں ہوتا ہی نہیں ہے' وہ تو عالمِ خلق کی بات ہوتی ہے۔ کہا کہ اس کے لیے پہلے سے کوئی Material (مواد) نہیں ہے۔ یہ جسے آپ Nothingness (عدم) کہتے ہیں' جس کے لیے لفظ عدم ہے یعنی کسی شے کا بھی موجود نہ ہونا تو کہا کہ یہ اُس Nothingness (عدم) سے وجود میں آئی ہے۔ اور کہا کہ یہ جو چیز ہے یہ صرف خدا ہی کے لیے ہے' یہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ اور یہ جو اسٹیج ہے کہ پہلے سے کوئی شے یا اُس کے لیے جو Material (مواد) درکار ہے' وہ نہ ہو اور اس شے کی نمود ہوجائے یعنی تخلیق ہوجائے تو کہا کہ یہ کوئی نہیں کرسکتا۔ پہلے سے کچھ موجود ہو تو اُن میں تو آپ تبدیلیاں کرکے ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری شے بنا سکتے ہیں اور اس طرح سینکڑوں ہزاروں لاکھوں بنتی چلی جارہی ہیں۔

---

[1] ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر (مرزا اسداللہ خان غالب)

سائنٹسٹ کی زندگی کا اہم موڑ

ایٹم وہ ابتدائی ذرہ ہے جو آسمان پر، چاند پر، اور مریخ پر پہنچانے کا ذریعہ بن رہا ہے لیکن وہ جو پہلا ذرہ تھا، وہ تخلیق کا تھا، وہ کیسے نمود میں آیا، کیسے ظہور میں آیا، یا کیسے پیدا ہو گیا؟ کہتا ہے کہ پہلے سے کوئی Material (مواد) نہیں تھا۔ یہ چیز بھی قرآنِ کریم ہی کی خصوصیت ہے، عربی زبان ہی کی خصوصیت ہے کہ اس کے لیے لفظ **بدع** ہے، دوسرا لفظ **فطر** بھی ہے۔ لیکن میں یہ خاص طور پہ کہتا ہوں کہ اس میں **بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (2:117) آیا۔ **بدع** کے معنی ہیں کہ کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا، Nothingness (عدم) سے اُس کو کوئی شے بنا دینا۔ آج کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی یہ کہتا ہے کہ جتنا جی چاہے ہم تخلیق کے پیچھے چلے جائیں لیکن وہاں ایک مقام ایسا آ جاتا ہے جہاں ہماری سائنس بھی گم ہو جاتی ہے کہ یہ چیز Nothingness (عدم) سے کیسے وجود میں آ گئی۔ اور قرآن کہتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جس مقام پہ پہنچ کے ایک سائنٹسٹ کو ماننا پڑے گا کہ یہ **بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور اگلا لفظ ہے **بدا**۔ جسے ابتدا کہتے ہیں تو یہ وہ ہے۔ ابتدا اسی سے ہے۔ جو **بدع** ہے وہ یہ ہے کہ Nothingness (عدم) سے کوئی موجود (Being) شے بنا دینا۔ **بدا** یہ ہے کہ یہ شے جس شکل میں ہے یہاں سے تخلیق کی ابتدا کر کے آگے لے جانا۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں **بدع** اور **فطر** کے جو الفاظ ہیں ان کا ترجمہ انگریزی میں ہو ہی نہیں سکتا۔ جب وہ [1] کہتا ہے کہ ہمارے ہاں انگریزی میں اس کے لیے کوئی لفظ ہی نہیں ہے تو کیا کہیں گے۔ انہوں نے اس کے لیے Originative ایک لفظ کہا ہے لیکن اس سے بات بنتی نہیں ہے۔

''بدع یا فطر'' کا عمل انسانی احاطہ ادراک سے باہر کی شے ہے

بہرحال یہ جو **بدع** ہے یا **فطر** ہے، یہ لفظ قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پہ آیا ہے۔ کسی ایک مقام پہ یہ نہیں کہا گیا کہ تم غور کرو کہ خدا نے **بدع** کیسے کیا؟ یہ غور کے بس کی بات ہی نہیں ہے، یہ غور کے احاطے میں آتا ہی نہیں ہے۔ اُس نے سارے قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا۔ اور غور و فکر تدبر کے لیے جو کہا ہے تو **بدا** والی بات پہ کہا ہے کہ وہ شے جو تخلیق کے دائرے میں آ گئی تو یہاں سے وہ کہتا ہے کہ ہم نے ابتدا کی۔ اس ابتدا پہ قرآنِ کریم میں ہر مقام پہ آیا ہے کہ غور و فکر کرو، انکشافات کرو، تحقیقات کرو۔ اور یہ چیز فریضہ قرار دی ہے۔ فریضہ تو آدمی کے لیے قرار دیا ہے، مومن کا فریضہ تو اس سے کہیں آگے جاتا ہے۔ یہاں وہ کہتا ہے کہ تم غور و فکر کرو۔

اب ایک لفظ ہمارے سامنے آ گیا۔ کہا کہ **اَوَ لَمۡ یَرَوۡا کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ** (29:19)۔ یہ صرف **بدع** اور **بدا** کے فرق کو سمجھانے کے لیے میں نے یہ عرض کیا ہے۔ اور آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کتنی بنیادی چیز ہے۔ عزیزانِ من! میں اور آپ کیا، اور ہماری

قوم بھی کیا' وہ اس فرق کو' ان امتیازات کو' Appreciate (پسند) ہی کیا کر سکے گی۔ یہ تو پوچھیے سائنسدانوں سے کہ وہ یہاں پہنچ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ پوچھیے پرنگل پٹیسن [1] سے جو یہ کہتا ہے کہ یہ عرب قوم کتنی Advantageous Position (افادی حیثیت) میں ہے جن کے ہاں زبان میں دو الفاظ ہیں۔ یہ اندازہ لگائیے کہ اس لفظ کے لیے وہ کہہ رہا ہے۔

قدرت نے Being (وجود میں آنے) کے عمل پر غور فکر کے لیے کہا ہی نہیں

قرآن نے یہ چیز کہیں نہیں کہی کہ تم غور کرو کہ ہم کیسے Nothingness (عدم) سے اس کو Being (وجود) میں لے آئے ہیں۔ Being اس کو کہتے ہیں جو اس کی ابتدائی شکل ہوتی ہے۔ کہیں یہ بات نہیں کہی۔ یہ غور و فکر کی بات ہی نہیں تھی۔ اور اس کے اوپر غور کرنے کے لیے زور دیا کہ تم کائنات میں دیکھو کہ اس ابتدا سے یہاں تک کیسے پہنچی؟ یہ سائنس کی کتاب تو نہیں ہے کہ وہ M.Sc کے اسٹوڈنٹ کے لیے یہ کہہ رہا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں۔ بات تو وہ یہ کہہ رہا ہے کہ قوموں کی زندگی میں' یہ ہوتا ہے کہ جو قوم مسلسل حرکت اور حرارت سے آگے بڑھتی ہے' وہی زندہ رہتی ہے۔ جو قوم کہیں کھڑی ہو جاتی ہے تو وہ اس کی موت ہوتی ہے یا وہ صرف Repetition (تکرار) ہوتی ہے۔ اُس سلسلے میں یہ بات کہہ رہا ہے اور کہہ یہ رہا ہے کہ ذرا غور کرو۔

اب آیئے سائنس والوں سے پوچھیں کہ آج کے دور میں جو غور کیا گیا' وہ کیا ہے۔ ویسے تو بہرحال کوئی اٹھارویں صدی سے ہی یورپ میں یہ بات شروع ہوگئی تھی لیکن Theory of Evolution (نظریۂ ارتقا) تو 19 ویں صدی میں جا کر آگے بڑھی تھی۔ پھر وہ لوگ تو ایسے نہیں ہیں کہ ایک نے تھیوری (نظریہ) پیش کی اور وہیں کھڑے ہوگئے۔ یہ تو جمود ہے۔ وہ تو کھڑے نہیں ہوتے۔ وہ تو اُس کو لیے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کہیں اُس کے اسقام تھے' کمزوریاں تھیں' وہ دور ہوئیں' کہیں اُن میں اضافے ہوئے' کہیں اُس میں تبدیلیاں ہوئیں اور اس طرح وہ آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں لیکن یہ جو سارا سلسلہ ہے اِس میں ہمارے ہاں کی یہ سائنس متعین طور پر اس نتیجے پہ پہنچی ہے۔ یہ نتیجہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ تو اب لیبارٹری میں یہ کچھ کر کے بھی دکھا دیتے ہیں۔

زندگی کا لائف سیل ہے جو مائیکروسکوپ کی مدد سے نظر آتا ہے

جو زندگی کے بغیر ہے وہ جامد ہے۔ یہ اُس کے متعلق بات نہیں ہو رہی بلکہ یہ بات وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے حرکت اور حرارت ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی بات وہاں سے شروع ہوتی ہے' زندگی یا لائف کی نمود جہاں ہوئی وہاں سائنس یہ کہتی

---

[1] Pringle-Pattison, Andrew Seth (1856-1931)

ہے کہ وہ زندگی کا پہلا Life Cell (جرثومۂ زندگی) تھا۔ اب اُس لائف سل کے لیے ہمارے ہاں جرثومہ ایک لفظ ہے۔ یوں ہم نے کہہ دیا کہ پتہ نہیں کوئی اتنی سی بڑی چیز ہوگی۔ وہ ایسی چیز ہے جو بہت بڑی مائیکروسکوپ کے نیچے رکھنے سے نظر آتی ہے کہ وہ کیا ہے لیکن وہ ہر وقت متحرک ہوتی ہے۔ وہ ایک سیل ہوتا ہے اور زندگی آگے بڑھنے کے لیے دو متضاد قسم کے سیلز کی مقتضی ہوتی ہے اور وہ تو ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ سائنس بتا رہی ہے کہ اُس سیل کے اندر خود یہ تخلیق کا ایک جوش ہوتا ہے اور اس جوشِ نمود سے وہ پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور دونوں حصے اس فرق کے ساتھ ایک جیسے سیل بنتے ہیں کہ ایک اُن میں سے مادہ ہوتا ہے اور ایک نر ہوتا ہے۔ بات تو بڑی لمبی چلی جائے گی۔ اب تو سینما کی اسکرین کے اوپر یہ چیز دکھا دیتے ہیں۔ پتہ نہیں آپ احباب کو معلوم ہے یا نہیں' دو سال پہلے یہاں لائف کی ہسٹری کی ایک فلم آئی تھی' یہ British Council (برٹش کونسل) والے یہاں دکھاتے تھے۔ وہ بڑی عظیم فلم تھی۔ وہ جو پہلا لائف سیل ہے' اُنھوں نے وہاں سے شروع کیا تھا اور پھر جو پوری Development (نشوونما) ہوتی چلی آ رہی ہے' وہ دکھاتے چلے آتے تھے اور انسان تک پہنچے۔ پھر انسان کی یہ جو Civilization (تہذیب) ہے اُنھوں نے اس کی یہ پوری ہسٹری بتائی تھی۔ اب یہ چیزیں محسوسات کے دائرے میں آئی ہیں تو یہی نہیں ہے کہ لیبارٹری میں مائیکرواسکوپ کے نیچے نظر آ رہی ہیں بلکہ اُن کی تو اب تصویریں بنی ہوئی ہیں' فلم کے پردوں کے اوپر دکھاتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک ایک شخص دیکھ رہا ہے۔ زندگی کی اُس پوری کہانی (Story of life) میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ زندگی بردوش سیل ہے' یہ اگر حرکت کرتا ہے' اپنے Environment (ماحول) کے ساتھ Adjustment (تطابق) کرتا ہے تو یہ آگے بڑھتا ہے اور پہلے سے بہتر شکل اختیار کیے چلا جاتا ہے۔ اب یوں سمجھ لیجیے کہ آپ نے پرانے زمانے کے وہ بڑے بڑے اژدھا دیکھے ہونگے' بڑے بڑے نہنگ اور اُن کے ڈھانچے دیکھے ہوں گے' وہ ایک ایک ڈھانچہ ہی سو سو فٹ لمبی ریڑھ کی ہڈی کا ہوتا ہے۔ آج اُن کا کہیں وجود نہیں ہے۔

اثم کی حالت میں قومیں صرف سانس لیتی ہیں' زندگی بسر نہیں کرتیں

سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ جو زندگی کے اتنے اتنے بڑے پیکر تھے' اُنہیں کیا ہوا؟ اُنھوں نے یہ بتایا ہے کہ اس کارواں کے اندر جو کوئی تھک کر پیچھے رہ گیا' وہ آثم ہوگیا۔ یہ وہی اثیم ہے جو میں نے ابھی کہا تھا۔ اُس کی شکل یہ ہوگئی کہ یا تو وہ پھر اُسی طرح سے اپنے آپ کو Repeat (دُہرانے) کرنے لگ گئے مثلاً بکری بنی' چھ ہزار سال سے بکری' بکری ہی چلی آ رہی ہے کیونکہ اُس اسٹیج میں اس نے آگے بڑھنے کی صلاحیت کھو دی تھی' صرف زندہ رہنے کی صلاحیت باقی تھی' زندہ تو رہی لیکن Repetition (اعادہ) میں صرف زندہ رہی' آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قوموں میں یہ کیسے فِٹ آتا ہے۔ یہ بکریاں ہوتی ہیں' یہ قومیں نہیں ہوتیں۔ یہ اپنے آپ کو

Repeat (اعادہ) کرتی ہیں لیکن آگے نہیں بڑھتیں۔

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

لیکن یونہی نہیں مر گئے، وہ بکری تھی اور تین بکریاں اور پیدا کر گئی۔ اس زندگی کے سفر میں، اِس کاروانِ حیات میں، جو پیچھے رہ گئے تو وہ آثم ہوگئے۔ اُس نے کہا کہ ایسی قومیں آثم ہو جاتی ہیں، اثیم ہو جاتی ہیں، تھک کے پیچھے رہ جاتی ہیں۔ پھر اُس نے کہا کہ وہ اُسی دائرے میں گردش کرتی رہتی ہیں، اُن کے نصیب میں صراطِ مستقیم نہیں ہوتا۔ اُس میں صرف Duplication (مثنیٰ سازی) ہوتی ہے، Repetition (اعادہ) ہوتی ہے۔ جو Repetition (اعادہ) ہے، وہ تو کچھ بات نہیں ہے۔ بات تو بڑی پتے کی کہتا ہے [1] اور بڑے طنز میں کہتا ہے، خدا سے کہتا ہے کہ

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل

اگر اتفاق سے غلط تصویر بن گئی ہے تو پھر اُسی قسم کی غلط تصویر بناتے چلے جانے سے کوئی بات نہیں بنتی، یہ تکرار لا حاصل ہے:

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟ [2]

آدم کیا لکھو گھوڑے بنڑ دے ٹرئے جارہے نیں [3]۔ ٹھیک ہے کہ ایک تجربہ تم نے کیا تھا۔ نظر آ گیا کہ بات نہیں بن رہی، تو اب کسی اور قسم کا آدم شروع کرو۔ زندگی میں یا وہ Repetition (اعادہ) ہوتی ہیں، یا پھر وہ فنا ہو جاتی ہیں جیسے وہ ڈھانچے رہ گئے۔ وہ اتنے اتنے توانا، اتنے عظیم الجثہ، اتنے طاقتور تھے مگر اب وہ صرف ڈھانچے ہیں اور چھپکلی زندہ ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ چھپکلی کا سا ڈھانچہ نظر آتا ہے۔ اُن میں پہلے تو آگے بڑھنے کی صلاحیت ختم ہوئی تھی اور پھر زندہ رہنے کی صلاحیت بھی ختم ہوگئی۔ اور اُسی میں سے آگے پھر وہ بتاتے ہیں کہ جن میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی، جن کے اندر حرکت تھی، تو وہ انواع (Species) پہلے پیکر سے بہترین پیکر کے اندر آ گئیں۔ اور یہ جو سلسلہ تھا وہ جاری رہا تا نکہ وہی لائف جو اولیں جرثومے کے اندر تھی، وہ آدمی یا انسان کے پیکر کے اندر نمودار ہوگئی۔

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔
[2] اقبالؒ: بال جبریل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1996، ص۔42
[3] یہ آدم کیا کیا مٹی کے کھلونے بنائے چلا جا رہا ہے!

انسانی زندگی کی اس طبعی تکمیل کے بعد اب تو انسانیت نے اپنا سفرِ زندگی شروع کیا ہے

یہاں پہنچنے کے بعد پھر قرآن کہتا ہے کہ اب انسان کے متعلق اس کی اِس طبعی زندگی (Physical Life) کے اوپر غور نہ کرو' اس پر غور کرو جس نے آگے بڑھنا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس کی طبعی زندگی تو Repetition (اعادہ) کی ہے۔ اب اس کی انسانیت کی زندگی نے آگے بڑھنا ہے' اُس کے لیے اب ہم نئے قوانین دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ میں نہیں کہتا' یہ پیرس کا سائنٹسٹ [3] کہتا ہے۔ وہ کہتا کہ اے دنیا کے سائنسدانو! خدا کے لیے بتاؤ کہ چودہ سو سال پیشتر یہ بات کون انسان کہہ سکتا تھا۔ یہ تو بدبختی اس انسانیت کی ہے کیونکہ بقول اس کے ان لوگوں نے قرآن کو جزدانوں میں رکھ لیا۔ اگر ہزار سال پیشتر یہ کہیں سائنس کے میدان میں آ جاتا تو پتہ نہیں کہ ہم سائنسدان آج کہاں ہوتے۔ اس کا سارا جرم اِس قوم کے اوپر ہے جس نے اس قرآن کو باہر نہیں آنے دیا۔ اگر یہ اصول سائنسدانوں کو پتہ چل جاتے تو پھر پتہ نہیں کہ ترقی کر کے وہ کہاں پہنچتے۔

قرآن کہتا ہے کہ **اَوَ لَمۡ یَرَوۡا کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ** (29:19) ۔ ابتداوہ کیسے کرتا ہے' پھر وہ مختلف مراحل میں سے گردشیں دیتا ہوا ان کو آگے بڑھاتا ہے۔ **اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ** . (29:19) خدا کے لیے یہ بہت آسان بات ہے۔ اب انسانیت کے پیکر میں آ کر تم نے خود کوشش کر کے بڑھنا ہے۔ اب ہم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ سنیے! وہ کیسے بات کرتا ہے؟ یہاں تک تو کہہ دیا کہ یہ جو ہمارا مرحلہ تھا تو وہ ہمارے لیے بالکل آسان تھا' گاڑی کو ہم نے چابی دی اور وہ چل پڑی ہے۔ کہا کہ **قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنۡشِئُ النَّشۡاَۃَ الۡاٰخِرَۃَ** (29:20) ۔ کس شکل میں ابتدا کی؟ کس ہیئت میں کی؟ اِس پر غور کرو۔ پھر وہ گردشیں دیتا ہوا اسے جو بڑھایا تو کہتا ہے کہ وہ **النَّشۡاَۃَ الۡاٰخِرَۃَ** (29:20) ایک اور ہی مخلوق پیدا ہو گئی۔

لفظ خلق کا مفہوم

کہا کہ یہ جو چیز ہے' یہ بدع سے نہیں ہوئی' یہ خلق کے پروسیس (عمل) سے ہوئی۔ آپ کو پتہ ہے کہ خلق کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ مختلف چیزیں جو موجود ہوں' اُن کو صحیح Proportion (تناسب) کے ماتحت ملا کر اس طرح سے ایک نئی چیز بنا دینا خلق ہے۔ اور ایک یہ Invention (ایجاد) یہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ Invention (ایجاد) میں بھی تم Nothingness (عدم) سے کوئی چیز نہیں بنا سکتے۔ تمہارا عالمِ امر نہیں ہے۔ خلق یہ ہے کہ بہت سی چیزیں موجود ہوتی ہیں' تو صحیح Proportion (تناسب) سے تم ان چیزوں میں امتزاج کر کے اُن سے ایک نئی چیز پیدا کر لیتے ہو۔ جو چیزیں موجود ہیں اُن کو صحیح Propotion (تناسب) میں ملا کر

---

[3] یہ فرانس کے مورس بوکائے (Maurice Bucaille :1911-1989) کی طرف اشارہ ہے۔

ایک نئی چیز کا پیدا ہونا خلق ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق آپ ﷺ کی اخلاقی بلندی کا ذکر تو ہے' روحانیت کا نہیں ہے

یہ جسے آپ اخلاق کہتے ہیں' ہوتا کیا ہے؟ اخلاق' انسان کے اندر کی صلاحیتوں میں صحیح Proportion (تناسب) قائم رکھنے کا نام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ** (68:4) یہ جو خلق ہے' آپ اس کی انتہائی بلندیوں کے اوپر تھے۔ یہ انسانی صلاحیتوں کا صحیح اعتدال میں' صحیح Proportion (تناسب) کے اندر ہونا ہے۔ جتنا ہونا ممکن ہے وہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق خلق آیا ہے' روحانیت کا کہیں نہیں آیا۔ **یُنْشِئُ النَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ** (29:20) ہم ان میں سے گزارتے رہے تو اب تم دیکھو کہ یہ ایک نئی مخلوق پیدا ہوگئی ہے۔ اور واقعی یہ جو چیزیں ہیں یعنی اُس اولیں جرثومے کے بعد پھر یہ چلتا پھرتا انسان ہے۔ اگر کہیں ہے تو ''اسی تے سارے بکریاں ہیں نا[1]''۔ بہر حال انسان کا جو پیکر ہے تو کیا وہ **النَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ** نہیں ہے؟ کیا یہ آپ کو بالکل ایک نئی مخلوق نظر نہیں آتی؟ کہا کہ یہ بالکل نئی نظر آتی ہے حالانکہ ہوا صرف اتنا ہے کہ وہ جو ایک ذرۂ ناچیز تھا' وہ ان مراحل میں سے گزرتے ہوئے' حرکت کرتے ہوئے' عملِ پیہم سے بہترین شکلیں اختیار کرتا چلا گیا۔ ارتقا کی رو سے اس پیکر کے اندر آ گیا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسان کی نشاۃِ ثانیہ کی خاطر وحی کی اقدار دی گئیں

حضرت ابراہیمؑ اُن سے کہتے ہیں کہ یہ زندگی حرکت وحرارت کا نتیجہ ہے۔ اور یہاں آ کر یہ کہا کہ **اِنَّ اللّٰـہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ** (29:20) اب اس کے لیے ہم نے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں' قوانین بنا دیئے ہیں۔ اب اگر تم نشاۃ ثانیہ چاہتے ہو کہ کچھ اور بنو یعنی بکری سے انسان بنو تو اُس کے لیے ہم نے پیمانے اور اقدار مقرر کر دیئے ہوئے ہیں۔ یہ ہے پروسیس (عمل):

بدلے کچھ ایسے طور سے بے طور ہوگئے
تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہوگئے

قرآن کہتا ہے کہ کم بختو! کچھ اور بنو لیکن یہ جو سارا پروسیس (عمل) بتایا گیا ہے ہمارے پیمانوں کے مطابق ہوگا۔ عزیزانِ من! میں پھر دہرا دوں کہ یہ کم از کم پانچ چھ ہزار سال پہلے کی بات قرآن بتا رہا ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ نے اُنہیں کہا یہ تھا کہ قوموں کی زندگی حرکت وحرارت میں ہے' جمود میں نہیں ہے' اسلاف کی تقلید میں نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ ختم ہو جاؤ گے' مٹ جاؤ گے' پیچھے رہ جاؤ گے' یا فنا ہو جاؤ گے۔ اور

---

[1] ہم تو تمام بکریاں ہی ہیں' حیوانی سطح زندگی پہ ہیں۔

ثبوت میں یہ دلیلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ چھ ہزار سال پہلے کا انسان اگر نبی بھی ہو اور وحی کا علم اُس کو حاصل نہ ہو تو وہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اور جو کہا ہے تو اُس کے سچے ہونے کی دلیل بیسویں صدی میں آ کر یورپ سے مل رہی ہے:

پاسباں مل گئے کعبے کو، صنم خانے سے

وہ بتا رہے ہیں کہ یہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ ''یسیر'' (29:19) کا مادہ کیا ہے؟ پھر یہ ''قدیر'' (29:20) کیسے اُس کے بعد آ گیا؟ یہ ہے وہ نظریۂ ارتقا۔

ایک نئی شکل میں تخلیق

جہاں تک Repetition (اعادہ) کا تعلق ہے تو عزیزانِ من! سنیے! یہ ایک بات میرے علم میں بالکل نئی آئی ہے۔ یہ اپریل 1979ء کا ریڈرڈ ائجسٹ [1] ہے۔ اُس میں ایک سائنٹسٹ ایک نئی چیز، تھیوری (نظریہ) میں لایا ہے جسے وہ کلونز (Clones) کہتا ہے یعنی [2] Duplications (مثنیٰ سازیاں) ہے، جسے مثنیٰ کہتے ہیں یعنی کسی چیز کا کاپی کر لینا (نقل گیری کرنا)۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ اوریجنل (Original) انسان یا ایسی چیز بنانا تو ہمارے بس میں نہیں ہے لیکن ایک اولیں جرثومہ، جن حالات میں سے گزرتا ہے، اگر ہم اُس کو Study (مطالعہ) کرتے جائیں اور خود وہ جرثومہ لے کر ہم اُس قسم کے حالات پیدا کرتے چلے جائیں تو یہ ممکن ہے کہ یہ

---

[1] جس مضمون کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے اس کا نام ?Clones:will There Be"Carbon copy People ہے۔ اس کا مصنف Emily and per Qla D` Aulaire ہیں۔ یہ مضمون امریکا سے شائع ہونے والے مارچ 1979ء کے ریڈرز ڈائجسٹ میں پہلی بار چھپا اور پھر ایشیا سے نکلنے والے ریڈرز ڈائجسٹ کی اپریل 1979ء کی اشاعت میں آیا۔ اس کے عنوان کے اوپر یہ عبارت درج ہے:

one day we may be able to create exact duplicates of human being. The idea both fascinates and appals.

اپنے اس درس میں پرویزؒ نے جس سائنٹسٹ کی تھیوری کا ذکر کیا ہے، اس کا نام Liebe Cavalieri ہے وہ نیویارک کے سلون کیٹرنگ کینسر ریسرچ ادارے میں مالیکیولر بائیالوجسٹ ہیں۔ اس سائنسدان کے الفاظ یہ ہیں:

......is emerging that allows scientists to tinker with, and change, the very stuff of life (p.96)

[2] اصل الفاظ یہ ہیں:

Jake a cell, practically any cell, from your body, the theory goes, and through appropriate biological tinhering you can cause it to grow in to a duplicate of your self...... identical from eyelashes to toenails. No need for procreational sex anymore:with this system, you can neatly reproduce yourself without a partner. Human cloning, its called (p.95)

جو تخلیق کی یہ شکل ہے حتیٰ کہ انسان کی شکل ہے تو اس پیکر کے اندر زندگی آ جائے لیکن اُس نے کہا ہے کہ اس میں دو باتیں یاد رکھیے کہ زندگی کا پہلا جرثومہ بنا بنایا ہوا دینا ہوگا' وہ پہلا جرثومۂ زندگی ہم نہیں بنا سکتے کیونکہ وہ ''بدع'' والا مقام ہے' وہ ہمیں ملنا چاہیے اور پھر جن مراحل میں سے وہ ''یسیر'' (29:19) والا ان کو گزار رہا ہے اُن کو ہم نے صرف Study (مطالعہ) کرنا ہے' ہم اُن میں تبدیلی نہیں کر سکتے۔ یہ ہے کہ اُس قسم کے Environment (ماحول) پیدا کر سکتے ہیں جیسا اُنہوں نے رحمِ مادر کی جگہ اب (ٹسٹ) ٹیوب (بے بی) بنالی ہے۔ اُس جنین کو' اولیں جرثومے کو' جس قسم کی حرارت اور نشو و نما کی یہ چیزیں چاہیے تھیں' وہ وہاں مہیا کر دیں۔ تو کہتے ہیں کہ اندر' رحمِ مادر میں' کوئی نقص ہو گیا ہے تو کوئی بات نہیں' ہم اُسی قسم کا رحم باہر تیار کر کے اُس میں رکھ دیتے ہیں۔ اُنہوں نے رکھ کے وہ بچہ پیدا کر دیا ہوا ہے لیکن اُنہوں نے کہا ہے کہ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ پہلا جرثومۂ حیات ہم نہیں لا سکتے۔ اس کا نام انہوں نے کلونز (Clones) رکھا ہے۔

قرآنِ حکیم چیزے دیگر ہے

اُنہوں نے کہا ہے کہ یہ جو Plants (پودوں) میں قلم (Grafting) لگا دیتے ہیں' تو کہا ہے کہ دوسری چیز یہ ہے کہ ہم Repetition (اعادہ) کر سکتے ہیں' جو بنا ہوا ہے اُس قسم کا تو امکان ہے کہ ہم اس طرح سے بنا دیں لیکن اس سے آگے کوئی اور اس کی ہیئت ہمارے بس کی بات نہیں [1] ہوگی تاوقتیکہ ہم پھر نہ دیکھ لیں کہ وہ ''یسیر'' (29:19) والا آگے کیا کرتا ہے۔ عزیزانِ من! آپ غور فرما رہے ہیں کہ قرآن کیا ہے:

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

یہ واقعی چیزے دیگر ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں اور ابھی تو ہمارے پاس نہ وقت ہے اور نہ ایک کلاس کی کیفیت ہے۔ بہر حال میرا علم بھی کچھ محدود ہے مگر اس کے باوجود اُس میں قرآن کی یہ چیزیں ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔

قرآن اور اقبالؒ

یہ شخص اقبالؒ (1877-1938) جو ہمارے ہاں گزرا ہے' میں یونہی بار بار اُس کا نام نہیں لے لیا کرتا' اس کی عظمت میرے لیے

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: ریڈرز ڈائجسٹ کے اسی مضمون کے صفحات 96 اور 97

(Emily and D`Aulaire, Per Ola:Clones: will there be ""Carbon copy" Peple? Reader`s Digest, (US), March 1979. (pp.95-98)

اسی لیے ہے کہ اُنہوں نے قرآن کے ان مقامات پہ غور کیا اور پھر فطرت نے اُن کو اس کے اظہار کی جو صلاحیت اور استعداد دی تھی، وہ بھی اُس کو ایک وہبی چیز مل گئی تھی کہ اتنا حسین انداز تھا! وہ جو بات کہتا ہے تو وہ قرآن ہی کا ایک نکتہ لیتا ہے اور اپنے انداز میں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ پچھلی دفعہ بھی میں نے اس کی دو ایک نظمیں کہی تھیں۔ دیکھیے کہ وہ اس چیز کو کیسے کہتا ہے؟ یہ ارتقا ہے جسے کہتے ہیں۔ ارتقا کے معنی ہیں کہ مسلسل ترقی کرتے ہوئے آگے بڑھنا اور اوپر چڑھنا کیونکہ اس میں دونوں چیزیں آتی ہیں۔ ہمارے ہاں Evolution کے لیے یہ لفظ ارتقا ایجاد ہوا ہے۔ یہ ابتدائی دور کی اُن کی ''بانگِ درا'' ہے یعنی ابتدائی دور میں بھی یہ شخص کہاں تک پہنچا ہوا تھا!

ارتقا کائنات کا ایک ابدی اصول ہے

اس کا یہ شعر تو مشہور ہے اور میں نے بھی شاید اسے بہت دفعہ Repeat (دہرایا) کیا ہوگا اور کرتا چلا جاتا ہوں:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

کہا ہے کہ یہ باہمی کشمکش ہے، جنگ ہے، یہ ستیزہ کاری پہلے دن سے آج تک جاری و ساری ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جنگ کن چیزوں میں چلی آ رہی ہے؟ کہا کہ

چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

کہنا اُس نے یہ تھا کہ تعمیری قوتوں اور تخریبی قوتوں کے درمیان جنگ چلی آ رہی ہے، ایک کشمکش چلی آ رہی ہے۔ جہاں تعمیری قوت، تخریبی قوت کے اوپر غالب آ جاتی ہے تو زندگی ایک قدم اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ جہاں تخریبی قوت بڑھ جاتی ہے تو وہاں زندگی کی نمو درک جاتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے۔ اب آگے بڑھنے والی جو بات ہے وہ ارتقا ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ قوم سے کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہ ایک اندازِ زندگی یہ ہے کہ خدا کے بتائے ہوئے اقدار و طریق کے مطابق بڑھتے چلے جاؤ، دوسرا یہ ہے کہ جو اسلاف کا عقیدہ اور تقلید اور جمود بتا رہے ہیں، اور تم میری مخالفت کر رہے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ازل سے تا امروز یہ ہوتا چلا آیا ہے۔ جمود میں سہل انگاری ہے۔ قرآن مترفین کہتا ہے یعنی بغیر کچھ کیے ہوئے عیش کی زندگی بسر کرنا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ یہ کچھ چھوڑ نہیں سکتے اور یہ جو زندگی میں کہتا ہوں تو اُس میں تو ایک ایک سانس کے اندر جہاد ہے، یہاں تو لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) ہے کہ جو محنت نہیں کرتا ہے، وہ انسان نہیں کہلا سکتا۔ کہا ہے کہ یہ ہے کشمکش:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

وہ بات Evolution (ارتقا) کی تھیوری کی کر رہا ہے' یہ ہے وہ بات' یعنی وہ سائنس کا سبق نہیں دے رہا بلکہ بتا یہ رہا ہے کہ یہ وحی کی دی ہوئی اقدار اور انسانوں کے خودساختہ مذہب کے اندر جو کشمکش ہے وہ کیسے چلی آتی ہے۔ اور اُس کے بعد مسلمان کو بتا یہ رہا ہے کہ اگر تم میں حرارت ہے' حرکت ہے' آگے بڑھنا ہے تو اس ستیزہ کاری کے اندر تم دیکھو گے کہ ان پہ غالب آ ؤ گے اور ایک قدم آگے بڑھ جاؤ گے' اور سے اور ہوتے چلے جاؤ گے۔ قرآن احسنِ تقویم کہتا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مُصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی
حیات شُعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی' جفا طلبی

لائف کی سرشت میں تو یہ مشکل کشی اور جفا طلبی ہے۔ اور سنیے کہ وہ کیا کیا تمثیلات اور تشبیہات دیتا ہے! جو حقائقِ ابدی ہیں وہ یہ بیان کر رہا ہے۔ یہ شاعری نہیں ہے۔ بات اُس نے یہ کہی ہے کہ اس کی سرشت مشکل کشی اور جفا کشی ہے' حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز ہے۔

مشکل کشی اور جفا کشی انسانی ذات کو فولاد بنا دیتی ہے

عزیزانِ من! اُس کے بعد کہتا ہے کہ

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

کہتا ہے کہ یہ شیشہ جو تمہارے سامنے آتا ہے وہ صاف بلوری آئینہ ہے۔ کیا تمہیں پتہ ہے کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی ہے؟ یہ سیاہ رنگ کی مٹی سے ہوئی ہے۔ یہ ہے وہ چیز۔ کہتا ہے کہ وہ اس قسم کی مٹی آئینہ کیسے بن گئی؟ پھر خود ہی کہتا ہے:

کشاکشِ زم و گرما' تپ و تراش و خراش

اُس کو گرمی پہنچائی اور پھر ٹھنڈا کیا' پھر گرمی پہنچائی اور پھر ٹھنڈا کیا۔ ان سے پوچھو کہ یہ جو فیکٹریوں والے ہیں وہ لوہے کو فولاد بنانے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ یہ زم و گرما کی کشاکش عجیب چیز ہے۔ ٹمپریچر کے فرق سے ان کے اندر کے ذرات میں تغیر ہوتا ہے:

کشاکشِ زم و گرما' تپ و تراش و خراش
ز خاکِ تیرہ درُوں تابہ شیشہ حلبی

''او مٹی ایویں نہیں شیشہ بنڑ جاندی[1]''۔ اور آگے غزل کا حسین مقام آیا۔ کہتا ہے کہ یہ جو بادۂ علم تمہیں نظر آتا ہے تو کیا تمہیں پتہ ہے کہ کیسے بن جاتا ہے؟ کہا کہ

مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید

بست' شکست ہے' یہ کبھی اکٹھا کرنا ہے' کبھی توڑ دینا ہے' فشار دینا ہے' سوز یعنی جلا دینا ہے اور کبھی اسے' کشید یعنی کھینچنا ہے:

میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عِنبی

وہ کہتے ہیں کہ یہ جو موتی بنتا ہے تو بہار کے موسم میں آسمان سے بارش کا ایک قطرہ آتا ہے اور سیپ اُسے اپنے اندر لے لیتی ہے تو اُس سے موتی بنتا ہے۔ یہ قطرۂ نیساں لیتا ہے' اور آتشِ انگور کی صورت میں سامنے آتا ہے:

میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عِنبی

یہ آتشِ سیال تو شراب کی شکل میں تمہارے سامنے آتی ہے اور وہ جو قطرۂ نیسان تھا' اُس کو اس تک پہنچنے کے لیے ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے:

مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید

''ایویں نہیں ایہہ بنڑ جاندی''[2]۔ بات پہلے اُس نے چراغِ مصطفویؐ اور شرارِ بُولہبی سے شروع کی تھی اس لیے کہا کہ

اسی کشا کشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام

یہ کشاکش پیہم' جن سے اقوام زندہ وتابندہ ہیں' تو فلسفہ ہے۔ اس میں پیغام کیا ہے؟ یہ کہ

یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

اسی سے ملتِ اسلامیہ زندہ ہوتی ہے' یہی اُس کا راز ہے۔

سیپ کی محنت بارش کے قطرہ کو موتی بنا دیتی ہے

عزیزانِ من! اس نظم کا آخری شعر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پوچھو نہیں کہ اس کے اندر شعریت کی کتنی انتہا ہے! کہتا ہے کہ

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند

---

[1] وہ مٹی یونہی شیشہ نہیں بن جاتی۔

[2] یہ قطرۂ نیسان یونہی نہیں بن جاتی۔

یہ شراب بنانے والے، انگور کے دانے کو جو پانی بنا دیتے ہیں، شراب کی شکل میں ڈھال دیتے ہیں، تو یہ کرتے کیا ہیں؟

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند [1]

اللہ اکبر! زندگی نام ہی اسی چیز کا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ان کے ہاں یہ فسانہ ملتا ہے کہ بہار کے موسم میں آسمان سے کبھی کبھی ایک بارش کا ایسا قطرہ آتا ہے کہ اگر سیپ اُس کی پرورش کرے تو وہ موتی بن جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ

تاک را سرسبز کن اے ابرِ نیسانِ بہار

تُو جو اوپر سے اترتا ہے تو سیپ کے اندر جانے کی بجائے یہ جو انگور کی بیل ہے، ذرا اس پہ برس۔ اس لیے کہ

قطرہ تامے تواند شد چرا گوھر شود

ایک قطرہ اگر شراب بن جائے "تے موتی بن کے کی لینڑا اونے [2]"۔ یونہی تُو اپنے آپ کو ضائع کر رہا ہے۔ یہ دیکھو تمہیں انگور کی بیلیں نظر نہیں آتیں، ان کو سرسبز کر، اس لیے کہ شراب بن جائے۔ عزیزانِ من! بات ہے بھی یہی۔ جتنی ہم محنت وسعی و کاوش سے ایک چیز بناتے ہیں، اُس نے یہ کہا ہے کہ یہ سوچو کہ کونسی چیز بنانے کے لیے بہتر ہے۔ کدو کاوش اور سعی و محنت تو دونوں میں ایک جیسی ہوگی۔ یہ بات آگے آئی کہ ہماری کاوش کا مقصد کیا ہونا چاہیے، ہماری تخلیق کس قسم کی ہونی چاہیے؟ یہ چیزیں بھی جو یہ غزلیات میں یونہی کہہ جاتے تھے تو یہ یونہی شاعر نہیں تھے، یہ بہت بڑی چیز تھی۔ اقبالؒ (1938-1877) کے یہ انداز ہیں جس میں یہ چیز کہتا ہے کہ ہزار مرحلے ہیں جن میں سے یہ گزرتا ہے۔ یعنی قطرۂ نیساں کو گوہر بننے کے لیے کیا کچھ کرنا ہوتا ہے۔ مرزا اسد اللہ خان غالب (1869-1797) بھی کم نہیں تھا، اُس کا اپنا انداز تھا۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

سمندر کی ہر موج کے اندر سو سو مگرمچھوں کے منہ کھلے ہوئے ہیں اور وہ جال کا حلقہ بن رہے ہیں۔

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

زندگی کو زندگی سے روشناس کرانے کا طریق

عزیزانِ من! زندگی یہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ پیغامِ ابراہیمیؑ کیا کہہ گیا ہے۔ اور پھر سنا کہ یہ [3] کیا کہتا ہے۔ کہتا یہ ہے کہ

---

1. اقبالؒ: بانگِ درا (اِرتقا)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1996 ص۔ 233۔
2. تو موتی بن کر اس نے کیا لینا ہے۔
3. اقبالؒ: بانگِ درا (جوابِ خضر، صحرانوردی)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1996 ص۔ 269۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی

جہاں رک گئے تو زندگی ختم ہوگئی۔

ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

یہ بھی ممکن ہے کہ تُو موت سے بھی مر نہ سکے۔ عزیزانِ من! یہ کیا چیز ہے؟ شکل وصورت میں یہ پنکھے اُسی طرح سے موجود ہیں، تو کیا چیز ہے کہ جس میں کمی ہوگئی ہے؟ یہ کہ اُس کے اندر وہ حرارت نہیں رہی۔ یہ مومن سے مسلمان بن گیا، ملتِ عربی سے ہم بن گئے۔ یہ ہے جمود۔ اس میں شکل وصورت تو اُسی طرح رہتی ہے۔ شکل وصورت تو مُردے کی بھی کچھ وقت تک ایسے ہی رہتی ہے اور اگر اُس کے اوپر مذہب کی ممی یعنی حنوط کر دیا جائے تو ہزاروں سال تک شکل وصورت ایسی رہتی ہے لیکن وہ مردہ ہوتا ہے۔ تو وہ یہ پنکھے ہو جاتے ہیں۔ چلیں ہم ان کے محتاج کیوں رہیں، یہ تو عارضی زندگی دینے والے ہیں۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

کبھی تو جان کو سنبھال کے رکھنا زندگی ہے اور کبھی جان کو دیدینا زندگی ہے اس لیے کہا کہ:

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

عزیزانِ من! اُس کے بعد وہی کلیجے پہ نشتر لگ جاتا ہے جب کہتا ہے کہ

بندگی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب

جوئے کم آب بھی شاید پہلے کبھی ہو "ایتھے تے چھپڑای بنڑ جاندی اے اووی سک جاندا[1] اے"۔

بندگی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

---

[1] یہاں تو تالاب ہی بن جاتا ہے اور وہ بھی سوکھ جاتا ہے۔

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹّی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی ❶

عزیزانِ من! یہ تھا وہ پیغام جو حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم کو دے رہے تھے۔ یہ ہے پیغام ابدی جو قرآن قوموں کو دینے کے لیے آیا ہے۔ وہ قوم سے یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ اسلاف نے جو ہزار سال پہلے کیا تھا تم اُسی مقام کے اوپر کھڑے رہنا۔ اگر یہ کیا تو یہ موت ہے:

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب ❷

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کیا باتیں کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم ◆ قوم کی طرف حیاتِ جاوید کا پیغام لے کر آئے تھے

حضرتِ ابراہیم ◆ نے اُن سے یہ کہا تھا کہ یہ جو میں نے کہا ہے کہ اس جمود کے اندر ایک مقام پہ رک نہ جاؤ، کھڑے نہ ہو جاؤ۔ یہ موت ہے، یہ زندگی نہیں ہے۔ میں پیغامِ حیات لے کر آیا ہوں، حیاتِ جاوداں کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ **اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً** (2:201) اس قریبی زندگی کے اندر بھی حسنات ہونگی اور یہ جو اس کے بعد تمہاری نشاۃِ ثانیہ ہو گی، جسے آپ حیاتِ آخرت کہتے ہیں، تو اُس میں بھی تمہارے ہاں یہ خوشگواریاں ہونگی۔ میں یہ پیغام لے کر آیا ہوں لیکن چلتے جانا ہے، رکنا نہیں ہے، آگے بڑھتے چلے جانا ہے:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش

کوہکن کی طرح اپنے تیشے سے، اپنے ہاتھ سے، اپنا راستہ تلاش کر۔

براہِ دیگراں رفتن حرام است

---

❶ اقبالؒ: بانگِ درا (زندگی)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1996، ص ص۔ 269 تا 270۔

❷ اقبالؒ: بالِ جبریل (مسجد قرطبہ)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1996 ص۔ 114۔

آگے کہتا ہے کہ

گر از دستِ تو کارِ نادر آید

اگر تمہارے ہاتھ سے کوئی نادر کام ہو جاتا ہے تو

گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

انسانی زندگی میں ثواب اور عذاب کا مفہوم

مُلا کہتا ہے کہ ہر نادر اور نئی چیز گمراہی ہے۔ یہ جو اُس نے کہا ہے کہ اگر کوئی نئی بات' کوئی نادر کام تمہارے ہاتھ سے سرانجام پاتا ہے تو مُلا اُس کو بھی گناہ کہتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ بالکل نہ ڈرو' اگر وہ کام خدا کے نظام کے مطابق ہے تو ثواب است یعنی ضرور اس کا نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آئے گا۔ اس لیے کہ **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ** (29:20) خدا نے اس کے لیے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں۔ اُس کے مطابق اب بات آ گئی۔ وہ قوم سے کہہ رہے ہیں کہ **يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ** (29:21) جس کا جی چاہے وہ ان پیمانوں کے مطابق زندگی کی شیرینیوں سے محروم رہ جائے۔ آپ کو پتہ ہے کہ ''عذاب'' کے معنی ''شیرینیوں سے محروم رہ جانا'' ہے۔ کہا کہ جس کا جی چاہے وہ ان پیمانوں کے مطابق اپنے اوپر یہ عذاب طاری کر لے' جامد ہو کر کھڑا ہو جائے' پیچھے رہ جائے۔ اب سوچیے کہ عذاب کے معنی قوموں کی زندگی میں کیا ہو گئے؟ یہ اقوامِ عالم کی صف میں تھک کر کارواں سے پیچھے رہ جانا ہے۔ عذاب یہ چیز ہے۔ اسے ذرا عذابِ صغریٰ کہہ لیجیے اور یہ جو بالکل کسی مقام کے اوپر کھڑے ہی ہو جانا ہے' یہ عذابِ کبریٰ ہے۔

رحمِ مادر میں کسی جنین کا جامد ہو جانا ہی تو موت ہے

عزیزانِ من! (29:21) میں **يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ** کہا ہے۔ اب تمہارے سامنے قانون ہے کہ جس کا جی چاہے' اپنے اوپر یہ عذاب طاری کر لے۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ''یعذب'' کے معنی جامد ہو کر رہ جانا ہے۔ اگلا لفظ اس کے مقابل آیا ہے کہ: **وَ يَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ** (29:21)۔ رحم کے معنی ہی ''پرورش پانا اور نشو و نما پانا ہیں''۔ اگر جنین جامد ہو جائے تو وہ بچہ مردہ پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے اندر حرارت اور حرکت رہتی ہے تو اولیں جرثومے سے انسانی پیکر میں آ جاتا ہے۔ آپ کو شاید یہ معلوم ہو گا کہ زندگی کے اولیں جرثومہ (Life Cell) نے انسان کے پیکر میں آنے تک جتنے مراحل طبعی طور پر طے کیے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ رحمِ مادر کے اندر یہ پہلا جرثومہ' جنین کی آخری شکل تک آنے کے لیے ان تمام مراحل میں سے گزرتا ہے جن میں سے وہ کائنات گزری ہے۔ اُس نے یہ پیریڈ شارٹ کر دیا لیکن مراحل سارے وہی ہیں۔ اور اندر جس مرحلے میں بھی اُس کی نشو و نما رک جاتی ہے تو وہ ویسے کا ویسا رہ جاتا ہے اور حیات آگے نہیں بڑھتی

۔وہاں اُس کی آخری سانس تک نشوونما ہونی چاہیے پھر وہ پیکرِ انسانی میں باہر آتا ہے۔کہا کہ وَ اِلَیۡہِ تُقۡلَبُوۡنَ (29:21) تم اپنی مرضی سے یہ کچھ نہیں کرسکتے کہ جیسے جی چاہے ہم کریں اور اُس کے مطابق یہ کچھ ہوتا جائے ۔ یہ تو سوال ہی نہیں ۔تم نے تو اُس کے قانون ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لو۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ حرکت وحرارت، فکر وعمل کی یہ چیزیں نہ رہیں اور تم زندہ بھی رہو اور آگے بھی بڑھ جاؤ۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں اِلَیۡہِ تُقۡلَبُوۡنَ (29:21) ہے۔اُس کے قانون کی طرف جانا ہوگا۔

نظریۂ ارتقا کے سلسلہ میں ''سیروا فی الارض'' کی اہمیت

قرآن کریم نے کہا کہ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ (29:22) تم نے اس کائنات کی حدود کے اندر تو رہنا ہے ۔ یہاں کسی جگہ بھی تم اُس کے قانون کو Defeat (شکست) نہیں کرسکتے' اُسے ناکام نہیں بنا سکتے ۔ وہ قانون اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے۔کہا ہے کہ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ (29:20) جاؤ اور جو آپ کے ہاں یہ بڑے بڑے عظیم الجثہ کرّے نظر آ رہے ہیں، جو پرانے زمانے کی تخلیقات کے یہ پیکر، جو ہڈیوں کے ڈھانچوں میں رہ گئے ہیں، ان کو دیکھو کہ اتنی اتنی قوتوں کے مالک تھے ۔ صرف اس لیے کہ ہمارے قانون کی خلاف ورزی کی، حرکت چھوڑ دی، حرارت چھوڑ دی، آگے چلنے کی سکت چھوڑ دی، تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے ۔کیا تم اُن سے بھی زیادہ عظیم الجثہ واقع ہوئے ہو؟ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ (29:20) تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ کتنی کتنی عظیم قومیں تھیں جنہوں نے اپنے اندر سے حرکت اور حرارت چھوڑ دی تھی تو وہ یا وہیں کھڑی رہ گئیں یا فنا ہو کر رہ گئیں۔

کائنات کے قانون سے انکار کرنے کا نتیجہ

کہا کہ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ (29:22) تم سمجھتے ہو کہ خدا کے قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے خود ساختہ قوانین سے زندگی حاصل کرلو گے ۔تم قطعاً نہیں کرسکتے ۔اب یہ رہا کہ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ لِقَآئِہٖۤ (29:23) جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ انہیں قانون مکافات کا سامنا کرنا ہے، وہ اپنی من مانی کرتے ہیں تو کہا کہ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوۡا مِنۡ رَّحۡمَتِیۡ (29:23) وہ سامانِ نشوونما سے محروم رہ جاتے ہیں ۔اب اس سارے پروگرام کے اندر کیا چیز ہے جو کارفرما ہے؟ کہا کہ یہ ہماری رحمت ہے، نشوونما دینا ہے لیکن جو بھی ہمارے قوانین سے انکار کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں نے اُس کے قوانینِ مکافات کا آمنا سامنا کرنا ہی نہیں ہے، اُس نے میرے سامنے آنا ہی نہیں ہے، اِدھر اُدھر نکل جانا ہے تو اُولٰٓئِکَ یَئِسُوۡا مِنۡ رَّحۡمَتِیۡ (29:23) وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ وہ خود ہمارے اُس نشوونما کے اسباب وسامان سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو Deprive (محروم) کر لیتے ہیں ۔ یہ کفر کے لفظ کے معنی ہیں کہ زندگی کی نعماء وآسائشوں سے اپنے آپ کو محروم کر لینا ۔تو

سیدھی سی بات ہے کہ اگر اس احاطے کے اندر کچھ بٹ رہا ہو' ایک شخص باہر کھڑا ہے' اُسے کہا جاتا ہے کہ اندر آ جاؤ اور لے لو۔ وہ کہتا ہے کہ میں اندر نہیں آنا چاہتا' تو وہ اپنے آپ کو اس سے محروم کر رہا ہے۔ یہ کفر ہے۔ یہ کوئی دوسرا اُس کے اوپر طاری نہیں کرتا۔ وہ تو اپنا دروازہ کھلا رکھتا ہے اور اُس کے لیے آوازیں دیتا ہے کہ تم اندر آ جاؤ لیکن اگر تم کہتے ہو کہ میں نہیں آتا تو یہ کفر ہے۔ ہمارے ہاں تو کافر اور کفر پوچھو ہی نہیں کہ اس کے کیا معنی ہو گئے ہیں۔

من حیث القوم ہماری حالتِ زار

عزیزانِ من! سوچیے کہ ہم من حیث القوم کہاں کھڑے ہیں۔ کہا ہے کہ وَ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (29:23) یہ ہیں وہ قومیں جو دردانگیز والم انگیز عذاب کے اندر مبتلا ہیں۔ عزیزانِ من! طبعی طور پر زندہ رہنا اور زندگی کی کیفیت کا یہ ہو جانا کہ ہر ایک کی محتاجی اور ہر ایک کی محکومی ہو تو یہ عذابِ الیم نہیں تو اور کیا ہے! یہ الگ بات ہے کہ انسان انسانیت کی سطح پہ ہی نہ رہے اور حیوانیت کی سطح کے اوپر چلا جائے۔ حیوانیت کی سطح کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ جسے آپ غیرت کہتے ہیں یا احساسِ عزتِ نفس کہتے ہیں تو یہ چیز وہاں نہیں ہوتی ۔ اگر ایک فرد یا ایک قوم اس مقام پہ پہنچ جاتی ہے کہ نہ اُس میں غیرت رہتی ہے' نہ حمیت رہتی ہے' نہ عذابِ الیم کا احساس رہتا ہے تو وہ جو قوم ہے پھر وہ زندہ نہیں ہے' وہ مردہ ہو چکی ہوئی ہے۔ وہ عذابِ الیم میں مبتلا ہے۔

عزیزانِ من! یہ تھا حضرتِ ابراہیمؑ کا وعظ یا پیغام جو اُنہوں نے اُس قوم کو دیا ہے۔ آپ قران کی یہ آیات دیکھ رہے ہیں۔ اور پھر اس کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام منکرین سے کہو کہ اس کے مثل دس آیتیں بھی بنا کے بتا دیں۔ یہ ہے قرآن کا انداز۔ اُس نے بات کہاں سے شروع کی ہے اور اُس کے بعد سمجھانے کے لیے کیا کیا حقائق ہیں جو سامنے آ رہے ہیں۔ اور اُس کے بعد پھر بتا رہا ہے کہ جب قومیں اس کے مطابق عمل کریں گی تو یوں اُن کو اسبابِ نشوونما ملیں گے۔ اگر نہیں کریں گی تو اپنے آپ کو اس سے Deprive (محروم) کر لیں گی' اپنے آپ کو محروم کر لیں گی تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا لیکن جس قوم کے اوپر مذہبی جنون طاری ہو جائے' اسلاف کو وہ خدا بنا رکھیں' ان کے اعصاب پہ' ان کی عقیدت اتنی طاری ہو جائے تو قرآن کہتا ہے کہ اس ساری وعظ ونصیحت کا ان کے اوپر کیا ردِعمل ہوتا ہے۔ کہا کہ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ (29:24) اُنہوں نے عوام کو بھڑکایا کہ اُٹھو' اس کو پکڑو' جلا دو' اس کو مار دو' اس کو پھانسی دیدو کیونکہ یہ تمہیں تمہارے اسلاف سے بیگانہ کرتا ہے۔ سوچو تو سہی کہ اُن کی کیسی بے حرمتی کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ اُنہوں نے اُسے کہا کہ اُٹھو! اسے جلاؤ اور مار دو اور اپنے دیوتاؤں کا بول بالا کرو۔ یہ سب جتنے بھی آپ کو یہ کچھ کہتے ہیں تو ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم ◆ کی ہجرت

قرآن تو ایک لفظ میں بات کہہ جاتا ہے۔ کہا کہ **فَاَنْجٰهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ** (29:24) وہ جوان کی آتشِ انتقام تھی' وہ اس کے تحت جنونی ہو گئے' تو ہم نے ایسا کیا کہ ابراہیمؑ کو اس سے محفوظ رکھا۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ اُنہوں نے کہا کہ **اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ** (37:99) وہ اُس مقام سے ہجرت کر کے دوسری طرف چلے گئے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ ایک میل لمبا اور ایک میل چوڑا لکڑیوں کا مچان بنایا تھا اور پھر اُس میں آگ نہیں لگتی تھی' تو گرگٹ نے پھونکیں ماری تھیں۔ اگلی بات یہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ بات نہیں تھی کہ انہوں نے اتنا بڑا انبار لگا کر اُس کے اندر آگ جلائی' پھر انہیں اُس کے اندر ڈالا تو وہ آگ کے شعلے پھول بن گئے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ آپؑ اُس کے اندر چالیس دن تک رہے تھے' تو وہ آگ کے شعلے پھول بن گئے تھے۔ یہ تو ایک ایسا معجزہ ہے جو عقل وفکر میں نہیں آ سکتا' یہ عقل وفکر کی بات بھی نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ** (29:24) اس واقعہ میں تو ایمان لانے والوں کے لیے' غور کرنے والوں کے لیے' بڑی نشانی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ **وَ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّ يَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ** (29:25) حضرت ابراہیمؑ نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش اختیار کر رکھی ہے وہ اس لیے نہیں کہ تم انہیں سچ مچ خدا مانتے ہو۔ تم تو اسلاف کی عظمت اور ان کے نام لیے پھرتے ہو۔ بظاہر لوگوں سے کہہ رہے ہو کہ صاحب! یہ بہت بڑا اجہاد کر رہے ہیں' یہ ہم دین کے استحکام کے لیے کر رہے ہیں۔ کہا کہ یہ ساری چیزیں بناوٹ کی ہیں۔ یہ جو تم کسی ایک چیز کو دیوتا بناتے ہو تو یہ صرف اس لیے ہے کہ اس کی وجہ سے تمہارا جتھہ قائم رہتا ہے اور دنیاوی مفاد کی خاطر تم نے ایک فرقہ بنایا ہوا ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! فرقے کی جو بنیاد ہے وہ خاص مخصوص طبقے کے اسلاف ہوتے ہیں اور ان کی عقیدت کا اشتراک ہوتا ہے مثلاً یہ کہ یہ حنفی ہیں' یہ شافعی ہیں' یہ حنبلی ہیں۔ یہ جھاڑو کا بنڈل ہوتا ہے۔ اب یہ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ وہ اُن کی عظمت اس لیے قائم رکھتے ہیں تاکہ تمہاری یہ گروہ بندی قائم رہے۔ اور یہ جو پھر اتنے بنے پھرتے ہیں' تو اب انہوں نے اپنے آپ کو دوسروں سے الگ کر لیا ہے۔ یہ اتنے اتنے مختلف گروہ ہیں تو اُنہوں نے ایک بہت بڑا حلقہ قائم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (29:25) یہ سارا کچھ یہ ہے کہ یہ دنیاوی زندگی کی کچھ مفاد پرستیاں ہیں۔ عام معاملات میں ان لوگوں کو دیکھو تو ایک ہی فرقے کے لوگ پوچھو نہیں کہ آپس میں کتنی دشمنی رکھتے ہیں' کتنے جھگڑتے ہیں' ایک دوسرے کو کتنی گالیاں دیتے ہیں! لیکن اُس فرقے پہ آتے ہیں تو وہ جو اوپر کا جھاڑو کا بنڈل ہے' وہ جو سلفِ صالحین کی عظمت ہے' وہ ہے جو ان کو اُس بنڈل سے باہر نہیں جانے دیتی۔ کہا کہ

ساری بات یہ ہے جس کے لیے تم ایسا کرتے ہو۔ یہ سارا کچھ کرلو، جس دن بھی حقائق سامنے آئے، اُس دن تم دیکھو گے کہ یہی جو تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ یوں ملے ہوئے نظر آتے ہو، ایک دوسرے پہ لعنتیں برساؤ گے۔ یہ جو تم میں بڑے بڑے ہیں، ان کو کہو گے کہ تمہارا بیڑا غرق ہو، تم نے ہمیں تباہ کیا ہے۔ دوسرے مقامات پہ قرآن میں ان کے جہنم کے اندر مکالمے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم نے ہمیں لیڈر کیوں بنا دیا تھا؟ وہ کہتے ہیں کہ تم ہمیں چکمے کیوں دیا کرتے تھے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ اُس وقت آپس میں جھگڑتے پھرتے رہو گے اور پھر کوئی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔

عزیزانِ من! سورۃ العنکبوت کی آیت 25 تک ہم آ گئے ہیں۔ یہاں حضرتِ ابراہیمؑ کے اسوہ کا ذکر ختم ہوتا ہے۔ 26 ویں آیت کو ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



نواں باب: **العنکبوت** (آیات 26 تا 28: مسئلہ جنسیات)



عزیزانِ من! آج مئی 1979ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 26 سے ہو رہا ہے: (29:26)۔

تبلیغ دین کا مقصد نفس شماری نہیں بلکہ نفس گدازی ہے

جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ کئی درسوں میں حضرتِ ابراہیمؑ کی داستانِ جلیلہ ہمارے سامنے آ رہی تھی۔ اُس کے لیے یہ دروس اس لیے بھی خصوصیت سے وقف کیے گئے کہ قرآنِ کریم نے اُن کی زندگی کو ہمارے لیے بھی بہترین ماڈل قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے جس زندگی کو ہمارے لیے ماڈل بننا ہے اُس کی زیادہ سے زیادہ تفصیلات و جزئیات تک بھی ہمارے سامنے آنی چاہئیں تاکہ ہم اپنی زندگیوں کو بھی اُس قالب میں ڈھال سکیں۔ اس ضمن میں ان درسوں میں بہت کچھ کہا گیا۔ اس کے بعد بھی یہ مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح ہمارے سامنے آئیں گی۔ جب بھی اُس میں کوئی نئی بات آئے گی تو میں اُس میں اضافہ کر دونگا تاکہ یہ داستان قرآن کی روشنی میں تکمیل تک پہنچ جائے۔

اب وہاں تک پہنچ گئے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ پھر وہ اپنی قوم کو، اپنے ملک کو چھوڑ کر، ہجرت کر گئے اور جو ہجرت ہے وہ انبیائے کرام

کی زندگی میں بڑا اہم مقام ہوتا ہے۔ کہا کہ **فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَ قَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ ط اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ** (29:26)۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ◆ پر حضرت لوط ایمان لائے۔ گویا اُس وقت تک حضرتِ لوطؑ کو نبوت نہیں ملی تھی کیونکہ بعد میں تو قرآن نے بتا دیا ہے کہ اُن کو بھی شرفِ نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تھا اور وہ نبی تھے۔ جب یہ اُن پہ ایمان لائے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وہ ابھی نبی نہیں ہوئے تھے۔ حضرتِ لوطؑ کے متعلق تاریخ کا بیان یہ ہے کہ وہ حضرتِ ابراہیمؑ کے برادرزادہ تھے لیکن اس رشتے کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ تو اپنے باپ کو بھی چھوڑ کر چلے گئے تھے' برادرزادہ تو ہونا کوئی بات نہیں ہے لیکن یہ تاریخی بات تھی جو میں نے عرض کی۔ حضرتِ لوطؑ ایمان لائے۔

یہاں سے ایک بڑی اہم بات ہمارے سامنے آتی ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ کی اتنی زندگی اپنی قوم میں پیغاماتِ خداوندی کو پہنچانے میں بسر ہوئی' تبلیغ کرنے میں بسر ہوئی اور آخر میں کہا یہ گیا ہے کہ اُن کے اوپر ایک فرد ایمان لایا۔ انہی کے ساتھ یہ نہیں ہوا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کی زندگی بھی ایسی ہی تھی۔ مکے میں تیرہ سال' تئیس سال ساری نبوت کی زندگی اور تئیس سال زندگی' قیامت تک نبوت رہنے والے کی ہے۔ اُس کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری ہے کیونکہ آپؐ تو آخری نبی ہیں۔ اُس آخری نبیؐ کی تئیس سال کی نبوت کی زندگی میں پچاس فیصد سے بھی زیادہ عرصہ اس قدر جدوجہدِ پیہم' جہادِ مسلسل' میں' تکالیف' صعوبات اور مشقتیں اٹھائی گئیں۔ اور وہ مکے کے تین سو نہیں تھے بلکہ ان میں مدینے کے بھی ملائے ہوئے تھے اور دیگر مقامات کے بھی ان میں شامل تھے۔ بدر کے میدان میں جسے تاریخ پہلی مردم شماری بتاتی ہے کہ تین سو ہی تھے' دو سال تو آ کے مدینے میں بھی ہو گئے۔ تو گویا مکے کی زندگی میں تو معدودے چند تھے۔ تئیس سالہ نبوی زندگی کی پیہم تگ و تاز کا نتیجہ اعداد و شمار کے اعتبار سے یہ چند نفوس تھے۔ میں بلاتمثیل یہ عرض کرونگا کہ میری زندگی کا مشن' مقصد یا جسے طلوعِ اسلام [1] کہتے ہیں' قرآنِ کریم کی اس تعلیم کا عام کرنا تھا۔ موجودہ مروجہ مذہب میں جو

---

[1] کوئی 1926ء کے لگ بھگ پرویزؒ (1985-1903): بسلسلہ ملازمت شملہ میں تشریف لائے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مسلمانانِ شملہ کو معلوم ہو گیا کہ پرویزؒ دیگر مسلمان نوجوانوں سے' جو شملہ میں معاشی ضروریات سے آتے ہیں' ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ امتیاز پرویزؒ کی اسلام دانی اور قرآن فہمی کی وجہ سے تھا جس کا مظاہرہ نجی ملاقاتوں' اسلامیہ ہائی اسکول کے صندل ہال میں منعقدہ ہفتہ وار تقریروں اور نئی دہلی میں سکریٹریٹ کی مسجد کے خطباتِ جمعہ میں ہوتا تھا۔ کم و بیش دس سال کے اختلاط کے بعد سکریٹریٹ کے ایسے مسلمانوں نے جنہیں اسلام اور قرآن سے دلچسپی تھی ایک نجی اجتماع میں طے کیا کہ پرویزؒ کے علم قرآن کی افادیت کو وسیع تر کرنے کے لیے ماہوار رسالہ جاری کیا جائے اور رسالہ کے پہلے سال کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے روپیہ جمع کر لیا جائے۔ مطلوبہ رقم جمع ہو گئی۔ اہلِ قلم حضرات نے قلمی معاونت کے وعدے کیے اور اپریل 1938ء میں طلوعِ اسلام کا پہلا شمارہ دھلی سے شائع ہو گیا۔ رسالہ کو جاری ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ نظر آ گیا کہ یہ سارا بوجھ تنہا پرویزؒ ہی کو اٹھانا پڑے گا۔ اس لیے کہ طلوعِ اسلام ان تصورات سے بالکل الگ پرچہ دکھائی دیا جو قلمی امداد کا وعدہ کرنے والوں کے ذہن میں تھے۔ اس میں تمام مسائل حیات کا حل خالص قرآنِ کریم **(باقی اگلے صفحہ پر)**

چیزیں خلافِ قرآن شامل ہوگئی ہیں اُن کو الگ کرنا اوران کی جگہ قرآنی پیغام اورتعلیم کو عام کرنا ہے۔ جہاں بات کی جائے تو وہاں پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کو اتنا عرصہ ہوگیا۔ اورجیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کی سوچ و بچار پہ تو کوئی میرا پچاس سال کا عرصہ ہوگیا لیکن اگر پاکستان میں بھی دیکھا جائے تو بہرحال تیس سال تو یہاں بھی مسلسل ہوگئے۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب! تیس سال کے عرصے میں اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ نتیجے سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ہنگامے کتنے ہوئے' جلوس کتنے نکلے' فسادات کتنے ہوئے' سرکتنوں کے پھٹے' لوٹا کتنا' مارا کتنا۔ یہ ہے ہمارے نزدیک عمل کا معیاراور Definition۔ یہ ہے عمل کا نقشہ۔ یہ کچھ ہوتو وہ جماعت بڑی باعمل ہوتی ہے۔ اُس میں سرگرمی ہوتی ہے' اس کا نام ہی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ یعنی سر میں گرمی آجائے تو پھر تو کوئی کام ہوتا ہے' اگر سر ٹھنڈا رہے تو پھر کوئی کام نہیں ہوتا۔ ذہنوں میں یہ تصور آ گیا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ میں اپنی بات بلاتمثیل عرض کررہا ہوں۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ حضرتِ ابراہیمؑ سے اگر کوئی پوچھ لیتا کہ حضرت! آپؑ نے اتنا عرصہ یہاں جان کھپائی اورسب کچھ چھوڑا اوراتنی قربانیاں بھی دیں تو آپ کا ماحصل کیا ہوا؟ اورحضورِ نبی اکرم ﷺ اورتمام انبیائے کرامؑ کی بھی ابتدائی زندگی کی یہی کیفیت تھی۔ ابتدائی دور میں ہوتا کیا ہے؟ ان کے نزدیک عمل کہتے کس کو ہیں؟ مذہب اوردین میں کیا فرق ہے؟ یہ چند سوالات ہیں جو غور وفکر کا تقاضا کرتے ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) کی روشنی میں پیش کیا جاتا تھا اوراسلوبِ نگارش بھی ایسا بلند تھا جو اردو کے بہت کم مجلّات کے حصہ میں آتا ہے۔ یہ دونوں کی خصوصیات کہیں اوریکجا نہیں مل سکتی تھیں اس لیے پورے پرچے کی ذمہ داری صرف پرویزؒ کے سر پر تھی۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس کا نہ کوئی باقاعدہ دفتر تھا' نہ عملہ۔ پرچہ کی تیاری کے ساتھ ساتھ قائداعظم مرحوم کے مشوروں اور دوسرے کاموں میں شرکت تحریک پاکستان کے متنوع گوشوں سے متعلق امور کی دیکھ بھال' قرآنی ریسرچ کا کام اس پر مستزاد تھے اور یہ سب کچھ اس جانکاہ ملازمت کے ساتھ جو کسی دوسرے کام کے لیے عام طور پر فرصت ہی نہیں دیا کرتی۔ یہ تھے وہ حالات جن میں پرویزؒ نے طلوعِ اسلام کی ابتدا کی۔

یہ پرچہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اورمیدان صحافت میں اس نے وہ بلند مقام حاصل کیا جو کم صحیفوں کو نصیب ہوسکا۔ ہرملی معاملہ میں طلوعِ اسلام کی تنقید حرفِ آخر تصور ہوتی تھی۔ پاکستان کی جدوجہد میں قاعدِ اعظم کی حمایت' مشترکہ قومیت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کی پرزور اور بدلائل تائیدٗ نیشنلسٹ علماء (بالخصوص ابوالکلام آزاد مرحوم' حسین احمد مدنی مرحوم وغیرہ) کے دعاوی کا قرآن کی روشنی میں ابطال' خاکسار سے ہمدردی' واردھا کی تعلیمی اسکیم کی نہایت شدید اور کامیاب مخالفت وغیرہ وہ اہم مسائل تھے جن کے حل میں طلوع اسلام کی آواز ہمیشہ وزنی سمجھی گئی۔ چارسال کی مسلسل جدوجہد کے بعد جب پرویزؒ شدید طور پر بیمار ہوگئے تو طلوعِ اسلام کی اشاعت عارضی طور پر روک دی گئی۔ تاہم مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ تقسیم ہند کے بعد پرویزؒ بسلسلۂ ملازمت پاکستان آگئے اور 1948ء کے شروع میں کراچی سے طلوع اسلام پھر جاری کردیا گیا۔

قارئینِ طلوع اسلام کے اصرار پر ہفتہ واری طلوع اسلام کا پہلا شمارہ فروری 1955 میں شائع ہوا۔ مالی خسارے کی وجہ سے سال بھر کا تجربہ ہفتہ وارکو جاری رکھنے کا مؤید نہ ہوسکا اور فروری 1956ء سے پھر ماہنامہ کی شکل اختیار کرلی اور تا حال جاری ہے۔ (ماخوز از عبدالرب؛ ادارۂ طلوع اسلام (رپورٹ)' طلوع اسلام' دسمبر 1956' ص ص۔ 52 تا 54)۔

تقلید پرست قوم کو مروّجہ روش پر چلاتے رہنا کوئی مشکل نہیں ہوتا

ایک شخص قوم کو اُس بات پہ آواز دیتا ہے جسے وہ پہلے سے مانتی چلی آتی ہے تو وہ تو پہلے ہی دن' پہلے ہی لاکھوں' اُس کے معتقد اور پیروکار ہوتے ہیں' وہ بات ہی اُن کی کہتا ہے۔یعنی اُسے کسی کو Convert (تبدیل) کر کے اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ لوگ مان رہے ہیں' وہ اُسی بات کو کہتا ہے اور وہ اُس کے ساتھ ہوتے ہیں۔وہ اُس کو اور پختہ تر کر دیتا ہے جو کچھ وہ مان رہے ہوتے ہیں۔پھر اگلا Step (قدم) یہ ہوتا ہے کہ جو اِس کے خلاف کہتا ہے' وہ باطل پر ہے اور تمہارے اسلاف کے خلاف ہے' تمہارے مذہب کے خلاف ہے' دین کے خلاف ہے' اٹھو اور اُس کو جلادو۔یہی کچھ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ہوا تھا۔اور یہ اس کا نام عمل رکھتے ہیں کہ اُٹھو' پکڑو' مارو' جلادو۔وہ کن سے یہ عمل کراتا ہے؟ ان سے جو پہلے سے ہی وہ کچھ مان رہے ہوتے ہیں جن کی یہ تلقین کرتا ہے۔وہ تو پہلے سے ہی ساتھ ہوتے ہیں۔

انبیائے کرامؑ انقلابی پیغام لے کر آتے ہیں۔وہ کرتے یہ ہیں کہ لوگ جو کچھ غلط اور باطل مان رہے ہوتے ہیں' وہ اُس کے خلاف جہاد کرتے ہیں' اُس کو باطل قرار دیتے ہیں' اُس کی تردید کرتے ہیں' اُسے چھڑاتے ہیں۔پھر ذہنوں کے اندر خلا پیدا نہیں کرتے بلکہ اُس کی جگہ حق کے اوپر مبنی تعلیم کو ذہنوں میں جاگزیں کرتے ہیں۔یہ Convert (تبدیل) کرنا ہوتا ہے' قلب و دماغ کے اندر ایک تبدیلی لانا ہوتا ہے۔اس کی رفتار کتنی سست ہوتی ہے' کام کتنا مشکل ہوتا ہے' تو وہ تو حضرتِ ابراہیمؑ کی زندگی میں اُس مثال میں ہم دیکھ چکے کہ جب اُنہوں نے کہا تھا کہ یا اللہ! یہ مُردوں کی بستی ہے جہاں صورِ اسرافیل پھونکتے پھونکتے میری ساری عمر گزر گئی اور ایک بھی اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں' تو میں کیا کروں؟ تُو مجھے یہ تو بتا کہ وہ طریقہ کونسا ہے جس سے مُردوں کو زندہ کیا جا سکتا ہے؟ یہ تو مُردوں کی قوم ہے۔فرمایا کہ اے ابراہیمؑ! تم نے دیکھا ہے کہ یہ جو وحشی پرندے ہوتے ہیں؟ اُن کو سدھانے والا کیا کرتا ہے؟ کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ اُس کے پاؤں کی آہٹ سن کر وہ پھڑ پھڑا کر اڑ جاتے ہیں' اس لیے ان کو وحشی کہتے ہیں۔اُن پرندوں کو اس طرح سے سدھاتے ہیں کہ اُس کے بعد اگر وہ ان کو فضا میں چھوڑ دیتا ہے تو اس کے باوجود وہ اس کی آواز پر پھدکتے ہوئے چلے آتے ہیں۔کہا کہ اے ابراہیمؑ! مُردہ انسانوں میں زندگی پیدا کرنے کے لیے یہ کرنا پڑتا ہے۔ایک پرندے کو سدھانے کے لیے وہ پرندے کو سدھانے والا جو کچھ کرتا ہے' آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔اُس میں آپ کے یا ان کے عمل کے معیار کے مطابق کچھ نہیں ہو رہا ہوتا لیکن وہ اُس کے اندر ایک تبدیلی پیدا کر رہا ہوتا ہے۔

قوموں کو ان کے غلط عقائد کی جگہ صحیح خطوط سے روشناس کرانا ایک مشکل ترین عمل ہے

یہ جو آسمانی انقلاب ہے' یا پیغمبری انقلاب ہے' وہ قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا کرتا ہے' وہ ہنگامے برپا نہیں کرتا۔ مشکل ترین کام کسی کے غلط عقیدے کو اُس کے قلب کی گہرائیوں سے نکالنا ہے۔ عقیدہ انسان کی عزیز ترین متاع ہوتا ہے۔ اور پھر جب ہم انسان کہتے ہیں تو پھر پوچھو ہی نہیں کہ حیوان کی تو بات ہی آسان ہے۔ شیر کا سب کچھ متعین ہوتا ہے کہ وہ کیا کرتا ہے اور کیا ہوتا ہے' سوجھ بوجھ کیا ہے اور فطرت کیا ہے؟ جب آپ بکری کہتے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ کیا ہے' کیا کرتی ہے' کیا کھاتی ہے اور کیا ردِعمل ہوتا ہے؟ لیکن انسان کی تو یہ کیفیت ہے کہ وہ بھی انسان ہے جو پیغمبر کو سولی پہ چڑھا دیتے ہیں اور وہ بھی انسان ہیں جو گائے کی پرستش کرتے ہیں۔ ذرا دیکھیے تو سہی کہ دونوں میں کتنا فرق ہے! یہ جو انسان ہے' اس کے دل سے اس کے عقائد کو نکالنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے' بڑا اہمت طلب ہوتا ہے' بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ کمر شکن ہوتا ہے' یہ مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونکنا ہوتا ہے۔ ہنگامہ برپا کرنے میں کیا مشکل ہوتی ہے لیکن جب یہ اس طرح سے قلب و دماغ کی تبدیلی کے بعد حق پہ آ جاتے ہیں تو اُس کے بعد ایک Instance (مثال) ایسی نہیں ملتی ہے جو اس کا ساتھ چھوڑ کر چلا جائے۔ اس کے برعکس یہاں ہر عظیم عمل کے بعد جب ان لیڈروں کے معتقدین میں سے چند باہر آتے ہیں تو پھر پوچھو نہیں کہ ان کے متعلق کیا کچھ کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! قلب و نگاہ کے بدلنے کو انقلاب کہتے ہیں' یہ قلب کی تبدیلی کا نام ہوتا ہے۔

یہ جو ہجرت کا مقام آتا ہے تو یہ بڑا اہم مقام ہوتا ہے۔ نبی جہاں پیدا ہوتا ہے' وہیں سے اپنی بات شروع کرتا ہے اور کرنی ہی وہیں چاہیے۔ یہ مقام اُس کے اپنے Choice (اختیار) کی بات نہیں ہوتی۔ جہاں وہ ہوتا ہے وہیں اُس کو یہ کرنا پڑتا ہے۔ اور بالعموم یہی دیکھا ہے کہ تمام انبیائے کرامؑ کے قصے میں یہی چیز سامنے آتی ہے کہ ایک وقت کے بعد پھر جب وہ دیکھ لیتے ہیں کہ یا تو اُن میں سے جو اس قسم کے افراد ہوتے ہیں جن میں تبدیلی آ جاتی ہے تو وہ ساتھ ہو جاتے ہیں اور پھر باقی ایسا طبقہ رہتا ہے جس میں تبدیلی کا امکان ہی نہیں ہوتا۔ ان کے پاس وقت تھوڑا ہوتا ہے تو وہ پھر اپنی Choice (مرضی) کا علاقہ یا مخاطب قوم تجویز کرتے ہیں کہ وہاں اس کا زیادہ امکان ہے۔ یونہی نہیں ہوتا کہ یہاں سے وہ اٹھتے ہیں کہ ''چلو گوجرانوالے چل دیئے'' وہ اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ جہاں کی فضا اس کے لیے زیادہ مساعد ہو وہاں چلے جاتے ہیں۔ وہاں جا کے ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ تو پہلے اس طرح سے Convert (تبدیل) ہوئے لوگ ہوتے ہیں اور اُس کے بعد جو وہاں فضا مساعد ہوتی ہے تو وہاں جا کر ان کی یہ محنتیں بارآور ہوتی ہیں۔

رب کی طرف جانے کا مفہوم

یہاں پہ حضرتِ لوطؑ اور حضرتِ ابراہیمؑ آتے ہیں۔قرآن کہہ رہا ہے کہ ایک شخص ہے اور وہ بھی برادرزادہ ہے' وہ اُن کے ساتھ ایمان لایا ہے اور وہی اُن کے ساتھ گیا ہے' اُسی نے ہجرت کی ہے' دونوں وہاں تنہا گئے ہیں۔اور تنہا جانے کے بعد کہا کہ **اِنِّیۡ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ** (29:26) میں اس فضا کی تلاش میں نکل کر جا رہا ہوں جو میرے خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لیے سازگار ہے۔میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ دوسری جگہ کہا ہے کہ **اِنِّیۡ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ** (37:99) میں چلا اپنے رب کی طرف' میں جا رہا ہوں اپنے خدا کی طرف۔خدا تو انسان کے رگِ جان سے بھی قریب ہے۔تو کیا وہ کسی مقام میں بیٹھا ہے؟ شام کی بستیوں یا فلسطین کی وادیوں میں بیٹھا ہے جو کہا ہے کہ میں وہاں چلا ہوں؟ بت کے پاس تو آپ ایسے جاسکتے ہیں کہ وہ ایک مقام میں جم کر بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔خدا تو زندگی کی رگِ جان میں ہوتا ہے۔خدا کی طرف جانے کے کیا معنی ہیں؟ معنی یہ ہیں کہ اُس مقام یا اُس فضا کی طرف جا رہا ہوں جو خدا کے پیغام اور انقلاب کے لیے زیادہ مساعد واقع ہوئی ہے۔میں چلا اُدھر۔اور اس لیے جا رہا ہوں کہ **اِنَّهٗ هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ** (29:26) وہ صاحبِ غلبہ ہے۔وہ مجھے غلبہ عطا کرے گا لیکن حکمت کے ساتھ عطا کرے گا' دھاندلی کے ساتھ نہیں' ڈنڈے بازی کے ساتھ نہیں۔یہ دونوں صفتیں انقلابِ آسمانی یا پیغمبری انقلاب میں ہیں کہ وہ عزیز ہوتا ہے لیکن حکیم ہوتا ہے کہ دھاندلی سے نہیں کرتا۔اور وہاں پہ اکیلے گئے ہیں اور صرف حضرتِ لوط ◆ ساتھ گئے ہیں۔جب وہاں گئے ہیں تو یہ کیفیت ہے کہ **وَ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ** [1] (29:27) وہاں جا کر حضرت اسحاق ◆ اور حضرت یعقوب ◆ کا ذکر کیا ہے۔ **وَ جَعَلۡنَا فِیۡ ذُرِّیَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الۡکِتٰبَ وَ اٰتَیۡنٰهُ اَجۡرَهٗ فِی الدُّنۡیَا وَ اِنَّهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ** (29:27) [2] ۔یہ عجیب چیز آ گئی۔یہاں سے اکیلے گئے اور حضرتِ لوط ◆ ساتھ ہیں۔اور وہاں جا کر اُن وادیوں میں پھر آگے ذریّت چلی ہے۔

نبوت کی زندگی خانقاہیت کی زندگی نہیں ہوتی

یہاں (29:27) میں تو یہ کہا ہے کہ نبوت اور الکتاب دی ہے۔دوسرے مقام پر کہا ہے کہ **فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ وَ اٰتَیۡنٰهُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا** (4:54) نبوت دی' ضابطۂ قوانین دیا' حکمت سکھائی اور پھر اُن کو ایک عظیم مملکت دی۔یہ

---

[1] ہم نے اُسے اسحٰقؑ جیسا بیٹا اور یعقوبؑ جیسا پوتا عطا کیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔916)۔

[2] اور اس کی نسل میں نبوت اور حکومت (ضابطۂ قوانین) کو جاری رکھا (4:59)۔ہم نے اس کی مخلصانہ جدوجہد کا یہ اجر تو اس دنیا میں دیا۔اور آخرت کی زندگی میں اس کا شمار صالحین کے زمرے میں ہوا۔اس طرح اس کا حال اور مستقبل دونوں خوشگوار ہو گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔916)۔

خانقاہیت کا انقلاب نہیں ہے۔مملکتِ عظیم بھی اُس کے ساتھ ہوتی ہے۔اُسی لیے کہا کہ **وَ اٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا** (29:27) یہ پہلا اجر اس دنیا کے اندر ملتا ہے اور یہی تو اِس کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔اگر محض ذہنی بات ہو تو اُس میں ٹیسٹ کیسے ہو جائے۔آج صبح ہی میں اپنی بچی سے کہہ رہا تھا' سائنس کی بات ہوئی تھی تو میں نے کہا تھا کہ بیٹا! بات بڑی سہل ہے' سائنس ایک فارمولا دیتی ہے کہ یہ اور یہ کرو گے تو یہ ہوگا۔آپ لیبارٹری میں ٹیسٹ کرتے ہیں' اگر اُس طرح سے کرنے سے وہ ہو گیا ہے تو فارمولا درست ہے' اگر فارمولا درست ہے اور اُس کے باوجود وہ نہیں ہوا جو درست فارمولے کا نتیجہ ہے تو تمہارا عمل غلط ہے۔تم اُس وقت اُس کو چھوڑ و گی جب اُس کے مطابق وہ نتیجہ آپ کے سامنے نکل آئے گا۔اگر وہ نتیجہ اُس فارمولے کے بالکل مطابق کرنے سے بھی نہیں نکلتا تو آپ کبھی اُس کو Repeat (اعادہ) نہیں کریں گے۔سو دانے کی تسبیح سے کام نہیں بنا تو ہزار دانے کی تسبیح سے نہیں بنے گا۔وہ دس ہزار دفعہ بھی آپ غلط فارمولے پہ عمل کرتے جائیں گے' Repeat (اعادہ) کرتے چلے جائیں گے تو نتیجہ نہیں نکلے گا۔سائنٹسٹ کبھی نہیں دہراتا۔وہ کیوں یہ نہیں کرتا؟ اس لیے کہ اُس کے سامنے Concrete (محسوس) شکل میں نتیجہ آتا ہے۔اب اگر اُس سے یہ کہا جائے کہ صاحب! آپ یہ کرتے جایئے اور یہ نہ دیکھیے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے بلکہ اس کے کرنے سے آپ کو ثواب ہوتا ہے اور جتنا زیادہ کرتے چلے جائیں گے تو اتنا زیادہ ثواب ہوتا چلا جائے گا۔یعنی غلط سوال نکالتے چلے جایئے' یہ نہ دیکھیے کہ ان سوالوں کا جواب ملتا ہے یا نہیں ملتا' وہ یہ کبھی نہیں کرے گا مگر ہمارے ہاں تو جوابوں والے صفحے ہی پھاڑ دیتے ہیں کہ کبھی آپ اپنے سوال کے جواب کو ملا ہی نہ سکیں کہ اس کے مطابق نکلا ہے یا نہیں نکلا۔ان کا کہنا یہ ہے کہ صرف اس طرح سے انسان اُس پہ کاربند رہے کیونکہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ **وَ اٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا** (29:27) ہم نے اس کی مخلصانہ جدوجہد کا یہ اجر تو اس دنیا میں دیا۔

مذہب کی انتہائی شکل تصوف ہوتی ہے نیز لفظ صالحین کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہ ہے اسوۂ ابراہیمی جو بتایا گیا ہے۔اس پہ نہ گھبرایئے کہ اس پہ اتنا وقت صرف کیا ہے' ایک آدمی ایمان لایا ہے اور سب کچھ چھوڑ کر دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔یہ کہا ہے کہ اسی دنیا میں اُس کا جو اجر ہے' وہ سامنے آئے گا۔پہلا ٹیسٹ یہ ہے۔یہاں تک بات تو آپ کو سیکولرازم بھی سکھا دے گا' مملکت بھی حاصل کرلے گا' حکومت بھی وہ حاصل کرلے گا لیکن آگے کہا ہے کہ **وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ** (29:27) زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔بس یہ ٹکڑا ساتھ ملانے سے اسلام ہو جاتا ہے اور صرف پہلا حصہ رکھنے سے سیکولرازم ہوتی ہے۔اور اگر نہ وہ پہلا ہو' اور نہ دوسرا ہو تو اسے مذہب کہا جاتا ہے جس کی انتہائی شکل تصوف ہوتی ہے۔اس دنیا کے اندر اجر دیا گیا ہے' آخرت کے اندر صالحین کے زمرے میں ہیں۔کہا جائے گا کہ صاحب! صالحین تو نیک بختوں کو کہتے ہیں تو آخرت میں

نیک بخت ہونا کیا معنی ہیں، وہاں جنت میں تو سارے ہی نیک بخت ہوتے ہیں۔ صالحین کا ترجمہ کچھ اور ہے۔ یہ آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ اس زندگی میں صالح وہ ہے جس میں اس زندگی سے اگلی ارتقائی زندگی کی اونچی منزل میں پہنچنے کی صلاحیت ہے اور وہاں بھی زندگی کا وہ منتہٰی نہیں ہے کہ وہاں وہ Terminal (اختتام) ہے کہ ریل گاڑی وہاں جا کر ختم ہوگئی۔ وہ بھی جو زندگی ہے جسے جنت کی زندگی کہتے ہیں، وہ راستے کا ایک مقام ہے، وہ آخری منزل نہیں ہے۔ وہاں صالحین کے معنی یہ ہیں کہ وہاں پھر جن کے اندر اتنی صلاحیت ہو کہ وہ اُس سے آگے چلیں اور ارتقائی منازل طے کریں۔ جیسا میں نے کہا تھا کہ

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد

یہاں تو نصب العین وہ ہے، منزل وہ ہے کہ جو منزل ہی نہیں ہے۔

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

عزیزانِ من! یہ ہے اصل چیز۔

حضرتِ لوط ◆ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ

بس یہ ہو گیا دین کہ اَجۡرَهٗ فِی الدُّنۡیَا وَ اِنَّهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ (29:27)۔ اب اس مقام میں سورۃ العنکبوت میں حضرت ابراہیمؑ کی داستان یہاں ختم ہوتی ہے، آگے تھوڑا سا ٹکڑا اور آئے گا لیکن بات حضرتِ لوطؑ کی شروع ہو جاتی ہے۔ کہا کہ وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ [1] (29:28)۔ حضرتِ لوطؑ کی زندگی میں ایک اہم واقعہ ہے جس کو قرآن بیان کر رہا ہے۔ پہلے یہ یاد رکھیے کہ یہ بات نہیں ہے کہ قرآن جو کسی نبی کا ایک اہم معاملہ یا کردار سامنے لایا ہے تو وہ اتنی ہی بات تھی جو اُس نے کی تھی بلکہ وہ تو اپنی قوم کی زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کا پیغامبر ہوتا تھا لیکن بعض حالات میں، بعض قوموں کے اندر، بعض برائیاں بڑی نمایاں حیثیت اختیار کر لیتی ہیں، وبائی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں، Epidemic (وبا) کی شکل اختیار کر لیتی ہے، وہ سب سے پہلے اُس برائی کو لیتا ہے۔ اور قرآن جب نمایاں طور پہ اُس کی Activities (سرگرمیوں) کا ذکر کرتا ہے تو وہ اُس نمایاں حیثیت کو سامنے لاتا ہے۔ یہ بات نہیں ہوتی کہ فلاں نبی نے کہا کہ صاحب! کم مت تولو، خالص چیزیں لوگوں کو دو۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ اتنی ہی بات کہہ کر چلا گیا تھا بلکہ اُس معاشرے میں یہ وہ خرابی تھی جو بہت عام ہوگئی ہوئی تھی، اس لیے قرآن نے اس کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] اور اسی طرح لوطؑ کی سرگزشت ہے۔ جب اس نے (نبوت ملنے کے بعد) اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک ایسی بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو جسے، اس سے پہلے، دنیا جہاں میں کسی نے اختیار نہیں کیا تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 916)۔

حضرتِ لوطؑ کے قصے میں قرآنِ کریم نے جنسیّت (Sex) کے متعلق بات کہی ہے۔ یہ قصہ پہلے بھی کئی دفعہ آ چکا ہے' بات پہلے بھی ہو چکی ہے۔ اب پھر سامنے آیا ہے' جب بھی سامنے آئے گا تو مجھے تو پھر اس کی توضیح کرنا ہوگی۔ اس میں میرے لیے ذرا سا جھجک کا اور حجاب کا مقام ہوتا ہے کہ کم از کم ہمارے معاشرے میں ابھی تک Sex (جنسیّت) کے متعلق گفتگو ایسی محفل میں مشکل ہو جاتی ہے جہاں میری بیٹیاں اور بہنیں بھی بیٹھی ہوئی ہوں' کھل کر بات نہیں کہی جا سکتی لیکن مجھے یونہی اس سے آگے بڑھ بھی نہیں جانا چاہیے کہ قرآنِ کریم نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے۔

عصمت کا لفظ مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے' صرف عورت کے لیے ہی نہیں ہے

جسے آپ عفت کہتے ہیں' جسے عصمت کہتے ہیں' ہمارے نزدیک تو بدقسمتی سے عصمت اور عفت صرف عورت کے لیے ہی کہی جاتی ہے یعنی مرد کے متعلق یہ بات ہی نہیں ہے۔ کیا کبھی آپ نے کسی مرد کے متعلق سنا ہے کہ یہ بڑا باعصمت انسان ہے۔ یہ تو تقاضا ہی ہمارا عورت کے متعلق ہوتا ہے۔ ''منڈا بھاویں کتھے کھے کھاندا پھرے لیکن کدی اے گل نہیں ہوندی[1]''۔ بیوی خاوند سے اتنا ہی کہتی ہے کہ ذرا دیکھو تو سہی کہ لڑکا آدھی آدھی رات تک کہیں رہتا ہے۔ ''تے او وی اگوں ایہہ ای کہہ دیندا اے کہ ایہو جئی عمر اچ ایہو جا ہوندا ای ہیگا اے' ایویں وہم نہ کریا کر[2]''۔ لیکن لڑکی اگر دوپٹہ بھی لے لیتی ہے تو محلّہ بھر مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگ جاتا ہے۔ یہ ہم نے اپنے ہاں عصمت کا دہرا معیار رکھا ہوا ہے۔ قرآنِ کریم پہلا تقاضا مردوں سے کرتا ہے اور یہ بڑے راز کی بات ہے۔ مرد اگر باعصمت ہوں تو عورت بگڑ ہی نہیں سکتی۔ اُس نے باعصمت افراد میں سے دو کی مثال دی ہے۔ حضرتِ یوسفؑ کا کارنامہ یہی ہے کہ اُنہوں نے اپنے دامنِ عصمت کو محفوظ رکھا تھا۔ اور پھر وہ جو اس حفاظتِ عصمت کی بنا پہ جو حسنِ یوسف کی رعنائیاں قرآن نے گنائی ہیں تو ان کی کیا بات ہے! اُن کی ایک ہی چیز گنائی ہے کہ اُنہوں نے اپنے دامن کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن نے اس مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اور دوسری مثال ایک عورت ہے جس کا ذکر کیا ہے۔ وہ حضرتِ مریمؑ ہیں۔ جہاں اُن کا ذکر آتا ہے تو بات یہی آتی ہے کہ اُس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ پہلی بات تو یہ دیکھیے کہ قرآن جب عصمت کے متعلق بات کرتا ہے تو پہلے ابتدا مرد سے کرتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ باہر نکلو تو نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دو۔ وہ یہ بات پہلے مردوں سے کہتا ہے اور بعد میں عورتوں سے کہتا ہے۔ میں بات پھر دہرا دوں کہ اگر یہ مرد اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں تو عورت کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ قرآنِ کریم اس مسئلے کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔

---

[1] بھلے لڑکا کہیں بھی گندگی کرتا پھرے لیکن اس کے لیے کبھی بھی یہ بات نہیں ہوتی۔

[2] وہ بھی سامنے سے یہ کہہ کر جان چھڑا لیتا ہے کہ اس عمر میں یہ کچھ ہوتا ہی ہے' اسے بھلیے! یونہی وہم نہ کیا کرو۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ محض ایک تمدنی مسئلہ ہے؟ سوسائٹی کا مسئلہ ہے؟ ہمارے ہاں تو صرف یہ سوسائٹی کا مسئلہ بن کر رہ گیا ہے کہ کسی لڑکی کے متعلق بھی اگر کوئی بات باہر نکل جاتی ہے تو اُس کو رشتہ ہی نہیں ملتا۔ قرآنِ کریم محض تمدنی مسئلے کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ اُس کے نزدیک ''وہ جو مستقل اقدار یا اُس کی غیر متبدل حدود (Boundary Lines) ہیں' اُن کے اندر رہتے ہوئے جس طرح بھی آپ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں' وہ تمدن ہے''۔ اُس کو اتنی اہمیت ہی حاصل نہیں ہے۔ اہمیت تو ان حدود کو ہے جو غیر متبدل قرار دی گئی ہیں۔ یہ مسئلہ اگر محض تمدنی ہوتا تو ٹھیک ہے قرآن جس طرح سے معاشرتی زندگی کی اور ہدایات دیتا ہے' تو یہ بھی ایسے ہی ہوتا۔ مثلاً وہ یہ بھی تو کہتا ہے کہ دوسرے کے ہاں جانا ہو تو By Appointment (وقت لے کر) جایا کرو' اجازت لے کر جایا کرو۔ یہ بھی قرآن میں ہے۔ لیکن اس کے متعلق اُس نے اتنی اہمیت نہیں دی ہے۔ اب چونکہ ہمارے سامنے حضرتِ لوطؑ کی قوم کے قصے میں وہ بات آ گئی ہے کہ اس مسئلے کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے۔ انسان کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ** (95:4) انسان میں وہ ممکنات رکھی گئی ہیں کہ یہ زندگی کا حسین ترین پیکر اختیار کر سکتا ہے۔ یہ بہت بڑا مقام ہے زندگی کا لیکن اُس کے بعد ہے کہ اس کی کیفیت یہ ہے کہ **ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ** (95:5)۔ یہ عجیب چیز ہے جو قابلِ غور ہے کہ اُس کے بعد اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ''یہ اپنے آپ کو اُن سے بھی پست کر لیتا ہے جو اس سے پست ہیں''۔ عزیزانِ من! یہ مقامات بڑے غور طلب ہیں۔

حیوانی زندگی اور انسانی زندگی میں فرق

اسی طرح دوسرے مقام پہ ہے کہ **اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ** (7:179) اس قسم کے لوگ حیوان ہیں' یہ انسان نہیں ہیں۔ اُس کے بعد ہے کہ **بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179) بلکہ ان حیوانوں سے بھی گئے گزرے ہیں' اُن سے بھی پست ہیں۔ گویا قرآنِ کریم میں انسان کو چونکہ اختیار وارادہ دیا گیا ہے' یہ ازخود وہ کچھ بن سکتا ہے جو اِس نے بننا ہو۔ حیوانات کو یا اشیائے کائنات کو بنا دیا گیا ہے کہ جیسے وہ ہیں۔ اس کی طبعی زندگی تو اِس کو دیدی گئی ہے لیکن اس کے بعد انسان نے خود کچھ بننا ہوتا ہے۔ اُس بننے کے جو ممکنات ہیں' جو Potentialities ہیں' جو مضمرات ہیں کہ یہ کیا کچھ ہو سکتا ہے' اُس میں اُس نے یہ بتا دیا کہ یہ بننا چاہے تو یہ بلند ترین مقام بھی حاصل کر سکتا ہے' اگر بگڑنا چاہے تو یہ **کَالْاَنْعَامِ** بھی اپنے آپ کو کر سکتا ہے' حیوانات کی سطح پہ بھی لا سکتا ہے۔ اور اُس سے پست تر سطح پہ بھی چلا جا سکتا ہے۔ یہ سارے امکانات اس میں موجود ہیں۔

آپ حیوانات کی زندگی کو لیجیے تو وہ اپنی حیوانی زندگی سے اوپر نہیں جا سکتے۔ شیر جیسا ایک کروڑ سال پہلے شیر تھا تو آج بھی ویسا ہی شیر ہے' وہ شیر سے اونچا ہو ہی نہیں سکتا حالانکہ اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے لیکن اُس میں ایک خصوصیت بھی ہے کہ وہ اُس سطح سے پست بھی

نہیں ہوسکتا' شیر بکری بن ہی نہیں سکتا۔ اگر حیوان اپنی سطح سے اونچا نہیں جاسکتا تو اپنی سطح سے نیچے بھی نہیں جاسکتا۔ اسی لیے حیوانات کی جو زندگی ہے' وہ سائیکل (دائروی) کی زندگی ہے' تکرار کی زندگی ہے' Repetition (اعادہ) کی زندگی ہے کہ اُسی قسم کے پیدا ہوتے چلے جائیں لیکن انسان کی کیفیت اُس نے یہ بتائی کہ جس سطح پہ اِس کو پیدا کیا گیا ہے تو پیدائش کے اعتبار سے تو حیوانی بچے اور انسانی بچے میں فرق ہی نہیں ہوتا۔ اُس کے بعد انسان نے خود کچھ بننا ہوتا ہے۔ اور بننے میں یہ کہا کہ یہ اِس مقام سے اونچا جاسکتا ہے' یہ بلند ترین ہے' احسن ہے' Superlative Degree (درجۂ اعلیٰ) ہے۔ یہ وہاں بھی جاسکتا ہے اور نیچے اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ بھی' جس کا ترجمہ ہی مشکل ہے۔ میں اسی طرح سمجھاؤں گا کہ جو اس سے پست سطح پہ ہیں' ان سے بھی پست ترین سطح پر جاسکتا ہے۔

عزیزانِ من! اور زندگیوں کو تو چھوڑ یئے یہ جو Sex (جنسیت) کی زندگی ہے' اس میں یہ تینوں مقام نظر آتے ہیں۔ اس لیے اس کی اہمیت ہے۔ ایک مقامِ خداوندی ہے۔ ایک چیز' Procreation (تولید) ہے کہ اُسی قسم کا پیدا کرتے چلے جانا' اِسے تولید کہتے ہیں' یہ جنسی اختلاط کے بعد بچے کا پیدا ہونا ہے۔ یہ جو سلسلہ ہے تو یہ سلسلہ حیوانات میں بھی یہی ہوتا ہے' اُسی طرح سے حیوانی بچہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ نر اور مادہ کے جنسی اختلاط سے ابتدا ہوتی ہے اور اُس سے ایک بچہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اسے تولید کہتے ہیں یعنی Procreation۔ ایک اور چیز Creation ہوتی ہے جسے تخلیق کہتے ہیں کہ جو کچھ موجود ہے اُن کو لے کر اُس میں نئے نئے فارمولے کر کے نئی نئی چیزیں پیدا کرتے چلے جانا۔ اسے تخلیق کہتے ہیں۔ خدا جس مقام پہ ہے وہاں تولید نہیں ہے۔ کہا کہ لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ (112:3) نہ اُس کی ہستی تولید کے نتیجے کی ہے اور نہ اُس کے بعد وہ تولید کے ذریعے سے کچھ پیدا کرتا ہے۔ خدا کے لیے تولید نہیں ہے بلکہ وہ خالق ہے اور تخلیق کرتا ہے۔ تو خدا کا مقام جو ہے وہ خالقیت کا ہے' ولدیت کا نہیں ہے۔ اُس کے بعد یہ جو چیزیں اُس نے پیدا کیں تو اُن میں جو جامد چیزیں ہیں پتھر وغیرہ' تو اُنہیں تو چھوڑ دیجیے۔ جو حیوانات ہیں' تو اُن میں Procreation (تولید) ہے' ان کے اندر تولید ہے' تخلیق نہیں ہے۔ یہ زندگی کی پہلی سطح ہے جس میں Procreation (تولید) تو ہے' Creation نہیں ہے یعنی تخلیق نہیں ہے۔ انسان کی زندگی کی جو Physical Life (طبعی زندگی) ہے تو یہ وہی ہے جو حیوانی زندگی ہے' اُس میں کچھ فرق نہیں ہے۔ وہی زندہ رہنے کے اسباب اور کھانا پینا' سانس لینا' روشنی' گرمی' طبعی قوانین کے ماتحت زندہ رہنا ہے' اُسی طرح سے اُس کی خلاف ورزی کرنے سے بیمار ہوجانا' اُسی طرح سے علاج کرانا ہے' ایک دن مشین کا چلتے چلتے بند ہوجانا ہے اور اُس کے بعد مرجانا ہے۔ تو یہ چیزیں حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہیں۔ اسی طرح سے حیوان کی سطح کے اوپر انسان کے اندر تولید (Procreation) موجود ہے لیکن قرآن نے کہا ہے کہ خدا احسن الخالقین ہے' یعنی وہ اکیلا خالق نہیں ہے۔ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ تو اُس نے اکیلا کہا تھا کہ جب کوئی شے موجود نہ ہو تو کسی شے کو موجود کر دینا تو یہ صرف ہم کر سکتے ہیں' یہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ خالق ہونے کی حیثیت سے کہا ہے کہ بہت سے

خالق ہیں اور ہم اُن میں سے بہترین تخلیق کرتے ہیں۔ جب وہ اور خالق تسلیم کرتا ہے تو حیوانات میں تو تخلیق ہے ہی نہیں۔ تو اُس کے بعد انسان ہی باقی رہتا ہے۔ انسان وہ ہے جس کی نسل کے تسلسل کی حیوانی سطح کے اوپر ضرورت ہے کہ یہ آگے چلتی رہے۔ اتنے حصے تک تو تولید کی ضرورت ہے۔ اور اس سے آگے پھر اس کے لیے تخلیق کی ضرورت ہے۔

اب یہاں ہم آ گئے۔ اگر وہ زندگی ہے کہ جس میں تولید بھی نہیں ہے کہ جسے خانقاہیت کی زندگی کہتے ہیں تو اُن کے نزدیک تو یہ جو شخص کی زندگی ہے، یہ سخت قابلِ نفرت ہے۔ اس میں ترکِ دنیا ہے، ترکِ علائق ہے، بیوی بچوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلے جانا ہے۔ یہ ہے کہ غاروں میں چلے جاؤ، کوٹھڑیوں میں چلے جاؤ۔ یعنی تولید بھی نہیں ہے۔ وہ زندگی تو وہ ہے جو حیوانی سطح پہ بھی نہیں ہے۔ جو ہمارے بلند ترین روحانی زندگی ہے وہ قرآن کی رو سے آدم نہ رسیدی ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) کیا خوب کہتا ہے کہ با آدم نہ رسیدی خدا چہ می جوئی کہ ''تو بندے دا پتر بنڑ نہیں سکدا اتے تو خدا نوں کی لبھدا پھردا ہیگا ایں❶''۔ خدا تک پہنچنے کے لیے پہلے آدم بن۔ یہ جو زندگی ہے جس میں حیوانی سطح کی تولید بھی نہیں ہے تو وہ تو آدم کی زندگی بھی نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب جو عقائد یا دین ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے بلکہ اُس میں Perversion (پستی) آ جائے تو اُس Perversion (پستی) کی انتہا یہ ہے کہ اسے آدم کا مقام بھی نصیب نہیں ہوتا۔ تولید بھی نصیب نہیں ہے اور یہ اُس سے بلند ترین مقام بتاتے ہیں۔

تولید کے جذبے کی تسکین صرف حیوانی سطح زندگی ہے

اگر تولید بھی نہیں ہے تو وہ تو حیوانی زندگی بھی نہیں ہے۔ اور اگر زندگی میں تولید ہی تولید ہے تو حیوانی سطح کی زندگی ہے، یہ انسان کی زندگی تو ہے ہی نہیں۔ یہ جو موجودہ دور میں زندگی کا منتہٰی ہے وہ یہ ہے کہ صاحب! اللہ کا شکر ہے کہ بڑی اچھی زندگی گزاری، محنت کی، بی اے کیا، نوکر ہوئے اور اب بڑھاپے میں یہ صورت ہے کہ اللہ کا احسان ہے، بچے وغیرہ اپنے کاروبار کے ہو گئے ہیں، سب کچھ ٹھیک ہے، بس میں آخرت کے لیے کچھ اللہ اللہ بھی تو کر لوں اور یہ میں کر لیتا ہوں۔ یعنی کچھ بچے پیدا کر دیئے اور اُس کے بعد چلے گئے تو یہ اُن کے نزدیک زندگی کا منتہٰی ہے۔ یعنی میں نے جیسا اُس دن کہا تھا کہ پھر ایک بکری میں اور اس میں کیا فرق رہ گیا۔ وہ تو اس سے بھی زیادہ بچے پیدا کر دیتی ہے اور پھر مر جاتی ہے۔ یہ صرف تولید ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ (7:179) یہ جو لوگ ہیں، یہ حیوانی سطح پہ جی رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کا ماحصل یہ ہے جو آج کے دور میں زندگی کا منتہٰی گنا جاتا ہے۔ یعنی طبعی زندگی کے لیے کھانا پینا، آسائشیں، رہائشیں، یہ تو ہر حیوان کرتا ہے۔ اس کے بعد آگے Procreation (تولید) ہے یعنی اپنے جیسا پیدا کر دینا ہے۔ یہ

---

❶ اگر تم آدم نہیں بن سکتے تو خدا کی تلاش کیا!

Repetition (تکرار) ہے' یہ Cyclic Order (دائروی نظم) ہے کہ اسی دائرے میں زندگی گزر جائے' یہ تولید ہے۔

تولید آج کے دور کے انسان کی زندگی کا منتہیٰ ہے

آپ دیکھیں گے کہ اس دور کے انسان نے اس تولید کو زندگی کا منتہیٰ بنایا ہوا ہے' انہوں نے زندگی کے مقاصد کا یہ منتہیٰ ٹھہرایا ہوا ہے۔ اور وہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اُس نے کہا تھا کہ **کَالْاَنْعَامِ** (7:179) اور اُس کے بعد کہا کہ **بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179) یہ تولید کی زندگی بھی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی گئی گزری ہے۔ یہ آ گئی مذہب اور تصوف کی زندگی جسے میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ یہ **اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ** (95:5) ہے۔ وہ اسفل تو حیوان ہوئے لیکن یہ اُن سے بھی گیا گزرا ہوا ہے یعنی پتھر کی زندگی ہے۔ اب میں اس زندگی پہ آ جاتا ہوں جہاں کم از کم تولید کی زندگی یا Procreation کی زندگی تو ہمارے اس دور کا منتہیٰ ہے۔

مادہ پرستی کی مزید وضاحت

عزیزانِ من! جسے یہ مادہ پرستی (Materialism) کہتے ہیں' ذہن میں نہیں آتا کہ یہ کیا بات ہوئی' یہ کیا ہیں' مادہ پرستی کے کیا معنی ہیں' مادہ پرست کون ہیں' کون سانس کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے' کون پانی پینے کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے' کون نہیں کھانا کھاتا؟ یہی تو مادی چیزیں ہیں۔ آپ کے ہاں بڑے سے بڑے روحانیت کے جو مدعی ہیں' وہ بھی سانس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے' کھانا پینا تو ان کو بھی پڑتا ہے۔ مادہ پرستی تو یہ ہے۔ کیا یہ مادہ پرستی نہیں ہے؟ مادہ پرستی یہ ہے کہ حیوانی سطح زندگی کے اوپر مطمئن ہو کے بیٹھ جانا کہ صرف Procreation (تولید) کی زندگی ہو۔ Procreation (تولید) میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ جی ٹھیک ہے' بچے پیدا کیے ہیں تو ان کی پرورش ہمارے ذمے ہے۔ وہ تو بکری کے ذمے بھی ہوتی ہے' چڑیا کے ذمے بھی ہوتی ہے۔ **ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ** (95:5)۔ وہ کہتے ہیں کہ بھئی! ہم تو اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں۔ اور منتہیٰ حیوانیت کی زندگی ہوئی' تولید کی زندگی ہوئی۔ اتنے میں خدائی صفت تو نہ آئی۔ خدا نے تو کہا تھا کہ تولید ہمارے لیے نہیں ہے' اُس نے تو تخلیق کہا تھا۔ اس کے بعد جو تخلیق ہے یعنی جو Creation ہے تو یہ ہے انسانیت کی سطح۔ یہاں سے انسانیت شروع ہوتی ہے۔

انسانی زندگی کا مقصد اور اس کی تکمیل کا ذریعہ تخلیقی ہے' تولیدی نہیں

تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ تولید سے بلند زندگی کا کوئی مقصد سامنے ہو۔ روپیہ پیسہ جمع کرنا' کاروبار کرنا وغیرہ' یہ تو سارا تولید کے اندر آتا ہے کہ آپ نے اپنے لیے اور بچوں کے لیے یہ جو مادی سامان وسائل ہیں وہ کیسے حاصل کرنے ہیں' کیسے ان کو پورا کرنا ہے۔ یہ تو ساری تولیدی زندگی ہے' حیوانی زندگی ہے۔ اس سے بلند مقصد کیا ہے؟ پہلی چیز یہ ہے کہ جو Purpose of Life

(مقصدِ حیات) ہے' وہ تولیدی زندگی سے بلند ہے یعنی تخلیقی زندگی ہے۔ اُس کے لیے آرزو' مدعا' مقصد سامنے ہونا چاہیے۔ حیوانی زندگی میں آرزو اور مقصد نہیں ہوتا' محض طبعی زندگی ہوتی ہے' جو طبعی قوانین کے تابع ہوتی چلی جاتی ہے۔ انسان کی زندگی کا مقصد تولیدی زندگی سے اونچا ہے۔ اس کے لیے پہلے دل میں ایک آرزو پیدا ہوتی ہے' ایک مدعا پیدا ہوتا ہے' ایک مقصد پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی لیے اقبالؒ (1938-1877) نے تخلیق کے لیے کہا ہے کہ

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم

انسانیت کی سطح کی زندگی تخلیق کے مقاصد سے ہوتی ہے۔ جو Purpose of Life (مقصدِ حیات) ہے وہ تخلیق کرنا ہے۔ یہ جو ہمارے تولیدی زندگی کا Purpose (مقصد) ہے تو یہ ہمارا تخلیق کیا ہوا نہیں ہے' یہ ہم نے کہیں بیٹھ کر کارخانے میں نہیں بنایا تھا کہ ہم ہوا سے زندہ رہیں گے۔ یہ ہماری تخلیق نہیں ہے۔

ماز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم ❶
ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست! ❷

جس میں قوتِ تخلیق نہیں ہے' وہ میرے نزدیک کافر و زندیق ہے۔ نظر آئے گا کہ بڑا متشدد ہو گیا ہے۔ یہ متشدد نہیں ہو گیا۔ اگر تخلیق نہیں ہے تو تولید کی زندگی ہے۔ یہ تو حیوانی سطح ہے' وہاں ایمان تو ہوتا ہی نہیں ہے' اسے کہا ہے کہ حیوانی سطح حیات پر قوتِ تخلیق نہیں ہے۔ پہلے دیکھیے کہ پھر وہ ہے کیا؟ اُس کی زندگی Procreation (تولید) کے Level (سطح) کی ہے' حیوان کے Level (سطح) کی ہے' تولیدی Level (سطح) کی رہ گئی ہے۔ اور کافر کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ يَتَمَتَّعُونَ وَيَاْكُلُونَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12)

---

❶ ہماری زندگی تخلیقِ مقاصد سے ہے۔ اگر ہم کسی مقصد کو اپنے سامنے نہیں رکھتے اور نئے نئے مقاصد کو پیدا نہیں کرتے تو ہم زندہ نہیں ہیں۔ یہ تو ہے ہماری زندگی کا راز' یعنی تخلیقِ مقاصد۔ باقی رہا اس زندگی میں درخشندگی اور تابندگی کا پیدا ہونا' تو وہ شعاعِ آرزو کے صدقے میں ملتی ہے۔ مختصراً یہ کہ اس آب و گِل کے پیکر میں زندگی کی نمود تخلیقِ مقاصد سے ہوتی ہے اور پھر اس زندگی میں حرارت اور نورانیت اس مقصد کے حصول کی تڑپ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو آرزو کہتے ہیں (پرویزؒ: مجلسِ اقبال' طلوعِ اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1996ء ص۔95)۔

❷ جس کسی میں تخلیق کی قوت نہیں وہ ہمارے نزدیک کافر اور زندیق کے سوا کچھ نہیں (اقبالؒ: جاوید نامہ' ندائے جمال)۔ شیخ محمد بشیر اینڈ سنز' لاہور' ص۔275)

ان کی زندگی کھانے پینے کی زندگی ہے' ایسے ہی ہے جیسے حیوان کی زندگی ہے۔ وہ حیوان کی طرح کھاتے پیتے ہیں اور سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ کفر کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ حیوان کی سطح کی زندگی ہے' تولیدی سطح کی زندگی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کفر ہے۔ اقبالؒ نے اگر یہ کہہ دیا ہے کہ

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست!

یہ تو قرآن کی آیت کا ترجمہ کر گیا ہے۔

مومن کی زندگی صبغت اللہ کے مفہوم میں ہے

آج پتہ چلا کہ قرآن کی رو سے کافر کس کو کہتے ہیں؟ وہ کہ جس کے نزدیک زندگی **يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ** (47:12) حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ یعنی صرف کھانا پینا' بچے پیدا کر دینا اور مر جانا' جس میں تخلیق نہیں ہے۔ انسانیت کی زندگی تو خدا کے رنگ میں رنگے جانے والی بات ہے' یہ صبغت اللہ ہے' یہ صفاتِ خداوندی کا' حدِّ بشریت کے اندر اپنے اندر' پیدا کر لینا ہے۔ یہ ہے ایمان کی زندگی' مومن کی زندگی' مسلمان کی زندگی۔ اور خدا کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہاں تولید تو ہے ہی نہیں' وہاں تو تخلیق ہی ہے۔ اس لیے اگر اس میں تخلیق نہیں آتی ہے تو پھر اس میں ایمان اور کفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بکری نہ مومن ہوتی ہے اور نہ کافر ہوتی ہے۔ اور اگر آپ ایمان کی شرط لگائیں تو پھر تو وہ مومن ہوتی ہی نہیں ہے' نہ ہی شیر مومن ہوتا ہے۔ لہٰذا جسے آج کی مادہ پرستی کی زندگی کہتے ہیں' اس میں انسان خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے' اُس میں بڑی لذت لیتا ہے' یہ افیون ہوتی ہے۔ وہ ان الفاظ کے معنی متعین نہیں کرتا کہ کیا بات ہوئی۔ جسے دیکھیے سب ان میں سے کہیں گے کہ جی! یہ مادہ پرست ہے' سارا یورپ مادہ پرستی میں گھرا ہوا ہے۔ ارے میاں! ذرا بات کرو' سمجھاؤ تو سہی کہ یہ مادہ پرستی ہوتی کیا ہے۔ میں نے جو عرض کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ مادہ پرستی ہوتی ہے' جو محض طبعی زندگی' تولیدی سطح کی زندگی' حیوان کی زندگی ہے۔ یہ ہے مادہ پرستی۔ **كَالْاَنْعَامِ** میں تو ہم آ گئے جو قرآن نے کہا ہے کہ تخلیق نہیں ہے تو **كَالْاَنْعَامِ** ہے۔ اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اگر تولید بھی نہیں ہے تو **بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179) ہے۔

عزیزانِ من! میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اس قسم کے مقامات مشکل ہیں اور شاید یہ پہلی دفعہ سامنے آ رہے ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اگر تخلیقی زندگی نہیں ہے تو حیوانی زندگی ہے' وہ انسانی زندگی نہیں ہے۔ اور اگر تولیدی زندگی بھی نہیں ہے تو پھر **بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179) ہے' **اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ** (95:5) ہے۔ ایک تو میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ وہ جسے ہم روحانیت کی زندگی کہتے ہیں' وہ تو

خیر خود چھوڑ دینے والی چیز ہے۔

قرآنِ حکیم میں داستان قومِ لوط کو بیان کرنے کا مقصد

اس دور میں خاص طور پہ یہ بات آئی ہے اور میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن نے حضرتِ لوطؑ کی قوم کی زندگی کو اتنی نمایاں حیثیت سے کیوں پیش کیا ہے۔غور سے سنیے گا۔اگر جنسی اختلاط ہو اور اُس میں پھر مقصد تولید نہ ہو تو یہ **اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ** (95:5) ہو گیا۔ بچے پیدا کر دینا تو حیوانی زندگی ہے یعنی تولیدی زندگی ہے۔انسان کی تو وہ بھی نہیں ہے کیونکہ اُس میں تخلیق نہیں ہے۔میری بیٹیاں اور بہنیں معاف کریں کہ وہ بات مجھے کہنا پڑتی ہے۔اگر جنسی اختلاط ہے اور مقصد تولید نہیں ہے تو حیوان سے پست درجے پہ چلا جاتا ہے۔اور یہاں آ گئے ہم اس چیز پہ کہ زنا اسے کہتے ہیں کہ جنسی اختلاط تو ہو لیکن اُس سے مقصد تولید نہ ہو۔اب بات سمجھ میں آئی کہ قرآنِ کریم نے اس کو اتنا سنگین جرم کیوں قرار دیا ہے۔یہ زندگی حیوانی سطح سے بھی پست زندگی ہے۔انسانیت کی عدالت میں یہ سنگین ترین جرم کیوں نہ قرار پائے۔خدا کی صفت تو ایک طرف چھوڑ دی کہ تخلیق نہیں ہے' عزیزانِ من! خدا کی صفت تو اُس وقت آئے گی جب تخلیق ہوگی۔پھر دہرادوں کہ

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

زنا کی تعریف (Definition)

خدا کی زندگی چھوڑ کر جب تولید کے اوپر آئیں گے تو وہ حیوانی زندگی ہے اور ان کی صورت **كَالْاَنْعَامِ** کی ہے۔قرآن کہتا ہے کہ ان میں سے **بَلْ هُمْ اَضَلُّ** ہیں۔حیوانی سطح تک جو جنسیت ہے تو وہ اُس کی لذت بازی کو تو پورا کرتے ہیں' اس سے مقصد Procreation (تولید) بھی نہیں ہوتا۔اسے Definition میں زنا کہتے ہیں۔زنا میں مرد اور عورت کبھی اس مقصد کے لیے جمع نہیں ہوتے کہ ہم بچہ پیدا کریں گے۔تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اس سے ہوتا کیا ہے؟ Character (کردار) کسے کہتے ہیں؟ اسے کہ اپنے جذبات کے اوپر کسی قسم کی کوئی حد مقرر نہ کرنا' قید مقرر نہ کرنا' پابندی مقرر نہ کرنا بلکہ اپنے جذبات کو بلا حدود و قیود پورے کرتے چلے جانا اور ان کی تسکین کے سامان بہم پہنچاتے چلے جانا۔یہ ہے عدمِ کیریکٹر۔

پُرامن شہری بننا اور بات ہے' با کیریکٹر ہونا اور بات

آگے بات ہوگی کہ اگر سوسائٹی نے کوئی حدود مقرر کی ہوئی ہیں تو اُس کو بھی کیریکٹر نہیں کہیں گے' اُسے آپ قانون کی پابندی کہیں گے۔یہ کہ آپ بائیں ہاتھ پہ جاتے ہیں اور دائیں پہ نہیں جاتے ہیں تو یہ کیریکٹر نہیں ہے حالانکہ آپ کا اگر جی چاہتا ہے دائیں کی طرف

جانے کو تو بہر حال آپ نے بھی تو یہ چیز اپنی مرضی کے مطابق کی ہے۔ یہ کیریکٹر نہیں ہے کہ آپ بائیں کی طرف جاتے ہیں۔ یہ ہماری جو تمدنی زندگی ہے' اُس زندگی کے کچھ قواعد ہیں اور آپ ان قواعد کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر نہیں کرتے ہیں تو کچھ طبعی زندگی میں نقصان ہوتا ہے' اُس کی سزا ملتی ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں کی طبعی زندگی کی حکومتیں ہیں' جو عام دنیاوی حکومتیں ہیں تو ایک شخص ان کے تمام قوانین کی اطاعت کرتا ہے اور پُرامن زندگی بسر کرتا ہے تو وہ بھی صاحبِ کیریکٹر نہیں ہوتا۔ اُسے آپ پرامن شہری کہتے ہیں۔

انسانی خودی کو مستحکم کرنے کا راز اور اس کا ماحصل

کیریکٹر وہاں سے شروع ہوتا ہے کہ آپ کے جذبات کا تقاضا کچھ ہو اور آپ نے کچھ اور حدود و قیود یا خود مقرر کی ہیں یا جنہیں خدا کی اقدار کہتے ہیں' تو آپ اپنے اختیار و ارادے سے' اپنے ان جذبات کو ان حدود کے اندر رکھتے ہیں۔ یہ کیریکٹر کہلاتا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ ایک طرف تو آپ کے اپنے ہی جذبات ہیں جو اتنی شدت اختیار کر رہے ہیں' اُس کے بعد آپ کو اپنے اختیار سے ان کو حدود کے اندر رکھنا ہے۔ اسے کیریکٹر کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے تمہاری خودی کا استحکام ہوتا ہے۔ خودی اور اُس کے استحکام کے کیا معنی ہوئے؟ یہ تمہارے ہاں اپنے اندر قوت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے کہ یہ جو اس قسم کے بیباک جذبات تمہارے اندر ابھرتے ہیں تو تم ان پہ قابو پا لیتے ہو' تمہیں اس کے بعد کچھ دقت نہیں ہوتی۔ یہ تمہارے ہاں کی ایک فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے کہ تم ان کے اوپر بغیر کسی قسم کی گرانی محسوس کیے ہوئے کنٹرول کر لیتے ہو۔ اسے مستحکم خودی کہتے ہیں۔ ہر وہ مقام جہاں جذبات کی شدت کا تقاضا کچھ اور ہو اور اُسے آپ اپنے اختیار و ارادہ سے ان حدود کے اندر رکھیں' یہ ہوتا ہے جس سے خودی کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں تزکیہ نفس کہا جاتا ہے۔ نشو و نما یافتہ خودی مستحکم ہوتی ہے اور اُس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ پھر اُس کو اس قسم کے جذبات کے اوپر کنٹرول رکھنے میں کوئی دقت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ایسا مضبوط بند بن جاتا ہے کہ کوئی سیلاب اُس کو توڑ نہیں سکتا۔ انسانی جذبات میں سب سے زیادہ قوی' طاقتور' شدید جذبہ جنسیت کا ہے۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہاں پہنچنے کے بعد ایک عجیب مسئلہ سامنے آتا ہے۔

عزیزانِ من! جنسیت کا جذبہ حیوان کی زندگی میں اور انسان کی زندگی میں بڑا مختلف ہے۔ مقصد تو دونوں کا تولید ہے لیکن اس جذبے کے اندر بڑا فرق ہے۔ حیوان اس کو از خود بیدار کر ہی نہیں سکتا۔ اُس بیل کے اندر اس جذبے کی پوری قوت ہوتی ہے' وہ سارا سال گائیوں کے گلے میں پھرتا رہتا ہے۔ اور جب Mating Season (جفتی رُت) آتا ہے تو اُس کو اپنے پہ بھی اختیار نہیں رہتا۔ وہ جو (مرزا اسداللہ خاں) غالب (1797-1869) کہتا ہے کہ

عشق پر زور نہیں' ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

اس بیل کے جذبے کو فطرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس کا جو لیور ہے' جسے Safety Valve (حفاظتی والو) کہتے ہیں' وہ فطرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اُنہیں اس چیز کا اختیار نہیں ہے۔ اگر انہیں اس کا اختیار دیدیا جاتا تو اُن کی Population (آبادی) تو پھر Planning (منصوبہ بندی) کے مطابق نہ ہوتی۔ پھر تو پوچھو ہی نہیں کہ "تہاڈے ساڈے لئی تے کھان پین ای کجھ نہ رہندا[1]" یعنی وہ جب جی چاہتے مزید پیدا کرتے چلے جاتے تو سوچیے تو سہی کہ اس کرۂ ارض کا پھر کیا بنتا۔ یہ حضرتِ انسان' جو یوں کہنے کو تو پھنے خاں ہے' یہ کم بخت کمزور ترین ہے۔ شیر اس سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہے' شیر اس کو پنجہ مار سکتا ہے' یا عقاب اس سے زیادہ تیز اڑ سکتا ہے' مچھلی زیادہ تیر سکتی ہے۔ یہ تو دو میل میں تھک جاتا ہے۔ پوچھیے ہرن سے کہ سارا دن چلتا رہتا ہے' پوچھیے کبوتر سے کہ جو سارا دن اڑتا رہتا ہے۔

انسان کی آزادی کو برقرار رکھنا شرف انسانیت ہے

اگر کیفیت یہ ہوتی کہ فطرت کا جو Safety Valve (حفاظتی صمام) ہے' وہ نہ ہوتا یعنی فطرت اُس کی پلاننگ اپنے ہاتھ میں نہ رکھتی تو انسان کے لیے جگہ ہی نہ رہتی لیکن انسان کے معاملے میں یہ ہے کہ اُس میں شرفِ انسانیت ہے' وہ اس کی آزادی کو برقرار رکھتا ہے۔ عزیزانِ من! جو قدم انسانیت کی آزادی کو مقید کرنے کے لیے ہوگا تو بارگاہِ الٰہی میں سنگین ترین جرم ہے۔ فطرت نے بھی انسان کے اوپر یہ نہیں کیا۔ انسان کے اختیار کے اوپر اُس نے خود جبر نہیں کیا' اُس نے زنجیریں نہیں پہنائیں' اُس نے قید خانہ نہیں بنایا۔ اُس نے کہا ہے کہ تم خود یہ اپنے اوپر عائد کرو گے' اسی کا نام انسانیت ہے۔ جبر سے اگر کوئی چیز آپ اس سے منواتے ہیں تو اول تو اس کا سوال ہی نہیں ہے۔

پری رو تاب ِ مستوری ندارند

جن کو تم چھپا کے رکھنا چاہتے ہو تو وہ نہیں چھپتے۔

چوں در بندی زِ روزن سر برآرند

تُو دروازہ بند کر دے تو یہ روشندان میں سے منہ نکال لیں گے۔ اگر آزادیوں کے صحیح طریقے بند کر دیجیے تو Perversion (بدنہادی) کے طریقوں سے وہ چیز اپنے راستے نکال لیتی ہے۔ بہرحال' فطرت نے انسان کے اوپر' انسان کے شرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے' اس کی آزادی کے اوپر خود پابندی عائد نہیں کی۔ فرشتے اس کے سامنے جھکے تھے' یہ ان کے سامنے نہیں جھکا تھا۔ اس کے اختیار کے اوپر اُس نے پابندی نہیں عائد کی۔ اب یہ اختیار ہے اس کا کہ یہ جو جنسیت کا جذبہ ہے یہ از خود بیدار نہیں ہوتا۔ وہ جو حیوانی سطح کے جذبے ہیں کہ کھانا پینا' سانس لینا' بھوک لگنا وغیرہ' یہ تمام اُسی طرح سے از خود اندر بیدار ہوتے ہیں۔ اُس پہ اس کے اختیار و ارادہ کا سوال نہیں ہے'

---

[1] ہمارے آپ کے لیے تو کھانے پینے کو کچھ بھی تو نہ رہتا۔

یہ نہیں ہے کہ یہ اگر چاہے تو پیاس لگے اور چاہے تو پیاس نہ لگے۔ پیاس لگے تو پھر اُس کے بعد پانی پیے اور نہ بھی پیے تو پیاس بجھ جائے۔ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ وہ جو طبعی زندگی کی سطح ہے، وہ حیوانی سطح کی زندگی ہے، اُس میں یہ از خود ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ان کے اندر چونکہ یہ از خود ہوتا ہے کہ بھوک لگتی ہے، اس کا سسٹم ایسا بنا ہوا ہے کہ اسے بھوک لگے۔ بھوک لگتی ہے اور اگر کوئی چیز ایسی پڑی ہوئی ہے جس کے کھانے پہ کوئی پابندی نہیں تو اُسے کھائے تو ٹھیک ہے لیکن اگر اُس وقت ایسی چیز بھی ہے جس پہ پابندی ہے اور جسے کہتے ہیں کہ حرام ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی اجازت دیدی ہے کہ اُس وقت تم اتنا سا کھا سکتے ہو اس لیے کہ یہ بھوک لگنے میں اس کے اختیار کا کوئی ارادہ نہیں تھا، اس نے خود نہیں لگائی تھی۔

جنسیاتی جذبہ انسان کے اپنے جذبات کا ہی رہینِ منت ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ بڑا اہم سوال ہے کہ بھوک تو تیرا سسٹم لگائے، رزقِ حلال پہ معاشرہ اپنے دروازے بند کردے تو یہ کیا کرے گا؟ اُس نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہے کیونکہ تُو نے اپنے اختیار سے تو یہ نہیں لگائی تھی۔ ٹھیک ہے اس حد تک تمہیں اجازت ہے کہ تم یہ کرلو لیکن کھانے پینے کے مسئلے میں یہ چیز قرآن نے خود کہدی ہے کہ حرام کی اجازت ہے۔ جنسیت کے مسئلے کے اندر اُس نے یہ بات نہیں کہی۔ اس لیے کہ یہ بھوک اور پیاس کی طرح از خود اندر بیدار نہیں ہوتا۔ اُس کی یہ کیفیت ہے کہ پیاس لگی ہے اور کچھ وقت تک آپ پانی نہ پئیں تو اُس کے بعد انسان مرجاتا ہے۔ جنسیت کو تو بیدار بھی یہ خود اپنے اختیار وارادہ سے کرتا ہے، یہ اس کے خیالات کے تابع رہتا ہے۔ اور اُس کے بعد اسے یہ معذور نہیں قرار دیتا کہ کوئی بات نہیں اگر حلال راستہ نہیں ہے تو حرام اختیار کرلو۔ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ طبعی زندگی سے اُس کا تعلق نہیں ہے۔ یاد رکھیے! جنسیت ایک جذبہ ہے، یہ ایک Emotional (جذباتی) چیز ہے۔ ایک قسم کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور ایک طرف انسان کا اختیار ہے اور یہی اُس کی خودی کا تقاضا ہے۔ اس جذبے کو اگر وہ اپنے اختیار سے اِن حدود کے تابع رکھتا ہے تو یہ اس کا کردار ہے۔ اور اگر یہ اُس کو بیباک ہوجانے دیتا ہے تو یہ اس کی خودی کا ضُعف ہے۔

جنسیاتی بے راہ روی کا نتیجہ انسانی خودی کے ایک ایک جز کو متاثر کرتا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں زنا کے متعلق کہا ہے کہ اگر یہ روش کروگے تو اثـــــم ہے جس سے توانائیاں مضمحل ہوجاتی ہیں۔ تمہارے اختیار کی قوتیں، جذبات کو کنٹرول کرنے کی جو تمہاری قوتیں ہیں تو وہ کمزور ہوجائیں گی اگر تم نے اس جذبے کو بیباک چھوڑ دیا۔ یہ اسی ایک ایکشن کے اوپر بات نہیں ہے۔ پوری انسانی خودی کے اوپر اس کا اثر پڑتا ہے، انسان کی ذات پہ اس کا اثر پڑتا ہے۔ جو کنٹرول کرنے کی قوت ہے یہی تو انسانیت ہے، فطرت اُس کو کنٹرول نہیں کرتی بلکہ اس کو خود کنٹرول کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ کنٹرول والی قوتیں جتنی

کمزور پڑتی چلی جائیں گی کیریکٹر اتنا ہی پست ہوتا چلا جائے گا۔ یہ قوتیں جتنی زیادہ مستحکم ہوتی جائیں گی' یہ اتنا ہی انسانیت کی صف میں اونچا ہوتا چلا جائے گا۔ اس طرف سے جب یہ مطمئن ہو جائے گا' جب اس طرف خیال ہی نہیں آئے گا' کنٹرول کی قوت بڑی ہوگی تو تخلیق کی طرف خود آ جائے گا۔ یہ جو قرآنِ کریم میں زنا کی پہلی شکل ہے' جو عورت اور مرد کے اندر جنسی اختلاط کی ایسی شکل ہے جس میں Procreation (تولید) بھی نہیں ہے' تو وہ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ کا درجہ آ گیا۔ اور اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ کے درجے میں (ہم جنس پرستی) Homo Sexuality ہے۔ آپ کو حیوانات میں یہ بات کہیں نہیں ملے گی۔ کہا گیا ہے کہ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ (95:51) اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ (7:179) اور بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ (7:179)۔ قرآنِ کریم میں دیگر مقامات میں جسے زنا کہا ہے اُس کے خلاف اتنا کچھ کہا ہے لیکن یہ جو حضرتِ لوطؑ کا قصہ ہے تو قومِ لوط میں یہ چیز اس حد تک' Perversion (بدنہادی) کی حد تک پہنچ چکی ہوئی تھی۔ یہ قوم ❶ بحرمیّت (Dead Sea) کے کنارے آباد تھی۔ وہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ اس میں آتش فشاں پہاڑ ہوئے تو وہ ساری Dead Sea (بحرمیّت) ہوگئی' وہاں زندگی باقی نہ رہی۔ یہ قوم ایسی تھی۔ یہ جو وہاں ان کا دارالخلافہ سدوم (Sodom) ہے' اُس کے کھنڈرات وہاں موجود ہیں۔

قانونی طور پر جنسیاتی میدان میں مہذب ترین یورپین قوم کی حالتِ زار

آپ کو پتہ ہے کہ Sodomy کا لفظ وہیں Sodom (سدوم) سے نکلا ہے۔ خود ہمارے ہاں بھی' عربی میں بھی' فارسی میں بھی' اردو میں بھی' لواطت لوط سے ہی نکلا ہوا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ بتایا کہ حیوان کی سطح تو اتنی تھی کہ اُس میں تو صرف Procreation (تولید) تھی۔ تم اِس سطح کے اوپر پہنچ جاتے ہو کہ اُس میں Procreation (تولید) بھی باقی نہیں رہتی۔ زندگی کا مقصد ہی جذبات کی تسکین رہ جاتا ہے۔ انسانی سطح تو بڑی اونچی بات رہی' حیوانی سطح کا مقصد بھی باقی نہیں ہے۔ اب اس کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آئے گی۔ اس سے پہلے ذہن میں نہیں آتا تھا اور کہتے تھے کہ ٹھیک ہے کہ گزری ہوئی قوم کا ایک واقعہ ہے اور قرآن بیان کرتا ہے۔

---

❶ یمن سے بحراحمر (Red Sea) کے کنارے کنارے ایک قدیمی تجارتی قافلوں کی سڑک حجاز و مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے۔ سدوم (Sodom) کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی۔ قرآنِ کریم نے اس شاہراہ کو اِمام مبین (15:79) کہا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ یہ علاقہ بحرمیّت (Dead Sea) کے قریب تھا۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت سا حصہ سمندر کے نیچے آ گیا...... قرآنِ کریم نے قومِ لوط کی جن بستیوں (سدوم اور عمارہ وغیرہ) کی بربادی کا ذکر کیا ہے وہ بحرمیّت (Dead Sea) کے اردگرد تھیں۔ دورِ حاضرہ کے اثری اور تاریخی اکتشافات سے اس کی تصدیق ہوتی جا رہی ہے۔ تفصیل کے لیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجز اینڈ ایتھکس میں سدوم (Sodom) اور بحرِ میّت (Dead Sea) کے عنوانات دیکھیے (حوالہ پرویزؒ: جوئے نور' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994 ص ص۔ 188-187-211)۔

اس لیے کہ اس فعل کو کم از کم ساری دنیا میں ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا' قانوناً بھی جرم قرار پاتا تھا۔ اس وقت ساری دنیا میں حیوانی زندگی ہے۔ حیوان سے اونچی انسانی سطح کی زندگی کہیں نظر نہیں آتی۔

یہ جو عام حیوانی سطح کی زندگی چلی تو اُس میں بھی قانوناً اس چیز کو معیوب قرار دیا جاتا تھا' سوسائٹی میں بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اوپر جانے کے لیے تو انسان تھک جاتا ہے' قدم قدم جاتا ہے' پھر کوئی انتہا ہوتی ہے' نیچے گرنے کی تو انتہا ہی کوئی نہیں ہوتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ یورپ میں اور سب سے مہذب ترین قوم جو انگریزوں کی گنی جاتی ہے' ان کے ہاں غالباً 1967 یا 1968ء میں اس Sodomy کو قانوناً جائز قرار دے رکھا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (95:5)۔ وہ تو اگر صرف Procreation (تولید) ہی زندگی کا مقصد قرار دے لیا جائے تو وہ حیوان کی زندگی قرار دیتا تھا لیکن جب اُس نے اُس سے پست کہا تھا تو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ حیوان سے بھی پست کیا بات ہے؟ اب یہ بات سمجھ میں آ گئی۔ یہ دنیا کی مہذب ترین قومیں ہیں' وہ حیوانی سطح پہ تو صدیوں سے تھیں' اب اُس سے بھی نیچے کی سطح کے اوپر آ گئیں۔

یہ جنسیاتی سلسلہ تو پوری انسانیت کی زندگی کا معاملہ ہے' تمدنی نہیں ہے

عزیزانِ من! یہ ہے جنسیت کا مسئلہ۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے اس کو کیوں اتنی اہمیت دی ہے۔ یہ تمدنی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو انسانیت کی زندگی سے ہے' انسانیت کے مستقبل کی زندگی سے ہے جسے آخرت کی زندگی کہتے ہیں۔ وہ جو استحکامِ خودی ہے' اُس کا سب سے بڑا ٹیسٹ جنسیت کے اندر آ کر ہوتا ہے۔ اور یہ تو مستحکم خودی ہے جو اگلی زندگی کی اگلی منزلیں طے کرنے کے قابل ہوتی ہے' اس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے' ان مستحکم خودی کے افراد کو صالحین کہتے ہیں۔ اس لیے اُس نے اس معاملے کو اتنی اہمیت دی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ صرف سوسائٹی کا مسئلہ نہیں ہے کہ سوسائٹی جس قسم کے قوانین جی چاہے' بنا لے اور ان کی پابندی کے مطابق زندگی بسر کرے تو ٹھیک ہے۔ یہ سوسائٹی کا مسئلہ نہیں ہے' یہ انسانی ذات کا مسئلہ ہے' اُس کی خودی کا مسئلہ ہے' اس کے Future (آخرت) کا مسئلہ ہے' Future (آخرت) کی زندگی کا مسئلہ ہے اور بڑا اہم ہے کیونکہ جذبات میں جو شدید ترین جذبہ ہے' وہ جنسیت کا ہوتا ہے اور یہ وہ جذبہ ہے جس کو بیدار بھی انسان خود ہی کرتا ہے اور اُس کی Satisfaction (تسکین) کے لیے اسفل ترین درجے تک لے جاتا ہے۔ قرآن نے اس لیے اس کے متعلق اتنی تاکید کی ہے۔

جذباتی تسکین کے لیے خود ہماری اپنی حالت

میں بار بار یہ کہا کرتا ہوں کہ ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم نے تو کبھی اس کو اہمیت ہی نہیں دی۔ اس جذبے کی تسکین کے لیے ہم نے

جائز شکلیں اتنی قرار دے لیں۔ ہمارے ہاں تو جائز شکلیں پوچھیے نہیں کہ کتنی ہیں۔ یعنی وہ چار چار تو بیویاں ہی ہوتی ہیں اور اُن کی بھی یہ صورت نہیں ہے کہ چلو ایک دفعہ ہی چار ہو گئیں بلکہ صورت یہ ہے کہ جس طرح ہر سال وہ گاڑی پرانی ہو جاتی ہے اور نئی لے آتے ہیں' اسی طرح جب جی چاہے ان میں سے ایک کو ایک دو تین کیا اور اُس کے بعد وہ نئی آ گئی۔ اس شخص [1] نے اس مسئلے پہ بحث کی ہوئی ہے۔ یہ لوگ جب تحقیق میں جاتے ہیں تو پھر عجیب باتیں کرتے ہیں۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ آ ؤ میں تمہیں بتاؤں کہ ان کے ہاں کی جو Monogamy (وحدتِ زوج) ہے' یہ کہاں تک چلی جاتی ہے۔ اُس [2] نے کہا کہ میں ایک ترک سے ملا اور اُس سے میں نے پوچھا تو اُس نے کہا کہ صاحب! میری تو ایک ہی بیوی ہے۔ کہنے لگا کہ یہ الگ بات ہے کہ میں نے چالیس دفعہ الگ الگ نکاح کیا ہے' بیویاں تو میری چالیس ہی رہیں لیکن ایک وقت میں ایک ہی رہی۔ لونڈیوں کے متعلق یہ ہے کہ نہ ان کی تعداد پہ کوئی پابندی ہے' نہ کوئی نکاح کی پابندی ہے' نہ کوئی طلاق کا مسئلہ ہے۔ اور یہ ساری چیزیں جائز کی حد کے اندر لے آئے۔ وہ جو انسانی خودی کو جذبات کی تسکین کے لیے کچھ قوت اختیار کرنا پڑتی تھی' اپنے اختیار سے کنٹرول میں رکھنا پڑتا تھا تو وہ سارا قصہ ختم ہو گیا جب آپ نے اسے جائز قرار دے لیا۔ یہ اُس کے اوپر قانون کی پابندی بھی نہیں لگنے دیتے۔

لونڈیوں کے سلسلہ میں پاکستان پارلیمنٹ میں مولوی نعمت اللہ کا مطالبہ

آپ کو معلوم ہے کہ مولوی نعمت اللہ [3] نے وہ سوال اٹھایا تھا۔ جب یہ سوال آیا ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی پابندی ہو تو اُس نے کہا کہ اگر آپ یہ چیز کرتے ہیں تو کم از کم ایک ایک لونڈی رکھنے کی اجازت تو قانون کی رو سے دیدیجیے۔ یہ آپ کے پارلیمنٹ میں مولوی نعمت اللہ نے کہا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے پھر ہوتا کیا ہے؟ میں پھر عرض کردوں اور میں بار بار اسے دہرایا کرتا ہوں کہ اس کا اثر قوموں کے عروج و زوال سے ہے۔

---

[1] یہ اشارہ رابرٹ برفو (Robert Briffault) کی طرف ہے۔ اس کی یہ کتاب The Mothers ہے جس میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔

[2] Rober Briffalt

[3] جمعیت علمائے اسلام کے رکن۔ انہوں نے قومی اسمبلی مجلس دستور ساز کے 1973 کے اسپرنگ سیزن میں یہ سوال اٹھایا تھا۔ پاکستان ٹائمز کی یکم مارچ 1973 کی اشاعت میں یہ کارروائی شائع ہوئی تھی (حوالہ مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورہ النور' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007ص۔53)۔

مغرب کے محقق ڈاکٹر انون کی تحقیق

اس مسئلے میں اہلِ مغرب کے ہاں کے لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ Perversion (بدنہادی) میں یہاں تک بھی جاتے ہیں لیکن اُس کے ہاں جو سائنٹسٹ، محقق یا ریسرچ کرنے والے لوگ ہیں، وہ بھی کمال کر کے دکھا دیتے ہیں۔ میں بار بار انون[1] کا نام لیا کرتا ہوں۔ اس موضوع پہ میں نے بعد میں بھی کئی کتابیں دیکھی ہیں۔ قرآن کی وجہ سے مجھے دلچسپی ہے۔ ڈاکٹر انون نے اپنی پوری عمر اسی میں گزار دی۔ اس نے اسی (80) غیر مہذب قبائل کے اندر جا کر ان کی زندگی دیکھی کہ جہاں جنسیات کے اوپر جنہوں نے کچھ کنٹرول رکھا تھا تو ان کی زندگی کس قسم کی تھی اور جہاں کنٹرول نہیں تھا تو ان کی زندگی کیسی تھی۔ وہ افریقہ گیا، جنوبی امریکہ گیا، آسٹریلیا میں اور دنیا بھر میں گیا۔ پھر سولہ (16) مہذب قوموں کی زندگی کا اُس نے بتایا۔ صرف اس مسئلے پہ مطالعہ کیا کہ جنسیات کے اوپر جو کنٹرول نہیں رکھا جاتا تو انسانیت پہ اُس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ J.D.Unwin اُس کا نام تھا، اس کی کتاب کا نام Sex and Culture تھا، وہ کیمبرج یونیورسٹی کا ڈاکٹریٹ تھا، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس میں یہ کتاب (1934ء میں) چھپی تھی۔ یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ میں اُس کے ماحصل کو چند الفاظ میں بیان کرتا ہوں کہ وقت ذرا تھوڑا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا ماحصل یہ ہے کہ جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں، تو ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ قرآن نے اسے یلق اثاماً (25:68) کہا تھا کہ ان جذبات کو بیباک نہ چھوڑو، یاد رکھو! اس سے تمہاری قوتیں مضمحل ہو جائیں گی۔

جنسیاتی بدنہادی قوموں کے فکر و عمل کو مفلوج کر دیتی ہے

یہی کچھ (ڈاکٹر) انون اتنی تحقیقات کے بعد کہہ رہا ہے کہ اُن میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ رومیوں نے ایسا ہی کیا کہ وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ یہاں یہ غلطی کر گیا ہے کیونکہ حیوان تو یہ نہیں کرتا۔ اس پر تو فطرت کی طرف سے عائد کردہ حدود و قیود ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سوسائٹی نے بھی کوئی پابندی نہیں عائد کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے پاس کسی اور کام کے لیے توانائی باقی نہ رہی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان پست ترین زندگی بسر کر رہے ہیں، دنیا کی قوموں کے مقابلے میں ضعیف ترین ہیں، کمزور ترین ہیں، ذلیل ترین ہیں، محکوم ترین ہیں۔ ایک جنس کے مسئلے کے اوپر آپ تحقیق کر کے دیکھ لیجیے تو آپ یہاں پہنچ جائیں گے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش، تربیت Monogamy (وحدتِ زوج) کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔

---

[1] Unwin, J.D. (M.C.Ph.D. Cantab) (1934). Sex and Culture, London: Oxford University Press.

تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اُس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو۔ اُس نے کہا کہ جب مساوی حیثیت سے فریقین کا عقدِ نکاح عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو تو باقی ساری چیزیں تو آپ کے ہاں کہیں گے کہ عمر بھر کی بھی ہم کہتے ہیں اور طلاق سے ہی الگ ہوسکتی ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ بھی مساوی حیثیت سے ہو۔ اور یہاں ساری کوشش یہ ہے کہ عورت کو مرد کے برابر مساوی حیثیت نہ دی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ شرط ہے کہ عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا۔ تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس کا شاہد ہے کہ جن اقوام میں جنسی اسباب کی ان حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا' تو وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اُس بلندی تک پہنچ سکی تھیں کہ جہاں تک انسانیت اس وقت پہنچ سکی ہے۔ اب سمجھ میں آئے گا کہ قرآن نے کیوں اس پہ اتنا زور دیا ہے۔

یہ جنسیاتی مسئلہ صرف سوسائٹی کا تمدنی سلسلہ نہیں

یہ جنسی مسئلہ صرف سوسائٹی کا تمدنی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ تو انسانیت کے ارتقا کا مسئلہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو قوم جنسی اختلاط کو اس طرح سے بیباک کر دیتی ہے خواہ وہ اپنے لیے قانون مقرر کرلے' جیسے ہم نے بھی تو اپنے ہاں قانون مقرر کرلیا ہے کہ جتنی چاہے بیویاں کر لیجیے' جب چاہے بدل لیجیے' جتنی چاہے لونڈیاں رکھ لیجیے' سینیے اور اُس کے بعد اپنے آپ پہ نگاہ ڈالیے' وہ کہتا ہے کہ ''اس میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی''۔ قرآن کہتا ہے کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا (7:179) یہ وہ قوم ہے جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اُس سے کبھی کام نہیں لے سکتی۔ وہ واقعات یا اسباب وعلل یا Causes کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی بلکہ جو کچھ ہوتا ہے اُسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے دائرے میں اُن کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے کہ ''جو ہوتا چلا آ رہا ہے اُسی طرح سے کرتے چلے جاؤ''۔ سوچتے جایئے کہ یہ کن کی بات کر رہا ہے؟ یہ ہماری بات کر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ ہر وہ غیر معمولی واقعہ جو اُن کی سمجھ میں نہ آئے تو اُس کے اسباب کی تلاش کی تحقیق نہیں کرتی' وہ کہہ دیتی ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہوا ہے اور پھر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہے اس لیے کہ ان کے اندر قوتِ فکر مفقود ہو چکی ہوتی ہے۔

جنسیاتی مرض میں مبتلا قوم توہم پرستی کے گہرے سمندر میں غرق ہو جاتی ہے

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اُن میں توہم پرستیاں شروع ہو جاتی ہیں' قبر پرستی شروع ہو جاتی ہے' نذر نیاز شروع ہو جاتی ہے' تعویذ

اور گنڈا شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی صرف ایک مسئلے میں جنسی قیود کو توڑنے سے یہ اِس قوم کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ اس قسم کے معتقدات اُس قوم میں نسلاً بعدِ نسلاً متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانے کی روش کا اُن کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس معاشرے میں انسان پیدا ہوتے ہیں' اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منّسِیًا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ انسان نہیں ہوتے بلکہ حیوان ہوتے ہیں۔ اَوْلٰئِکَ کَـالْاَنْعَـامِ (7:179)۔ عزیزانِ من! ہم اس قرآن کو دبائے پھرتے ہیں۔ یہ دیکھیے کہ وہ اس ایک مسئلے کو لے کر کس نتیجے پہ پہنچ رہے ہیں۔

اس مرضِ کہن کا شافی علاج

آخر میں وہ اس کتاب کا خاتمہ ان الفاظ سے کرتا ہے کہ ''اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اُس کی تخلیقی توانائیاں ابدالآباد تک قائم رہیں اور آگے بڑھتی رہیں تو اُس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو مساوی حیثیت دے۔ اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن سے معاشرے میں جنسی اختلاط کے مواقع کم از کم حد تک محدود ہو جائیں۔ اس طرح اُس معاشرے کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقا کی طرف مڑ جائے گا' اُس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہونگی' وہ تمدن وتہذیب کے اُس مقام تک پہنچ جائے گی جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اور انسان کی توانائیاں اُس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطہء ادراک میں بھی نہیں آ سکتا[1]۔''

عزیزانِ من! یہ جنس (Sex) کا مسئلہ ہے اور یہ ہے تحقیق۔ اب سوچ لیجیے کہ قرآنِ کریم نے اس مسئلے کو اتنی اہمیت کیوں دی تھی۔

آج اسی تمہید پہ ہم ختم کرتے ہیں' اس کے بعد قرآن کی آیات قومِ لوطؑ کے متعلق آئیں گی۔ اس سے کم از کم یہ بات تو سمجھ میں آ گئی کہ قرآن اس کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



---

[1] جو قارئین ڈاکٹر انون کے اپنے الفاظ اور جملے دیکھنا چاہیں وہ اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں:
مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ المؤمنون' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص۔50 (فٹ نوٹ۔2)

دسواں باب: **العنکبوت** (آیات 29 تا 37)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1979ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز یوں سمجھیے کہ سورۃ العنکبوت کی آیت 29 سے ہوتا ہے:(29:29)۔

سابقہ درس کا خلاصہ

پچھلا درس (آیات 26 تا 28) جنسیات کے متعلق قرآنِ کریم کے حقائق اور پیغامات پر مشتمل تھا۔ یہ آیات ہم نے الگ الگ بھی لیں تھیں۔ اور اب بھی میں دیکھ رہا ہوں کہ ان آیات میں کوئی نکتہ ایسا نہیں ہے جس کی مزید وضاحت کی ضرورت ہو۔ یہ بات بھی پچھلے درس میں سامنے آ گئی تھی کہ جنسی بدنہادی کا تعلق محض تمدنی قوانین یا معاشرتی حالات سے نہیں بلکہ خود اہلِ مغرب کی تحقیق یہ ہے کہ

قوموں کے عروج و زوال کا بڑا گہرا تعلق ان کے جنسیاتی قواعد اور پابندیوں سے ہے۔ قرآن نے جو بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی اور چودہ سو تو یوں کہیے کہ اُس نے چودہ سو سال پہلے اُسے دہرایا تھا' اُس نے یہ بات کہی تو دو ہزار سال پہلے [1] تھی۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ یہ ایک انفرادی فعل کا نام نہیں ہے' نہ یہ تمہارا تمدنی مسئلہ ہے کہ تمہاری قوم یا سوسائٹی مل بیٹھ کر جس قسم کے قواعد مرتب کرے اُس کے مطابق چلے۔ یہ بات ایسی نہیں ہے۔ عصمت کا قوموں کے عروج و زوال سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

عزیزانِ من! (ڈاکٹر) انون نے کہا تھا کہ کوئی قوم جو اس معاملے میں ان پابندیوں میں ذرا ڈھیل پیدا کرتی ہے تو زیادہ سے زیادہ وہ قوم تین نسلوں تک زندہ رہ سکتی ہے۔ اُس کے ذہنی قوائے عملیہ میں تو اُسی وقت سے انحطاط آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اسے قرآن نے اثم کہا تھا' یہ اُس کا بالکل صحیح ترجمہ ہے اور آہستہ آہستہ اس اضمحلال کے تین Generations (نسلوں) کے بعد' وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ خدا نے کہا ہے کہ ہمارا عذاب آ جائے گا اور اُس کے بعد تم اُس عذاب کو برداشت نہیں کر سکو گے۔ ہمارے ذہنوں میں تو اب عذاب اور ثواب وغیرہ کے یہ تصورات کچھ الگ سے ہی آ گئے ہیں۔ قوموں کی تباہی' قوموں کا زوال عذاب ہے' یہ غلط روشِ زندگی کا نتیجہ ہے۔ تباہ کُن نتیجہ ہو تو اُسے عذاب کہا جائے گا' تعمیری نتیجہ ہو تو اُسے ثواب کہا جائے گا۔ قرآنِ کریم نے یہ بات دو ہزار سال سے بھی پہلے کہی ہے اور آج اہلِ مغرب جو وحی کی پابندیوں کے قائل نہیں ہیں' جنہوں نے ان چیزوں کو قرآن میں نہیں دیکھا ہے' نے آزادانہ تحقیق کی ہے اور اُس تحقیق کے بعد وہ حرفاً حرفاً اُس نتیجے پہ پہنچے ہیں جو قرآنِ کریم اتنا عرصہ پہلے واضح کر چکا ہے کہ یاد رکھو! اس طرح سے قوم تباہ ہو جائے گی۔ یہ ہے جسے خدا کا عذاب کہا گیا ہے۔

یہ بات پچھلے درس میں پوری وضاحت سے سامنے آ گئی تھی اس لیے یہ جو آیات [2] اب ہمارے سامنے آتی ہیں تو ان میں کوئی مزید ایسا نکتہ نہیں ہے جو وضاحت طلب ہو۔ یوں سمجھیے کہ اس درس کا آغاز اس سورۃ کی 29 [2] ویں آیت سے ہو رہا ہے۔

---

[1] یاد رکھیے کہ تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے حضرت لوط علیہ السلام کا زمانہ کوئی 2 ہزار سال ق م کے لگ بھگ کا ہے۔

[2] وہ اگلی آیات یہ ہیں کہ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (29:29) تمہاری حالت یہ ہے کہ تم جنسی جذبہ کی تسکین کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو (7:80-81) اور اس طرح اس راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائش نسل کے لیے تجویز کیا ہے۔ نیز تم اپنی مجلسوں میں نازیبا حرکتیں کرتے ہو۔ اس کی قوم کے پاس اس کی ان باتوں کا جواب کچھ نہیں تھا' بجز اس کے کہ انہوں نے کہا اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو (کہ ہماری اس روش سے خدا کا عذاب آ جائے گا) تو اس عذاب کو لا کر دکھاؤ۔ اس پر قرآن بتاتا ہے کہ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ (29:30) لوطؑ نے اپنے رب سے عرض کیا کہ بار الٰہا! مفسدین کی اس قوم کا مقابلہ کرنے میں' تو میری مدد فرما۔ اسی واقعہ کی ایک کڑی اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (29:31) جب ہمارے فرستادہ ابراہیمؑ کے پاس (بیٹے کی) خوشخبری لے کر پہنچے تو انہوں نے ابراہیمؑ سے کہا کہ ہم لوطؑ کی بستی کو تباہ کرنے کے لیے مامور ہیں۔ انہوں نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ (ماخوذ از پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 916-917)

حضرت لوطؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں دو فرستادگان کے ذکر کی نوعیت

عزیزانِ من! اب دو باتیں آتی ہیں۔ یہ حضرتِ لوطؑ کی طرف اللہ کے فرستادگان کے جانے (29:31-33) کے متعلق دو باتیں ایسی ہیں جن کا تعلق میں سمجھتا ہوں کہ نبوت سے ہی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ پہلے حضرتِ ابراہیمؑ کے پاس آتے ہیں اور اُنہیں ایک بیٹے کی بشارت دیتے ہیں (11:69-73;15:51-56;29:31;51:24-30)۔ وہؑ اُن سے پوچھتے ہیں کہ اصل میں تمہارا ارادہ کہاں کا ہے، آئے کاہے کے لیے ہو؟ وہ بتاتے ہیں کہ ہم قومِ لوطؑ کی طرف جا رہے ہیں اور اُنہیں وارننگ دے رہے ہیں اور انہیں بتا رہے ہیں کہ ان کی بے راہروی اس مقام تک پہنچ چکی ہے کہ اگر اُنہوں نے اصلاح نہ کی تو وہ تباہ ہو جائیں گے [1] (29:32-33)۔

میں نے جیسا عرض کیا تھا کہ حضرتِ ابراہیمؑ چچا تھا اور حضرت لوطؑ بھتیجا تھے اور وہ اکٹھے ہی وہاں (بابل) سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ حضرتِ ابراہیمؑ تو فلسطین اور شام کی وادیوں میں Settle (سکونت پذیر) ہو گئے۔ اور حضرت لوطؑ اس مقام پہ گئے جسے آج آپ Dead Sea (بحرمیّت) کہتے ہیں، یہ اُسی زمانے کی تباہ ہوئی ہے۔ آتش فشاں پہاڑ سے گندھک وغیرہ کا لاوا نکلا تھا اور اُس کی وجہ سے یہ جسے آپ جھیل کہتے ہیں وہ بھی اُس زمانے سے بالکل گندھک آلودہ ہے وہاں کوئی زندگی نہیں ہے۔ اور اُس کے اردگرد یہ سارے کے سارے علاقے پتھر ہو چکے ہوئے تھے۔ جسے سدوم کہتے ہیں، یہ وہ علاقہ ہے۔

پہلے یہ دیکھیے کہ یہ جو خدا کے فرستادگان ہیں انہیں قرآن نے رسلنا (11:69-73;29:31) کہا ہے کہ ہماری طرف سے بھیجے گئے تھے۔ حضرتِ ابراہیمؑ کے پاس آتے ہیں اور اُنہیں بیٹے کی بشارت دیتے ہیں اور پھر وہ کہتے ہیں کہ ہم قومِ لوطؑ کی طرف جا رہے ہیں اور اُنہیں ان کی تباہی کی وارننگ دیں گے (11:69-73;15:51-56;51:24-30)۔ اب یہ جو بات ہے کہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اس کا تعلق نبوت کے احاطہ سے ہے اور ہم اسے اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے کہ حضرتِ ابراہیم ◆ بھی نبی ہیں

---

[1] قَالَ اِنَّ فِیۡهَا لُوۡطًا ؕ قَالُوۡا نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِیۡهَا لَنُنَجِّیَنَّهٗ وَ اَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۫ کَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ (29:32) ابراہیمؑ نے کہا کہ اس بستی میں خود لوطؑ بھی آباد ہے۔ (کیا بستی والوں کے ساتھ اسے بھی ہلاک کر دیا جائے گا؟) انہوں نے کہا کہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہاں کون کون آباد ہے۔ ہم لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس تباہی سے محفوظ رکھیں گے۔ البتہ اس کی بیوی اس سے محفوظ نہیں رہے گی کیونکہ وہ ان سرکش لوگوں کی پارٹی میں شامل ہے۔ وَ لَمَّاۤ اَنۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَ ضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ وَ لَا تَحۡزَنۡ ۟ اِنَّا مُنَجُّوۡکَ وَ اَهۡلَکَ اِلَّا امۡرَاَتَکَ کَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ (29:32) جب ہمارے فرستادگان لوطؑ کے پاس آئے تو وہ بستی والوں کی روش بد اور ان کے مقابلہ میں اپنی بے بسی کے خیال سے افسردہ خاطر ہوا (کہ نہ معلوم وہ کمبخت ان کے ساتھ کیا سلوک کریں) ان فرستادگان نے لوطؑ کی اس پریشانی کو محسوس کیا تو کہا کہ تمہیں ہمارے لیے خوف زدہ یا غمگین ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 917)۔

اور حضرتِ لوطؑ بھی نبی ہیں' ان پہ وحی آتی ہے لیکن خدا اپنے فرستادگان کو بھیج رہا ہے اور وہ پہلے آکر انہیں بشارت دیتے ہیں۔ بشارت تو وہ خدا ہی کی طرف سے دے سکتے تھے۔ تو یہ بات ہے کہ ان کی طرف جو خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں ایک نبی کو بشارت دلائی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ کہا ہے کہ یہ فرشتے آئے تھے اور انہوں نے یہ بشارت دی تھی۔ فرشتہ تو ہر نبی پر وحی لے کر آتا ہے تو پھر یہ کہنے کے لیے یہ فرستادگان کا ہے کے لیے آئے؟ فرشتوں کی تو بات ہی نہیں ہے کیونکہ حضرتِ ابراہیمؑ نے تو ان سے آتے ہی کہا تھا کہ سَلٰمًا (11:69;15:52;51:25) بیٹھیے' تشریف رکھیے اور کھانا کھا کر جایئے۔ وہ تو ان فرشتوں کے لیے کھانا پکوار ہے تھے (51:26)۔ وہ کا ہے کے لیے کھانا پکوار ہے تھے؟ یعنی یہ تو ہمارے چوں نہ دیدند حقیقت۔ رہِ افسانہ زدند۔ یہ ذہنِ انسانی کی افسانہ تراشی ہے۔ خدا نے تو صرف یہ کہا ہے کہ یہ ہمارے بھیجے ہوئے ہیں۔ اور وہ نظر آ رہا ہے کہ وہ ان سے باتیں کر رہے ہیں' وہ ان کا کھانا تیار کرا رہے ہیں اور پھر وہ اُدھر حضرت لوطؑ کی طرف جا رہے ہیں۔ تو یہ ساری چیزیں یہ ہیں کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے انسان تھے لیکن یہ بات کہ انہیں خدا نبی کی طرف بھیجتا ہے تو بہرحال اگر وہ آکر انہیں خدا کا پیغام دیتے ہیں تو خود یہ بھی تو نبی ہونگے۔ پھر وہ قومِ لوطؑ کی طرف جاتے ہیں کہ جہاں پہلے سے ایک نبی موجود ہے۔ اور وہاں جا کر حضرتِ لوطؑ سے یہ کہتے ہیں کہ اس قوم کی تباہی کا وقت آ گیا ہے' ہم یہ کہنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ پہلا نکتہ تو یہ ہے۔ بہرحال نبوت' وحی اور اس سے متعلقات کی جتنی چیزیں ہیں ان کو غیرِ نبی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ خاصۂ نبوت ہے۔ وہ پیغام جو نبوت کے ذریعے ہمیں ملتا ہے' جو ہدایت ہمیں ملتی ہے' اُسے ہم سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ مقاماتِ نبوت یا کیفیت اور نوعیت اور ماہیتِ وحی جو ہے' وہ غیر از نبی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لیے میں ان مقامات پہ یہ کہہ کر کہ ان کا تعلق خاصۂ نبوت سے ہے' آگے بڑھ جایا کرتا ہوں۔ میں ذہنی افسانہ تراشی نہیں کیا کرتا' وہ نبوت' خاصۂ نبوت اور وحی ہمارے ذہن کی حد سے ماورا بات ہے۔

قرآنی تعلیم کے تحت خونی رشتہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا

اس کے اندر دوسری بات وہ ہے کہ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ہدایت کے معاملے میں یہ جو ہمارے زندگی کے باہمی تعلقات ہیں' رشتہ داریاں ہیں' ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرتِ نوحؑ نبی ہیں تو ان کا بیٹا ان کے خلاف ہے اور غرق ہو رہا ہے۔ باپ اور بیٹے کا تعلق نہیں ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ نبی ہیں اور جوان کا باپ ہے وہ اُس کو وارننگ دے رہے ہیں۔ وہ بھی ایمان نہیں لایا۔ تو نبی کا بیٹا ہونا کوئی کام نہیں دے رہا' نبی کا باپ ہونا کوئی کام نہیں دے رہا۔ یہاں جو نبی کی بیوی ہے اس کے متعلق کہا کہ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ (29:32) ان کی بیوی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ گویا میاں بیوی کا رشتہ بھی اس معاملے میں کام نہیں دیتا۔ یہ ایمان اور اعمال انفرادی چیز ہے' کسی کی رشتہ داری کا سوال ہی نہیں ہے' کسی کی رشتہ داری کسی کو کوئی کام ہی نہیں دے سکتی۔

بندۂ عشق شُدی ترکِ نسب کن جامی

کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

مکافاتِ عمل کی وادی میں کسی قسم کی کوئی نسبت کوئی کام نہیں دیتی

یہ ''عشق'' کا معاملہ ہے یہاں نسبی تعلقات نہیں چل سکتے۔ اسی لیے تو وہ زیادہ عشق کی منزل میں جانے والے حضرتِ سلمان فارسیؓ سے نام پوچھا جاتا تھا تو کہتے تھے سلمان اور باپ کا نام؟ تو کہتے تھے اسلام۔ وہ باپ کا نام ہی اسلام بتایا کرتے تھے۔ ٹھیک ہے اپنے سوشل' اور تمدنی تعارف کے لیے یہ ضرورت ہوتی ہے کہ آپ کا نام اور باپ کا نام بتایا جائے ورنہ بارگاہِ خداوندی میں یا مکافاتِ عمل میں یا انسان کی ذات کی نشو و نما کے سلسلے کے اندر کوئی کسی قسم کا رشتہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے اسی لیے قرآن نے یہ تیسری بات یہاں کہی۔

فرعون کی بیوی فرعون کے گھر میں مومنہ کی صفات لیے ہوئے تھی

اس کے برعکس قرآنِ کریم نے فرعون کی بیوی کی حمد و ستائش کی ہے (66:11)۔ وہ مومنہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ بڑی باہمت خاتون ہوگی۔ باہمت اتنی ہوگی تو قرآن نے اپنی دفتین میں اُس کی داستان کو محفوظ کیا ہے' یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ قرآن کے اندر دائمی طور پر قیامت تک کے لیے ایک نام کا محفوظ ہو جانا اور اس قدر بلندی اور نورانیت کے ساتھ ہو جانا' بہت بڑی عظمت کی بات ہے اور بات بھی یہی ہے۔ فرعون کی بیوی کا مومن ہونا اور مومن رہنا' یہ بڑی بات ہے۔ اس سے یہ نظر آیا کہ یہ بھی بات نہیں ہے کہ صاحب! وہ جو بیوی ہے وہ کہے کہ ''کیا کروں وہ خاوند ہے' وہ مجھے یہ کہتا ہے' مجھے یہ سب کچھ ماننا ہی پڑتا ہے''۔ خدا نے تو یہ بات کہی ہے کہ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ فرعون کی بیوی مومنہ ہو سکتی ہے تو تم کیوں نہیں ہو سکتیں؟

انسانی ذات کی قیمت کے برعکس ہر چیز ہی اضافی ہے

تو قدر خویش ندانی بہاز تو گیرد

یہ اضافی چیزوں کو جو تو قیمت دیتا ہے' تجھے اپنی قیمت معلوم نہیں ہے۔

وگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

(اقبالؒ: پیامِ مشرق)

جسے تُو لعل کہہ رہا ہے' جواہر کہہ رہا ہے' وہ تو پتھر ہے اور تُو اُس کی قیمت بڑھاتا ہے تو اُس کی قیمت ہو جاتی ہے۔ تُو اُس کی قیمت کچھ نہ

لگائے تو وہ پتھر ہوتا ہے۔ اس لیے میری بیٹیو! تُو قدرِ خویش ندانی [1]۔ یہاں کہا گیا ہے کہ حضرت لوط ◆ کی جو بیوی تھی وہ بھی پیچھے رہ گئی۔ کہا یہ ہے کہ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ [2] (29:34) یہ جانے والے ایسا کہتے ہیں کہ جیسے ہم یہ کریں گے اور ہم یہ کرتے ہیں (29:32)۔ تو گویا یہ خود کرنے والے ہیں (29:31) لیکن دوسرے مقامات میں یہ ہے کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم نے یہ سارا کچھ کیا تھا اور اُن سے کہا تھا کہ جا کر یہ کہیں' تو صورت یہی ہوتی ہے۔

وحی کی روشنی میں نبی کا عمل خدا کا ہی عمل ہوتا ہے

خدا کے احکام کے مطابق جب نبی تعمیل کرتا ہے تو وہ درحقیقت خدا ہی کا کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ جو قرآن نے نبی اکرم ﷺ کے متعلق بدر کے مقام کے اوپر کہا ہے کہ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ (8:17) وہ تیر تم نہیں چلا رہے تھے بلکہ ہم چلا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ تیر تو ان کے دست و باز سے نکل رہے تھے' انہی کے کمانوں سے نکل رہے تھے۔ خدا نے کہا ہے کہ تم نہیں چلا رہے تھے بلکہ ہم چلا رہے تھے۔ اس لیے کہ اُس نے حکم دیا تھا کہ دشمن کے خلاف جا کر لڑو اور تیر چلاؤ۔ دشمن کے خلاف لڑنے والے کے متعلق یہاں تک قرآن نے کہا ہے کہ تم تیر نہیں چلا رہے تھے بلکہ ہم چلا رہے تھے۔ اور یہ بات ہے ہی یہی۔ حکومت یا عدالت کی طرف سے' جو احکام لے کر آتا ہے تو اُس کا اپنا کوئی اختیار' قوت اور طاقت نہیں ہوتی کہ وہ آپ کو گرفتار کر لے۔ وہ سپاہی گرفتار تو کر رہا ہوتا ہے لیکن وہ گرفتار نہیں کرتا بلکہ وہ تو عدالت کا گرفتاری کا حکم ہے جس کی وہ صرف تعمیل کرتا ہے۔ اس لیے اگر وہ جا کر عدالت میں یا کسی جگہ یہ کہتا ہے کہ میں نے گرفتار کیا تو وہ تو ایک Physical Action (جسمانی فعل) ہے جس کے متعلق وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے کیا ورنہ وہ صاحبِ اقتدار نہیں ہے کہ وہ کسی کو گرفتار کرے۔ اگر اُس کے پاس عدالت کا پروانہ نہ ہو اور یہ ایسے کرے تو حبسِ بے جا کے اندر وہ خود قید خانے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ انبیائے کرامؑ جو کچھ کرتے تھے تو کیونکہ وہ خدا کے احکام کی تعمیل میں کرتے تھے اسی لیے خدا اُس کو براہِ راست بھی اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے مثلاً وہ صلح حدیبیہ میں شجرِ رضوان کے نیچے بیٹھے ہوئے جو حضور ﷺ نے صحابہؓ سے بیعت لی تھی کہ انہوں نے اپنا جان اور مال ان کے ہاتھوں بیچ دیا تھا تو وہ جو بیعت لی تھی تو وہاں یہ کہا گیا ہے کہ یاد رکھو! تمہارے ہاتھ کے اوپر نبی کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ یہ خدا کا ہاتھ تھا۔ خدا کا ہاتھ تو ایسا ہوتا ہی نہیں کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے۔ اُس کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہا تھا کہ On behalf of Allah (اللہ کی جانب سے) یہ بیعت لے۔

---

[1] تم اپنی قیمت نہیں جانتی ہو۔

[2] ان بستی والوں پر (خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے) فضائے آسمانی سے سخت تباہی نازل ہونے والی ہے اس لیے کہ وہ بڑی غلط راہوں پر چل رہے ہیں لیکن اس تباہی سے تم اور تمہارے ساتھی محفوظ رہیں گے سوائے تیری بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والی ہے (29:33)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔918)

رہا تھا' یہ نبی خود نہیں لے رہا تھا۔ اس لیے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ (9:111) اللہ نے خریدا ہے۔ تو یہ جو خرید کی بیع اور شرح کا معاملہ طے پا رہا تھا تو اب وہ Physically طبعی طور پر' تو کسی محسوس شخصیت سے پانا تھا۔ اور وہ نبی اکرم ﷺ تھے۔ بیعت کے معنی ہیں کہ خرید لینا' بیچ دینا۔ اس لیے وہ جو ان سے یہ بیعت لی تھی اور یہ جو اپنی جانیں بیچ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہم بیچ رہے ہیں تو کہا کہ بظاہر تو تمہارا ہاتھ تھا لیکن درحقیقت وہ خدا کا ہاتھ تھا کیونکہ خدا کے ہاتھ تم بیچ رہے تھے اور خدا تم سے خرید رہا تھا۔ یہ تو درمیان میں ایک طبعی ایجنسی تھی جو یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ تو یہ ہے وہ چیز۔ اسی لیے وہ جسے رسول ﷺ کی اطاعت کہتے ہیں تو وہ خدا کی اطاعت ہوتی ہے ورنہ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ کسی بشر کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ اُس کو ہم نبوت بھی کیوں نہ دیدیں کہ دوسروں سے کہے کہ تم میری اطاعت کرو' میرے بندے بن جاؤ (3:78)۔ بہرحال کہنے کی بات یہ تھی کہ ان مقامات میں جہاں یہ آتا ہے کہ یہ فرستادگانِ خدا یا جو نبی ہیں وہ کہیں کہ ہم یہ کر رہے ہیں تو وہ ایسی ہی صورت ہے کہ جیسی کسی عدالت کے حکم کی تعمیل ہوتی ہے۔ یہ خود یہ نہیں کرتے اور نہ ان کو یہ اختیار ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! اب ہوا یہ کہ وہ قوم تباہ ہوگئی۔ اس پر کہا کہ وَ لَقَدۡ تَّرَکۡنَا مِنۡہَاۤ اٰیَۃًۢ بَیِّنَۃً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (29:35) ان کی داستان میں بھی ہم نے عقل و فکر سے کام لینے والوں کے لیے' قانونِ مکافاتِ عمل کی صداقت اور محکمیت کی واضح نشانی رکھی ہے۔ یہ ہم اس سورۃ العنکبوت کی آیت 35 تک آ گئے۔ آیات 30 تا 35 میں صرف یہ فرستادگان کا واقعہ ہے اور چونکہ پچھلے درس میں' میں نے جنسی جذبے کی تسکین' تحفظِ عصمت اور زنا کی ساری تفصیل بیان کر دی تھی اس لیے ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کے بعد اس سورۃ کی آیت 36 پہ آ جاتے ہیں۔ کہا کہ وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاہُمۡ شُعَیۡبًا[1] (29:36)۔ یہ پہلی دفعہ آیا ہے۔

حضرت نوح ◆، حضرت ھود ◆، حضرت صالح ◆ کی طرف سے پیش کردہ تعلیم کے مختلف پہلو

آپ کو یاد ہے کہ ہمارے درس میں پچھلے چند ماہ سے سلسلہ یہ شروع ہو رہا تھا کہ قرآنِ مجید میں انبیائے سابقہؑ یا اقوامِ گزشتہ کے جو واقعات یا داستانیں بیان کی ہیں' تو میں نے یہ کہا تھا کہ جسے آپ اسلامی نظام یا قرآن کا نظام یا نظامِ خداوندی یا حکومتِ الٰہیہ کہیں گے تو یہ اُس کے مختلف شعبے ہیں۔ یہ جتنی سابقہ انبیائے کرامؑ کی داستانیں ہیں' اُن میں سے ایک ایک شعبے کو نمایاں طور پر' اُن کی وساطت سے سامنے لایا گیا ہے۔ مثلاً یہ جو فلاں قوم تھی تو اُنہوں نے طبقاتی تفریق پیدا کر رکھی تھی؟ حضرتِ نوحؑ کا قصہ تھا کہ وہاں طبقاتی تفریق پیدا کر رکھی تھی اور اُس کی وجہ سے اُس قوم میں تباہی آ رہی تھی۔ تو حضرتِ نوحؑ نے آ کر اُس تفریق کو مٹایا۔ گویا یہ نظامِ خداوندی کا ایک شعبہ ہے

---

[1] اور (اسی طرح) اہلِ مدین کی طرف' ان کے بھائی بندوں میں سے' شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 918)۔

کہ اُس میں طبقاتی تفریق نہیں رہے گی۔اب حضرتِ نوحؑ کی داستان میں یہی بات ہے۔

قومِ عاد کے سلسلے کے اندر یہ ہے کہ حضرتِ ھودؑ ان کی طرف آئے تھے۔اُنہوںؑ نے کہا تھا کہ اُن کا نظامِ سیاست ایسا تھا کہ وہ کمزور پہ ہاتھ ڈالتے تھے تو اُس کی ہڈیاں تک توڑ دیا کرتے تھے۔ یہ صرف اتنی ہی بات ہے۔نظامِ سیاست میں اس قسم کا استکبار' استبداد ایک ہی گوشہ ہے۔

قومِ ثمود کی طرف حضرتِ صالحؑ ہیں تو وہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ خدا کی دی ہوئی چراہ گاہیں ہیں' اُس کی دی ہوئی زراعت ہے اور اُس کا دیا ہوا یہ رزق ہے۔ یہ بڑے بڑے جبار' بڑے بڑے جاگیردار' یہ بڑے بڑے رؤسا لکیریں کھینچ کر ان کو اپنی ذاتی ملکیت بنا لیتے تھے۔ اس کے خلاف ایک نبی آیا اور اُس نے کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔ خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے عام ہونی چاہیے' کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس پہ لکیریں ڈال کر اپنی ذاتی ملکیت بنالے۔ وہ یہی کہنے کے لیے آئے تھے۔اور قرآنِ کریم نے ہر مقام پہ یہی کہا کہ جس قوم نے اُن کی بات نہ مانی ان کا یہ حشر ہوا۔اب یہ تمام گوشے جتنے بھی ہیں' یہ آخرالامر آ کر تعلیم کے اعتبار سے' قرآنِ کریم میں محفوظ ہوئے اور عملی تشکیل کے اعتبار سے نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوا جس میں یہ تمام جتنی بھی تباہی لانے والی خرابیاں تھیں' ان کا ازالہ کیا گیا اور جو کچھ ان انبیائے کرامؑ نے فرداً فرداً کیا تھا تو وہ یہاں اجتماعی طور پر حضور ﷺ کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کی شکل میں متشکل ہوا۔اسے الاسلام یا الدین کہا جاتا ہے۔ میں نے یہ جتنے انبیائے سابقہؑ تھے' ان کی اور ان کی قوموں کی داستان ایک ایک کر کے بیان کی تھیں۔ وہ اس طرح سے تھا کہ یہ تمام سورۃ الشعرآء میں سامنے آئی تھیں' وہ ہم بیان کرتے چلے آئے تھے۔اُن میں حضرتِ شعیبؑ کا قصہ نہیں آیا تھا اور وہ اب ہمارے سامنے آتا ہے۔آپ دیکھیں گے کہ یہ بات اُس زمانے کی ہو رہی ہے کہ یہ حضرتِ موسیٰؑ کے ہمعصر ہیں' گویا قریباً سولہ سو سال قبلِ مسیحؑ' آج سے قریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے کی بات ہے' جو وہاں کہی گئی ہے۔آپ دیکھیں گے کہ چودہ سو سال نزولِ قرآن کے زمانے میں نہیں بلکہ آپ کے زمانے میں اُس نے کتنی اہمیت اختیار کی ہوئی ہے!

قرآنِ حکیم میں ان بیان کردہ انبیائے کرام کی داستانوں کا مقصد

قرآن ان داستانوں کو اس لیے بیان کرتا ہے کہ ان سے عبرت حاصل کرو۔ یہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ آپ کو یہ بتائے کہ اکبر کس سال تخت پہ بیٹھا اور رانا ٹو نگا کے ساتھ کب لڑائی ہوئی تھی۔ یہ تو صرف معلومات ہیں۔ وہ یہ باتیں اس لیے بیان کرتا ہے کہ اِن سے عبرت حاصل کرو۔ اگر تم نے بھی یہی کچھ کیا جو ان قوموں نے کیا تھا تو تمہارا بھی یہی حشر ہوگا جو ان کا ہوا تھا۔عزیزانِ من! یہ ہے ان تاریخی شہادتوں کے بہم پہنچانے کا مقصد۔

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ اسی طرح وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا (29:36) مدین قوم ہے' مدین علاقہ ہے' اُس قوم کی طرف ان کا بھائی شعیب ◆ پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔ اُسی قوم میں سے نبی پیدا ہوتا تھا۔ اسی لیے ہمیشہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان کا بھائی تھا۔ وہ انہی میں سے ہوتا تھا۔ مدین کا ذکر آیا تو بتادوں کہ اس کا تعارف قرآنِ کریم نے حضرتِ موسیٰؑ کی داستان میں کرایا تھا۔ بات تو پچھلی سورۃ میں آ گئی ہے لیکن میں دہرادوں تاکہ اس قوم کا ایک اجمالی سا تعارف ایک واقعہ کی شکل میں' جو قرآن نے بیان کیا ہے' ہمارے سامنے آ جائے۔ حضرتِ موسیٰ ◆ مصر سے اس واقعۂ قتل کے بعد بھاگ کر اُدھر آ گئے۔ مصر سے ذرا سا پانی عبور کیا تو مدین آ گئے۔ اب تو وہاں یہ نہرِ سویز ہے' اُس زمانے میں نہر نہیں ہوتی تھی' وہ تھوڑا سا جو پانی بھی تھا' اُس کو عبور کرنے کے بعد آگے آئیں تو یہ صحرائے سینا ہے۔ ذرا آگے بڑھیں تھا تو یہ جو علاقہ ہے کہ کہیں مدین ہے' کہیں فلسطین ہے' کہیں شام ہے' کہیں بابل ہے' تو یہ علاقے شروع ہو جاتے تھے۔ یہ ساری داستانیں انہی علاقوں کے گرد گھومتی ہیں۔ یہ جو سارے سامی النسل پیغمبر ہیں تو یہ سارے اس علاقے میں آئے تھے۔

حضرت موسیٰ ◆ کا مویشیوں کو پانی پلانے کا واقعہ

وہاں مصر سے جب یہ بھاگ کر آئے ہیں تو وہاں قرآن یہ کہتا ہے کہ وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ وَجَدَ عَلَیْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ یَسْقُوْنَ (28:23) وہاں آیا' تھکا ہوا تھا' ایک چشمہ تھا' چشمے پہ کچھ لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ کسی درخت کے سائے تلے یہ ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ اب دیکھیے کہ راستے کی ایک بات ہے اور ابھی حضرتِ موسیٰؑ نبوت سے سرفراز بھی نہیں کیے گئے' یہ اُس سے پہلے کی بات ہے۔ لیکن نبی کی تو قبل از نبوت کی زندگی بھی بڑی حسین کردار کی مالک ہوتی ہے۔ وہاں بیٹھ گئے اور دیکھ رہے ہیں۔ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ یَسْقُوْنَ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَیْنِ تَذُوْدٰنِ [1] (28:23)۔ کیا بات ہے عربی زبان کی! دیکھا کہ وہ چرواہے یا جو بڑے لوگ ہیں' وہ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں۔

عزیزانِ من! اُس علاقے میں پانی بڑی قیمتی چیز ہے۔ وہ بہترین مال پانی کو ہی کہتے تھے' زندگی کا انحصار پانی پہ تھا۔ جہاں کہیں چشمہ ہوا تو وہیں کہیں دو چار درخت اگ آئے تو وہ اُن کے ہاں جنت کہلاتی تھی اور وہیں اُنہوں نے ڈیرے ڈال لیے' پانی خشک ہوا تو دوسری جگہ چلے گئے۔ پانی بڑی قیمتی چیز تھی۔ دیکھا کہ اُس پانی کے چشمے پہ مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ موسیٰؑ نے دیکھا کہ دو لڑکیاں ہیں۔

---

[1] کچھ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں لیکن کچھ دور دو لڑکیاں ہیں جو اپنی بکریوں کو روک رہی ہیں کہ وہ پیاؤ کی طرف بڑھنے نہ پائیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 888)۔

اس آیت میں ایک لفظ ہے اور جیسا میں نے کہا ہے کہ قرآن کا انداز محاکاتی ہے' وہ کینوس (پردے) پہ تصویر کھینچتا ہے لیکن اُس کے اندر اختصار اتنا ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک لفظ میں ساری بات کہہ جاتا ہے اور یہ انتہائی اعلیٰ ادب کا تقاضا ہوتا ہے۔ جو اختصار ہے بلکہ جسے ارتکاز (Concentration) کہتے ہیں' وہ ایک لفظ کے اندر ساری بات کہہ جاتا ہے۔ یہاں وہ لفظ تِذُوْدٰنِ ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''وہ جو اُن کی بھیڑیں تھیں یا بکریاں تھیں' وہ پیاس کی ماری بھاگی ہوئی پانی کی طرف جارہی تھیں اور یہ اُنہیں روک کر پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھیں''۔ وہ پیاس کا فطری تقاضا ہے جو مویشیوں کو پانی کی طرف لیے جارہا ہے۔ جس فطرت نے یا جس خدا نے ان کے اندر یہ تقاضا رکھا ہے تو اُس خدا نے اُس چشمے میں پانی رکھا ہے کہ یہ تقاضا وہاں پورا ہو جائے۔ وہ فطرت کا تقاضا ہے جو اُنہیں ادھر لیے جارہا ہے۔ اب انسان درمیان میں آتے ہیں۔ انسانوں کا ایک گروہ ہے جو وہاں اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہا ہے۔ انسانوں ہی کی یہ دو نمائندہ ہیں جو اپنے مویشیوں کو روک رہی ہیں کہ وہاں نہ جائیں۔ اتنی سخت پیاس ہے' خدا کا دیا ہوا یہ پانی موجود ہے۔ وہیں کی یہ بھی رہنے والی ہیں۔ یہ روک کیوں رہی ہیں؟ سیدھی سی بات ہے۔ یہ اُٹھے اور انہوں نے ان لڑکیوں سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ وہ پیاس کے مارے تڑپ رہی ہیں اور تم ان کو روک کر پیچھے لا رہی ہو؟ کیا انہیں پیاسا مارنا چاہتی ہو؟ وہ کہنے لگیں کہ یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ بڑے بڑے لوگ ہیں' یہ قوتوں کے مالک ہیں اور ہمارا باپ بوڑھا ہے اور گھر میں کوئی اور مرد ہے نہیں۔ ہم کمزور اور ناتواں سی دو لڑکیاں ہی ہیں۔ جب تک یہ اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر نہ لے جائیں ہم اپنے مویشیوں کو آگے نہیں بڑھنے دے سکتیں [1] کہ مویشیوں کی خیر نہیں ہوگی (28:23)۔ اتنی سی بات سے آپ دیکھیے کہ سارے معاشرے کا نقشہ قرآن نے کھینچ دیا۔ اِنہوں نے یہ نہیں کیا کہ یہ بات سنی اور اُس کے بعد کہا کہ ٹھیک ہے بھئی! پھر بعد میں پلا لینا۔ یہ اٹھے' یہ طاقتور اور توانا تو پوچھو ہی نہیں کہ کیسے تھے! بہرحال یہ آگے بڑھے اور قرآن کہہ رہا ہے کہ اُس نے جا کر ان کے مویشیوں کو پانی پلا یا۔ آگے قرآنِ کریم نے بتایا کہ **فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰى اِلَى الظِّلِّ** (28:24) پانی پلانے کے بعد پھر اُسی درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ یا اللہ! بہر زمینے کہ رفیتم آسماں پیداست...... مصر سے بھاگا تھا کہ وہاں انسانی استبداد نے کمزوروں پر زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ بھاگا تھا کہ کسی ایسی سرزمین میں چلا جاؤں جہاں انسانوں کا گلا انسانوں کے ہاتھوں سے نہ گھٹے۔ اب کہاں چلا جاؤں یہاں آکر میں نے دیکھا ہے کہ اُس سے بھی زیادہ بدتر استبداد

---

[1] قَالَتَا لَا نَسْقِىْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ (28:23) انہوں نے کہا کہ جب تک یہ چرواہے اپنی بکریوں کو پانی پلا کر لے نہ جائیں' ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ (اس لیے کہ یہ لوگ بڑے بڑے جتھوں کے مالک اور صاحب قوت ہیں' اور ہمارا کوئی آدمی نہیں) صرف ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے۔ (اس لیے ہماری کیا مجال ہے کہ جس وقت ان کی بکریاں پانی پی رہی ہوں' ہم اپنی بکریوں کو آگے بڑھنے دیں۔ ان کی بکریاں سیر ہو کر پی لیں۔ اس کے بعد اگر کچھ بچ رہے گا تو ہماری بکریوں کے حصے میں بھی آ جائے گا) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔889)۔

ہے۔انہوں نے کہا کہ رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ (28:24) یہی بات تو سمجھ میں نہیں آتی' میں تو ایک فقیر کی طرح تیرے سامنے جھولی پھیلائے ہوئے ہوں کہ یا اللہ! مجھے کوئی ایسا مقام بتا جہاں انسان انسان کا گلا نہ کاٹ رہا ہو۔

عزیزانِ من! مدین یہ تھا۔میں نے کہا تھا کہ میں صرف تعارف کرانا چاہتا ہوں۔قرآن بتا رہا ہے کہ اُن کی جو معیشت تھی' وہ یہ Agriculture Economy نہیں تھی' زرعی نہیں تھی بلکہ کاروباری تھی۔جو کاروباری ہوتے ہیں ان کے پاس طاقت بھی ہوتی ہے' روپیہ بھی ان کے پاس ہوتا ہے اور وہ سب کچھ خرید سکتے ہیں۔یہ پیاؤ کے اوپر یا اس چشمے کے اوپر ان کا جو اقتدار تھا' وہ وہاں کے زمیندار ہونے کی بنا پہ نہیں تھا۔قرآن کہتا ہے کہ کاروباری اعتبار سے وہ لوگ اتنے صاحبِ اقتدار ہو جاتے ہیں' اتنی قوتوں کے مالک ہو جاتے ہیں کہ پھر غریب ہر مقام پر ان سے ڈرتا ہے۔ان کی کیفیت کیا تھی؟ یہ تفصیل قرآن نے سورۃ الاعراف میں اور سورۃ ھود میں دی ہے سورۃ الاعراف میں کہا ہے کہ وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاہُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ' (7:85) پہلی بات جو ہر نبی آ کر کہتا تھا وہ یہ تھی کہ بھئی! اختیار اور اقتدار صرف خدا کو حاصل ہے۔اُس کی محکومیت اختیار کرو۔یہی بات اہل مدین کے بھائی بندوں میں سے شعیبؑ نے کہی تھی۔اور کہا تھا کہ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ (7:85) تمہارے پاس تمہارے نشو ونما دینے والے کی طرف سے واضح تعلیم آ چکی ہے۔

قرآنِ حکیم کی ساری تعلیم دلائل و بینات پر مبنی ہوتی ہے

قرآن یہ بتاتا ہے کہ نبی جب بھی پہلے اپنا پیغام دیتا تھا تو وہ دلیل وبصیرت کی رو سے دیتا تھا' علم وبصیرت کی رو سے دیتا تھا' دلائل وبراہین کی رو سے دیتا تھا' اِسے وہ بینات کہتا ہے کہ میں نے تم لوگوں کو عقل وفکر کی رو سے دلائل دے کر' شہادات پیش کر کے' یہ ساری چیزیں Rationally تمہیں Explain (بیاں) کر دی ہیں کہ یہ تمہاری روش تباہ کن ہے۔بینات جو قرآن کی طرف سے ہوتی ہیں' وہ پہلی اسٹیج ہوتی ہے۔سورۃ الحدید میں قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہمارے رُسل بالبینٰت آئے۔پھر اگلی اسٹیج کتاب ہوتی ہے۔جو لوگ بینات کی رو سے Convert (تبدیل) ہو جائیں' ان کے ساتھ ہو جائیں' یعنی جو ایمان لانا ہے یا ساتھ دینا ہے تو وہ علی وجہ البصیرت ہے۔پہلے نبی بینات پیش کرتا ہے' ان بینات کی رو سے جو قلب ودماغ کے اطمینان کے بعد اس کی صداقت پر یقین کر کے اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں' تو ان کے لیے پھر ایک ضابطہء قانون دیتا ہے تا کہ عدل قائم کیا جائے۔اور اُس کے بعد ہے کہ وہ قوتیں جو عدل قائم نہیں ہونے دیتیں' تو ان کی اگلی منزل یہ ہوتی ہے کہ انہیں میدانِ جنگ تک جانا پڑتا ہے۔اس کے بعد الحدید ہے' اور اس کے لیے قرآن میں شمشیرِ خارہ شگاف بھی خدا نے نازل کی ہے۔یہ تین چیزیں نہایت ضروری ہیں۔سوسائٹی کو اقدارِ خداوندی کے مطابق رکھنے کے لیے

بینات پہلی چیز ہے۔ یہاں دھاندلی سے کچھ نہیں منوایا جاتا۔ اُس کے بعد الکتٰب آتی ہے۔ خالی قانون کی رو سے آپ اصلاح کر ہی نہیں سکتے۔ یہ تو پہلے قلب و دماغ و نگاہ کی صلاحیتیں ہیں اور ان کی ذہنیتیں ہیں جنہیں تبدیل پیدا کرنا ہوتا ہے۔ پھر اصلاح ہوتی ہے۔ اُس کے بعد اگلی چیز یہ ہے کہ وہ دھاندلی والی قوتیں، جو زمین میں عدل نہ ہونے دیں، ان کے خلاف ان کی اس زبردستی کو روکنے کے لیے اٹھنا پڑتا ہے۔ اور یہ جو مدافعانہ شمشیر زنی ہے، اس کے لیے ہم نے حدید نازل کیا۔ اُس نے یہ کہا ہے کہ مجرمین کے لیے، ظالمین کے لیے، اُس میں بڑی سختی ہے اور انسانوں کے لیے منفعت بخش ہوتی ہے۔ ظالم کو وہ قوت کے زور سے روکتی ہے۔ ظالم کا روک دینا مظلوم کے لیے نہایت منفعت بخش ہوتا ہے۔ بیک وقت یہ دو کام کرتی ہے۔ اگر وہ یہ دو کام نہیں کرتی، اگر وہ صرف یہی چیز کرتی ہے کہ قتل و غارت گری کرتی چلی جاتی ہے، تو اس سے بڑا جرم کوئی نہیں ہے۔

حضرت شعیبؑ کے پیغام کی اہمیت اور اس کی وضاحت

حضرتِ شعیبؑ کا پیغام یہ ہے کہ فَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَ الۡمِيۡزَانَ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَ هُمۡ (7:85)۔ الفاظ تو یہی ہیں کہ ماپ تول پورا رکھا کرو، ڈنڈی نہ مارا کرو، کم نہ تولا کرو، خالص چیزیں دیا کرو، ملاوٹیں نہ کیا کرو۔ بات تو یہ اتنی سی ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ Economics (معاشیات) کی دنیا کے اندر یہ بنیادی چیز ہے۔ یہ صرف ایسے ہی نہیں ہے کہ ماپ اور تول کا قصہ ہے کہ کپڑے والے کی دکان کے لیے یہ ہے، یا سبزی یا گوشت فروش کے لیے ہے کہ وہ ماپتا ہے اور یہ تولتا ہے۔ یہ جو قرآن نے ہدایات یا Directions دی ہیں تو یہ صرف ان کے لیے نہیں ہیں جو گز اور ترازو لیے بیٹھے ہیں، یہ تو اکنامکس کا بہت بڑا مسئلہ ہے، یہ تو تبادلے کا سوال ہے کہ بدل میں کیا چیز دی جائے۔ اور اس کا میدان بڑا وسیع ہے۔ یہ جو اکنامک سسٹم ہے، جو آج ہمارے ہاں Commercial System (تجارتی نظام) ہے، بزنس کی سائیڈ ہے، کاروباری سائیڈ ہے، خواہ اُس میں صنعت گری یا انڈسٹری کیوں نہ آ جائے، سوال یہی ہے۔ اُس نے کہا یہ ہے کہ جس سے جتنا لیتے ہو اُس کو بدلے میں اتنا دو۔ اب اگر اُسے آپ بھنڈی توری سے شروع کر دیتے ہیں تو وہاں سے شروع کر دیجیے، لٹھا خریدنے کے لیے شروع کرتے ہیں تو وہاں سے بھی بات شروع ہو جائے گی۔ اور بلند ترین آپ کے ہاں جو لین دین کا معاملہ انسانیت کا آتا ہے تو وہاں بھی لے جائیں گے تو اصول یہی ہوگا۔ بات یہی کہی ہے کہ جتنا کسی سے لیتے ہو تو اُس کے بدلے میں اتنا اُس کو دو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی جامعیت کتنی بڑی ہے۔ اب یہ جو بات تھی تو اگلی بات نے اس کو واضح کر دیا کہ ان احکام میں وسعت کتنی تھی! یہ صرف ترازو کی ڈنڈی مارنا یا گرہ کم کرنے تک محدود نہیں تھے بلکہ یہ ایک بہت بڑا اصول تھا۔ اسی لیے یہ کہہ کر کہا کہ وَ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا (7:85) بڑی مشکل سے پہلے نبی نے یہاں وہ نظام قائم کیا تھا جس میں جو

کچھ کوئی دیتا تھا تو اُس کے بدلے میں اُس کو اتنا مل جاتا تھا۔ یہ اصلاح ہے۔ تم اس اصلاحی نظام کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ یہ جو صلح اور فساد کے لفظ قرآن میں آتے ہیں تو میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ ہمارے نزدیک تو اب فساد کے معنی دنگا فساد ہی رہ گیا ہے اور صلح تو صلح صفائی رہ گئی۔ یہ تو قرآن کی بنیادی اصطلاحات ہیں، نظام کی بنیادیں اس سے قائم ہیں۔ اصلاح کے لفظ کے معنی ہمواریاں پیدا کرنا ہوتا ہے اور **فساد** کے معنی ناہمواریاں پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جیسے حسنات کے معنی توازن برقرار رکھنا اور سیأت کے معنی توازن بگاڑ دینا ہے۔ عزیزانِ من! گناہ اور ثواب کے الفاظ سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کسی دور میں ٹھیک ہے کہ اسی کو گناہ کہتے ہونگے لیکن آج تو وہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ آج تو ہمارے ہاں جرم اور گناہ کے لیے بھی الگ الگ لفظ ہوگئے۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ یہ کرنے سے گناہ ہوتا ہے اور سپاہی کہتا ہے کہ یہ جرم ہوتا ہے۔ قرآن کی رو سے تو اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

کم ماپنے اور کم تولنے کے نظام کی نوعِ انسانی میں اثراندازی

اُس نے کہا یہ ہے کہ وہ نظام جس کے اندر ہمواریاں پیدا کی گئی تھیں تو اُس کے بعد ایسا کچھ نہ کرو جس کا نتیجہ فساد فی الارض ہے۔ یہ کسی دکان کا قصہ نہیں ہے، کسی گلی محلے کا قصہ نہیں ہے۔ اگر اس کو سمٹا کر نہیں لیں گے تو اسے آپ پوری مملکت کہیں گے، آپ پورا ملک کہیں گے۔ کم از کم یہ معنی لیں گے۔ اور اگر وسعت دیں گے تو قرآن نے جو کہا ہے تو قرآن تو عالمگیر نظام قائم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ باطل کا نظام بھی عالمگیر ہوجاتا ہے۔ کہا ہے کہ **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ** (30:41) انسانوں نے جب اپنے ہاتھوں میں نظام لیا تو ساری دنیا کے خشکی وتری کے اندر فساد برپا ہوگیا۔ جو اُس کے ہاں **فَسَاد فِی الْاَرْضِ** کہا ہے تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ تم ایسا نظام قائم کرو۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ انفرادی چیز ہے کہ فلاں دکاندار کم تولتا ہے یا کم ماپتا ہے بلکہ ملک کے اندر **تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ** ہے۔ ملک کے اندر تم نے اس قسم کا نظام قائم کر دیا ہے کہ کسی شخص کو جو وہ دیتا ہے اُس کے بدلے میں اتنا ملتا نہیں ہے، جس کے لینے کا وہ مستحق ہے، تم نے یہ نظام قائم کرلیا ہوا ہے۔ ایسا نہ کرو۔ **ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ** (7:85)۔ میں پچھلی دفعہ یا اُس سے پہلے درس میں عرض کر چکا تھا کہ قرآن نے جتنے احکامات دیئے ہیں، تلقینات کی ہیں، پیغامات دیئے ہیں، ہر جگہ یہ کہا ہے کہ **خَیْرٌ لَّكُمْ** او! یہ تمہارے بھلے کی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ نبی اپنے متعلق یہ کہتا ہے کہ میں اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ یہ پہلی بات ہی بہت بڑی ہے جو کسی قسم کا معاوضہ نہ چاہے۔ اور معاوضے میں تو آپ جانتے ہیں کہ یہ پیسہ ٹکا ہی نہیں ہے بلکہ ووٹ بھی تو اس میں آجاتا ہے۔ نبی کہتا ہے کہ میں کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میں کہتا ہوں کہ اتنا سا جو اعلان ہے بشرطیکہ اُس کی سیرت اس کی آئینہ دار ہو، اس کی شہادت بہم پہنچائے کہ وہ واقعی معاوضہ نہیں چاہتا۔ جتنی مؤثر یہ چیز ہوتی

ہے کوئی اور نہیں ہوتی۔ اس میں اس کے اپنے کسی نفع نقصان کی بات نہیں ہوتی ' اپنا کوئی مقصد نہیں ہے۔ تو بات سنو یہ جو کہتا ہے۔ ہر جگہ قرآن نے یہ کہا ہے۔

اگلی چیز یہ ہے جو میں نے اُس دن بھی کہی تھی کہ ہمارے ہاں دو حقوق ہیں جنہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کہتے ہیں۔ یعنی ایک چیز حقوق اللہ ہمارے ہاں کردی اور وہ اللہ کے لیے ہے جبکہ ہر جگہ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ہے' یہ انسانوں کے لیے ہے' بندوں کا ہی اس کے اندر بھلا ہوتا ہے۔ ایک مقام پہ یہ ہے کہ جب تم فصل کاٹو' تمہارے ہاں یہ جنس آجائے' دانے وغیرہ ہوجائیں' تو جب تقسیم کرنے لگو تو اُس میں سے اُس کا حق ادا کرو' اگرچہ وہ بھی حقُّہ ہے۔ کھیتی کے جو Dues ہیں' یہ بھی اُس کا ترجمہ ہے۔ وہاں اللہ کا لفظ نہیں ہے لیکن اگر یہ کہا بھی جائے کہ خدا کے لیے ہے تو قرآن نے تو دوسری جگہ کہا ہے کہ **مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ** (56:73) جسے کہتے ہو کہ خدا کا حق ہے' تو یہ بھوکوں کا حق ہے ان کو پہنچاؤ۔ اپنے متعلق تو وہ کہتا ہے کہ ہم تو کبھی روٹی ہی نہیں کھاتے تو ہمیں دانے دے کر کیا کرو گے۔ کیا بات ہے اُس کے کہنے کی! کہا ہے کہ **مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ** (56:73) یہ بھوکوں کا حق ہے۔ تو جہاں بھی قرآن میں یہ بات آئی ہے تو وہاں **خَيْرٌ لَّكُمْ** ہے۔ جہاں عذاب دینے کی بات آئی ہے تو کہا کہ جہاں بھی آپ قرآن میں دیکھیں گے تو یہ ہے کہ **يَظْلِمُوْنَ اَنْفُسَكُمْ** اپنے آپ پہ زیادتی کرتے ہو' خدا کا کوئی کچھ نہیں بگاڑتا۔

خدا کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا' اس کی تو یہ روش ہی نہیں ہے

وہ کہتا ہے کہ یہ جو تم غلط روش اختیار کرتے ہو تو اپنے خلاف زیادتی کرتے ہو۔ اور دوسرے مقام پہ ہے کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ خدا کا عذاب ہے تو کہا کہ اگر تم صحیح راستے پہ چلو تو ہم نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔ ہماری روش یہ نہیں ہے کہ تمہیں عذاب دیں۔ یہ تم اپنے خلاف خود عذاب تیار کر رہے ہو' اپنے ہاتھوں سے اپنا عذاب تیار کر رہے ہو۔ یہ اُس کا فطری نتیجہ ہے کہ سنکھیا کھاتے ہو تو ہلاکت ہوجاتی ہے۔ اب یہ ٹھیک ہے کہ سنکھیے کے اندر یہ جو خاصیت تھی کہ اسے کھانے سے ہلاکت ہوجائے گی تو یہ تو ہماری دی ہوئی تھی لیکن ہم نے تمہیں تو نہیں کہا تھا کہ سنکھیا کھاؤ' ہم نے تو کہا تھا کہ سنکھیا کھاؤ گے تو ہلاک ہوجاؤ گے۔ اس کے فائدے اور ہیں۔ تو ہمیشہ **خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ** (17:85) آتا ہے بشرطیکہ تم اس بات پہ یقین رکھو کہ یہ ہمارے ہی بھلے کی بات ہے۔ یعنی آپ سوچیے کہ اس میں کونسی بات غلط ہے۔ کسی دوکاندار سے آج بھی آپ یہ کہیے کہ صاحب! تم نے کم تولا ہے تو وہ کبھی نہیں مانے گا کہ میں نے کم تولا ہے۔ وہ کہے گا کہ "اسی اینوں حرام سمجھنے ہیگے آں [1]" ہمارے نزدیک تو خنزیر ہے۔ وہ اور بات ہے کہ اُس فقرے میں اور لفظوں میں ڈنڈی ماری

---

[1] ہم اسے حرام سمجھتے ہیں۔

ہوئی ہوتی ہے تو کوئی نہیں مانے گا۔ اور یہ جو بڑے پیمانے کے اوپر آپ دیکھیں گے کہ جو یہ کریں تو کیا وہ کبھی اسے مانیں گے کہ جو کچھ ہمارے لیے کوئی محنت کرتا ہے تو ہم اُس کا پورا معاوضہ اُس کو دیتے ہیں۔ جو محنت کرتا ہے تو جو کچھ بھی اُس کا ماحصل ہے تو وہ پورے کا پورا دیدیا جائے تو نظامِ سرمایہ داری ختم ہو جاتا ہے۔ یہ نظام تو قائم ہی اس پہ ہے کہ وہ جو محنت کرتے ہیں وہی سارا کچھ لے جاتے ہیں۔ اور پھر یہ ورکرز کی فلاح اور بہبود کے لیے اسکیمیں بنتی ہیں، قوانین بنتے ہیں، سوسائٹیاں بنتی ہیں۔ کام کرنے والوں کی ویلفئیر (فلاح و بہبود) کے لیے وہ کوششیں کرتے ہیں جو خود کام نہیں کرتے۔

سرمایہ دار Worker (کارکن) کے مقابلے میں اپنے آپ کو Un-worker (غیر کارکن) کیوں نہیں کہتے؟

عزیزانِ من! سوچیے تو سہی کہ یہ عجیب بات ہے۔ یہ نظامِ سرمایہ داری میں کتنا بنیادی نقص ہے کہ ان کام کرنے والوں کو تو ورکرز کہا جاتا ہے، انگریزی زبان میں اس دوسرے طبقے کے لیے کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ اُس کے لیے Employees اور Employer کے یہ لفظ تو ایجاد کیے ہیں۔ یعنی اُن کو Worker کے مقابلے اپنے آپ کو Un-Worker کہنے میں اتنی شرم آئی ہے، تو اُنہوں نے اپنی زبان میں لفظ ہی نہیں رہنے دیئے۔ تو ہمارے ہاں کونسا لفظ ہے۔ ایک تو محنت کش ہوتا ہے، تو دوسرا محنت خور ہوتا ہے لیکن یہ لفظ زبان میں نہیں آنے دیا کیونکہ اس سے بدنامی ہو جائے گی۔ کیا بات ہے قرآن کی! تم کہتے ہو کہ یہ ورکر اور پھر یہ دوسرا طبقہ ہے کہ جس کے لیے تم نے لفظ بھی نہیں چھوڑا یعنی اپنا نام ہی کچھ نہیں رکھا۔ قرآن کہتا ہے کہ تم کیا تفریق کر رہے ہو؟ **لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى** (53:39) جو کوشش نہیں کرتا وہ انسان ہی نہیں ہے، جو محنت ہی نہیں کرتا وہ انسان ہی نہیں ہے۔ اب ان کا جو بھی نام رکھ لو یہ انسان تو نہیں رہے۔ انسان تو وہی ہے جو محنت کرتا ہے اور اُس کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے۔ یہ کیا معنی ہیں کہ یہ ورکر ہے اور اُس کے بعد وہ Non-Worker ہے۔ سارے قرآن میں **یسعون** ہے کہ جو کچھ تم محنت کرتے ہو، جو کچھ تم کماتے ہو، جس کے لیے تم محنت کرتے ہو، تو **يُجۡزٰٮهُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰى** (53:41) پورے کا پورا وہ تمہارا ہے۔ تو اب دوسرا طبقہ کہاں سے آئے گا۔ بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ انہوں نے یہ بات کہی۔ نظر بظاہر نظر آ رہا ہے کہ اس کے جواب میں کوئی کیا کہے گا۔

لفظ الملاء کا مفہوم

ایک دکاندار یہ نہیں کہتا کہ ہاں صاحب! واقعی میں ڈنڈی مارتا ہوں، میں پورا نہیں تولتا، میں کم ماپتا ہوں۔ یہ کوئی نہیں اقرار کرتا، تو بڑے پیمانے پہ کون اقرار کرے گا؟ **قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ** (7:88)۔ قرآن نے یہ لفظ الملا ہر اس جگہ استعمال

کیا ہے جب اصلاح کی کوئی بات کسی بھی نبی نے آ کر کہی ہے تو قوم کا یہ طبقہ ہے جسے الملا کہتے ہیں' سامنے آتا ہے۔ اب ہمارے ہاں اس کا ترجمہ سرداران قوم یا رئیسانِ قوم کیا گیا ہے۔ قرآن تو بنیاد پہ چلا جاتا ہے۔ الملا کے معنی ہوتے ہیں ''وہ جن کے گھر کی کوٹھیاں دانوں سے بھری ہوئی ہوں' ''جناں دے بھانڈے بھرے ہوئے ہون''۔ اب دو ہی فریق ہیں ایک وہ کہ ''جناں دے بھانڈے بھرے ہوئے نیں' تے اک او کہ جناں دے خالی نیں' تے اوسویرنوں اُٹھ کے تے ٹُر جاندے نیں تہاڈی ول تے تسی جو کہندے او کردے نیں[1]''۔

عزیزانِ من! یہ قرآن کا کتنا جامع لفظ ہے۔ اور پھر اُس کے بعد جن کے برتن بھرے ہوئے ہوں ''جناں دی کوٹھی اچ دانے تے اوناں دے کملے وی سیانے''[2]۔ یعنی جن کے گھر کھانے کو ہو تو اُن کے پاگل بھی دانشمند گنے جاتے ہیں۔

دوسو گدھوں کی عقل ایک انسان جیسی نہیں ہوسکتی

آپ ذرا معاشرے پہ نگاہ ڈالیے۔ وہ جسے وہ کہہ گیا ہے:

که مغز دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

کہ پارلیمنٹ میں دوسو گدھا اکٹھا کرلو تو وہ ایک انسان جتنا نہیں سوچ سکتے۔ تو یہ گدھے کون ہوتے ہیں اور کیسے اُس پارلیمان کے اندر آ جاتے ہیں؟ یہ الملا الذین ہیں' یہ وہی آ سکتے ہیں جن کے گھر کے برتن بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ **قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا** (7:88) کھانے کو ملا اور استکبار آیا۔ اور دوسروں سے کہتے ہیں کہ ''کیوں بھئی! ہُن توں وی شملےنوں مایا لانڑی شروع کردتی' لواہ دیاں گے اک دن''[3]۔ عزیزانِ من! میں یونہی یہ افسانہ نہیں کہہ رہا' میں تو گاؤں کا رہنے والا ہوں اور ان علاقوں کا رہنے والا ہوں۔ واقعی یہ صورت ہوتی تھی۔ اُن کے برابر بیٹھ جانا تو کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جو پگڑی کا شملہ ہوتا تھا' وہ جو اتنا بڑا طرہ جسے کہتے ہیں' تو غریب کو اجازت ہی نہیں تھی کہ وہ اپنے شملے میں مایا لگائے۔ طرہ بازیاں تو ان کے لیے ہوتی تھیں۔ **الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ** (7:88)۔ کھانے کو ملا اور استکبار آیا۔ کھانے کو وہ کہ جو اپنی محنت سے نہیں کمایا۔ جو محنت سے کماتا ہے تو اُس میں استکبار پیدا نہیں ہوتا۔ جواب کیا مل رہا ہے؟ سن رہے ہیں کہ حضرتِ شعیبؑ سے کیا کہا تھا۔ کہا کہ اے شعیب **لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا** (7:88) یا تو یہ ہے کہ جیسا کچھ یہاں ہو رہا ہے تم اُسی روش کے اوپر آ جاؤ

---

1. جن کے برتن اناج سے بھرے ہوں اور ایک وہ جن کے خالی ہوں اور وہ صبح اُٹھ کر آپ کے پاس آ حاضر ہوتے ہیں کہ آپ جو کہیں' وہ کریں۔
2. جن کی کوٹھیاں اناج سے بھری ہوں ان کے پاگل بھی عقلمند سمجھے جاتے ہیں۔
3. کیوں صاحب! آپ آپ نے بھی اپنی پگڑی کے شملے (طرّے) کو کلف لگانا شروع کردیا؟ (ہاں بھئی!) اتروادیں گے ایک دن۔

اوراس قسم کی باتیں کرنا چھوڑ دو ورنہ تم اور تمہارے ساتھیوں کو مار مار کر گاؤں سے نکال دیں گے۔ یہ ساڑھے تین ہزار سال پہلے کا جواب ہی نہیں ہے بلکہ آج بھی یہی جواب ملتا ہے۔ کسی مزدور نے کھڑے ہوکر یہ کہا کہ صاحب! یہ تو بڑی کم اجرت ملی ہے تو وہ دوسرے دن اندر ہوتا ہے۔ کہا کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ وہی روش اختیار کرلو تو اب پیغمبرانہ بات آئی۔ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ (7:88) یعنی اگر ہمارا دل اُس کو نہ بھی مانتا ہو تو پھر بھی وہ روش اختیار کرلیں تو کیا تم یہ چاہتے ہو؟ جب میں نے تم سے یہ تقاضا نہیں کیا ہے کہ تم جس پہ دل نہیں ٹکتا' اُس چیز کو مان لو' میں تو بینات کی رو سے بات سمجھا رہا ہوں۔ اور تم اُسے یہ کہہ رہے ہو کہ اگر تم اُسے نہیں مانو گے تو گاؤں سے نکال دیں گے۔ تم اپنی اور میری روش دیکھو تو سہی۔ میں نے تو زبردستی نہیں کی تو تم مجھے بھی اُسی طرح سے سمجھاؤ۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اونچ اور نیچ کی ذہنیت پر استوار ہوتی ہے

عزیزانِ من! دیکھتے چلے جایئے کہ یہ قرآن کیا داستانیں بیان کررہا ہے۔ مرورِ زمانہ یا جو زمانے کا مزاج ہے کیا یہ ذرا بھی ان چیزوں کو جھلاتا ہے؟ اسی لیے قرآن کے متعلق خدا نے یہ کہا تھا کہ یہ وہ درخت ہے جس پہ کبھی خزاں ہی نہیں آئے گی' ہمیشہ تروتازہ رہے گا۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ جو تم کہتے ہو کہ ہم ایسا کریں تو پھر ہم کھائیں کیا اور ہم اُس میں سے کیا لیں؟ تو آپؑ نے کہا کہ اس روش کو چھوڑ دو جو تم دوسروں کی محنت میں سے لے لیتے ہو اور ان کو پورا نہیں دیتے۔ کہا کہ پھر کیا کریں؟ کہا کہ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (11:86) خدا کے نظام کے مطابق جو تمہیں حصہ ملے گا تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے بشرطیکہ تم اس بات کو سمجھو اور اس کے اوپر ایمان لے آؤ۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر یہ صورت ہو کہ تم جو کہتے ہو کہ یہ ورکر ہیں تو دوسرا طبقہ جو ہے جس کا نام ہی نہیں ہے تو بہرحال یہ نظام یوں چلتا ہے۔ کچھ کارخانہ دار ہوتے ہیں' کچھ مالک ہیں' کچھ اوپر والے ہیں اور کچھ مزدور ہیں تو اس طرح سے کام چلتا ہے۔ تم یہ کہتے ہو کہ جو محنت ہی نہیں کرتا ہے تو اُس کا اس میں کچھ حصہ ہی نہیں ہوتا۔ کہا کہ میں تو یہ نہیں کہتا ہوں بلکہ یہ تو خدا کہتا ہے۔

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام باہمی رفاقت اور برابری کی سطح پر پروان چڑھتا ہے

قرآنِ کریم نے اس کو باہمی تعاون کہا ہے' Co-operation کہا ہے۔ کوآپریشن میں اور مزدور و مالک کے اندر زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى (5:2) کام مختلف ہوتے ہیں' مختلف استعداد کے لوگوں کو مختلف کام کرنے ہوتے ہیں۔ ایک طرف وہ ہوتا ہے جو پلان ہی بناتا ہے تو وہ بھی کام ہی کر رہا ہے' ایک یہ ہے کہ جو Supervision (نگرانی) ہی کر رہا ہے کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو رہی ہو تو وہ بھی کام کر رہا ہے لیکن یہ سارے ایک دوسرے سے کوآپریٹ (تعاون) کر رہے ہیں۔ ان میں اونچ اور نیچ کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ تو باہمی تعاون ہے۔ یہ محنت کی مختلف شکلیں ہیں لیکن ان مختلف شکلوں کی بنا پر ان کے

مدارج میں فرق نہیں آ جاتا' شرف میں فرق نہیں آ جاتا' تکریم میں فرق نہیں آ جاتا۔ یہ سارے ایک جیسے ہیں۔ ایک مشین کے پرزے ہیں جس میں ایک پیچ کی بھی اتنی ہی اہمیت ہوتی ہے جتنی سپرنگ اور فرکی کی اہمیت ہوتی ہے۔ یاد رہا ہو تو وہ مثال سن لیجیے جو میں نے کہا ہے کہ سو سو روپے کے اگر سو نوٹ ہوں تو ان کو بکھرے ہوئے تو رکھا نہیں جا سکتا۔ ان کو اکٹھا اوپر نیچے رکھا ہوگا۔ کیا یہ جو سب سے نیچے کا نوٹ ہے اُس کی قیمت سب سے اوپر کے نوٹ سے کم ہوتی ہے؟ کیا اس بنڈل میں نوٹ کا مقام ان کی قیمتوں کا تعین کرتا ہے؟ یہ ہے تعاون۔ قرآن انسانیت میں تعاون چاہتا ہے۔ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ (11:86) وہ ہے تمہارے لیے خیر۔

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بات دکاندار کے ترازو یا اُس کے گز کے اوپر منحصر نہیں ہے۔ بات تو قرآن نے ایسے سمجھائی ہے کہ جس کو ایک عام فہم بدو بھی سمجھ لے' وہ بھی یہ کہے گا کہ صاحب! یہ بات ٹھیک ہے کہ پورا تولنا چاہیے۔ اور آج کا اکنامکس کا جو کنگ (ماہر) ہے تو وہ بھی بات کو سمجھے کہ اس نے بڑا صحیح کہا ہے کہ جو محنتی ہے اُس کو اُس کا پورا ملنا چاہیے اور اُس میں کمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہی نظام ہے جس میں انسانیت عدل کے اوپر چل سکتی ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے' یوں وہ بات سمجھاتا ہے۔ اب دوسری جگہ اس کے لیے ایک اور لفظ استعمال کیا ہے۔ کہا ہے کہ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ (83:1) تباہی ہے اُس نظام کے لیے جس کو نظامِ تطفیف کہا جاتا ہے۔ یہ کیا نظام ہے؟ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ . وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (83:2-3)۔ عام الفاظ میں اس کا ترجمہ یہی کیا جائے گا کہ جب دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا پورا' خون کے آخری قطرے تک لے لیتے ہیں اور جب دیتے ہیں تو وہ ایسا حساب ہوتا ہے کہ جس کے اندر کبھی ان کو وہ پورا نہیں دیا جاتا جو ان کو دیا جانا چاہیے۔

لفظ تطفیف کا قرآنی مفہوم

یہ ہے نظامِ تطفیف۔ مُطَفِّفِيْنَ وہ لوگ ہیں جو ایسا نظام قائم کرتے ہیں۔ تطفیف کے معنی عام طور پہ تو یہ ہوتے ہیں کہ ایک برتن تو پورا لبالب بھرا ہوا ہوتا ہے اور اُس بھرنے سے تھوڑا سا کم رہ جاتا ہے تو بنیادی معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ کسی کو دینا تو وہ بھرا ہوا پیالہ دینا چاہیے لیکن وہ اُس سے کم دیتا ہے۔ ابتدائی معنی یہ تھے۔ اب یہ لوگ آگے بڑھے۔ اونٹنی نے بچہ تو پورا دینا تھا لیکن قبل از وقت اُس کا بچہ لے لیا جائے تو وہ جس قسم کا ہوتا ہے تو یہ بھی تطفیف ہوتی ہے۔ اور آگے بڑھے۔ اونٹنی کے پاؤں باندھ دیئے جائیں کہ ان کی مرضی کے مطابق اُس کی رفتار ہو اور اپنی آزادی کے مطابق نہ چل سکے تو اسے تطفیف کہتے تھے۔ عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز۔ کیا وجد آور کتاب ہے۔ آج کے اکنامک سسٹم میں اس کو رکھ کے دیکھیے کہ کیا کہہ گیا ہے۔ یہ بزنس کا جو ہیڈ ہوتا ہے تو اُس کا اپنا ایک نقشہ ہوتا ہے کہ اس حد تک اس کو چلنے دینا ہے اور اس سے زیادہ نہیں چلنے دینا۔ یہاں تک اس کی صلاحیتیں برومند ہوں اور اس سے آگے نہیں ہونے دینی ورنہ یہ سر

چڑھ جائے گا۔ کہا کہ یہ جو تطفیف والے ہیں تو تباہی ہے اُس معاشرے کے لیے جس میں یہ کیفیت ہو کہ فرد کے اندر جتنی صلاحیتیں ہیں ان کو پورے کا پورا نشو و نما کا موقع نہ دیا جائے' ان کو نمود کا موقع نہ دیا جائے' ان کو عمل پیرا ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ نقشہ بنانے والا وہ ہے جو کام ہی نہیں کر رہا اور وہ اپنے منشا کے مطابق اور اپنے پروگرام کے مطابق اور اپنی اسکیم کے مطابق ان کو چلنے کی اجازت دیتا ہے اس سے زیادہ کی اجازت ہی نہیں دیتا۔

لفظ مُطَفِّفِيۡنَ کا مفہوم اور اس کا انجام

تو یہ ہے مُطَفِّفِيۡنَ۔ کہا کہ وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ (83:1) اس قسم کا نظام قائم کرنے والوں کے لیے اور اُس نظام کے لیے تباہی ہے۔ اب میں نے کہا تھا کہ قرآن کے الفاظ پہ آ ئیے۔ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ (83:2) جب لوگوں سے لیتے ہیں تو اُس کا پورا پورا لیتے ہیں۔ وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ (83:3) یہاں چیزیں نہیں کہا کہ چیزیں ماپتے ہیں یا تولتے ہیں بلکہ کہا کہ جب انسانوں کو ماپتے ہیں اور تولتے ہیں تو وزن پورا نہیں دیتے۔ ایں کتاب نیست چیزے دیگر است۔ یہی بات نہیں کہ چودہ سو سال پہلے یہ بات تھی۔ عزیزانِ من! کہنے کا انداز بے مثل و بے نظیر ہے۔ پہلا حصہ تو اشیاء تک ہی ہوگا کہ جسے آپ ماپ اور تول کہتے ہیں۔ تطفیف تو یہاں آئے گی کہ جب وہ انسانوں کو ماپنے اور تولنے لگتے ہیں تو وہ بھی پورا ماپ اور تول نہیں ہے۔ کہا کہ یہ ہے وہ نظام جس کا نتیجہ تباہی ہے۔ کہا کہ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ (83:4) کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارا یہ نظام ابدی ہے اور ہمیشہ تک رہے گا اور کوئی اس کو بگاڑ نہیں سکتا؟ یہ زعمِ باطل ہے' خود فریبی ہے' ان کا ظن ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ. لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍ (83:4-5) یہ راستے سے ہٹا دیئے جائیں گے۔ بعث کے معنی ہوتے ہیں کہ ''کسی کو راستے سے ہٹا کر خود آگے لگ جانا''۔ اسی لیے بعث آزادی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اب اس دور میں بھی یہ جو عربی جدید ہے' عراق کے اندر آپ نے بعث پارٹی دیکھی ہے۔ وہ یہی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہوتا ہے ''راستے کے موانعات کو ہٹا دینا''۔

یومِ عظیم عالمی سطح پر نظام ربوبیت کے نفاذ کا دور

اس ایت (83:4) میں کہا ہے کہ کیا تمہارا ظن یہ ہے کہ ہم نے ایسا انتظام کر لیا ہے' ان کی صلاحیتوں کو باندھ دیا ہے' یہ ہماری اسکیم سے زیادہ رفتار سے نہیں چل سکتے۔ تم سمجھتے ہو کہ ایسا کچھ کر لینے سے ہمیشہ کے لیے تمہارا یہ نظام قائم رہے گا جبکہ ہم نے وَيۡلٌ (83:1) کہا ہے کہ تباہ ہوگا۔ یقیناً تم راستے سے ہٹا دیئے جاؤ گے۔ کب ہٹا دیئے جاؤ گے؟ لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍ (83:5) بہت بڑے انقلاب کے دن یا دور میں۔ اب یہ کہہ کر ہمارے تخیل پر نہیں چھوڑ دیا کہ ہم خود فیصلہ کریں کہ وہ کونسا عظیم انقلاب کا دور یا دن کہا ہے۔ کہا

کہ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) جس دن یا دور میں کوئی ایک گروہ یا ایک پارٹی یا فرقہ نہیں بلکہ انسانیت تمہارے نظام سے تنگ آ کر ربوبیتِ عالم کے لیے کھڑی ہوگی تو اُس دن یا دور میں تم راستے سے ہٹا دیئے جاؤ گے۔ یہ ہے یومِ عظیم۔ یہ تمہارا نظام عالمگیر ہو جائے گا۔ اور آج ساری دنیا پہ تمہاری یہ اکنامکس (معاشیات) چھائی ہوئی ہے کہ تم انہیں پورا دو گے ہی نہیں اور ان کو باندھ کر رکھو گے۔ ٹھیک ہے انفرادی طور پہ، محدود حلقوں کے اندر تم یہ کرتے چلے جاؤ گے تو یہ ہوتا جائے گا لیکن جب یہ الناس تک 'انسانیت تک' پھیل جائے گا تو پھر اس کے بعد وہ جسے تنگ آمد بجنگ آمد کہتے ہیں، وہ ہوگا۔ وہ پھر کاہے کے لیے کھڑے ہونگے؟ کہا کہ فساد کے لیے نہیں، دھاندلی کے لیے نہیں، خود لوٹنے کے لیے نہیں۔ خود لوٹنے والی بات میں تو ایک قسم کے جو مطفف ہیں، اُس میں دوسری قسم کے مطفف آ جائیں گے بلکہ یہ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الناس جب ربوبیتِ عالمینی کے لیے کھڑے ہو جائیں گے تو اُس دن یہ راستے سے ہٹا دیئے جائیں گے [1]۔ یہ تھا پیغام حضرتِ شعیبؑ کا۔

دین اور مذہب میں فرق

اب ایک بڑی اہم بات سامنے آ رہی ہے۔ وہ دین اور مذہب کا فرق آ رہا ہے۔ پھر سن لیجیے کہ بات قریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے کی ہو رہی ہے۔ نظر آ رہا ہے کہ ان لوگوں نے حضرتِ شعیبؑ کو ایک مذہبی رہنما یا ایک روحانی پیشوا سا ہی ذہن میں سمجھا ہوگا اور یہ بھی نظر آتا ہے کہ یہ ابھی ابتدائی دور کی بات ہے، ابھی اتنی قوت حاصل نہیں ہوئی۔ انہوںؑ نے اُن سے کہا کہ تم مجھے صلوٰۃ کی اجازت دیتے ہو۔ قرآن میں لفظِ صلوٰۃ ہے جس کا ترجمہ ہمارے ہاں نماز ہو گیا ہے۔ نماز تو عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے، یہ تو قدیم فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن میں اور عربی زبان میں تو صلوٰۃ ہی ہے۔ میں اس میں چلا گیا تو زیادہ وقت لگ جائے گا۔ مختصراً کہتا ہوں کہ اُنہوں نے اپنے ذہن میں سمجھ لیا کہ ٹھیک ہے پوجا پاٹ ہی کی بات ہے، ہم اپنے ہاں اس طرح سے ناقوس بجا کر، گھنٹیاں بجا کر، پھول چڑھا کر پرستش (Worship) کر لیتے ہیں، گرجے والے کچھ سنکھ بجا کر اپنے ہاں گا لیتے ہیں، یہ بھجن گا لیتے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ یہ اپنے ہاں نماز پڑھنے کے لیے کہتا ہے تو کوئی بات نہیں، ہمارا اس سے کیا بگڑے گا۔ اور آپ کو جیسے معلوم ہے کہ نماز پڑھنے کی اجازت تو ہر حکومت دیتی ہے۔ انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں پہلا اعلان جو ملکہ کا ہوا تھا تو اُس میں یہ تھا کہ انہیں Religious Freedom (مذہبی آزادی) ہے۔ وہ نماز روزے میں دخل ہی نہیں دیتے تھے۔ اُنہوں نے بھی یہ سمجھ کر کہ کوئی بات نہیں ہے، یوں پڑھ لے گا تو ہمارا کیا بگاڑ

---

[1] اس کی مکمل تشریح و تبئین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 مکمل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2006، ص ص۔ 282 تا 342۔

لے گا۔ان کے ساتھ Agreement (معاہدہ) ہوگیا' کہ مجھے صلوٰۃ کی اجازت ہوگی اور تم اس میں دخل نہیں دو گے۔قرآن آگے یہ تو نہیں بتاتا کہ ہوا کیا تھا لیکن ان کی طرف سے اعتراض سن لیجیے۔کہا کہ **یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ تَاۡمُرُکَ اَنۡ نَّتۡرُکَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَآ** (11:87)اے شعیبؑ! یہ ہے تمہاری صلوٰۃ۔ہم نے تو کہا تھا کہ نماز پڑھ لیا کرو اور کچھ پوجا پاٹ کر لیا کرو۔

حضرت شعیب ◆ کی صلوۃ پر قوم کا اعتراض

یہ ہم نے Agreement (معاہدے) کے اندر وہاں صلوٰۃ لکھ دیا تھا تو یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے؟ پہلی بات تو وہ یہ کہتی ہے کہ ہم اپنے ہاں کے جو اسلاف کا طور طریق چلا آ رہا تھا وہ بالکل غلط تھا اور اُس کی محکومیت اختیار نہیں کی جا سکتی۔عزیزانِ من! اگلی بات یہ ہے کہ **نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا** (11:87) تمہاری یہ نماز کس قسم کی ہے کہ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنا مال بھی اپنی مرضی سے صرف کر سکیں' یہ کس قسم کی نماز ہے''اسی کتھے پھنس گئے ❶''؟ اُنہوں نے صلوٰۃ لکھایا ہوگا۔اِدھر سے ہم نے ان سے نماز مانگا اور اُنہوں نے اس کا ترجمہ Prayer کیا۔دن رات کرتے رہو ہمیں کیا۔اور پھر وہ محکوم تو Prayer کے سوا جانتا ہی کچھ نہیں ہے۔

نظامِ صلوٰۃ کی وسعت

عزیزانِ من! صلوٰۃ وہ ہے جس کا دائرہ وہاں تک وسیع ہے' یہ **اَمۡـــوَالِـنَـــا** (11:87) والی بات ہے۔یہ صلوٰۃ جو اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں۔کیا کہتی تھی صلوٰۃ؟ یہ کہ یہ مال کہاں خرچ کرو؟ کیا یہ کہتی ہے کہ ہم' جس طرح ہمارا جی چاہے' دولت نہ حاصل کریں' اور نہ ہی جس طرح جی چاہے اُسے خرچ کریں؟ چہ خوب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے آباؤاجداد جن سے یہ موجودہ نظام منتقل ہو کر چلا آ رہا ہے' سب ظالم اور جاہل تھے اور **اِنَّکَ لَاَنۡتَ الۡحَلِیۡمُ الرَّشِیۡدُ** (11:87) عقل وفہم' تحمل اور بردباری تمہارے حصے میں آ گئی! یہ غریبوں کے غمگسار' مخلصوں کے ہمدرد' بھوکوں کے بہی خواہ' اس قسم کے رقیق القلب' یہ ساری دنیا کے اندر تم ہی ہو اور کوئی نہیں ہوگا! اور پھر یہ نہیں کہ یہ محض جذباتی چیز ہے بلکہ الرشید بھی ہے۔صحیح راستہ ہی یہ ہے' میرے جذبات کا تعلق نہیں ہے کہ تم کہہ دو کہ یہ تمہاری رقیق القلبی کا ہے۔یہ بھی تو ہوتا ہے کہ محض اپنی رقت کے جذبات جو ہوتے ہیں تو وہ تو اعصابی Weakness (کمزوری) ہوتی ہے۔عزیزانِ من! لفظ پہ تو غور کیجیے کہ دل تو تمہارا اتنا غمگسار ہے لیکن یہ بات نہیں ہے کہ جذباتی طور پہ تمہارے دل میں یہ بات اُٹھتی ہے۔تم الرشید ہو۔

---

❶ ہم کہاں آ پھنسے؟

جذباتی غمگساری کے ساتھ الرشید ہونا بھی ضروری ہے

ہمارے ہاں نماز کے بعد جو مدد ہوتی ہے‘ وہ اس طرح سے ہوتی ہے کہ آدمی دوسرے کے اوپر ترس کھاتا ہے‘ غمگساری کرتا ہے۔ ہم دوسروں کے جذبات سے اپیلیں کرتے ہیں کہ ”اوئے تینوں ایہدے تے ترس نہیں اوندا ہیگا“[1]؟ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ہم الرشید نہیں ہوتے۔ اس میں یہ بات ہے کہ Rationally ہو کہ تم دوسرے کے غم اور بھوک کے اوپر تڑپ اٹھو لیکن جذباتی طور پہ نہیں بلکہ رشید ہو کر۔ عزیزانِ من! میں یہ بات تو بیان ہی نہیں کرسکتا۔ نماز میں آپ کو حلیم تو ملیں گے‘ اگرچہ اُس میں سخاوت والے سنگدل زیادہ ہوتے ہیں‘ الرشید نہیں۔ ان حلیموں نے بنک میں وہ رجسٹر کھول رکھا ہوتا ہے کہ ایک نماز پڑھنے سے آٹھ دن تک کے لیے گناہ معاف ہو گئے۔ صلوٰۃ کے نظام کی کیفیت تو قلب کی تبدیلی بھی ہوتی ہے یعنی نیست ایں کارے فقیہاں اے پسر! خالص قانون کی بات نہیں ہے۔

صلوٰۃ کا نظام خالصتاً جذباتی نہیں ہوتا بلکہ قلب و نگاہ کی ہم آہنگی کا بھی متقاضی ہوتا ہے

جب آپ کہتے ہیں کہ Keep to the Left[2] تو جو شخص ساری عمر Left (بائیں ہاتھ) پہ چلتا ہے تو وہ قانون کا بڑا ہی پابند ہوتا ہے عملدرآمد کرنے والا ہوتا ہے لیکن نہ وہ حلیم ہوتا ہے اور نہ رشید ہوتا ہے۔ یہ پابندی نہ تو اُس کے جذبات کو متاثر کرتی ہے اور نہ عقل وفہم کی رو سے ہوتی ہے۔ حکومت نے کہا کہ Keep to the Left اور وہ Left (بائیں ہاتھ) پہ چلا جارہا ہے۔ اگر وہ کل کو کہیں کہ Keep to the Right[3] تو وہ Right (دائیں ہاتھ) پہ چلنا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے بھیڑ چلتی ہے ویسے ہی یہ چلتا ہے لیکن الصلوٰۃ وہ ہے جو کسی غیرِ خدا کی معبودیت کی اجازت بھی نہیں دیتی اور کسی کو یہ بھی حق نہیں دیتی کہ وہ اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف کر سکے‘ اور یہ جو نظام قائم ہوتا ہے‘ وہ نہ تو خالص جذبات سے ہوتا ہے اور نہ صرف آپ کے ہاں فلسفہ پہ قائم ہوتا ہے‘ اس میں جو جذبات اور فکر ہے‘ جو قلب اور دماغ ہے‘ ان دونوں کا تعاون نہایت ضروری ہے۔ اگر قلب جذباتی ہو کہ دوسرے کے غم کے اوپر آنکھ کے راستے سے بہہ نکلے تو سنو:

ہیرا بھی ہو دل تو پتھر ہے
کچھ قدر نہیں یوں ہوتی ہے

---

1. ارے! کیا تجھے اس پر ترس نہیں آتا؟
2. بائیں ہاتھ چلو
3. دائیں ہاتھ چلو

ہاں آنسو ہو کر بہہ نکلے
پھر جو قطرہ ہے وہ موتی ہے

یہ جذباتیت ہے۔

جذبات کی بنیاد پر اُٹھی ہوئی عمارت کبھی مستحکم نہیں ہوتی

حلیم تو یہ ہے کہ دوسروں کی مصیبت کے اوپر آنکھوں سے یہ قطرے موتی بن کر نکلیں لیکن یہ صرف جذبات نہیں ہیں۔ جذبات کے اوپر آپ کے ہاں جو کوئی بھی نظامِ تعمیر ہوگا' اُس کو دوام نہیں ہوگا' استحکام نہیں ہوگا' ابدیت نہیں ہوگی۔ یہ تو Emotional (جذباتی) چیز ہے۔ اسی لیے آپ کے ہاں اتنی خیرات ہے لیکن وہ کوئی مفید کام نہیں کر رہی بلکہ وہ جذباتی ہوتی ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے کہ خیرات کی طرف نہ جاؤ' اس سے دینے والے کے دل میں تکبر پیدا ہوتا ہے اور لینے والے کے دل میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ۔ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (51:19) ضرورت مند کا یہ حق ہے اور وہ As of Right (بطورِ حق) تم سے اس کو لے سکتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ خیرات نہیں ہے' خیرات جیسی ذلیل چیز تو کوئی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ صرف حلیم ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اُس کے ساتھ رشید ہونا بھی ضروری ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ٹھیک ہے کہ ''قرآن دماغ کے راستے قلب پہ جاتا ہے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ قلب کے راستے دماغ کی طرف بھی آ جاتا ہے''۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ قرآن کی رو سے اس میں فرق ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس کو حلیم بھی اور رشید بھی' بیک وقت یہ دونوں ہی کہتا ہے: اُسے حلیم بھی ہونا چاہیے اور اُسے رشید بھی ہونا چاہیے۔ صلوٰۃ کا نظام یہ ہے جس میں کوئی شخص اپنے مال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف نہیں کر سکتا' یہ انسان کے اندر ایک ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ ایک ہی وقت میں حلم بھی ہوتا ہے اور رشد بھی اُس کے اندر ہوتا ہے۔ حضرتِ شعیبؑ کا پیغام یہ تھا۔ جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ اُنہوں نے اس کی مخالفت کی اور کرنی ہی تھی۔ مخالفت کی اور اُس کے بعد یہ ہوا کہ فَکَذَّبُوۡہُ فَاَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ [1] (29:37)۔ انداز ایسا کہا ہے کہ رات کو جیسے بڑے اطمینان سے سوئے' صبح اُٹھے تو سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔

اگر کسی قوم کی شعوری آنکھ نہ کھلی ہو تو وہ جاگتی ہوئی بھی سو رہی ہوتی ہے

یوں نہیں ہے کہ یہ چار گھنٹے یا دس گھنٹے کی کوئی بات ہوئی ہے بلکہ یہ نہایت اطمینان سے خود فریبی کے اندر زندگی بسر کر رہے تھے' سو

---

[1] انہوں نے شعیبؑ کی تکذیب کی تو (آخر الامر) انہیں زلزلے کی تباہی نے اس طرح آ پکڑا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرے ہوئے پائے گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 918)۔

رہے تھے، یعنی جاگتے بھی سو رہے تھے اور جب شعور کی آنکھ کھلی ہے تو اردگرد سب کچھ کھنڈر ہو گیا ہوا تھا:

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را

تم نے غور کیا کہ شمع نے پروانے کا ناحق خون کیا۔

چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کنند

اُس نے اتنی بھی مہلت نہیں دی کہ رات سے صبح ہی کر دے بلکہ صبح سے پہلے ہی بجھا دی۔ یہ ہے **فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ** (29:37) رات سوئے تو بھلے چنگے، صبح اٹھے تو بجھی ہوئی شمع تھی اور بس اُس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا جو بتا رہا تھا کہ ان کی داستان کیا تھی؟

عزیزانِ من! سورۃ العنکبوت کی آیت 37 تک آ گئے ہیں اور اُس کے بعد قرآن پھر دوسری اقوام کی طرف اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہم ان کی داستانیں پہلے بیان کر چکے ہوئے ہیں۔ 38ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



گیارھواں باب: **العنکبوت** (آیات 38 تا 44)



عزیزانِ من! آج جون 1979ء کی پہلی تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 38 سے ہو رہا ہے: (29:38)۔

قرآنِ حکیم میں بیان کردہ تاریخی واقعات انسانیت کے لیے سبق آموزی کا ذریعہ ہیں

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے درسوں میں اقوامِ گزشتہ یا انبیائے سابقہ کی داستانیں ہمارے سامنے آ رہی تھیں ۔ میں نے اس امر کی وضاحت کی تھی کہ یہ داستانیں تاریخی نوشتیں نہیں ہیں بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ انسان اپنے لیے ایک غلط نظامِ زندگی وضع کرتا ہے اور اُس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے ۔ یہ حضراتِ انبیائے کرامؑ آتے تھے اور ان لوگوں کو Warn (تنبیہ) کرتے تھے' تنذیر دیتے تھے' آگاہ کرتے تھے کہ اس روشِ زندگی کا نتیجہ بڑا ہی تباہ کن ہوگا۔ اور اُس کی جگہ وہ صحیح نظامِ زندگی ان کے سامنے پیش کرتے تھے ۔ ویسے تو وہ پورا

نظام ہوتا تھا لیکن کسی خاص قوم یا خاص ملک یا خاص زمانے میں جو خرابی سب سے زیادہ عالمگیر ہوتی تھی یا عام ہوتی تھی یا زمیں گیر ہوتی تھی تو وہ نمایاں طور پر اس کے خلاف جدوجہد کرتے تھے۔ اور قرآنِ کریم بھی اُس نظام کے اُسی ایک گوشے کو نمایاں طور پہ سامنے لاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اگر ان تمام گوشوں کو یکجا کر لیا جائے تو ایک طرف باطل کا نظام اپنے تمام عناصر کے ساتھ یکجا سامنے آتا ہے اور اُس کے برعکس انبیائے کرامؑ نے جو کچھ کہا تھا اگر اُس کو بھی یکجا کر لیا جائے تو وہ صحیح آسمانی نظام کا گلِ سرسبز یا ایک گلدستہ بن جاتا ہے۔ یعنی وہ مکمل نظام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور یہ جو مکمل نظام ہے آخرالامر قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا اور اُس کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا کہ اُس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ یہ ہے قرآنِ کریم کی تعلیم اور اُس میں جو تاریخی شواہد آئے ہیں ان کا مقصد۔

ہم نے یہ دیکھا تھا کہ قرآنِ کریم نے حضرتِ نوحؑ سے بات شروع کی' پھر قومِ عاد' قومِ ثمود' حضرتِ موسیٰ ◆' قومِ مدین' حضرتِ شعیب' قومِ لوط ◆' حضرتِ ابراہیم ◆' ان تمام کے تذکارِ جلیلہ اور ان قوموں کی داستانیں ایک ایک کر کے ہمارے سامنے آتی گئیں۔ اُن میں بتایا گیا کہ وہ کونسا غلط نظام یا غلط نظام کی کونسی شق تھی جس کی وجہ سے ان کی تباہی ہوئی۔ اس لیے کہ اُنہوں نے ان انبیا کی بات نہ مانی اور اپنی ضد پر اڑے رہے اور اُس کا نتیجہ تباہی ہوا۔ یہ سارا کچھ گنانے کے بعد قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ پھر وہ نہایت مختصر الفاظ میں Sum-up (تلخیص) کرتا ہے اور وہ ارتکازی طور پر چند لفظوں میں بتا دیتا ہے کہ اصل حقیقت کیا تھی' وہ نقطہء ماسکہ کیا ہے' اُنہوں نے غلطی کیا کی تھی اور اُس کا انجام ایسا کیوں ہوا۔ ان تمام قوموں کے بعد کہتا ہے کہ وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَا (29:38) اور اسی طرح عاد و ثمود کے ساتھ ہوا' یعنی پیچھے سے اور قوموں کی داستان کا ذکر تھا اور ان دو کا خاص طور پہ یہاں ذکر کیا ہے اور دو چار کا ذکر آگے کرے گا۔

قرآن کریم قوموں کی تباہی کا تذکرہ صرف نظری طور پر نہیں کرتا

قرآن کریم نے بتایا کہ وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَا وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ [1] (29:38)۔ اب دیکھیے کہ قرآن صرف نظری بات نہیں کرتا کہ ذہنی طور پر تم تصور میں لاؤ کہ وہ قومیں کس طرح سے تباہ ہوئیں بلکہ کہا کہ صبح شام تمہارے قافلے یہاں سے چلتے ہیں۔ مکہ بہت بڑا تجارتی مرکز تھا' یمن سے بھی قافلے چلتے تھے اور اس راستے سے گزر کر شام تک جاتے تھے۔ اُس زمانے میں یہی ایک اتنا علاقہ تھا جو ان عربوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ جتنے سابقہ انبیائے کرامؑ کے واقعات بتائے ہیں' ان کی اپنے اپنے زمانے میں بستیاں اسی شاہراہ کے قرب و جوار میں واقع ہوئی تھیں۔ یہ ان کے جو قافلے جاتے تھے تو وہ ان بستیوں کے کھنڈرات کے اوپر سے ہوتے ہوئے جاتے تھے۔ قرآن یہ بات کہتا ہے کہ ان پہ کیا بیتی' ان پہ کیا گزری' ان کا مآل' انجام کیا ہوا' یہ ہم سے نہ پوچھو بلکہ تمہارے قافلے جو صبح و شام ان کے کھنڈرات سے گزرتے ہیں' ان کھنڈرات کی ویران شدہ اینٹوں پہ یا ان کے پتھروں پہ ان کی داستانیں زبانِ حال سے پکار

---

[1] اور اسی طرح عاد و ثمود کے ساتھ بھی ہوا جن کی تباہی کی داستانیں' ان کے مکانوں کے کھنڈرات سے ظاہر ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 918)۔

پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اپنے وقتوں میں یہ لوگ کتنی بڑی تہذیب کے حامل تھے اور اُس کا انجام کیا ہوا۔ آپ دیکھیے کہ ہمارے دور میں اثریات (Archaeology) نے ایک سائنس کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آئے دن اخباروں میں آتا ہے کہ فلاں جگہ نئی کھدائی شروع ہوئی ہے اس لیے کہ وہاں نیچے سے کچھ آثارِ قدیمہ ان کو نظر آئے ہیں۔ پھر وہ بڑی احتیاط سے کھدائی ہوتی ہے کہ کہیں کوئی ذرا سا ٹکڑا ٹوٹ نہ جائے۔ اور اُس کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ پرانے برتنوں کے ٹکڑے، وہاں کے زیورات، کپڑے، پارچات، اینٹیں، پتھر، عمارتوں کا انداز، یہ تمام چیزیں ایک ایک کر کے اُس کھدائی سے اکٹھا کرتے ہیں۔ اور اُس پر پھر اُس دور کی تہذیب اور تمدن اور نظامِ زندگی کی ایک تاریخ ان ذرائع سے لکھی جاتی ہے۔ اب غور کیجیے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں تو ابھی آرکیالوجی (اثریات) کا اس طرح کا سائنٹفک تصور بھی سامنے نہیں آیا تھا لیکن قرآن یہ بات کہتا ہے کہ یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ قومیں اپنی تہذیب کے کس اوجِ کمال پہ پہنچی ہوئی تھیں اور اُس کے بعد ان کا انجام کیا ہوا تو تم آرکیالوجی (اثریات) کے نقطۂ نگاہ سے تحقیق کرو تو بات سمجھ میں آجائے گی۔ بات تو صرف اتنی ہی کی ہے کہ قَدْ تَّبَيَّنَ (29:38) یعنی بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ وہ قومیں کیسی تھیں اور ان کے ساتھ کیا ہوا۔ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ (29:38) یہ جو ان کے آثارِ قدیمہ تمہیں نظر آ رہے ہیں، کچھ تو زمیں دوز ہوتے ہیں اور کھدائیوں کے بعد نکلتے ہیں اور بہت سے تو سطح کے اوپر پڑے ہوئے ہوتے ہیں، کہا گیا ہے کہ تم ان کھنڈرات سے آنکھیں بند کر کے نہ نکل جاؤ کیونکہ ان کی تو ایک ایک اینٹ اپنے عہدِ گزشتہ کی پوری داستان اپنے اوپر منقوش رکھتی ہے۔ اُسے ذرا چشمِ بصیرت سے پڑھو، غور کرو تو تمہیں نظر آئے گا کہ یہ کھنڈرات کس طرح اپنی ان اقوام کے مرثیہ خواں ہیں جو کسی زمانے میں ان محلات کے اندر رہتی تھیں۔

اب دیکھیے کہ قرآن کہتا ہے کہ ہوا کیا تھا، یعنی ان کی تفصیل پیچھے بیان کرتا آیا ہے، ایک ایک جزئیات تک کی چیزیں ہمارے سامنے آ گئی تھیں کہ ان کا غلط نظام کیا تھا، کیوں غلط تھا، اُس کے نتائج کیا تھے۔ یہ ساری چیزیں ایک ایک کر کے وہاں بیان کی ہیں لیکن یہاں دو لفظوں کے اندر Crystalize (مرتکز) کر کے، ارتکازی طور پر بات بیان کی ہے۔

برائی میں اچھائی نظر آنے پر انسان کی کیفیت اور احساسِ زیاں کی اہمیت

عزیزانِ من! یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔ کہا ہے کہ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (29:38)۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ کوئی شخص غلط کام کرتا ہے، بُرا کام کرتا ہے، تو اُسے بُرا سمجھتا ہے اور اُسے احساس ہوتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ اُس کی اصلاح کا تو امکان ہے اور وہ بات آسان بھی ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا ہوتا ہے وہ بہر حال عادتاً کر رہا ہوتا ہے، اُس میں اُسے احساسِ ندامت ہوتا ہے، وہ خود سمجھتا ہے کہ یہ غلط چیز ہے، یہ بُرا کام ہے اور مجھے یہ چھوڑنا چاہیے۔ صرف اُس کی Will Power یعنی قوتِ ارادی کو تقویت پہنچانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب وہ سمجھتا ہے کہ بُرا ہے اور عام طور پہ نہیں چھوڑتا تو اُس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قوتِ ارادی کمزور ہے، تو قرآن

اُس کا بھی علاج بتاتا ہے لیکن ایک منزل اُس کے بعد آگے جا کر آتی ہے کہ معاشرہ میں وہ برائی اس قدر عام ہوجاتی ہے کہ وہ برائی برائی نظر نہیں آتی۔ وہ عیب ہُنر بن جاتا ہے۔ کہا ہے کہ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ (29:38) اُن کے بیباک جذبات نے ان کی غلط کوشیوں کو بڑا مزین کر کے ان کی نگاہوں میں بسا دیا۔ پرانے زمانے کی داستانوں کو تو چھوڑ دیئے' آپ بیس پچیس سال پہلے کی تاریخ سامنے رکھیے تو آپ دیکھیں گے کہ بیشمار ایسی برائیاں ہونگی جو اُس زمانے میں ہر شخص انہیں برا کہتا تھا اور برا سمجھتا تھا۔ اگر کوئی مجبوراً یا معذوراً اُسے کرتا تھا تو اُسے چھپاتا تھا' نمایاں ہونے نہیں دینا چاہتا تھا' اُس کے اندر ندامت ہوتی تھی۔ اور آج آپ دیکھیے کہ وہ برائیاں اعلانیہ کی جاتی ہیں' نہ کوئی کسی سے چھپاتا ہے' نہ ذکر کرتا ہوا شرماتا ہے' نہ اُس کو بُرا سمجھتا ہے۔ کسی سے بھی کہیے تو وہ کہے گا کہ ''جی سارے کر دے ہیگے نیں' جے میں کیتا تے تاں کی ہوگیا[1]''! جب یہاں تک بات پہنچ جائے کہ بُرائی بُرائی نہ رہے بلکہ مزّین بن کر دکھائی دینے لگ جائے تو قوم تباہ ہوجاتی ہے۔ یہ وہی ہے جسے اقبالؒ (1938-1877) نے احساسِ زیاں کہا ہے:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

قوم اُس وقت تباہ ہوتی ہے جب وہ برائی کو برائی نہ سمجھے بلکہ وہ اُسے مزین بن کر دکھائی دے۔ آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح قرآن دو لفظوں میں یہ کہہ گیا ہے کہ جب اُس برائی کی شکل یہاں تک پہنچ جائے تو پھر اصلاح کی کوئی صورت یا امکان باقی نہیں رہتا تو پھر تباہی آ کر رہتی ہے۔ بُرائی مزین ہو کر دکھائی دینے لگتی ہے۔ کہا کہ اصل میں جذبات بیباک ہوجاتے ہیں تو اُس وقت یہ شکل پیدا ہوتی ہے کہ پھر وہ عیب بھی ہنر بن کر دکھائی دیتا ہے۔ جب یہ چیز اس درجے تک راسخ کر جائے اور ایک وبائی مرض کی طرح عام ہی نہ ہوجائے بلکہ برائی حُسن بن کر نظر آنے لگ جائے تو کہا کہ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ (29:38) یہ ہے وہ مقام جہاں پھر یہ قوم صحیح راستے کی طرف نہیں آ سکتی' ان کی یہ روش' ان کے جذبات کی سرکشی' برائی کا حسن بن کر محسوس ہونا ان کے راستے میں روک بن کر کھڑا ہوجاتا ہے' یہ بات ان کو صحیح راہ کی طرف نہیں آنے دیتی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دو دو لفظوں میں قرآن کیا بات کہہ گیا ہے!

تمکن' تدبر' شعور کے باوجود تباہی و بربادی کی بنیادی وجہ

یہ کہا جاسکتا ہے کہ صاحب! وہ کوئی بے وقوف سی یا احمق یا جاہل سی قوم ہوگی ورنہ یہ کوئی بات نہیں ہے کہ وہ سمجھ سوچ رکھنے والی قوم ہو' علم و ہنر رکھنے والی قوم ہو' غور و فکر رکھنے والی قوم ہو تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ سنکھیے کو تریاق سمجھنے لگ جائے۔ ذہن میں یہ آتا ہے کہ ان قوموں نے جہالت کی بنا پہ کچھ ایسا کیا ہوگا۔ قرآنِ کریم چودہ سو سال پیشتر یہ بات کہتا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ وہ قومیں جاہل تھیں یا ان کو علم نہیں تھا۔ کہا کہ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (29:38) وہ اربابِ بصیرت تھے۔ آپ غور کیجیے۔ اب یہ ایک بڑی اہم بات ہے جو قرآن نے

---

[1] سبھی یہی کرتے ہیں اگر میں نے کرلیا تو کیا ہوا!

کھدی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ مُسْتَبْصِرِيْنَ ہوتے ہوئے' غلط نظام اور غلط روش کے اوپر اصرار اور ضد کے ساتھ اس طرح چلے جانا کہ وہ مستحسن بن کر دکھائی دینے لگ جائے۔ قرآن نے یہاں لفظ بصیرت استعمال کیا ہے یعنی وہ جو بصیرت رکھنے والے لوگ ہوں' وہ جو مُسْتَبْصِرِيْنَ تھے اُس کے باوجود ان کی یہ کیفیت ہوگئی۔ دوسرے مقام پہ اس کی ذرا اور وضاحت کی ہے۔ اُنہی اقوامِ سابقہ کی تباہیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن اُس زمانے کی مخاطب قوم عرب یا قریش سے کہتا ہے کہ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ (46:26) یہ قومیں جن کی داستانیں ہم تم سے بیان کرتے ہیں' یہ تم سے زیادہ صاحبِ تمکن تھیں' ان کو تم سے زیادہ اقتدار حاصل تھا' مملکت حاصل تھی' وہ کمزور نہیں تھیں۔ یہ چیز غور طلب ہے کہ ان کو تمکن حاصل تھا۔ یعنی وہ قوم اس لیے تباہ و برباد نہیں ہوئی تھی کہ کمزور تھی۔ قرآن بڑی عظیم حقیقتیں بیان کرتا جاتا ہے۔ انتہائی تمکن کے اندر تباہی کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا یہ بات ہوگئی کہ قوت' اقتدار' تمکن تو کسی طرح سے حاصل ہو گیا ہوگا لیکن وہ قوم جاہل ہوگی کہ اُس کے باوجود تباہ ہوگئی؟ قرآن کہتا ہے کہ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً (46:26) وہ جاہل نہیں تھی۔ قرآن جہاں بھی علم وفکر اور تدبر وشعور وبصیرت کی بات کرتا ہے تو یہ جو علم حاصل کرنے کے ذرائع ہیں' ان کا ذکر کرتا ہے کہ یہ سماعت رکھتے تھے' بصارت رکھتے تھے' وہ ایک سمجھنے والا دل بھی رکھتے تھے۔

عزیزانِ من! انسان کے جو حواس ہیں یہ باہر کی اطلاعات اُس تک پہنچاتے ہیں' یہ اُس کو خبر دیتے ہیں۔ اور اُس کے بعد پھر اگلی چیز اَفْئِدَةً ہے کہ یہ ساری چیزیں اندر جا کر فیصلہ کرتی ہیں کہ یہ کیا ہوا ہے اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس اَفْئِدَةً کے لیے ابھی تک کوئی لفظ نہیں ہے' Mind کا ایک لفظ تھا جو ان لوگوں نے کبھی اس کے لیے تراشا تھا لیکن وہ بھی آگے چل کر وہ معنی نہ دینے لگا کیونکہ جب اُس کا اِنہوں نے Adjective (اسم صفت) بنایا تو وہ Mental بنایا اور یہ Mental پھر Mental Hospital (ذہنی امراض کا ہسپتال) ہوگیا۔ یعنی اُنہوں نے صرف دماغی خرابی بتائی۔ اسی لیے ان کو Mind کا لفظ چھوڑنا پڑا کہ اُس سے نگاہ انسان کے Physical Brain (جسمانی دماغ) کی طرف جاتی تھی۔ اور اب ان کی یہ سائیکولوجی اس نتیجے پہ پہنچی ہے کہ یہ Physical Brain (جسمانی دماغ) اور اُس کے Cells (خلیوں) کا کام نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے اندر ایک اور قوت ہے۔ اتنی سی بات کہ اگر آپ کو بندوق کے چلنے کی آواز آتی ہے تو ٹھیک ہے کان میں آپ کے آواز آئی اور یہ چیز تو Physical Mind (جسمانی دماغ) عادتاً فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ بندوق کی آواز ہے اور کسی نے گولی چلائی ہے۔ اُس کے بعد چیخ کی آواز آتی ہے اور وہ بھی آپ کا دماغ اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ انسان کی آواز ہے' ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ معلوم ہو کہ یہ میرے کسی دوست کی آواز ہے۔ اگلی جو بات ہے کہ اُس کے بعد آپ کا جو Re-action (ردِّعمل) ہوتا ہے تو یہ دماغ کا فعل نہیں ہے۔ دشمن کی آواز ہے تو اور Re-action (ردِّعمل) ہوگا' دوست کی آواز ہے تو اور Re-action (ردِّعمل) ہوگا۔ یہ فیصلہ کرنا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے' وہ اس اَفْئِدَةً سے تعلق رکھتا ہے۔

معاشرتی اور تمدنی زبوں حالی کی بنیادی وجہ مستقل اقدار کو نظر انداز کرنے کا ہی نتیجہ ہوتی ہے

میں عرض کر رہا ہوں کہ اس وقت تک بھی یہ تو نہیں کہہ سکے کہ وہ اندر کیا شے ہے جو فیصلہ کرتی ہے۔ بہرحال قرآن نے سمع اور بصر کہا ہے اور تیسری چیز اُس نے قلب کہا ہے یا افئدۃ کہا ہے۔ کہا کہ سماعت' بصارت اور قلب تو وہ رکھتے تھے اور ان کے پاس ایسے ذرائع بھی تھے کہ ان کو معلومات بہم پہنچیں' اُس کے بعد وہ قوت بھی موجود تھی جو فیصلہ کرے کہ کیا کرنا چاہیے' تمکن بھی حاصل تھا' علم بھی حاصل تھا' بصیرت بھی حاصل تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن فَمَآ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُهُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِذۡ كَانُوۡا یَجۡحَدُوۡنَ ۙ بِـاٰیٰتِ اللّٰهِ (46:26) اس علم کو استعمال کس طرح سے کرنا چاہیے اس کے لیے ایک خارجی معیار یا نظام یا اقدار کی ضرورت تھی کہ وہ فیصلہ کرے کہ مجھے انہیں استعمال کیسے کرنا چاہیے۔ مظلوموں کی امداد کے لیے کرنا چاہیے یا ظالموں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے کرنا چاہیے۔ اپنا جتھہ مضبوط کرنے کے لیے یہ کچھ کرنا چاہیے یا جن کے جتھوں نے دنیا میں کہرام مچا رکھا ہے ان کا گلا کاٹنے کے لیے مجھے یہ استعمال کرنا چاہیے۔ یہ ہے اصل شے کہ اس کا استعمال کس طرح سے کرنا چاہیے' کس مقصد کے لیے کرنا چاہیے؟ کہا کہ جب وہ اس چیز سے انکار کرتے تھے' نہیں' بلکہ اس کی خلاف ورزی کرتے تھے' سرکشی برتتے تھے' اور اس سے انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے اپنی قوم کے لیے یہ کرنا چاہیے' مجھے اپنے لیے یہ کچھ کرنا چاہیے تو فَمَآ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ (46:26) نہ ان کا تمکن ان کے کسی کام آیا' نہ یہ علم و بصیرت ان کے کسی کام آئی۔

کمزور بنیادوں پر بنا ہوا آشیانہ کبھی پائیدار نہیں ہوسکتا

جب کوئی صاحبِ بصیرت ان سے کہتا تھا کہ وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (46:26) تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی تو وہ اُس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ملاحظہ فرماؤ کہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ ہماری ایمپائر (سلطنت) جس پہ کبھی سورج غروب نہیں ہوتا' یہ ہماری تہذیب اور تمدن کہ جن کے ڈنکے ساری دنیا میں بج رہے ہیں' تمام اقوامِ عالم اس کی نقالی میں فخر محسوس کر رہی ہیں' شعوری اور غیر شعوری طور پر ساری دنیا کی قومیں اس کے اندر بہے چلی جارہی ہیں' وہ کہتے تھے کہ تم یہ کیا کہتے ہو۔ ہماری طاقت کی یہ کیفیت ہے کہ ہماری Empire (سلطنت) پہ سورج غروب نہیں ہوتا' ہمارا علم و بصیرت وہ ہے کہ ساری دنیا کی قومیں اُس کی نقالی میں فخر محسوس کر رہی ہیں اور تم کہہ رہے ہو کہ تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے یا اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی؟ اُنہوں نے کہا کہ کیوں کرے گی۔ کہنے لگا کہ اس لیے کہ

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

بس اتنی سی دلیل ہے۔ آشیانہ تو بڑا خوبصورت ہے لیکن شاخِ نازک پہ بنا ہے' اس کی جو بنیاد ہے وہ کمزور ہے' جھکڑ آئے گا اور اڑا کر لے

جائے گا' بجلی گرے گی تباہ کر کے رکھ دے گی۔ اگر وہ شاخ نازک ہے جس پہ آشیانہ بنایا گیا ہے تو آشیانے کا خوبصورت ہونا کچھ کام نہیں دے گا۔ اس تمکن کی بنیاد' اس تمدن کی عمارت جن بنیادوں پہ اٹھی ہے وہ کمزور ہیں۔ اس لیے یہ حوادثِ ارضی اور سماوی کے جھکڑوں کو سہہ نہیں سکیں گے' برداشت نہیں کر سکیں گے' منہدم ہو جائیں گے' کہا کہ **وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ** (46:26) جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اُسی نے آ کر ان کو گھیر لیا۔

قرآنِ حکیم کی اقدار کا ماحصل' نوعِ انسانی کی عادلانہ منفعت میں ہے

اب قرآن نے ہمیں یہ بتایا کہ جو تباہ ہونے والی قومیں تھیں وہ تمکن میں بھی بہت زیادہ تھیں اور علم و بصیرت میں بھی بہت آگے تھیں۔ ایک چیز تھی جو ان سے کہا گیا کہ یہ تمکن' قوت' اقتدار' علم و بصیرت اور فہم و تدبر کو تم اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کرو اور ان کے تابع رکھو۔ اور وہ اقدار تو بہت سی گنانے کے لیے ہیں لیکن ان کا ماحصل ایک ہی ہے۔ **وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ** (13:17) دنیا میں بقا اُسی کام کے لیے' اُسی نظام کے لیے ہے' جو تمام نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے قائم ہوتا ہے۔ یہ چیز کہ علم بڑی چیز ہے' سے انکار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ کریم نے بھی علم کی بڑی عظمت بتائی ہے۔ انسان (آدم) کے قصے کی ابتدا ہوتی ہے کہ **وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ** (2:31) اور انتہا نبی اکرم ﷺ پہ ہوتی ہے جن پہ وحی کا سلسلہ بھی ختم ہوا اور مقامِ انسانیت میں مقامِ کبریٰ پہ بھی پہنچے۔ ان کی آخری دعا ہے کہ **رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا** (20:114) یا اللہ! میرا علم اور زیادہ کر دے۔ علم کا تو یہ مقام ہے۔

بلند پایہ مفکر کی غلط سوچ صدیوں تک دامن گیر رہتی ہے

قرآن کہتا ہے کہ صاحبِ علم اور علم نہ رکھنے والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے لیکن علم مقصود بالذات نہیں ہے۔ علم ایک مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے' علم فطرت کی تسخیر کرتا ہے' فطرت کی قوتوں کو اپنی گرفت میں لاتا ہے لیکن اتنی سی چیز مقصود بالذات نہیں ہے۔ ابھی میں عرض کروں گا کہ یہ کیوں مقصود بالذات نہیں ہے۔ یہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ بہت پہلے ذہنِ انسانی نے ایک غلطی کھائی۔ سقراط کا فلاسفرز میں بہت بڑا مقام ہے' ساری دنیا کی قوموں کے اوپر یونان کے مفکروں کی فکر چھائی ہوئی ہے اور ان میں سقراط (469-399BC) ان کا ابوالآباء ہے۔ اُس نے کہا یہ تھا کہ Knowledge is virtue یعنی علم ہی نیکی ہے [1]۔

---

[1] سقراط (469-399BC) نے Virtue is Knowledge (نیکی ہی علم ہے) اور Knowledge is Virtue (علم ہی نیکی ہے) کی منطق (Logic) میں عقل فریب دلائل دے کر الجھا دیا ہے۔ یہی چیز آج نصاب (Curriculum) کے ذریعے درس و تدریس میں دلائل و براہین سے لائی جا رہی ہے۔ ''طبیعت اِدھر کیوں نہیں آئی'' ان کی منطق (Logic) اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ صرف ''جاننا'' ہی عمل کا محرک نہیں بنتا۔ علم (knowledge) کی تشریح میں افلاطون (428-347BC) نے اسے قرآن کی اصطلاح ایمان کے مرادف قرار دیا ہے جبکہ ارسطو (384-322 BC) نے اسے علم بے عمل بتایا ہے۔ علامہ پرویزؒ نے ارسطو کے نظریہ کو لے کر یہاں تنقید کی ہے۔

وہ بہت بڑا دھوکا کھا گیا لیکن یہ لوگ جو دماغی طور پہ بلند پایہ فکر والے ہیں' وہ اگر کسی مقام میں دھوکا کھاتے ہیں اور غلطی کرتے ہیں تو ان کا اثر بڑا دوررس جاتا ہے۔ وہ اپنی غلطی کے حق میں ایسے دلائل دے جاتے ہیں کہ عام طور پہ ان کا رد ممکن نہیں ہوتا' اس لیے سب دنیا فریب میں آتی جاتی ہے۔ وہ جو اتنی بات کہی ہے تو آپ سوچیے کہ یہ سقراط (469-399 BC)' افلاطون (428-347 BC)' اور ارسطو (384-322 BC) کے دیئے ہوئے جو دلائل ہیں' یہ جو Logic (منطق) ہے' آپ حیران ہونگے کہ آج بھی آپ کے ہاں جو نصاب میں Logic (منطق) داخل ہے' وہ ارسطو کا Logic (منطق) ہے' وہ پلیٹو کا فلسفہ ہے' وہ سقراط کی فکر ہے۔ آپ اس میں دیکھ لیجیے جو وہ کہہ گیا ہے کہ Knowledge is virtue. کہ محض جو علم ہے یہ نیکی ہے' یہ اُس کی بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ علم تو نہ نیکی ہے' نہ بدی۔ مثلاً ایک شخص اس چیز کو جانتا ہے' اسے اس کا علم ہے کہ یہ چیز نقصان دہ ہے' مگر اُس کے باوجود وہ اسے کرتا ہے۔ تو محض اُس کا علم تو نیکی نہیں ہے۔ اس سے آگے کرنے کی بات ہے۔ سقراط (469-399BC) کو تو غالب (1797-1869) نے ایک مصرعے کے اندر ختم کر کے رکھ دیا:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

بات ساری یہ ہے۔ یعنی ایک مصرعے میں اس کے سارے فلسفے کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے۔

انسان کو صرف علمِ خالص تباہ ہونے سے نہیں بچا سکتا

آپ اپنی دنیا میں دیکھیے کہ یہ جانتے ہوئے کہ یہ چیزیں کتنی غلط ہیں اور ان میں کتنی برائیاں ہیں' آدمی ہے جو کیے چلا جاتا ہے۔ ''جاننا'' اُسی صورت میں فائدہ دے سکتا ہے کہ طبیعت اُس ''جاننے'' کے تابع چلے۔ اصل چیز تو وہ طبیعت والی بات ہے۔ یہ تباہیاں کس لیے ہیں؟ اس لیے کہ وہ سب کچھ جانتے تھے لیکن اس کے باوجود طبیعت ادھر نہیں آتی تھی۔ کوئی چیز ایسی ہونی چاہیے جو طبیعت کے اوپر کچھ کنٹرول رکھے اور وہ یہ بات جانے کہ واقعی یہ شراب نقصان دہ چیز ہے' یہ سکھیا ہے۔ مگر اُس کے باوجود' یہ جانتے ہوئے بھی' جب اُس طرف کوئی جائے تو کوئی چیز ایسی ہونی چاہیے جو اُسے روکے۔ جو علم خالص ہے' وہ اسے نہیں روک سکتا۔ اگر تنہا علم اس کو روک سکتا تو وہ[1] جو کہتا ہے کہ ''طبیعتِ ادھر نہیں آتی'' تو پھر سوال یہ ہے کہ طبیعت کیوں اُدھر نہیں جاتی۔ یہ ایک بڑا بنیادی نکتہ ہے' یہ بڑی اہم چیز ہے۔

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869)۔

قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ جو کچھ انسان کے ساتھ' فرد کے ساتھ' قوموں کے ساتھ' ہوتا ہے وہ کسی چیز کا نتیجہ ہوتا ہے' وہ ایسے ہی نہیں ہو جاتا۔ کہا ہے کہ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (56:24) یہ نتیجہ تھا' عوض تھا' معاوضہ تھا اُس کا جس پر وہ عمل رکھتے تھے۔ علم کا نتیجہ اور معاوضہ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ علم کا درجہ تو اتنا بتایا گیا ہے لیکن جو تنہا علم ہے اُس کا نتیجہ اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ سارے قرآن میں ہر جگہ یہ ہے کہ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (56:24) جو اُنہوں نے کام کیا تھا تو یہ اُس کا نتیجہ ہے۔ ''نتیجہ کرنے کا ہے' جاننے کا نہیں ہے''۔ جاننا تو اُس صحیح کام کے کرنے کا ذریعہ ہے۔ مثلاً میں جانتا ہوں کہ وہ گاڑی اتنے بجے چلے گی' میں جانتا ہوں کہ ٹیکسی یہاں سے ملے گی' میں جانتا ہوں کہ اتنا کرایہ ہوگا' میں جانتا ہوں کہ ٹکٹ بھی لینا ہوگا اور یہ سب کچھ جاننے کے باوجود میں گھر میں بیٹھا رہوں تو کیا میں پشاور پہنچ جاؤنگا؟ اس سفر کے متعلق میرا جو اتنا بڑا علم ہے' وہ کچھ بھی نتیجہ مجھے نہیں دے گا۔ نتیجہ اُس وقت دے گا جب میں گھر سے اٹھونگا تو یہ سارا علم میری راہنمائی کرتا جائے گا۔ وہاں سے ٹیکسی لونگا' وہاں سے ٹکٹ لونگا' اُس پلیٹ فارم کے اوپر جاونگا اور گاڑی میں بیٹھ کر پشاور پہنچ جاؤنگا۔ یہ خالی جاننا نتیجہ خیز نہیں ہے۔ یہ ''جاننا'' اُس کام کو صحیح لائن پہ ڈالنے کا ذریعہ ہے' نتیجہ خیز میرا وہ کام ہوگا جو میں کر رہا ہوں۔

زندگی کے سفر میں تنہا علم کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا

عزیزانِ من! کیا بات ہے! یہ قرآن ہے۔ علم کا اتنا بلند درجہ ہونے کے باوجود کسی ایک جگہ قرآن میں یہ نہیں آیا ہے کہ تنہا علم نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ قرآن میں کہیں بھی تَعۡلَمُوۡنَ یا یَعۡمَلُوۡنَ' علم کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے نہیں آیا' عمل کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے جہاں بھی آیا ہے تَعۡلَمُوۡنَ یا یَعۡمَلُوۡنَ ہی آیا ہے۔ اس لیے یہاں (29:28) میں یہ جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مستبصرین تھے یعنی فکر' غور' تدبر' علم' فہم' یہ سب کچھ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ تباہ ہوئے۔ اس لیے کہ ''صرف جاننا'' ان کے کسی کام نہ آیا۔ جو وہ کرتے تھے' وہ اس ''جاننے'' کے خلاف تھا۔ جب وہ اپنے ہی جذبات کے تابع اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے تو یہی علم' جسے ہم عقل کہتے ہیں' یہ اور زیادہ نقصان دہ ہو جاتا تھا۔ یہ جو طرار' عیار اور چالاک لوگ ہیں یہ جس طرح ناجائز طریقے پہ کام کرتے ہیں' جاہل اور بدھو بیچارہ تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ یعنی یہی عقل وفکر اگر اقدارِ خداوندی کے تابع کچھ کرتی ہے تو نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہوتی ہے' اس کے برعکس اگر یہی عقل وفکر اپنے ہی جذبات کے تابع چلتی ہے تو یہ اتنی تباہیوں کا موجب بن جاتی ہے۔ علم تو ایک دودھاری تلوار ہے' جس مقصد کے لیے جی چاہے اسے چلائیے اس لیے عقل کو Condemn (موردِ الزام) تو نہیں کیا جا سکتا۔ یہ علم اور عقل کی تنقیص نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ چیز دیکھ کر کہا ہے کہ صاحب! جو بڑی بڑی عقلمند قومیں ہیں' وہ تباہیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔

تصوف کے نزدیک عقل انسان کی دشمن ہے

تصوف نے آ کر یہ کہا کہ عقل سرے سے ہے ہی شیطان کی دی ہوئی' یہ ابلیس ہی ہے اور جس نے سب سے پہلے عقل سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا۔ اُنہوں نے سرے سے اس کو Condemn (موردِ الزام) کر دیا۔ یہ علم کے پیچھے جو لٹھ لیے پھرتے ہیں کہ "اکو الف تینوں درکار' علموں بس کریں او یار" تو یہ چلا ہوا ہے۔ پوچھیے تو وہ بتاتے ہیں کہ دیکھیے صاحب! یہ اتنے اتنے بڑے علم والے کیا کرتے ہیں اور یہ قومیں کیا کرتی ہیں تو لہٰذا یہ سب نقص علم اور عقل کا ہے۔ دوسری طرف جو علم و عقل والے ہیں وہ آئے تو اُنہوں نے کہا کہ یہی چیز ہے جو ہمارے لیے کافی ہے۔ اسے کسی کنٹرول یا حدود کے تابع رکھنے کی ضرورت نہیں ہے' عقل اپنی دلیل آپ ہے' عقل اپنی راہنما آپ ہے' یہی ہمیں راہنمائی دے گی۔ چوروں کے گروہ کا سالارِ کارواں بڑا چور ہے تو ٹھیک ہے وہ تو چوری کی طرف ہی لے جائے گا۔

اقبالؒ نے عقل کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں

عزیزانِ من! دوسری طرف یہ چیز ہے کہ یہ جو اقدارِ سماوی یا جنہیں آپ Permanent Values کہتے ہیں' اگر آپ کا علم اور عقل ان اقدار کے تابع نہیں رہتا تو وہ تباہی بہم پہنچائے گا' بیوقوف کے مقابلے میں یہ جو لوگ ہیں' یہ بہت زیادہ نقصان پہنچانے والے ہیں' اس لیے عقل کے استعمال کی رو سے' اقبالؒ (1938-1877) نے کہا ہے کہ دو قسم کی عقلیں ہو جاتی ہیں: عقلِ خود بیں جو صرف اپنی ذات کا فائدہ سوچتی ہے' اگر فرد کی ہے تو اُس فرد کا فائدہ سوچتی ہے' اگر قوم کی ہے تو صرف اُس قوم کا فائدہ سوچتی ہے' اور دوسری ہے عقلِ جہاں بیں۔ وہ جو میں نے ابھی ایک قدر گنائی تھی' وہ ما ینفع الناس [1] تھی۔ وہ ہے صحیح عقل جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے اپنے آپ کو استعمال کرے۔ عقل کے استعمال کی رو سے اس کی دو قسمیں ہو گئیں۔ اقبالؒ (1938-1877) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

عقلِ خود بیں دگرو عقلِ جہاں بیں دگر است [2] (اقبالؒ: پیامِ مشرق)

عقل کے استعمال کا صحیح طریق اور اس کا مقام بلند

عقل کی عظمت تو قائم ہے لیکن استعمال کے اعتبار سے اُس کی دو شقیں ہو گئیں:

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست

وہ عقل والا بڑا صاحبِ قسمت ہے جس کی عقل کی وسعتیں اس دنیا کے اوپر بھی ہیں" اور آنے والی دنیا کے اوپر بھی ہیں"۔ اور آنے والی دنیا

---

1. وَاَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13:17) اور جو کچھ نوعِ انسان کے لیے نفع بخش ہوتا ہے' وہ باقی رہ جاتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔556)۔
2. عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است — بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است (پیامِ مشرق، ص۔198)

میں، مکافاتِ عمل، مرنے کے بعد کی زندگی، اور یہ سارا کچھ آ گیا۔

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم بااوست

عزیزانِ من! سُنیے کہ پہنائے دو عالم رکھنے والی عقل کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟

نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم بااوست

اُس کے پاس روشنی ہوتی ہے، ابلیس کی روشنی نہیں ہوتی بلکہ فرشتے کی روشنی ہوتی ہے۔

فقر بخشی؟ باشکوہِ خسروِ پرویز بخش

اگر تُو فقر بخشتا ہے تو پھر شکوہِ خسروِ پرویز کے ساتھ اس کو بخش

یا عطا فرما خرد بافطرتِ روح الامیں ❶

(زبورِ عجم)

یہ ہے نورِ افرشتہ۔ یہ کاہے کے لیے ہے؟ تاکہ سوزِ دلِ آدم بااوست۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو جو تنہا عقل ہے، وہ تو کسی نظام کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی، اُس کے لیے بقا نہیں ہے۔ جیسا اُس نے یہ کہا کہ

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا

جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(بانگِ درا)

داستانِ موسیٰ ◆ کے تین اہم شعبے

یہ چیزیں ہیں جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَ مَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ (29:39)۔ وہ اربابِ بصیرت تھے، جانتے تھے، عقل بھی رکھتے تھے، فکر بھی رکھتے تھے، تمکن بھی رکھتے تھے لیکن اُن کے پاس نورِ افرشتہ نہیں تھا، عقلِ جہاں بیں نہیں تھی۔ وہ تدبر کی فسوں کاری سے چاہتے تھے کہ اپنا نظام محکم رکھیں۔ یہ کبھی نہیں رہ سکتا۔ وَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ (29:39) وہ قومیں بھی دیکھیں اور یہ قارون، فرعون اور ہامان بھی دیکھیے: یہ تو ایک ہی داستان کے تینوں ٹکڑے ہیں۔ میں نے یہ کہا ہے کہ دنیا میں انسانیت کی ہڈیاں توڑنے کے لیے یہ تین ہی لعنتیں ہیں: ملوکیت، سرمایہ داری اور برہمنیت (مذہبی پیشوائیت)۔ ان میں سے کوئی ایک ہی اگر کسی ایک مقام پہ ہو تو وہی کچھ کم نہیں ہوتی۔ یہ جو قصہ بنی اسرائیل میں حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش ہے تو اُس میں

---

❶ یا پھر وہ عقل عطا کر جس کی سرشت روح الامیں جیسی ہو۔ یعنی جو اللہ کے ارسال کردہ پیامِ قرآن سے راہنمائی حاصل کرے۔

یہ تینوں لعنتیں بیک وقت ایک جگہ اکٹھی ہو چکی ہوئی تھیں۔ فرعون ملوکیت کا نمائندہ تھا' ہامان برہمنیت (مذہبی پیشوائیت) کا نمائندہ تھا اور قارون سرمایہ داری کا نمائندہ تھا۔ کہا کہ **وَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ لَقَدْ جَآءَ هُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ** (29:39) موسیٰ ان کے پاس دلائل لے کر آئے۔ آسمانی انقلاب والا آتے ہی ڈنڈا نہیں چلاتا' اُس کے پاس تو دلائل ہوتے ہیں۔ پہلی چیز دلائل ہوتی ہے۔ **فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ** (29:39) لیکن وہ قوت کے نشے میں اس قدر بدمست تھے کہ ان میں تکبر تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اوتم کیا کرسکتے ہو! **وَ مَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ** [1] (29:39)۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اوہ ساتھوں اگوں نہیں سی لنگھ سکدے'' [2]۔ دوڑ ہو رہی ہے اور بہت زور لگا رہے ہیں لیکن ہم سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ کہا کہ **فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ** (29:40) ان میں سے ہر ایک کو ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل نے پکڑا۔ یہ ''ذنب'' کا لفظ بھی عجیب وغریب ہے۔ ہمارے ہاں تو ان سب چیزوں کا ترجمہ بس ''گناہ'' ہی ہو جاتا ہے۔ اس سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ عزیزانِ من! جب یہ الفاظ محض نظری رہ جائیں تو ان کا نہ دل پہ کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ زندگی پہ کوئی اثر ہوتا ہے۔

الفاظ کے صحیح استعمال سے زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے

وہ کہتے ہیں کہ کسی کام کرنے سے ثواب ہوتا ہے' اور کسی کام کے کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔ اس ثواب اور گناہ سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ہوتا کیا ہے حالانکہ زندگی کے بننے اور بگڑنے میں ان چیزوں کا بنیادی دخل ہے۔ اس لیے کہا کہ یوں کہو کہ اس کام کے کرنے سے زندگی سنورتی ہے اور اس کام سے زندگی بگڑتی ہے تو پھر کچھ تو بات سمجھ میں آئے گی۔ ''ذنب'' کے معنی یہ ہیں کہ کوئی غلط کام جو آپ کرتے ہیں تو وہ تو ہو گیا اور آپ چلے گئے۔ اب اُس کا جو نتیجہ ہے وہ آپ کے پیچھے لگا ہوا ہے' نتیجہ ہمیشہ عمل کے بعد ہوتا ہے۔ گائے کے پیچھے جو دم لگی ہوئی ہوتی ہے اُس کو عرب ذنب کہتے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ اُس سے چھٹکارا ہی نہیں ہے۔ وہ گائے یا اونٹ ہزار جی چاہے لیکن وہ دم اُس کے ساتھ چپکی ہوئی ہے' وہ جا رہی ہے تو اُس کے ساتھ ہے بیٹھی ہے تو اُس کے ساتھ ہے۔

قوموں کے حالاتِ زندگی ان کے اپنے اعمال کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں

عزیزانِ من! اندازہ لگائیے کہ یہ عرب قوم کیا تھی! عمل کے نتیجے کو مثال کے طور پر سمجھانے کے لیے اُنہوں نے ذنب کا لفظ استعمال کیا۔ کہا کہ بتائیے کہ یہ قومیں جنہوں نے زندگی کا غلط نظام وضع کیا تھا' یہ اُس کے تباہ کن نتیجے سے کیسے بچ سکتی ہیں کیونکہ وہ تو دم کی طرح اِن کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اب آپ کو ''ذنب'' کی بات سمجھ آ گئی ہوگی۔ **فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ**

---

[1] (اس لیے) وہ قارون' فرعون اور ہامان بھی' اپنی تمام دولت اور قوت اور لاؤ لشکر کے باوجود' ہمارے قانونِ مکافات کی گرفت سے بچ نہ سکے۔ اُس نے انہیں آن دبوچا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔919)۔

[2] وہ ہم سے کبھی بھی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے' ہمارے سامنے سے نہیں گزر سکتے تھے۔

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ اَخَذَتۡهُ الصَّیۡحَةُ ۚ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ خَسَفۡنَا بِهِ الۡاَرۡضَ ۚ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ اَغۡرَقۡنَا [1] (29:40)۔اُس کے بعد تباہی کی شکلیں مختلف تھیں لیکن علتِ غائی ان کی ایک ہی تھی' ان کا Cause (سبب) ایک ہی تھا کہ وہ جو غلط نظام تھا' غلط روش تھی' اُس کے تباہ کن نتائج دم کی طرح ان کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ کسی میں کسی صورت میں نمودار ہوئے اور کسی میں کسی صورت میں نمودار ہوئے۔ آتش فشاں پہاڑوں سے نمودار ہوئے' کوئی غرق ہو گیا' یہ سب کچھ ہوا۔ یہ چیز ان کے ''ذنب'' کی وجہ سے تھی۔

اب اُس کے بعد اگلی بات آئی کہ اگر صرف اسی پہ نگاہ رکھی جائے کہ وہ قوم یوں تباہ ہو گئی' وہ یوں تباہ ہو گئی تو ذہن میں یہ آتا ہے کہ صاحب! یہ اللہ میاں اسی کام کے لیے ہے کہ اُسے بھی تباہ کیا' اُسے بھی تباہ کیا اور داستانیں ساری سنا رہا ہے۔ ایسا ذہن میں آتا ہے کہ کوئی ظالم قسم کا یا ہلاکو قسم کا خدا ہے جس کا کام ہی یہ ہے۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ وَ مَا کَانَ اللّٰهُ لِیَظۡلِمَهُمۡ (29:40) خدا کسی پہ ظلم نہیں کیا کرتا۔ ہوتا یہ ہے کہ وَ لٰـکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ (29:40) انسان اپنے آپ پہ خود ظلم کرتا ہے' کوئی دوسرا نہیں کرتا' خدا بھی نہیں کرتا۔ قرآن کے بیشتر مقامات ہیں جہاں اُس نے کہا ہے کہ جرم یا زیادتی جو تم اپنے ذہن میں سمجھتے ہو کہ تم نے دوسرے کے خلاف کی ہے' اصل میں وہ تم نے اپنے ہی خلاف کی ہے۔ ٹھیک ہے Physically (جسمانی طور پر) تو یہ ہے کہ دوسرے کے خلاف ہوتا ہے کہ طمانچہ دوسرے کو آپ مارتے ہیں اور اُسے لگتا ہے' چھڑی یا خنجر مارتے ہیں تو اسے لگتی ہے لیکن جو کچھ تم کر رہے ہو اُس کا ایک نتیجہ تمہاری ذات پہ مرتب ہوتا ہے تو وہ ہے اصل میں فیصلہ کن حقیقت۔ اسی لیے اس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ اگر تم ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرو تو دنیا میں کوئی شخص تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ جو نقصان ہے وہ Physical (طبعی) چیز ہے۔

کوئی شخص بھی کسی کی ذات کو نقصان نہیں پہنچا سکتا

وہ کہتا ہے کہ کوئی دوسرا تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ صرف تمہاری چیزوں کو نقصان پہنچائے گا لیکن تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہ ''تم اور تمہاری چیزوں'' میں فرق بڑی چیز ہے۔ جیسے میں کہتا ہوں کہ میری زندگی' میرا مال' میرا ہاتھ' میرا پاؤں۔ کہتا ہے کہ جس کو تم ''میرا'' کہتے ہو تو اس کو تو نقصان پہنچائے گا لیکن یہ جسے تم ''میں'' [2] کہتے ہو اِس کو تو کوئی دوسرا نقصان نہیں پہنچا سکتا' اسے تو تم خود ہی نقصان پہنچاتے ہو۔ یہ ہے وہ جو کہا ہے کہ وَ لٰـکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ (29:40)۔ یہ وہی ہے جو میں

---

[1] غرضیکہ اسی طرح ہم نے تمام اقوامِ سابقہ کو' ان کی غلط روش کی زندگی کی پاداش میں پکڑ لیا۔ ان میں سے بعض پر (آتش فشاں پہاڑوں سے) پتھروں کی بارش ہوئی۔ کسی کو زلزلے کی سخت مہیب آواز نے آ پکڑا' بعض زمین میں دھنس کر نیست و نابود ہو گئے۔ کوئی سمندر میں ڈوب مرے۔ یہ سب کچھ ان کے اعمال کی وجہ سے ہوا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 919)۔

[2] I -am -ness

نیٹشے (1844-1900) کا فقرہ دہرایا کرتا ہوں کہ ''تم نے میرے خلاف جو زیادتی کی' اُسے تو میں معاف کر دونگا لیکن اس سے تم نے جو اپنے خلاف زیادتی کی ہے اُسے کون معاف کرے گا''۔ اسی لیے قرآن نے یہاں کہا ہے کہ خدا نے یہ ظلم نہیں کیا بلکہ تم نے اپنے آپ پہ خود ظلم کیا ہے (29:40)۔ کہا کہ ان لوگوں کو اتنا تمکن حاصل تھا' اتنی قوتیں تھیں' اتنا ساز و سامان و یراق تھا' اتنا علم وفضل اور تدبر تھا' یہ سارا کچھ تھا تو پھر ہوا کیا؟ تباہ کیوں ہوئے؟ کہا کہ بات مثال سے سمجھ میں آئے گی۔

انسانی عقل کے بل بوتے پر تشکیل کردہ نظام کی کیفیت: ایک مثال

جہاں کہیں بھی کوئی ایک بڑی ہی عمیق اور نظری چیز آتی ہے تو قرآن وہاں فوراً محسوس مثال دیتا ہے۔ کہا کہ **مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ** (29:41) یہ لوگ جنہوں نے اقدارِ خداوندی کو چھوڑ کر اور نظام اور اصول اور اقدار اور روشیں اختیار کیں' اور پھر وہ ایسی قومیں تھیں جنہوں نے اس قسم کے لوگوں کو اپنا سہارا بنایا' تو وہ بہت مطمئن تھیں۔ کہا کہ کیفیت یہ تھی کہ **کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ** (29:41) یہ تو مکڑی کا جالا تھا۔ مکڑی کا جالا کرتا یہ ہے کہ جو اُس سے کمزور مکھیاں مچھر ہوتے ہیں' ان کو تو پھانس لیتا ہے۔ اور اگر کوئی اُس سے طاقتور پھونک بھی مار دے تو سامنے کچھ نہیں ہوتا۔ کہا کہ یہ سارا تمکن' یہ سارا علم و بصیرت اپنے سے کمزور کو پھانسنے کے لیے تو بہت ٹھیک تھا لیکن اس سے زیادہ قوت والا ایک بھی آئے تو اُس کی تو پھونک کو نہیں سہار سکتا۔ کیا بات ہے اس مثال کی! کہا کہ گھر وہ بناؤ جو طاقتور کو پھانس لے اور کمزور کی حفاظت کرے' وہ گھر نہیں ٹوٹے گا۔ مکڑی کے جالے نہ بناؤ جو ہر کمزور کو پھانس لے گا۔ **مَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی** (2:256) جس نے غیر خدائی قوانین کو تیاگ کر' اقدارِ خداوندی کے محکم سہارے کو پکڑ لیا' تو اُس نے ایسا سہارا پکڑا جس کا ٹوٹنا تو ایک طرف' وہ تو تڑکتا بھی نہیں ہے۔ کہا کہ سہارا لینا ہے تو وہ سہارا لو۔ ان مکڑی کے جالوں کے سہاروں کی کیا کیفیت اور تمہاری کیا حالت ہوگی۔ **اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ط وَ اِنَّ اَوْھَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ** (29:41) کوئی ذرا سا بھی مقابل میں زور والا آ جائے تو اُس کے سامنے یہ ختم ہو جاتی ہے۔ کہا کہ ہم نے مثال سے بات تو سمجھائی ہے' خدا کرے کہ **لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ** (29:41) تم علم و عقل کی رو سے بات سمجھو کہ میں کیا کہہ گیا ہوں۔

نوعِ انسانی کے لیے مہلت کا وقفہ خدا کی حکمت پر مبنی ہے

کہتا ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ** (29:42) جب یہ لوگ جالے تن رہے تھے اور وہ لوگ جو ان مکڑی کے جالے تننے والوں کو یار بنا رہے تھے' اپنے سہارے سمجھ رہے تھے' تو خدا جانتا تھا کہ یہ کیا کرتے ہیں۔ اور پھر ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ اگر وہ جانتا تھا تو اُسی وقت کیوں نہ فوراً جھپٹ لیا۔ عام طور پہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ظالم کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑ لیتا۔ کہا کہ **وَ ھُوَ**

الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (29:42) وہ صاحبِ غلبہ ہے اور صاحبِ اقتدار ہے، وہ کر سکتا ہے لیکن یہ سارا کچھ جو ہے وہ ہلاکو اور چنگیز کی طرح نہیں کرتا، بلکہ حکمت کے ساتھ کرتا ہے، مہلت دیتا ہے، Warnings (تنبیہات) دیتا ہے، چھوٹی چھوٹی تباہیاں لاتا ہے۔ اور جب مرض انتہا تک پہنچتا ہے تو پھر یہ تباہی آتی ہے۔ عزیز کے ساتھ یہاں حکیم کہا ہے۔

قرآنِ حکیم میں اپنے اپنے مقام پر صفاتِ خداوندی کو بیان کرنا بھی حکمت ہے

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم اپنی آیات میں جہاں صفاتِ خداوندی لاتا ہے تو وہ مقام بڑا غور طلب ہوتا ہے کہ یہاں وہ یہی صفت کیوں لایا ہے۔ عزیز تو لایا ہے کہ اُس کے قانون کی گرفت اتنی زیادہ شدید ہے: **اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ** (85:12) اُس میں بڑی شدت ہوتی ہے تو اُس کے سامنے مکڑی کا جالا کیا شے ہے لیکن وہ جھپٹ کے نہیں توڑتا بلکہ وہ سمجھاتا ہے، تنذیرات دیتا ہے، مثالوں سے بتاتا ہے، Reasons (وجوہات) دیتا ہے۔ اور جب اِس کے باوجود وہ اصرار کیے چلے جاتے ہیں تو پھر خدا کی وہ جو عزیز ہونے کی صفت ہے، وہ بصورتِ قانونِ مکافات روبہ عمل ہوتی ہے، تو اس وقت تو قانونِ مکافات غالب آتا ہے۔ اس لیے کہا کہ **وَ تِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ** (29:43) یہ مثالیں ہم نوعِ انسانی کے لیے بیان کرتے ہیں۔ **وَ مَا یَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ** (29:43)۔ دیکھیے کہ یہاں علم کی کتنی عظمت بیان ہوتی جارہی ہے لیکن ان کو سمجھتا تو وہی ہے جو صاحبِ علم ہے۔ علم کی رو سے، مثال سے، یہ بات جو کہی گئی ہے، سمجھ میں آتی ہے۔

عربی میں عقل کا لفظ کن معنی میں استعمال ہوتا تھا؟

یہاں ایک لفظ **وَ مَا یَعْقِلُهَاۤ** (29:43) آیا ہے۔ عربوں کے ہاں لفظِ عقل کے معنی یہ تھے کہ ''وہ اونٹوں کو باہر کھڑا کردیتے تھے، وہاں ہر جگہ کھونٹے تو ہوتے نہیں تھے لیکن ان کو چھوڑ کر ادھر اُدھر جانا پڑتا تھا، وہ اونٹ کا گھٹنا ایک رسی سے باندھ دیتے تھے تاکہ وہ بیباک ہو کر نہ چل پڑے۔ یہ جو رسی تھی جس سے وہ اونٹ کا گھٹنا باندھتے تھے کہ یہ بیباک نہ ہو جائے، اِسے وہ عقل کہتے تھے۔ انسانی جذبات کے شترِ بے مہار کے گھٹنے کو، ہر بے مہار کو باندھ دینے والی چیز، عقل کہلاتی ہے۔ عزیزانِ من! زندگی میں پتہ نہیں پھر یہ باتیں کہہ سکوں یا نہ کہہ سکوں، میں بار بار کہتا ہوں کہ قرآن سمجھنا ہے تو دیکھیے کہ عرب قرآن کے الفاظ و مفردات کے کیا معنی لیتے تھے۔ اب یہ جو Verb (فعل) **یَعْقِلُهَاۤ** یہاں آیا ہے تو اب اس سے یہ بات سمجھ میں آ گئی۔ کہا ہے کہ **وَ مَا یَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ** (29:43)۔ جب عقل کے وہ معنی سمجھ میں آ گئے تو اب بات سمجھ میں آ گئی۔ یہ جو عربوں کو آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے سر کے اوپر ایک رسی باندھی ہوئی

ہوتی ہے وہ اس رسی کو عــقــال کہتے ہیں۔ ''اوہ گوڈا ہنڑ دی بجائے سر بنی پھر دے نیں ❶''۔ آپ دیکھیے کہ یہ قوم کرتی کیا تھی؟ وہاں اس عقال سے یہ لفظ عقل ہے۔ قرآن نے کہا کہ بات تو ہم نے مثال سے سمجھائی لیکن ان مثالوں سے اپنے شترِ بے مہار کے گھٹنے کو وہی باندھے گا جو علم سے کام لے گا۔ تو یہ ہے ان مثالوں کا مقصد لیکن اس کے لیے علم کی ضرورت ہے۔ اگر علم آ بھی جائے اور یہ جو مقصد ہے اُس تک نہ پہنچے تو پھر یہ علم کوئی کام نہیں دے گا۔ اُن کا علم جذبات کو ایک حد کے اندر رکھنے کا ذریعہ بنے گا جو ان مثالوں سے بات کو سمجھے گا۔ اور حد کے اندر رکھنا ہی تو سارا دین ہے۔ یہ ہر قوت کو' دولت کو' جذبے کو' اقتدار کو' حکومت کو' اپنے جذبے کو ایک حد کے اندر رکھنا ہے۔ اور حد بھی خدا کی متعین کی ہوئی ہو اور کوئی انسان اُس میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ غیر متبدل حدود کے اندر ان سب چیزوں کا رکھنا دین ہے۔ کہا کہ علم کی رو سے یہ بات ہو سکتی ہے۔

آگے ایک بڑا اہم مقام ہے جس کے بعد بیسواں پارہ ختم ہو گا۔ یہ پارہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کچھ مقامات ایسے آئے تھے جن کو میں اپنی سمجھ کے مطابق واضح کرتا گیا ہوں۔ اب یہ اس پارے کی آخری آیت ہے۔

قرآن حکیم کو تیس پاروں میں تقسیم کرنے کا مقصد

عزیزانِ من! یاد رکھیے کہ قرآنِ کریم میں پاروں کی یہ تقسیم کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ تو انہوں نے تلاوت کے لیے' سہولت کے لیے' یا جیسے ہم ریفرنس کے لیے ایک ذرا سا کاغذ رکھ دیتے ہیں' یا نشانی رکھ دیتے ہیں' پورے قرآنِ کریم کو تیس حصوں (پاروں) میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی وہ ایسے بھی ہے کہ ایک فقرے کا ایک لفظ ایک پارے میں ہے تو دوسرا لفظ اگلے پارے میں ہے۔ تو یہ یاد رکھیے کہ تیس پاروں کی صرف اتنی ہی حیثیت ہے۔ اصل چیز سورۃ ہے جس میں قرآن تقسیم ہوا ہے۔ کہا کہ یہ جو دو نظام ہم نے گنائے ہیں' یہ دو قسم کے مصارف' دو قسم کے انداز ہیں جن سے علم و عقل کی روشنی میں کام لیا جاتا ہے۔ ہم یہ دو گناتے چلے آئے ہیں۔ کہتا ہے کہ یہ دو ہیں کیا؟ اگر ہمارے ہاں کے مولوی صاحب سے پوچھیے تو وہ کہتے ہیں کہ ایک کفر ہے اور ایک ایمان ہے۔ پوچھا کہ صاحب! یہ بات کیا ہے؟ کہنے لگے کہ ''تینوں ایناں وی پتہ نہیں تے توں کاہدا مسلمان ہیگا ایں ❷''۔ کہا کہ ''جی مینوں تے نہیں پتہ' پر تُسی دسو ❸''۔ کہن لگے کہ ''پتہ تے مینوں وی نہیں ہیگا'' ❹۔

---

❶ وہ گھٹنا باندھنے کے بجائے سر ہی باندھے پھرتے ہیں۔
❷ اگر تمہیں اتنا بھی علم نہیں ہے تو تم کاہے کے مسلمان ہو۔
❸ مجھے تو معلوم نہیں ہے۔ آپ بتائیں
❹ معلوم تو مجھے بھی نہیں ہے۔

دین کا ایک ایک لفظ اپنے ہاں واضح مفہوم لیے ہوتا ہے

یاد رکھیے کہ مذہب میں انسان صرف الفاظ سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ اَسۡمَآءٍ سَمَّیۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ (7:71) کچھ نام ہیں جو تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے اور کچھ تم نے رکھ لیے' ان کو دہرائے چلے جا رہے ہو' نہ اُنہوں نے کبھی کھڑے ہو کر سمجھا کہ یہ بات کیا ہے جو کہہ رہا ہے اور نہ تم نے کبھی کھڑے ہو کر سمجھا۔ اسی کا نام تم نے اپنے ہاں اسلام یا دین رکھ لیا ہے۔ یہ مذہب ہے' دین نہیں ہے۔ دین ہر مقام پہ کھڑے ہو کر یہ بات کہتا ہے کہ جو لفظ کہہ رہے ہو' بتاؤ کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ وہ لفظ عمل میں لانے کے لیے ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں صدیوں سے کلمہ کے الفاظ کا استعمال

عزیزانِ من! لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ چودہ سو سال سے کونسا مسلمان ہے جس نے زندگی میں ایک دفعہ نہیں ہزاروں لاکھوں بار نہ کہا ہو۔ کیا اس سے کوئی اثر اس کی زندگی کے اوپر پڑا؟ یہ جو کلمہ ہے' یہ کس کام آتا ہے؟ یا تو قسم کھانے کے کام آتا ہے "تے ساڈے پہلے زمانے اچ بھانڈے پاک کرن دے کم اوندا ہوندا سی' تین واری کلمہ پڑھ کے تے اوہدے اُتے پانی پائی دا سی [1]"۔ عزیزانِ من! اگر ایک دفعہ کھڑے ہو کر دین سے پوچھتے اور لفظ کو دیکھتے تو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے مفہوم کا پتہ چل جاتا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کسی کا اقتدار ایسا نہیں جس کے سامنے جھکا جائے سوائے خدا کے اقتدار کے۔ یہ ہیں اس کے معنی۔ ایک بار کہیے تو پھر ہم پوچھیں گے کہ کیا تمہارا عمل یہی ہے کہ جو تم کہہ رہے ہو؟ عمل ہے تو ایمان ہے' نہیں ہے تو کفر ہے۔

انسانی زندگی کے دو نظریات: کفر اور ایمان

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو کافر بھی لاکھوں بار دہراتا ہے۔ ہوا صرف یہ ہے کہ ہم الٰہ کا لفظ دہراتے گئے' یہ نہ دیکھا کہ یہ ہے کیا۔ یہ زندگی کے دو نظریئے ہیں' ان پہ دین اسلام کی بنیاد ہے' اُسی کا نام کفر اور ایمان ہے۔ ایک نظریۂ زندگی یہ ہے:

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

(چکبست)

---

[1] ہمارے پہلے زمانے میں تو برتن پاک کرنے کے لیے کام آتا تھا۔ تین بار کلمہ پڑھ کر اس برتن پر پانی ڈالا جاتا تھا۔

پہلا نظریہ حیات: میکانکی

اسی طرح سے یہ جو Matter (مادہ) کی مختلف چیزیں ہیں تو یہ کسی طرح سے ایک خاص ترتیب کے ماتحت اکٹھی ہوگئیں۔ایک نظریۂ زندگی یہ ہے۔''خلق'' کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں پڑی ہوئی ہیں' ان کو ایک خاص ترتیب سے ملایا جائے تو ایک نئی چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی چیزوں میں کسی طرح سے ظہورِ ترتیب ہوا' یہ Physical Universe (طبعی کائنات) ظہور میں آ گئی اور اُس کے بعد اس میں تغیرات ہوتے چلے جاتے ہیں' یہ مشین کی طرح چلتی چلی جاتی ہے۔ایک دن چلتے چلتے یہ پرزے گھس جائیں گے تو وہ بھی ختم ہو سکتی ہے۔نہ اس کا کوئی مقصد ہے' نہ منزل ہے' نہ کوئی پروگرام ہے' نہ کوئی ایسی ہستی پیچھے ہے' جس نے کسی خاص مقصد کے لیے اسے Create (پیدا) کیا ہے اور اُس مقصد کے تابع وہ اس کو چلا رہا ہے' اُسی کے تابع اُس کو کسی منزل تک پہنچانا ہے۔ایسا کچھ نہیں ہے۔عزیزانِ من! ایک نظریۂ زندگی یہ ہے۔اور جب کائنات کے متعلق یہ نظریہ ہے تو خود انسان کے متعلق بھی یہی نظریہ ہے کہ انسان بھی تو کائنات کی ایک شے ہے۔یہ بھی جیسے حیوانات ہوتے ہیں اور نر مادہ کے جنسی اختلاط سے جنین رحمِ مادر میں پرورش پاتا ہے' اُس کے بعد پھر اس دنیا میں آتا ہے' طبعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق بیمار ہوتا ہے' شفا پاتا ہے' پرزے گھس جاتے ہیں' انہی قانون کے مطابق اس کے بعد اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور آدمی ختم ہو جاتا ہے۔یہ ہے ایک نظریۂ زندگی۔اب اس کے تابع سب کچھ Physically (طبعی طور پر) ہے جو ہوتا ہے' اس کے Beyond (ماوراء) کوئی چیز نہیں ہے۔سوسائٹی نے آپس میں رہنا ہے تو سوسائٹی جو قانون بنائے گی اُس کے مطابق چلتے چلے جائیں اور بات ختم ہوگئی۔اس کا کوئی اور اثر اس پہ نہیں پڑتا' صحت ہی انسان کی ایک چیز ہے اگر اُس کو برقرار رکھتا ہے تو ٹھیک ہے' اگر چوری کا گھی کھائے یا قیمتاً لے کر کھائے تو گھی کا اثر ایک ہی ہوتا ہے۔

دوسرا نظریہ حیات: ایمان

اس کے برعکس ایک دوسرا نظریۂ زندگی ہے کہ ایک قوت ہے وہ ایک خاص مقصد کے لیے اس کائنات کو وجود میں لائی ہے۔میں اس وقت اس کے لیے دلائل نہیں دوں گا کیونکہ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ان سائنسدانوں کو ہم دلائل سے سمجھا سکتے ہیں۔وہ ایک مقصد کے لیے اس کائنات کو وجود میں لایا ہے' ایک منزل ہے جس کی طرف وہ اس کو لیے چلا جا رہا ہے۔اسی کے اندر انسان ہے۔انسان کی زندگی بھی محض طبعی زندگی نہیں ہے' اس کے اندر ایک اور چیز بھی ہے۔اس کی زندگی کا بھی ایک مقصد ہے جو صرف Physical (طبعی) نہیں ہے' اس سے آگے ایک مقصد ہے۔جو کچھ یہ کرتا ہے تو اُس کا اثر Physical (طبعی) تو ہوتا ہی ہے کیونکہ اس کا جسم

Physical (طبعی) تو ہے ہی لیکن اُس کے علاوہ ایک اور اثر بھی ہوتا ہے' ایک اور نتیجہ بھی مرتب ہوتا ہے۔ سمجھنے کے لیے کہہ لیجیے کہ انسان کی ذات کے اندر نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ یہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے' یہ انسانی زندگی کا ایک مقصد ہے' اس ذاتِ انسان کے لیے ایک منزل ہے' اس نے آگے چلنا ہے۔ Evolution (ارتقا) کی تھیوری (نظریہ) Physical Death (جسمانی موت) پہ ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کی صورت میں وہ ارتقائی منازل آگے بھی ہیں۔ اگلی منزل یہ ہے کہ جس قسم کی زندگی یہاں گزارتا ہے اُس کے مطابق اس کی اگلی زندگی بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ دوسرا نظریۂ زندگی ہے۔

پہلا نظریۂ زندگی کفر ہے اور یہ نظریۂ زندگی ایمان ہے۔ کفر کا وہ نظریہ عمل میں آتا ہے تو وہ یہ سیکولرازم پیدا کرتا ہے جو اس وقت ساری دنیا میں چلا ہوا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ' ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ Physical (طبعی) مفاد کو حاصل کرنے کے لیے لگا ہوا ہے۔ دوسرا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ مقصود صرف Physical (جسمانی) زندگی نہیں ہے بلکہ انسانیت کی زندگی ہے اور وہ اقدارِ خداوندی کے تابع چلتی ہے۔ جو مکافاتِ عمل ہے' یہ ہے اصل چیز۔ عزیزانِ من! اب سنیے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ تمام اقوامِ عالم کی داستانیں بیان کر کے' اور یہ کہہ کر کہ وہ کس طرح سے تباہ و برباد ہوئیں' کہا کہ اس کی بنیادی لِم یہ تھی کہ وہ حقیقت کی اس چیز سے انکار کرتے تھے کہ **خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ** [1] (29:44)۔ ہمارے مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن میں ربط نہیں ہے۔ افسوس صد افسوس کہ

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(اقبالؒ)

''تینوں ست سُر اں داوی پتہ نہیں ہیگا [2]''۔ عزیزانِ من! آپ ربط دیکھیے کہ تمام اقوام کی داستان بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یہ ایک غلط نظریۂ زندگی تھا جس کے تابع یہ سب کچھ ہوا اور ہوگا۔ صحیح نظریہ یہ ہے کہ **خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ** (29:44)۔ قرآن بات کائنات سے شروع کرتا ہے کیونکہ یہ لوگ بھی جنہوں نے انسان کے متعلق یہ غلط نظریہ اختیار کیا تھا وہ بھی بات کائنات کی ہی شروع کرتے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے بات کر رہا ہے کہ خدا نے اس کائنات کو بلا مقصد پیدا نہیں کیا بلکہ بالحق پیدا کیا ہے'

---

[1] خدا نے اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو ایک حقیقتِ ثابتہ کے طور پر پیدا کیا ہے' جس کا ایک خاص مقصد ہے۔ (یہ یونہی کھیل تماشے کے طور پر' بلا مقصد و غایت پیدا نہیں کی گئی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔920)۔

[2] (اے مولوی صاحب!) تجھے تو سات سُروں کا بھی علم نہیں ہے (ان میں جو ربط و آہنگ ہے' وہ تجھے کہاں آئے گا!)

حق کے مطابق پیدا کیا ہے' ایک مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔اس کے پیچھے ایک قوت ہے جو الحق ہے' وہ اس کو اسی طرف لے جانے کے لیے چلا رہی ہے' اُس کو اپنے قوانین کے اوپر گرفت ہے' وہ صحیح نتائج پیدا کرتے ہیں' یہ بالحق پیدا کی ہے۔ **اِنَّ فِــــیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّـلْمُؤْمِنِیْنَ** (29:44)۔ میں نے کہا تھا کہ ایمان یہ ہے۔اس آیت میں کہا ہے کہ جو یہ بات ماننا ہے کہ یہ جو کائنات ہے' اس کی تخلیق بالحق ہوئی ہے تو یہ ایمان ہے اور اس کو وہی مانے گا جو مومن ہوگا۔اب ایمان اور کفر میں تمیز کر کے رکھ دی۔

حضرتِ انسان اور کائنات کا باہمی ربط اور مقصد

اب درمیان میں انسان آ گیا۔ **خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ** (45:22) ۔اب خارجی کائنات اور انسان کی زندگی کا تعلق دیکھیے کیونکہ یہ بھی بالحق پیدا کیا گیا ہے' یہ اُسی کا ایک گوشہ ہے۔خدا نے ارض و سماوات اور کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔مقصد یہ ہے کہ **وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ** (45:22) ہر فرد کو اُس کے کیے کا صحیح صحیح نتیجہ مل سکے اور کسی پہ کسی قسم کا ظلم نہ ہو۔یہ ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات۔کہا کہ اس سے دوسری طرف کون جاتے ہیں؟ کہتا ہے کہ اس کے برعکس وہ لوگ ہیں کہ **اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً** (45:23) جو اپنے جذبات' اپنی مفاد پرستی کو ہی اپنا الٰہ بنا لیتے ہیں۔الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار ہیں۔اُس انسان کی انسانیت پہ کنٹرول اُس کے جذبات کا ہوتا ہے۔آپ نے دیکھا کہ جب اُس نے کہا تھا کہ **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** تو کہاں تک پہنچا ہوا تھا۔باہر کے الٰہ تو ایک طرف رہے وہ تو اپنی ذات کا جو الٰہ ہے اُس کو بھی الٰہ نہیں تسلیم کرتا' اُس کو بھی اُس کے تابع رکھتا ہے کہ الٰہ وہی ہے' میرے جذبات بھی میرے الٰہ نہیں ہو سکتے۔کہا کہ اُس نے یہ کیا کہ اپنے جذبات کو الٰہ بنایا اور نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ سماعت' بصارت' قلب' آنکھیں اور کان' سب جواب دے گئے' ان کے اوپر پردے پڑ گئے۔کہتا ہے کہ **فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ** (45:23) جو اپنی یہ کیفیت پیدا کر لے' جذبات کے نشے میں آ جائے' تو یہ خدا کی طرف سے دیا ہوا علم اُس کے کس کام آ سکتا ہے۔

اب اگلی بات آ گئی جو میں نے کہا تھا کہ اصل چیز مکافاتِ عمل ہے' زندگی کی Continuity (تسلسل) ہے' تسلسلِ حیات ہے۔انسان کا طبعی جسم مرتا ہے' انسان نہیں مرتا بلکہ آگے چلتا ہے۔کہا کہ جنہوں نے یہ نظریۂ زندگی اپنایا کہ یہ کائنات بس اسی طرح سے وجود میں آ گئی' اس کے پیچھے کوئی حکمت اور مقصد نہیں' تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ **وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا** (45:24) وہ کہتے یہ ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ ربط کہاں تک چلا آ رہا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ **وَمَـــا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ** (45:24) ساری چیز ٹائم ہے' وقت گزرتا چلا جاتا ہے' عمر بڑھتی چلی جاتی ہے' بڑھنے کے بعد ایک وقت آ جاتا ہے کہ مشین کے پرزے گھس جاتے ہیں اور آدمی ختم ہو جاتا ہے۔کہتا ہے کہ علم کی بارگاہ سے انکو یہ جواب نہیں ملے گا۔ **وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ**

مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (45:24) یہ ان کا ظن وقیاس ہے' جس سے یہ بات کر رہے ہیں۔ سمجھتے اس لیے نہیں ہیں کہ جذبات کے نشے میں مدہوش ہیں۔

عزیزانِ من! بات یہ ہوئی کہ کائنات کے پیدا کیے جانے کا جو نظریہ ہے کہ کائنات یونہی الل ٹپ پیدا ہو چکی ہے' انسانی زندگی بھی صرف Physical Life (طبعی زندگی) ہے' آگے کچھ مقصد نہیں ہوتا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ پھر کوئی اقدار' کوئی 'Values' کوئی کسی دوسرے کا خیال آ ہی نہیں سکتا۔ یہ حیوانی سطحِ زندگی ہوتی ہے' Law of the Jungle (جنگل کا قانون) ہوتا ہے جو کارفرما ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی چیز جس کی بنا پہ وہ کہتا ہے کہ جو پہلی اقوام تھیں وہ تباہ ہوئیں اور ہمارے اس دور میں تو یہ نظریہ اتنا عام ہوا ہے کہ مسلمانوں میں اس کے خلاف صرف زبان پر ہی الفاظ ہوتے ہیں کہ یہ باالحق ہے جبکہ ان کے عمل میں یہ قطعاً نہیں آتا۔ یہ جو موجودہ تہذیب ہے جس کے لیے اُس [1] نے کہا تھا کہ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی' تو اُس کی لم قرآن نے یہ بتائی ہے کہ انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ صرف Physical Life (طبعی زندگی) ہے اور بس۔

بے مقصد زندگی ایک آوارہ انسان کی مانند ہوتی ہے

اقبالؒ (1938-1877) ان اقوامِ مغرب یا اس تہذیب والوں سے کہتا ہے کہ

در نگاہش آدمی آب و گِل است

ان کی نگاہ میں جو انسان ہے وہ صرف پانی اور مٹی کا ایک مجموعہ ہے اور اسی طرح سے یہ بن گیا ہے۔

کاروانِ زندگی بے منزل است

کاروانِ حیات کی کوئی منزل نہیں ہے۔

عزیزانِ من! سفر اور آوارگی میں فرق ہوتا ہے۔ سفر میں تو آپ کی ایک منزل متعین ہوتی ہے' آپ کا ہر قدم اُس کی طرف اٹھتا ہے لیکن آوارگی میں منزل کا تعین کیے بغیر جب آپ چلتے رہتے ہیں تو ساری عمر چلتے رہیے' تھکان تو آپ کے حصے میں آئے گی' منزل تک آپ نہیں پہنچ سکتے۔

---

[1] یہ اشارہ مفکرِ قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے جس نے کہا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائدار ہوگا

(بانگِ درا)

تہذیب کی تعریف کیا ہے؟ اور مومن کی زندگی کیا؟

یہ جو سیکولرازم ہے، یہ تہذیبِ مغرب ہے۔ سوچیے کہ یہ ہے کیا؟ یہ سگرٹ، یہ لپ اسٹک، اور یہ چیزیں وغیرہ وغیرہ، یہ تہذیبِ مغرب نہیں ہیں۔ تہذیبِ مغرب یہ نظریہ حیات ہے کہ

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ مومنین کی زندگی یہ نہیں ہے۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے یہ الفاظ، یہ نظریات یا وہ جس کو کلمہ کہتا ہے، یہ الفاظ نہیں جو دہرائے جاتے ہیں بلکہ اس سے مسلکِ حیات بنتا ہے، اس سے روشِ زندگی بنتی ہے، اس کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ کہا کہ **اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ** (3:189) اس کائنات کی تخلیق میں، دن اور رات کی گردشوں میں، اربابِ عقل وفکر کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ قرآن ہمیشہ نشانی کہتا ہے یعنی یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں ہیں، بلکہ کسی مقصد تک پہنچنے کے لیے نشانی ہیں۔ لفظ الباب ہے۔ ہمارے ہاں لُبِّ لباب ہوتا ہے ''تت کڈیا ہویا جنوں کیندے ہیگے نیں ❶''۔ کہا ہے کہ ان کے لیے ان کے اندر نشانیاں ہیں۔ **الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ** (3:190) یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے، بیٹھے، چلتے، قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں۔ اب اس **یَذۡکُرُوۡنَ** کا ترجمہ ذکر کر دیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ نہیں ہے، وہ عربوں کے ہاں ہے کہ گالیاں بھی دے رہے ہیں، باتیں بھی کر رہے ہیں اور تسبیح ہاتھ میں ہے اور ذکر ہو رہا ہے۔ مگر یہاں اِس آیت (3:190) میں یہ الباب کی بات ہو رہی ہے کہ وہ جو عقل وفکر کے انتہائی مقام پہ پہنچے ہوئے لوگ ہیں، یہ ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ کیا یہ لوگ تسبیح کے دانے گنیں گے؟ ذکر کے معنی ہوتا ہے کہ ''قوانینِ خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھنا''۔ ہم نے یذکرون کا یہ مفہوم کیسے سمجھا؟ وہ اس لیے کہ اُس نے کہا ہے کہ **وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ** (3:190) وہ تخلیقِ کائنات کے اوپر غور وفکر کرتے رہتے ہیں، تو اس سے ذکر کے معنی صاف ہو گئے، **یَتَفَکَّرُوۡنَ** نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور غور وفکر کے بعد کس نتیجے پہ پہنچتے ہیں۔ یہ ہے اصل شے جن کو مومن کہا گیا۔ پھر کہا کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا** (3:190) اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تُو نے اس کائنات کے سلسلے کو بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے، کاروانِ زندگی بے منزل نہیں ہے۔ وہ غور وفکر کے بعد اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں۔

---

❶ جسے کسی بات کا جوہر کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! سوچیے کہ اسے ایمان کہا جائے گا۔ کہا کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ** (3:190) اے بارِ الٰہا! تیری ذات اس سے بہت بلند تھی کہ تُو اس کارگہء کائنات کو بے مقصد' بچوں کی طرح کھیل کے طور پہ پیدا کر دیتا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا' ہم تم سے یہ Expect (توقع) ہی نہیں کر سکتے۔ تُو اس سے بہت بلند ہے۔ اور ہماری دعا یہ ہے کہ کہیں ہم یہ نہ سمجھنے لگ جائیں کہ یہ بے مقصد ہے۔ یہ سمجھنا تو **فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ** (3:190) ہوگا یعنی یہ جہنم کی زندگی ہوگی' مولا! اس سے ہم کو بچا لے۔ یہاں (3:190) میں کائنات کو بے مقصد اور کاروانِ زندگی کو بے منزل سمجھنے کے بعد کہا کہ یہ جہنم کی زندگی ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ جہنم کیا ہوگا؟ کیا وہ کہیں بہت سی لکڑیاں جل رہی ہونگی؟ اُس نے اگلے ہی فقرے میں وضاحت کر دی کہ **رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ**[1] (3:191) ۔جہنم کی زندگی یہ ہے کہ وہ دنیا کے اندر رسوا ہو جاتا ہے' وہ دنیا کے اندر ذلیل ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ **وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ** (3:191) اور جو قوم دنیا میں رسوا ہوتی ہے تو اُس کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! غور فرمایا کہ بات تو یہ تھی کہ **خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ** (29:44) ۔جو شخص عقل و فکر سے کام لے اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا نے ارض و سماء کو ایک حقیقت ثابتہ (Established Fact) کے طور پر پیدا کیا ہے' اس کا ایک خاص مقصد ہے یہ یونہی کھیل تماشا نہیں ہے۔ اور **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ** (29:44) جو لوگ اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں' ان کے لیے' اس میں زندگی کی صحیح روش پہچاننے کے لیے' بڑی واضح نشانیاں ہیں۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ یہ کس طرح آپ کے ہاں ایمان کی بنیاد بن گئی' یہ بنیاد بن گئی ہے دین کی' یہ بنیاد بن گئی ہے زندگی کے مقاصد کی۔ کہا کہ جن قوموں نے یہ بات اپنے سامنے نہ رکھی' وہ اس کو باطل سمجھتے رہے' اس کا نتیجہ جہنم کی رسوائیاں اور تباہیاں ہیں۔ اب اس کے بعد ان کی داستانیں باقی ہیں' یہ کھنڈرات باقی ہیں' وہاں جا کر ان کی اینٹوں پہ ان کی زندگی کی داستانیں پڑھو اور اُس سے عبرت حاصل کرو۔ تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ کاروانِ زندگی بے منزل ہے' یہ کرو گے تو تمہارا یہی حشر ہو جائے گا جو ان کا ہے اس لیے **اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ**[2] (29:45)۔

عزیزانِ من! اب درس کا وقت پورا ہوا۔ ہم سورۃ العنکبوت کی آیت 44 تک آ گئے ہیں۔ آئندہ درس آیت 45 سے ہوگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

---

[1] جو قومیں ''اِس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے' اشیائے کائنات کی نفع بخشیوں سے محروم رہتی ہیں' ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں اور وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔172)۔

[2] (اے رسول!) تم ان قوانین کو' جو تمہیں بذریعہ وحی دیئے گئے ہیں' ان لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔921)

بارھواں باب: **العنکبوت** (آیت 45: تصور ومبادیاتِ صلوٰۃ)



عزیزانِ من! آج جون 1979ء کی 8 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 45 سے ہو رہا ہے: (29:45)۔

مروّجہ تراجم کے تحت زیرِ نظر آیت صرف نماز پڑھنے اور ''اللہ ھو'' کرنے تک محدود ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے درس میں' میں نے اس آیہ جلیلہ کو یونہی چھوڑ دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے لیے کافی وقت کی ضرورت ہے۔ میں پہلے یہ آیت پیشِ خدمت کردوں۔ کہا ہے کہ اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ط اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ط وَ لَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ط وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (29:45)۔ کسی ترجمے میں آپ دیکھ لیجیے' یا کسی سے آپ پوچھ لیجیے اس کے معنی یہ بتائے جائیں گے اور ترجمے کے اعتبار سے جو ہمارے ہاں مروج ہے وہ ٹھیک بھی ہونگے کہ اے رسول! تیری طرف جس کتاب کو وحی کیا جاتا ہے' تُو اُسے پڑھ اور ان کے سامنے پیش کر' نماز قائم کر' نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے' اللہ کا ذکر اُس سے بھی بڑا ہے' خدا جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ اب اس ترجمے کے بعد آپ پوچھیں گے کہ وہ کونسی بات ہے جس کے لیے آپ نے کہہ دیا کہ اس کے لیے تو شاید ایک درس بھی کافی نہیں ہوگا۔ یہ بات تو بڑی صاف سی ہے کہ نماز پڑھ کہ یہ بے حیائیوں اور برائیوں سے روک دے گی۔ نماز پڑھ لیتے ہیں اور پھر اللہ کا ذکر شروع ہوتا ہے اور پھر وہ لا الہ اللہ کی ضربیں لگتی ہیں' تو یہ بات صاف ہوگئی۔ اس کے اندر کونسے ایسے حقائق پوشیدہ ہیں' کونسی معرفتیں اس کے اندر آئی ہوئی ہیں' کہا جا رہا ہے کہ اس کے لیے کئی درس ضروری ہونگے ۔اب میں اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ

تفصیلِ معنیٰ غمِ الفت طویل ہے
اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

بات تو اتنی سی ہے کہ نماز پڑھ' اللہ کا ذکر کر' یہ برائیوں اور بے حیائیوں سے روک دے گی' اللہ جانتا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو۔ بات تو صرف اتنی ہے لیکن اتنا ہی عرض کرونگا کہ تفصیلِ معنیٰ غمِ الفت طویل ہے:

''بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی''

بلکہ اس سے بھی خوبصورت شعر یہ ہے کہ

ہم درد کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے
سمٹے تو مرا دل ہے' پھیلے تو زمانہ ہے

آیئے دیکھیں کہ یہ پھیل کر زمانہ کیسے بنتا ہے۔ سمٹنا تو آپ نے دیکھ لیا کہ نماز پڑھ اور اُس کے بعد ''اللہ ھو'' کر۔

نمازیوں اور نماز پڑھانے والوں سے ایک اہم سوال

بات یہ ہے کہ اس میں وہ حقائق کونسے ہیں' دقت کونسی ہے' جس کے لیے اتنی بڑی تفصیل کی ضرورت ہوگی۔ مشکل کی بات یہ ہے کہ اگر ان سے صرف یہ پوچھ لیا جائے تو آپ دیکھیے گا کہ یہ کس طرح منہ بسور کر رہ جاتے ہیں۔ ان سے یہ پوچھا جاسکتا ہے اور پوچھا جانا بھی چاہیے جو یہ کہتے ہیں کہ نماز پڑھو تو آگے یہ ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (29:45) یہ یقینی بات ہے کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روک دیتی ہے۔ پوچھنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات! جو نمازی ہیں' کیا یہ واقعی بے حیائیوں اور برائیوں سے رکے ہوئے ہیں؟ خدا کا دعویٰ ہے کہ یہ یقینی بات ہے: یہ صلوٰۃ برائیوں اور بے حیائیوں سے روک دیتی ہے۔ اب اس کا ٹیسٹ تو سامنے ہے کہ نمازی موجود ہیں۔ نمازیوں سے پوچھیے کہ کیا وہ واقعی برائیوں اور بے حیائیوں سے رکے ہوئے ہیں؟ نماز پڑھانے والوں سے پوچھیے۔ ان سے کیا پوچھیے' ان پڑھانے والے اماموں کے قصے جو روز اخبارات میں آتے ہیں' اُن سے تو حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اگر یہ صورت ہے کہ کوئی نمازی دعویٰ نہیں کرسکتا' ان کی سیرت و کردار اس کی شہادت نہیں دے سکتے کہ وہ بے حیائیوں اور برائیوں سے رکے ہوئے ہیں' خدا کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ یقینی چیز ہے کہ صلوٰۃ بے حیائیوں اور برائیوں سے روک دیتی ہے اگر نہیں روکتی تو کیا خدا کا یہ دعویٰ غلط ہے یا یہ وہ نماز ہی نہیں ہے جو برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے؟ آپ پوچھیے ان سے کہ کیا کبھی آپ نے اتنے سے ٹکڑے پہ غور کیا ہے کہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ روکتی ہے۔ اور نماز پڑھنے والے کہتے ہیں کہ صاحب! ہم تو بندہ بشر ہیں' گنہگار

ہیں یا پھر اُس سے پوچھو کہ (معاذ اللہ) یہ کیوں کہا گیا ہے اور اگر یہ ایمان ہے اور ہونا چاہیے کہ اُس نے تو سچ کہا ہے تو پھر اگلی بات یہی ہے کہ یہ جس نماز کو تم صلوٰۃ کہتے ہو تو پھر یہ وہ صلوٰۃ نہیں ہے جو برائیوں اور بے حیائیوں سے روک دیتی ہے۔

عزیزانِ من! یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے۔ اگر یہ روکے تو صلوٰۃ ہے' نہیں روکتی تو اگر وہ صلوٰۃ وہی ہے تو (معاذ اللہ) خدا کا دعویٰ غلط ہے۔ وہ حکیم کہتا ہے کہ اس نسخے سے بخار اتر جائے گا اور اگر بخار نہیں اترا تو دو ہی چیزیں ہیں کہ یا تو حکیم کا نسخہ صحیح نہیں تھا یا پھر نسخے کے اجزا وہ نہیں ہیں جو اُس نے بتایا تھا۔ اس میں تیسری بات تو ہے ہی نہیں۔ نماز بھی پڑھے جائیں گے اور اعتراف بھی کیے جائیں گے کہ یہ برائیوں اور بے حیائیوں سے تو نہیں روکتی۔ نمازی یہ بھی نہیں کہتے کہ خدا کا دعویٰ غلط ہے۔ اور اگر کہیے کہ یہ نماز وہ صلوٰۃ نہیں ہے تو یہ بھی نہیں مانتے:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

قرآن حکیم کا ہر حکم اپنے اندر ایک محسوس نتیجہ رکھتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کے ہر حکم کا ایک محسوس ٹیسٹ ہے' محسوس معیار ہے۔ یہ ذہنی' اعتقادی' نظری' تصوراتی یا تخیلاتی بات نہیں ہے کہ میں نے اپنے ذہن میں سمجھ لیا کہ ہو رہا ہے اور وہ واقعی ہو رہا ہے۔ وہ تو ٹمپریچر کا نارمل پہ آنا آپ کو تھرمامیٹر بتائے گا۔ اگر بخار اترا ہے تو ٹمپریچر نارمل ہے' اگر نہیں اترا تو کہیں غلطی ہے اور کھڑے ہو کر دیکھو لیکن اگر بخار نہیں اتر رہا تو آپ ہیں کہ نسخہ بھی کیے جا رہے ہو اور اطمینان بھی ہے کہ علاج بھی صحیح ہو رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ (29:45) الصلوٰۃ وہ ہے جو فحشا اور منکر سے روک دیتی ہے۔ اب میں قرآن کے یہ الفاظ لاؤں گا۔ جب تک الفاظ سمجھ میں نہ آئیں کہ قرآن کہتا کیا ہے تو بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ جتنا حصہ میں نے عرض کیا ہے اس میں آپ غور کیجیے گا کہ کوئی بات جھگڑے والی تو نہیں ہے' کوئی بحث والی بات تو نہیں ہے۔ یہ نمازیوں کو اقرار ہے کہ ہم برائیوں اور بے حیائیوں سے نہیں رکے ہوئے۔ یہ ان کی سیرت اور کردار سے اقرار ہے کہ یہ نہیں رکے ہوئے تو اگلی بات پھر یہ ہے کہ یا یہ دعویٰ (معاذ اللہ) غلط ہے یا پھر یہ الصلوٰۃ' وہ نماز نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اتنے حصے سے تو آپ مطمئن ہوں گے کہ بات بڑی صاف ہو گئی ہے۔

نماز کے مروّجہ معنی اور صلوٰۃ کے بنیادی مفہوم میں فرق

بات تو الصلوٰۃ کی ہے۔ وہ الصلوٰۃ کہتا ہے اور ہم نماز کہتے ہیں' بس یہیں پہ بات ختم ہو جاتی ہے۔ ایرانیوں نے ذرا سا یوں پھیر دیا

اور جب وہ گاڑی کا نٹا بدلتی ہے تو اُس وقت تو دونوں لائنوں میں دو تین انچ کا ہی فرق ہوتا ہے' انجن کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ میں اُسی پٹڑی پہ ہوں یا میرا ذرا سا رخ مڑ گیا ہے۔ اور پھر جتنی تیز رفتاری سے چلے گا' اتنا ہی منزل سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اُنہوں نے' اِن ایرانی کانٹے والوں نے' آپ کے ساتھ ذرا سا یوں کیا ہے' بس صرف پٹڑی بدل دی۔ الصلوٰۃ کی جگہ اُنہوں نے نماز کہا اور ہم اس پہ مطمئن ہو گئے اور یہ ہو رہا ہے۔ اب یہ نہیں ہوتا تو خدا کے ہاں تو لکھا جا رہا ہوگا' تو وہاں جا کے حساب پوچھ لے گا۔

یہ الصلوٰۃ کیا ہے؟ عربی زبان کی رو سے اس لفظ کا جو Root (مادہ) ہے' اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''کسی کے پیچھے اس طرح سے چلے جانا کہ اُس سے آگے تو نہ بڑھے لیکن اُس میں اور اس کے درمیان فاصلہ نہ رہ جائے۔ ایسا ہو کہ ساتھ کے ساتھ جا رہا ہو' بہت پیچھے نہ رہ جائے اور آگے بھی نہ بڑھے''۔ ان کے ہاں یہ محسوس شکل ہوتی تھی کہ یہ جو ریس کورس میں گھوڑے دوڑتے ہیں' تو جو دوسرے نمبر پہ گھوڑا ہوتا تھا جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ اُس کی کنوتیاں اگلے گھوڑے کی پشت کے ساتھ تو لگی رہتی تھیں لیکن یہ اُس سے آگے نہیں بڑھتا تھا اور ان دونوں کے اندر انقطاع بھی نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے نمبر کے گھوڑے کو وہ مصلی کہتے تھے۔ ابھی میں عرض کرونگا کہ یہ دوسرے نمبر کا کیوں ہے۔ صلوٰۃ یہ ہے۔ اس گھوڑے کے سامنے بھی منزلِ مقصود ہوتی ہے اور یہ اُس کی طرف جا رہا ہوتا ہے اور پہلے نمبر والے کو Follow کرتا ہے۔ اس کے اندر اتباع کی بات آتی ہے۔ ایک منزل' ایک نصب العین' ایک مقام جس کی طرف جاتا ہے' ایک خاص راستہ ہوتا ہے جس کی طرف وہ چلتا ہے۔ یہ مفہوم اس مروجہ نماز میں نہیں ہے۔

تسبیح کا قرآنی مفہوم

دیکھیے کہ یہ لفظ کہاں آیا ہے۔ کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (24:41)۔ اب اس آیت میں تسبیح کا بھی لفظ آیا ہے' یہ بھی میں عرض کرونگا۔ الم ترا وہاں آتا ہے جہاں محسوس چیز ہوتی ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جو کچھ بھی خارجی کائنات میں ہے وہ خدا کے پروگرام تک پہنچنے کے لیے تسبیح کرتا ہے۔ یہ جو گھوڑا اگلے گھوڑے کے اتباع میں اپنی منزلِ مقصود کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ ریس میں تو گھوڑا اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیتا ہے' اُس کی وہ جو چال ہوتی ہے تو وہ پورے دو پاؤں یوں کر کے چلتا ہے۔ یعنی انتہائی درجے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح سے یہ جو تیراک اس طرح کی تیرا کی سے چلتا ہے یعنی پورے ہاتھ پھیلا کر تیرتا ہے' تو عرب اس کو تسبیح کہتے ہیں۔ ان کے ہاں مصلی کے ساتھ یہ دونوں چیزیں آتی تھیں۔ یعنی صلوٰۃ اور تسبیح کرنے والا گھوڑا۔ اپنی منزلِ مقصود کی طرف کسی کے اتباع میں چلنے والا' پوری کوشش اور توانائی کے ساتھ چلے تو یہ صلوٰۃ اور تسبیح ہے۔ اُس زبان میں جس میں قرآن نازل ہوا تھا' قرآن کا مفہوم تو اُسی زبان سے پوچھا جائے گا۔ سنسکرت سے تو نہیں پوچھا جائے گا' اردو اور پنجابی اور انگریزی سے

تو نہیں پوچھا جائے گا۔ یہ تھے ان الفاظ کے مفاہیم جو نزولِ قرآن کے وقت عرب لیتے تھے۔ کہا کہ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کائنات کی ہر شے خدا کے پروگرام کے لیے مصروفِ تسبیح ہے یعنی پوری پوری توانائیاں صرف کر کے اس منزل تک پہنچنے کے لیے کوشش کرتی ہے۔ یہ تسبیح ہوگئی۔ کہا کہ **وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ** (24:41) اور نہیں تو ذرا ان پرندوں کو دیکھو کہ یہ پر پھیلائے ہوئے کس طرح سے جا رہے ہیں۔ **كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ** (24:41) ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتا ہے۔ اگر یہاں وہی نماز ترجمہ کر دیجیے تو پھر تو کوئی بات ہی نہیں رہتی۔ کہا کہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتا ہے۔ **وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ** (24:41) اور خدا کی ان کے اوپر نگاہ ہوتی ہے کہ یہ کس طرح سے یہ کچھ کر رہے ہیں۔ ویسے تو یوں بھی اپنے ہاں کے پرندوں کو بھی آپ دیکھ لیجیے' یہ سارا دن سینکڑوں میل کی مسافت طے کرتے ہیں' یہ فضا کی پہنائیوں میں اڑتے رہتے ہیں اور شام کے وقت ہر پرندہ اپنے گھونسلے میں واپس آ جاتا ہے۔ کوئی سڑک نہیں' کوئی راستے میں سنگِ میل نہیں' کوئی نشاناتِ راہ نہیں' کوئی بتانے والا نہیں' کوئی سکھانے والا نہیں۔ یہ کس طرح اپنی اُسی منزل پہ پہنچ جاتے ہیں اور کتنی تیزی سے اڑ کر پہنچ جاتے ہیں؟ اس لیے کہ یہ اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتے ہیں۔ ذرا ان کبوتر بازوں سے پوچھیے جو یہ کبوتر اڑاتے ہیں۔ وہ کبوتر سارا سارا دن اڑتا رہتا ہے اور اُس کے بعد پھر وہ اپنی چھتری کے اوپر آ کر بیٹھتا ہے۔ شہد کی مکھی کو دیکھ لیجیے' شہد کی مکھی کو ایک قطرہ شہد کا یعنی پھول سے رس لانے کے لیے 37 ہزار میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ قطرہ جو لے کر آئی ہے وہ کسی دوسرے چھتے میں چلی جائے یا راہ گم کر دے اور اپنا چھتہ اُس کو پتہ ہی نہ چلے کہ کہاں ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ یہ ہے **كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ** (24:41)۔ یہ جو ''قد'' کا لفظ عربی زبان میں ہوتا ہے تو یہ یقینی چیز ہوتی ہے۔

یہ Migratory Birds ہیں' جن کو مہاجر پرندے کہتے ہیں' حیرت ہے کہ ان لوگوں نے ان کے اوپر جو تحقیق کی ہے وہ حیرت زا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ وہ فلپائن یا آسٹریلیا کے کسی مقام سے اڑتے ہیں' ان کے راستے میں سمندر پڑتا ہے۔ وہ تین ہزار میل کا سفر سمندر کے اوپر طے کرتے ہیں۔ چلیے خشکی کے اوپر تو پھر بھی کہہ لیں گے کہ اُنہوں نے کسی درخت کا' کسی چٹان کا' کسی دریا کا' کوئی نقشہ ذہن میں قائم کر لیا تھا اور اُس کے مطابق واپس آئے تھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ تو سمندر پہ اڑ کر جاتے ہیں۔ وہ جنوبی امریکہ میں کسی مقام پہ یا جس نے کسی جزیرے پہ جانا ہوتا ہے وہ وہاں پہ جاتے ہیں۔ ان کا وہ سردی گرمی کا موسم ہوتا ہے تو جب وہ موسم ختم ہوتا ہے تو وہ وہاں سے اڑتے ہیں اور اُسی طرح سے اپنے پہلے ٹھکانوں پہ آ جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! اتنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ وہاں انڈے دیتے ہیں اور خود واپس آ جاتے ہیں' انڈے ریت کے اندر ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ان انڈوں میں سے بچے نکلتے ہیں اور وہ بچے جب اڑنے کے قابل ہوتے ہیں تو وہ انہی راستوں سے ان کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ہے **كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ** (24:41)۔ ''باپ'' پہنچا ہوا

ہوتو ''بیٹا'' بھی پہنچ جاتا ہے۔ سوچیے تو سہی جو قرآن کہہ گیا ہے کہ **کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ** (24:41)۔ یہ یورپ کے تحقیق کرنے والے تو انہی چیزوں پہ تحقیق کرتے ہیں' مکھیوں پہ تحقیق کرتے ہیں' ان پرندوں پہ تحقیق کی ہوئی اتنی اتنی ضخیم کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ اور وہ **کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ** (24:41) کی تفسیر ہے اور وہ الفاظ صلوٰۃ اور تسبیح کی تشریح ہے۔ اب صلوٰۃ کے تو معنی آ گئے کہ ایک متعین منزلِ مقصود اور اُس تک پہنچنا اور پوری کی پوری توانائیاں صرف کر کے اُس پہ پہنچنا تسبیح ہے۔ منزلِ مقصود کا تعین ہونا چاہیے۔

دلجمعی کے ساتھ صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کا عزم

اب باقی رہا کہ وہ جو راستہ ہے وہ کونسا ہے جس پہ چلتے ہوئے اُس منزلِ مقصود پہ پہنچنا ہے۔ یہ جو مصلی گھوڑا ہے اُس کے لیے تو ٹریک بنا دیا جاتا ہے اور وہ اُس ٹریک کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ نمبر ایک کے گھوڑے کو دیکھتا ہے اور اُسی کے پیچھے چلتا ہے۔ عزیزانِ من! یہاں کونسی چیز ہے۔ یہاں قرآن ہے۔ ہم نماز پڑھنے والے دن میں کم از کم چوالیس مرتبہ تو کہتے ہیں کہ **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (1:5) ۔ یہ بہت بڑی دعا ہے اور بہت بڑی آرزو ہے کہ ہمیں صراطِ مستقیم پر چلا دے۔ یہ انتہائی حرکت نہیں ہے کہ سارا دن چلتا رہے اور شام کو پھر وہیں آ جائے۔ یہ تو کولہو کا بیل ہوتا ہے۔ جو صراطِ مستقیم ہے' وہ کسی منزل تک پہنچانے کے لیے راستہ ہوتا ہے۔ خالی حرکت صرف گردش ہوتی ہے' آوارگی ہوتی ہے وہ سفر نہیں ہوتا' وہ وہیں کا وہیں ہوتا ہے جہاں سے چلتا ہے۔ صلوٰۃ میں تو وہیں کے وہیں بات نہیں ہے بلکہ منزلِ مقصود سامنے ہے اور اُس تک پہنچنا ہے۔ یہ راستہ کونسا ہے؟ دوسری جگہ ہے کہ **اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (11:56) کہہ دے' اے رسول! کہ میرا رب صراطِ مستقیم پہ جا رہا ہے اُس کے پیچھے چلو۔ اب پہلے نمبر کا گھوڑا سامنے آ گیا: **اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (11:56)۔ اب دیکھیے ان عربوں کی حقائق شناسی اور جزرسی۔ وہ مثال یہ ہے کہ وہ گھوڑا اول نمبر کے گھوڑے سے آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن ان دونوں کے درمیان فاصلہ بھی نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے صراطِ مستقیم کے اوپر چلنے کی دعا ہے اور **اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (11:56) سے بات صاف ہوگئی۔ خدا کی صفات اپنے اندر پیدا کرتے ہوئے چلے جانا اتباعِ خداوندی ہے' یہ صراطِ مستقیم پہ چلنے کی بات ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ خدا کے مقرر کردہ راستے کے اوپر اُس کے پیچھے چلنا۔ ابھی ہم نے دیکھا کہ صلوٰۃ تو ایک متعین راستے کے اوپر ایک منزل تک پہنچنے کا نام ہے اور اس میں خدا کا اتباع ہے۔ اب اس کے مقابلے میں آیا کہ انسان اپنے ہی جذبات' مفاد اور مصالح کے تابع چلتا رہے۔ سنیے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ انبیائے کرامؑ کا ذکر آ رہا تھا اور اُس کے بعد تھا کہ **فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ** (19:56) ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے کہ **اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ** (19:56) اُنہوں

نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک صلوٰۃ کو ضائع کرنے والوں کی نشاندہی

قرآن تو اپنے الفاظ کو تشریح کیے بغیر چھوڑتا نہیں ہے۔ اُنہوں نے کیا کیا جس کو کہہ دیا ہے کہ صلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ کہا کہ **وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ** (19:56) اپنے ہی جذبات کے پیچھے چلنے لگ گئے۔ اتباعِ خداوندی اور صلوٰۃ' دوسری طرف اپنے ہی جذبات کا اتباع کرنا اور صلوٰۃ کا ضائع کر دینا۔ نتیجہ اُس کا یہ ہے کہ **فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا** (19:56) تباہی انکے پیچھے لگی ہوئی ہے کہ ابھی آیا ہی چاہتی ہے ۔صلوٰۃ کو ضائع کرنا یعنی اُس کے اتباع کے بجائے اپنے ہی جذبات' مفاد یا مصالح کا اتباع کر کے بیٹھ جائے۔ نتیجہ اس کا تباہی ہے۔ یہ قدم قدم کے اوپر سامنے آتا جا رہا ہے کہ الصلوٰۃ کیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید آگے بڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ الصلوٰۃ کس طرح سے فحشا اور منکر سے روک دیتی ہے۔ اپنا اتباعِ جذبات کیجیے تو فحشا اور منکر کے پیچھے چلتے چلے جایئے گا اور جب اُس کا اتباع نہیں تو یہ بات نہیں ہوگی۔ ابھی آئے گا کہ قرآن کی رو سے فحشا اور منکر کیا ہے۔ یہاں آ گیا کہ صلوٰۃ کے جو مقابل میں لفظ ہے تو وہ اتباعِ جذبات ہے یعنی اپنی ہی خواہشات کا اتباع کرنا۔ اور خداوندی قاعدے کے مطابق چلتے چلے جانا الصلوٰۃ ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ کے لیے پہلی چیز تمسک بالکتاب ہے

یہ جو الصلوٰۃ ہے' جب یہ نماز ہوگئی تو اُس میں تو یہ ایک خاص وقت کے اوپر خاص رکعتیں' ارکان' اُس کے اندر کچھ پڑھنا وغیرہ ہوگیا لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ یہ کسی خاص وقت کے اوپر یہ کچھ کرنے کی بات نہیں ہے۔ یہ تو **وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ** (7:170) زندگی کے پورے دور میں الکتٰب (قرآنِ مجید) کے ساتھ متمسک رہنا ہے' یہ ہے اقامتِ صلوٰۃ۔ وہ جو درمیان میں' میں نے کہا تھا کہ Gap (خلا) نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں لفظِ تمسک کہا ہے کہ کسی چیز کے ساتھ چپکے رہنا۔ تو کہا کہ الکتٰب کے ساتھ چپکے رہو۔ الکتٰب کے ساتھ تمسک' اقامتِ صلوٰۃ ہے اور یہی خدا کا اتباع ہے لیکن جو نماز ہے' وہ تو ہر حالت میں پڑھی جا سکتی ہے' گھر کے اندر بھی لوگ پڑھتے ہیں' انگریزوں کی غلامی کے اندر بھی پڑھی جا سکتی تھی' آج ہندوؤں کے ہاں بھارت میں جو مسلمان بستے ہیں تو نماز کی ان کو بھی اجازت ہے اور وہ پڑھتے ہیں' اس کے لیے تو کوئی شرط نہیں۔

قرآن الصلوٰۃ کے لیے ایک شرط بتاتا ہے۔ سب سے بڑا اعلان جو غیر مسلم حکومت کرتی ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کو نماز روزے کی اجازت دیتے ہیں اور اس میں ہم کوئی دخل نہیں دیں گے۔ ساری دنیا میں یہ چیز ہے۔ وہ جو آپ کے ہاں UNO کا چارٹر ہے اُس کے اندر یہ ایک شق ہے کہ ان کو نماز روزے کی اجازت ہوگی ۔قرآن کہتا ہے کہ نماز روزے کی اجازت تو یہ دیں گے لیکن صوم و صلوٰۃ کی

اجازت تو نہیں دے سکتے۔اس کے لیے تو شرط ہے۔

قرآنِ حکیم میں نماز پڑھو کا لفظ ہی نہیں' البتہ نظامِ صلوٰۃ کے قیام کا بار بار حکم ہے

قرآنِ کریم میں صلوٰۃ کے لیے اقامت کا لفظ آیا ہے۔سارے قرآن میں ''نماز پڑھو'' کا لفظ ہی نہیں آیا۔صلوٰۃ کے لیے Establish (قائم) کرنے کا لفظ ہے اور Establish (قائم) تو کوئی نظام کیا جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا انفرادی طور پر یا غیر مسلموں کی حکومت میں یا مسلمانوں کی غیر قرآنی حکومت میں کہ جس میں تمسک بالکتاب نہ ہو تو کیا الصلوٰۃ قائم کی جا سکتی ہے؟ قرآن اس کے لیے ایک شرط قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22:41) یہ امت جو پیدا ہو رہی ہے اگر انہیں ملک میں تمکن حاصل ہو گیا' ان کی اپنی Sovereign Government قائم ہو گئی تو پھر یہ ہے کہ یہ صلوٰۃ کے نظام کو قائم کریں گے۔یہ اقامتِ صلوٰۃ تو مشروط ہے' عزیزانِ من! یہ انفرادی طور پہ کچھ کر لینا تو ایک طرف رہا یہ غیر قرآنی مملکت کے اندر بھی ممکن نہیں ہے۔خواہ وہ مسلمانوں کی اپنی مملکت ہو یا غیر مسلموں کی ہو۔قرآن کہتا ہے کہ جب انہیں تمکن حاصل ہو گا تو پھر یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے۔گویا اقامتِ صلوٰۃ ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے تمکن فی الارض شرط ہے۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں علمائے ہند کی سوچ کا تجزیہ

ضمناً یہ عرض کر دوں کہ تحریکِ پاکستان کے دوران طلوعِ اسلام [1] کے اس زمانے کے فائل شاہد ہیں۔اُدھر سے بڑے بڑے شیخ الحدیث' علمائے کرام' مولانا حسین احمد مدنی (1957-1879ء)' مولانا کفایت اللہ نے یہ دلیل دی تھی کہ ہندو اس کی ضمانت دیتا ہے کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد جب اپنی حکومت قائم ہو گی تو اُس میں نماز روزے کی اجازت ہو گی۔وہ کہتے تھے کہ اس کے بعد تم لوگ اپنی الگ آزاد مملکت کا مطالبہ کیوں کرتے ہو کیونکہ یہی تو اسلام ہے اور اُس کی وہ اجازت دیتے ہیں۔مجھے آج تک یاد ہے اور میں نے اُس کے بعد لکھا تھا کہ صاحب! ذرا پھر اس قرآنِ کریم میں مہربانی کر کے تھوڑی سی تبدیلی کر دیجیے تو آپ کا اور ہمارا جھگڑا مٹ جائے گا کیونکہ وہ کہتا ہے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (22:41) انہیں جب اپنی آزاد مملکت ملے گی تو پھر یہ اقامتِ صلوٰۃ کر سکیں گے۔آپ کہتے ہیں کہ ہندو کی مملکت میں بھی ہو سکتا ہے تو یہ تو قرآن کے ساتھ جھگڑا ہے' یہ ہمارے ساتھ نہیں ہے' لہٰذا اس معاملے کو صاف کر دیجیے۔عزیزانِ من! وہ ختم ہو کے رہ گئے۔یہ چیز تھی جو علامہ اقبالؒ نے کہی تھی کہ

---

[1] مجلّہ طلوعِ اسلام کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا نواں باب' ص ص 162 تا 163' فٹ نوٹ 1

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

(ضربِ کلیم)

اَلَّـذِيْـنَ اِنْ مَّـكَّـنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (22:41) ان کی اپنی مملکت ہوگی تو پھر اقامتِ صلوٰۃ کر سکیں گے اور پھر یہ جو زکوٰۃ ہے یہ دیں گے۔ میں اس زکوٰۃ کو ابھی نہیں لے رہا۔

تمکن فی الارض اقامت صلوٰۃ کی بنیادی شرط ہے

یہ ہمارے علمائے کرام وعظ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس سے اَمَـرُوْا بِـالْـمَـعْـرُوْفِ (22:41) اور نَهَـوْا عَـنِ الْـمُـنْكَرِ (22:41) کرتے ہیں۔ ''امر'' کے معنی حکم کرنا ہوتا ہے اور ''نھی'' کے معنی کسی کو روک دینا ہوتا ہے۔ یہ شرط ہے تمکن فی الارض کی۔ تمکن فی الارض کے بعد امر بالمعروف اور نھی عن المنکر ہوسکتا ہے۔ اگر دوسروں کے قوانین ہوں تو تم یہ کیسے کر سکتے ہو۔ میں ابھی اقامتِ صلوٰۃ پہ آ رہا ہوں۔ تمکن فی الارض ہوگا تو اقامتِ صلوٰۃ ہو سکے گی۔ نظر آیا کہ یہ ایسی چیز کا قائم کرنا ہے جس کے لیے اپنی آزاد مملکت کا ہونا لاینفک ہے' اس کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ یہ نماز پڑھنا تو نہیں ہوا۔ اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ ایک اور جگہ ہے کہ وَعَـدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (24:55) ۔ یہاں جو پوچھا جائے کہ ایمان اور نیک عملی یعنی اچھے اور نیک کام کرنے کا' نتیجہ کیا ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ جی' ثواب ملتا ہے۔ میں نے جب ان لوگوں سے کہا تھا کہ آپ یہ عربی زبان کا لفظ بول رہے ہیں اور میں تو پنجابی آدمی ہوں ''تے مینوں پنجابی اچ سمجھا دیو کہ ہوندا کی اے۔ کہندے کہ ثواب ہونداا ے ہور کی ہونداا ے [1] !!''۔ سنیئے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ اللہ نے انسانوں سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ اگر وہ ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں تو ہم انہیں زمین میں مملکت عطا کر دیں گے' اسے ثواب کہتے ہیں۔ قرآن نے اسی لیے ثواب الدنیا (3:145) کہا ہے اور ثواب الاخرت (3:145) بھی کہا ہے۔

یہ بندۂ درگاہ' ماضی میں تین خانوادوں کا خلیفہ تھا: پرویزؒ

یہاں کہا ہے کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ (24:55) ۔ عزیزانِ من! خدا کو پتہ ہے کہ انہوں نے ان الفاظ کے کیا کیا معنی لینے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جتنے بھی ہمارے ہاں کے صوفیائے کرام ہوتے ہیں' ان کے خلیفہ ہوتے ہیں۔ یہ بندۂ درگاہ بھی تین

---

[1] مجھے پنجابی زبان میں سمجھا دیجیے کہ یہ (ثواب) ہوتا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ثواب ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے!!

خانوادوں [1] کا خلیفہ تھا۔ اسی آیت کی بنا پہ وہ کہتے ہیں کہ خلافت ملی ہوئی ہے۔ وہ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مغل بڑے صاحبِ ذوق بھی تھے کہ انہوں نے نائی کو خلیفہ کہہ دیا۔ انہوں نے اس آیت کا یہ ترجمہ اور یہ معنی کرر کھے ہیں' یہ خلافت ہے جو پیروں سے مریدوں کو ملتی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ** (24:55) انہیں حکومت ملے گی جس قسم کی مملکت اور حکومت اس سے پہلے قوموں کو ملی تھی۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے مملکت کے حصول کا مقصد اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! قرآن تو اس طرح محسوس دلائل دیتا ہے کہ آپ اُن میں سے نکل ہی نہیں سکتے۔ وہ مملکت کاہے کے لیے دیتا ہے؟ **وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ** (24:55) تا کہ اُس مملکت میں تمہارا دین متمکن ہو سکے۔ دین متمکن ہو ہی نہیں سکتا اگر اپنی مملکت نہ ہو۔ تو یہ مملکت کا ملنا شرط ہے۔ اور اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ مملکت مقصود بالذات نہیں ہے کہ بس مملکت مل گئی بلکہ اس کا مقصد تمکنِ دین ہے۔ تمکنِ دین کا پتہ کیسے چلے کہ دین کا تمکن ہو گیا؟ کیا بات ہے قرآن کی! کہا! **وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا** (24:55) اُس میں پہلی چیز یہ ہوگی کہ کسی قسم کا خوف باقی نہیں رہے گا بلکہ ہر ایک کو اس کے اندر اطمینان ہوگا۔ تو دین کے تمکن کا پہلا نتیجہ یہ ہے۔ اگلی بات یہ ہوگی کہ **يَعْبُدُوْنَنِيْ** (24:55) اُس کے بعد اطاعت اور محکومیت صرف میرے قوانین کی ہوگی' کسی انسان کی نہیں ہوگی۔ یہ ہے دین کا تمکن۔ **لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا** (24:55) یہ بھی نہیں ہوگا کہ کچھ میرے قوانین کی محکومیت ہو اور کچھ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی ہو۔ یہ شرک ہوگا' اُس میں یہ نہیں ہوگا۔

صدیوں سے مسلمانوں کی زبوں حالی کی بنیادی وجہ

اب آئی ہماری مسلمانوں کی تاریخ۔ کہا کہ **وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ** (24:55) جو اس کے بعد انکار کرتا ہے تو اُس کا شمار فاسقوں میں ہوتا ہے' مومنوں میں نہیں ہوتا۔ مومنوں کے ہاں مملکت بھی ہوگی' ان کے تمکن بھی ہوگا۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو وہ **كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ** ہے۔ اور اگر **كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ** (24:55) نہ ہو اور وہی چیز رہے تو کہا کہ **وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ**

---

[1] سلاسلِ تصوف میں عام طور پر چار پیر اور چودہ خانوادے گنائے جاتے ہیں۔ پہلا پیر حضرت علیؓ' دوسرا پیر خواجہ حسن بصریؒ تیسرا پیر خواجہ حبیبؒ عجمی اور چوتھا پیر عبدالواحد بن زید کرخیؒ۔ چودہ خانوادے ''پرویزؒ کی کتاب تصوف کی حقیقت (1992) کے ص 75'' پر دیئے گئے ہیں۔
برّصغیر ہندو پاک صوفیائے کرام کے چار خانوادے زیادہ مشہور ہیں: (1) چشتیہ' (2) قادریہ' (3) سہروردیہ اور (4) نقشبندیہ۔ (پرویزؒ: تصوف کی حقیقت' طلوعِ اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1992 ص۔ 77)۔

(24:56) او جماعتِ مومنین! صلوٰۃ کے نظام کو قائم رکھو تو پھر یہ سارے مقصود برقرار رہیں گے' پھر یہ کفر بعدِ اسلام نہیں ہوگا۔ **وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ** (24:56) یہ ہے اس کا مقصد اور اُس کے لیے **وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ** (24:56) ہے یعنی یہ جو مملکت کا سربراہ ہے اُس کی اطاعت کرو۔ اس کے بعد رسول کے جو جانشین ہونگے تو ان کی اطاعت کرو۔ **لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ** (24:56) تا کہ تمہاری صلاحیتیں نشو ونما پاتی چلی جائیں۔

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ **وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ** کہاں آ رہا ہے۔ ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن نے صلوٰۃ کے کیا کیا نتائج بتائے ہیں! میں نے تو عرض کیا تھا کہ ''سمٹے تو مرا دل ہے' پھیلے تو زمانہ ہے''۔ یہ اقامتِ صلوٰۃ تو مرکزی چیز ہے' دین کا ملخص ہے' اُس کے قیام کا ذریعہ ہے۔ اِس کی تفصیل قرآن نہیں دے گا تو اور کس بات کی تفصیل دے گا۔ یہ چیز بڑی تفصیل سے آئی ہوئی ہے۔

فرقوں کی موجودگی میں نماز تو پڑھی جا سکتی ہے لیکن نظام صلوٰۃ قائم نہیں ہو سکتا

ایک بات تو اُس نے واضح کر دی کہ اس کے لیے اول شرط یہ ہے کہ امت میں فرقے پیدا نہیں ہو سکیں گے۔ جس امتِ مسلمہ کے اندر فرقہ ہے تو وہاں صلوٰۃ نہیں ہو سکتی' وہاں صرف نماز ہو سکتی ہے اور وہ ہر فرقے کی الگ ہے۔ کہا کہ **وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ** (30:31) نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔ **وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** (30:31) دعویٰ اسلام کے بعد مشرک نہ بن جانا۔ بتوں کے پوجنے کا نام شرک نہیں ہے۔ سنو کہ شرک کیا ہے؟ کہا کہ **مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا** (30:32) مشرک وہ ہیں جو اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیتے ہیں۔ او! اقامتِ صلوٰۃ پیدا کرو تا کہ فرقے پیدا نہ ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ اقامتِ صلوٰۃ کیا چیز ہے۔ سوال یہ ہے کہ فرقوں کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:32) ہر فرقہ اس بات میں مگن ہوتا ہے کہ میں تو جنتی ہوں اور باقی سارے جہنمی ہیں۔ اور کہا کہ کوئی بھی جنتی نہیں ہوتا' یہ تو سارے مشرک ہوتے ہیں۔ جب امت فرقوں میں بٹ گئی تو امت تو باقی نہیں رہی جبکہ کہا یہ تھا کہ **وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ** (30:31) نظامِ صلوٰۃ کو Establish (قائم) کرو تا کہ امت فرقوں میں نہ بٹ جائے۔

فرقوں کی موجودگی میں صلوٰۃ کا حشر

عزیزانِ من! غور سے سنیے جو میں ابھی عرض کر رہا ہوں۔ اب جب اس کا ترجمہ نماز پڑھنا کیا تو پھر کیفیت کیا ہے؟ مثلاً شام کو انار کلی [1] میں چلے جائیے تو یہاں سے وہاں تک مسلمان چل پھر رہے ہونگے اور وہ الگ الگ نظر نہیں آئیں گے لیکن جیسے ہی وہاں مغرب

---

[1] شہر لاہور' پاکستان کا ایک قدیم' مشہور اور خوبصورت بازار۔

کی نماز کی اذان ہوگی تو ایک ٹولی اُس مسجد کی طرف جائے گی' ایک ٹولی دیوبندیوں کی طرف' ایک ٹولی شیعوں کی طرف' چلی جائے گی۔ وہی امت جس میں کوئی فرق نہیں تھا لیکن نماز سے تفرقہ نمایاں طور پہ ظاہر ہوگیا یعنی نماز آپ کے ہاں فرقہ بندی کی علامت بن گئی کہ جسے قرآن نے کہا تھا کہ صلوٰۃ قائم کروتا کہ فرقے نہ پیدا ہوں۔

نظامِ صلوٰۃ کے برعکس آج ہم نے ہر مسجد پر فرقہ واریت کے بورڈ کندہ کرر کھے ہیں

ہمارے ہاں نماز امت کے اندر فرقے کی علامت ہوگئی۔ گاؤں کے اندر ابھی تک وہ برادری کی کیفیت ہوتی ہے تو کم از کم سارے گاؤں میں نہ سہی' برادری تو ایک ہوتی ہے لیکن جونہی اذان ہوتی ہے تو اُس وقت وہ برادری بٹ جاتی ہے' کوئی اس مسجد میں اور کوئی اُس مسجد میں۔ قرآن نے کہا تھا کہ اقامتِ صلوٰۃ سے امتِ واحدہ رہتی ہے۔ یہ آپ کی نماز سے جو ویسی ایک امت' ایک قوم' نظر آتی ہے تو وہ فرقوں کے اندر بٹ جاتی ہے۔ صلوٰۃ کا نظام کیا ہے؟ وہاں جو کہا ہے کہ ہم تمہیں تمکن فی الارض دیں گے تو یہ پھر نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور پھر کہا ہے کہ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22:41) تمام معاملات کے فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق ہوں۔ عزیزانِ من! یہ ہے نظامِ صلوٰۃ کا قائم کرنا کہ تمام امور کے فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق ہونگے۔ قرآن نے کہا تھا کہ تمسکِ کتاب ہی صلوٰۃ ہے۔ اب تمام فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق ہونگے' تو اس کے لیے ایک عملی نظام کی شکل ضروری ہے کیونکہ یہ تو انفرادی چیز نہیں ہے اور اس کے لیے اُس نے کہا ہے کہ مملکت کا ہونا ضروری ہے۔ مملکت ہوگی تو فیصلے کرنے کے لیے آپ کے ہاں کوئی نظام' کوئی سسٹم ہوگا' جیسے کوئی پارلیمنٹ بنتی ہے' کوئی کابینہ ہوتی ہے' وہاں معاملات پر Discussions (مباحث) ہوتی ہیں' اور فیصلے لیے جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے حکم کے مطابق نظامِ شورائیت کا قیام

قرآن نے اس کے لیے نظامِ شورائیت کہا ہے یعنی باہمی مشورے سے یہ کیا کرو۔ اُس کے اندر ایک ہی لفظ ہے اور تفصیل اُس نے نہیں دی ہے کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تفصیل تو زمانے کے تقاضے سے خود حکومت متعین کرے گی لیکن اصول یہ ہے کہ یہ نظام تمہارے ہاں باہمی مشاورت سے قائم ہوگا۔ اس کی جو شکل قرآن نے وضع کی ہے اُس میں ایک چیز صلوٰۃ آئی ہے کہ قرآنِ مجید کے مطابق نظام قائم کرو۔ تو کہا کہ یہ صلوٰۃ کے نظام کے لیے حاضر ہوجاتے ہیں (42:38) اور وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) پھر باہمی مشاورت کرتے ہیں' باہمی مشورہ کرتے ہیں کہ اس معاملے کا فیصلہ کس طرح سے کیا جائے۔ اس فیصلے کے لیے پہلی چیز تو یہ ہے کہ پھر کچھ دینا پڑتا ہے۔ کہا کہ ان کے لیے کچھ دینے کا سوال نہیں ہے' وہاں وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (42:38) ان کو تو جو کچھ دیا ہوا ہوتا ہے تو انہوں نے ہر وقت کھلا رکھا ہوا ہوتا ہے کہ جی جتنا اس میں سے جی چاہے لیتے چلے جایئے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ کہنے کے بعد کہ

خدا کی آواز پہ حاضر ہوں تو پھر اقامتِ صلوٰۃ یعنی نظام صلوٰۃ قائم ہوتا ہے۔اس کے لیے اَمۡـرُهُـمۡ شُـوۡرٰی بَیۡـنَهُمۡ (42:38) پھر آپس میں مشاورت کرتے ہیں۔اور جو کچھ اُس کے لیے ضرورت ہوتی ہے وہ حاضر کر دیتے ہیں۔

عزیزانِ من! اس طرح نظامِ صلوٰۃ قائم ہو رہا ہے۔اب اس کے لیے ایک اجتماعی سی شکل ہمارے صدرِ اول میں پیدا کی تھی اور یہ ضروری ہوتا ہے۔ہر غیر محسوس نظریئے کے لیے ایک محسوس پیکر ہوتا ہے' مرئی پیکر ہوتا ہے۔یہ اجتماعیت کے لیے بڑی ضروری چیز ہوتی ہے۔اُس کے لیے ہمارے ہاں یہ شکل تھی۔

نظامِ خداوندی کے قیام کے لیے مسجد کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی

حضرتِ عمرؓ کے عہد (634-644/45AD) کی تاریخ زیادہ محفوظ ہے' میرے ہاں ''شاہکارِ رسالت [1]'' میں آپ دیکھیے گا اُس میں یہ چیز ہے کہ تمام معاملات مسجدِ نبویؐ میں طے ہوا کرتے تھے' ان کے ہاں کی پارلیمنٹ وہی تھی' ان کے ہاں کا Discussion (بحث و تمحیص) کا مقام بھی وہی تھا' عدالت بھی وہی تھی' باہر کے سفیر بھی وہیں آیا کرتے تھے' حتٰی کہ حبشیوں کا ناچ بھی وہیں ہوا کرتا تھا۔وہ اُس زمانے میں حکومت کا مرکز تھا۔جب کبھی کوئی اہم معاملہ آ کر پڑتا تھا تو اعلان کرنے والا شہر میں اعلان کرتا تھا کہ الصلٰوۃ الجامعة ' الصلٰوۃ الجامعة آ ؤ صلوٰۃ کے لیے جمع ہو جاؤ' صلوٰۃ کے لیے جمع ہو جاؤ۔یہ لفظ تھا۔معاملہ یہ ہے کہ فلاں مملکت کی طرف سے اعلانِ جنگ آیا ہے تو فیصلہ کرنا ہے کہ لڑائی کی جائے یا صلح کی جائے۔اُس زمانے میں ابھی یہ لاؤڈ اسپیکر یا یہ ریڈیو وغیرہ نہیں تھے تو آواز دینے والا جا کر ڈھنڈورا پیٹتا تھا تو الصلوٰۃ کا لفظ کہتا تھا یعنی یہ نہیں تھا کہ ظہر کی نماز یا عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا بلکہ جب کوئی امرِ جامع ہوتا تھا یعنی جس معاملے میں مملکت کو اجتماعی فیصلہ مقصود تھا اور کیبنٹ کی میٹنگ کرنی تھی تو اُس کے لیے آواز یہ دی جاتی تھی کہ الصلٰوۃ الجامعة ۔اسے وہ صلوٰۃ کہتے تھے۔اب چونکہ ہمارے ہاں ہر معاملہ خدا کے نام پہ شروع ہوتا ہے تو یہ چیز تھی کہ یہ جو موجودہ رکعتیں یا جو طریق ہے' یہ نبی اکرمؐ نے تجویز فرمایا تھا اور یہ چیز پہلے تھی کہ ہم خدا کے لیے جمع ہوئے ہیں' ہم نے خدا کے لیے فیصلہ کرنا ہے اور خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔یہ جو دل کے اندر ایک نظری چیز تھی' ایک اعتقادی چیز تھی' تو اُس کو محسوسات کے اندر لانے کے لیے جسے آپ دو رکعت کہتے ہیں' تو پہلے یہ دو رکعت نماز کی پڑھ لیتے تھے۔اس مقصد کے لیے جمع ہوتے تھے۔یہ تھا مقصد۔

مساجد کے اندر نظامِ صلوٰۃ کے قیام کے لیے طریقِ کار کی وضاحت

اس بات کے لیے جس کا اُس نے کہا ہے کہ پھر جو تمام امر ہے وہ خدا کی طرف رجوع کرے گا تو اُس کی ابتدا اس شکل میں

---

[1] یہ پرویزؒ کی مشہور کتاب کا نام ہے جس میں حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں اسلام ایک جیتے جاگتے نظامِ حیات کی شکل میں سامنے لایا گیا ہے۔

کریں۔ یہ کرنے کے بعد پھر امام کھڑا ہوجاتا تھا' امام کے معنی امیر ہیں۔ وہ کھڑا ہوجاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ مسئلہ یہ معاملہ ہمارے سامنے آیا ہے تو اُس کے لیے آپ کو جمع کیا گیا ہے۔ پھر Discussion (گفتگو) ہوتی تھی' مشورہ ہوتا تھا۔ اس طرح مملکت کے فیصلے ہوتے تھے۔ یہاں اُس دور کے اندر ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ جب بھی کوئی اہم معاملہ آتا تھا تو اُس کے لیے مشورہ کرنا ضروری ہوتا تھا۔ اس کے لیے اعلان کیا جاتا تھا۔ وہ آتے تھے اور یہ دو رکعتیں ادا کرلیا کرتے تھے۔ اس طرح سے اُس کی ابتدا کرتے تھے' پھر وہ معاملہ پیش کرتے تھے۔ جیسا ہمارے ہاں ہے کہ تلاوتِ قرآنِ کریم سے جلسے کی ابتدا کرتے ہیں۔ اب یہ تو رسمِ اذاں رہ گئی ہے' روحِ بلالیؓ نہیں رہی۔ وہ رسم نہیں ادا کرتے تھے بلکہ اصل میں تو اس صلوٰۃ کی اس رکعت کے اندر بھی سوال یہی ہے کہ یہ اس چیز کا عہد ہے کہ **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (1:5) ہمیں اس معاملے کے اندر اُس راستے کی راہنمائی کر جس راستے پہ تُو چلا جا رہا ہے۔ اور اُس کے بعد اس مقصد کے حصول کے لیے ہمارا جھکنا ہو' اٹھنا ہو تو اُس کے لیے ہو۔ عزیزانِ من! زندگی میں جھکنا اور اٹھنا' یہ دو ہی چیزیں ہوتی ہیں' کہیں جھکا جاتا ہے اور کہیں اٹھا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کس وقت جھکا جائے اور کس وقت اٹھا جائے:

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

نظامِ زندگی کی تشکیل کے لیے قیام اور اس کے استحکام کے لیے سجدہ

عزیزانِ من! یہ رکعتوں کے قیام اور سجدے نہیں ہیں بلکہ یہ زندگی کے معاملات کے قیام اور سجدے ہیں۔ جس امت کی یہ صورت ہوجائے کہ ''ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا''، تو یہ وہ سجدہ ہوتا تھا۔ کبھی یہ نماز کے ارکان کی تفصیل آئے گی تو عرض کروں گا۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قیام تو یہ ہے۔ وہ[1] کہتا ہے کہ اس دورِ حاضر کے محروموں کو میں کیا سمجھاؤں کہ مومن جب کہتا تھا کہ **قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ** تو اُس کے کھڑے ہونے میں کتنی قیامتیں پوشیدہ ہوتی تھیں۔ قیامت ہا کہ در قد قامتِ اوست۔ اور باقی رہا یہ جھکنا' تو بعض مقامات ہوتے ہیں' جن میں ابتدائی دور کے اندر آپ کو احکام کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ اور جب اُس کے احکام کے سامنے Complete Submission (کامل سرِ تسلیم خم) ہوتی ہے تو میدانِ جنگ میں ہوتی ہے تو یہ سجدہ ہے۔ اور یہ سجدہ بڑی قیمت رکھتا ہے:

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

کسی کے آگے نہیں جھکنا بلکہ صرف اُس کے آگے جھکنا ہے' تو یہ صلوٰۃ کی صفیں اور نوعیتیں ہیں' یہ صلوٰۃ کے قیام ہیں۔

دورِ اولیٰ میں نظامِ صلوٰۃ پر عمل پیرائی کے خدوخال

یہ جو اجتماع کے اندر رکعتوں والی صلوٰۃ تھی تو یہ چیز اُس دور میں تھی۔ وہاں کوئی فرقہ نہیں تھا' کوئی الگ فقہیں نہیں تھیں' کوئی الگ مسجدیں نہیں تھیں' کوئی الگ نمازیں نہیں تھیں۔ اندازہ لگائیے کہ یہ مقصد تھا' اس کے لیے یہ اجتماعات ہوتے تھے' یہ سجدے اور اُس کے لیے یہ قیام ہوتا تھا۔ خدا کی اطاعت اور اُس کے اتباع میں مسلسل' غیر منقطع طور پر چلے جانا اور پوری پوری توانائیوں تک چلے جانا اور منزلِ مقصود پہ پہنچنا' یہ تھا صلوٰۃ۔ وہ تھا یہ نظام جس کی رو سے ایسا ممکن ہے۔ قرآن نے جسے استخلاف فی الارض کہا ہے' یہ نظامِ صلوٰۃ ہے۔ اس کا قائم کرنا نظامِ صلوٰۃ کا قیام ہے۔ یہ نماز پڑھنا تو صرف اس کے اندر چھوٹی سی شق تھی کہ مشاورت کی۔ مجلس میں جب جمع ہوں تو اس کی ابتدا اُس کے نام سے ہوتی تھی۔ یہ تھا اُس کے اندر یہ اتنا سا ٹکڑا کہ جسے ہم اجتماعِ صلوٰۃ کہتے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں ''نظامِ صلوٰۃ کو اور نظامِ دین کو قائم کرنا''۔ یہ پورے کے پورے دین کے نظام کو قائم کرنا ہے۔ یہ نماز اُس کے حصے کا ایک جزو بنتا ہے اور اس کی بڑی اہمیت ہے۔ جو اجتماعات مشاورت کے لیے ہوتے ہیں تو نظام تو اُسی کے سر پہ قائم ہوتا ہے۔ اُس میں پھر یہ چیز ہوتی ہے کہ مومن جس بات کی ابتدا کرتا ہے' تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے۔ اُس کی محسوس شکل یہ تھی جو اُنہوں نے قائم کی تھی لیکن یہ تھا وہ مقصد جو اس صلوٰۃ کا بتایا ہے۔ کہا ہے کہ اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ (29:45) یہ قانونِ خداوندی جو تجھے وحی کے ذریعے دیا گیا ہے' تم اسے ان کے سامنے پیش کردو۔ پھر خود رسول سے کہا گیا ہے کہ صلوٰۃ کا نظام قائم کر' وہ صلوٰۃ کا نظام جس میں کوئی بھی اپنی خواہشات' جذبات' شہوات کے پیچھے نہیں چلے گا بلکہ قرآن کے بتائے ہوئے قوانین واحکام واقدار کے پیچھے پیچھے چلے گا۔

صلوٰۃ اور نماز کی قبولیت کا معیار الگ الگ ہے

عزیزانِ من! جب یہ صورت پیدا ہوجائے گی تو اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (29:45) وہ صلوٰۃ تو خود ان چیزوں کو روک دے گی۔ جب اپنے جذبات وشہوات کا اتباع کرنا نہیں ہے بلکہ اتباع احکامِ خداوندی کا ہے تو یہ چیزیں کہاں باقی رہیں گی۔ تو یہ ہے الصلوٰۃ کا نظام جو اس کو روکتا ہے' نماز پڑھنا نہیں روکتا۔ ٹیسٹ یہ ہے کہ نماز ہوئی ہے یا نہیں مگر وہاں تو ٹیسٹ یہ ہے کہ

ہاتھ کہاں باندھے تھے، وہ ٹخنے ننگے ہیں یا نہیں۔ایک دن یہ ''بھائی صاحب'' دلی کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے، جماعت کھڑی تھی تو انہوں نے جلدی جلدی وضو کیا اور جا کر کھڑے ہو گئے۔پتلون پہنے ہوئے تھے جب رکوع میں جھکے تو ساتھ والے نے دیکھا کہ ان کی پتلون ٹخنوں سے ذرا نیچے ہے۔وہ ساتھ والا تو ''بڑا دیندار'' آدمی تھا اور اُس کی غیرتِ دینی کیسے گوارہ کرسکتی تھی کہ ایک شخص نماز میں کھڑا ہو اور اُس کی صورت یوں ہو۔اُس نے اپنی نماز توڑی اور اُس کی پتلون کی نیکر بنائی اور پھر اُس نے اللہ اکبر کیا۔اُس کے بعد کہا کہ تمہاری نماز نہیں ہوتی تھی، میں نے تمہاری نماز کے لیے اپنی نماز توڑی تھی۔عزیزانِ من! جس نماز کا معیار پتلون کا ماپ ہو تو وہاں کیا صورت ہوگی۔

یادرکھیے کہ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں یعنی جزئیات بھی ضروری ہیں۔فوج کے سپاہی کے بوٹ کا تسمہ بھی اُس کے مطابق ہونا چاہیے جو Regulation (قواعد وضوابط) میں لکھا ہوا ہے۔یہ بڑا ضروری ہے لیکن یہ فوج کے سپاہی کا تسمہ ہے، وہ جو سپاہی ریٹائر ہو کر باہر آجائے اور وہ ہر صبح اٹھ کر اُسی طرح سے تسمے باندھے، پیٹی باندھے، ڈنڈا ہاتھ میں لے اور وہ ساری وردی پہنے اور گلی کے اندر لیفٹ رائٹ کرتا ہوا آدھے گھنٹے تک آجائے اور وہ کہے کہ میں عسکرِ پاکستان کے جو فرائض تھے ان کو ادا کر رہا ہوں، تو آپ سوچیے کہ اُس کا اُس کو یا ملک کو کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔تو یہ جزئیات نظام کے اندر ضروری ہوتی ہیں۔کہا ہے کہ **اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ** (29:45) صلوٰۃ فحشا اور منکر کو روکتی ہے۔صلوٰۃ ضائع کی اور اپنے ہی خواہشات اور جذبات کے پیچھے لگ گئے۔ہمارے ہاں فحشا کا ترجمہ تو بے حیائی ہوا اور منکر کا ترجمہ برائی ہوا۔تو ٹھیک ہے کہ بے حیائی اور برائی بُری چیز ہے لیکن یہاں تو قرآن کچھ اور کہتا ہے۔یہاں فحش نہیں بلکہ ''فحشاء'' کہا ہے۔وہ جو نظام خداوندی ہے یا نظامِ صلوٰۃ ہے تو وہاں کہا تھا کہ وہ آتے ہیں اور جمع ہوتے ہیں اور **مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ** (42:38) جو کچھ ان کا اپنا ہوتا ہے، وہ دوسروں کے لیے کھلا رکھتے ہیں، دیدیتے ہیں۔اس کے لیے کشادِقلب کی ضرورت ہے، بڑے وسعتِ قلب کی ضرورت ہے۔پوری محنت سے جان مار کر کمائی کرے اور اُس میں سے صرف اپنی ضرورت کے لیے لے اور باقی سارے کا سارا دوسروں کی ضرورتوں کے لیے دیدے۔اس کے لیے بڑے کشادِقلب کی ضرورت ہے۔اس کے لیے انسان کے اپنے جذبات اور خواہشات اُسے روکیں گے کہ کیوں سارا دوسروں کے لیے دے رہے ہو۔

عقل کی فریب کاریوں کا علاج

''فحشاء'' کے معنی بخل ہوتے ہیں یعنی وہ جذبہ جو یہ کہے کہ اپنی ذات کے لیے رکھ، تیری مت ماری ہے کہ تُو دوسروں کے لیے دے رہا ہے۔کہا کہ صلوٰۃ کا نظام اس چیز کو روک دے گا۔وہ ایسے روک دے گا کہ وہ نظام ہر فرد اور اُس کے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی بہم

پہنچانے کی ساری عمر کے لیے ضمانت دیتا ہے۔ وہ جب ضمانت دیدیگا تو پھر کسی کو کاہے کے لیے بُخل کرنا ہوگا۔ تو وہ ایسے فحشاء سے رک گیا۔ اپنے ہی لیے رکھ لینا' بخیل ہونا فحشاء ہے۔ عربی زبان میں ''النّکرُ'' کے معنی ہوتے ہیں کہ ''عقل فریب کی حیلہ کاریاں''۔ یہ عقلِ فریب کار کی حیلہ کاریاں اس لیے ہوتی ہیں کہ سمیٹ لو جو کچھ سمیٹا جاسکتا ہے' دے لو فریب جتنا دیا جاسکتا ہے۔ اور جب صورت یہ ہوجائے کہ حلال اور طیب کمائی کا سمیٹا ہوا بھی صرف ضرورت کے لیے رکھ سکتا ہے اور باقی سارا دیدینا ہے تو پھر عقلِ فریب کار کی حیلہ جوئیاں کاہے کے لیے ہونگی۔ وہ تو اپنے جذبات کے اتباع کرنے میں یہ چیز آتی ہے۔

عقل کی فریب کاریاں ہی حیلہ جویوں کی محتاج ہوتی ہیں

عزیزانِ من! جذبات تو کوئی شے ہی نہیں ہوتے جب تک عقلِ فریب کار کی حیلہ جوئیاں ساتھ شامل نہ ہو۔ جی چاہتا ہے کہ میز کے اوپر یہ بٹوہ رکھا ہوا ہے اس کو اڑا کر لے جاؤں تو اُس کے لیے تدبیر عقل سکھاتی ہے کہ کیسے کرے۔ اسے کہے گا کہ جی! ذرا پیاس لگی ہے اندر سے پانی لے آیئے۔ یہ عقلِ فریب کار سکھا رہی ہے اور جذبہ یہ تھا کہ بٹوہ چرالوں' عقلِ فریب کار کہہ رہی ہے کہ اس کو اٹھا دے اور اُس کے بعد وہ ایسے انداز سے چرا کہ پتہ ہی نہ چلے۔ نظامِ صلوٰۃ میں ہر فرد کی ضروریات کو پورا کرنا مملکت اپنے اوپر لے لے گی اور جتنا کوئی محنت سے کمائے گا تو اپنی ضرورت کے مطابق مملکت کی اجازت سے رکھ کر باقی سارا دوسروں کی ضروریات کے لیے دیدیگا۔ اس میں نہ تو وہ بُخل اور خودغرضی کی کوئی بات رہے گی اور نہ ہی عقلِ فریب کار کی حیلہ جوئیاں رہیں گی۔ کہا کہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرو تو یہ ساری چیزیں ختم ہوجائیں گی۔

حضرت شعیب ◆ کی صلوٰۃ قرآنی صلوٰۃ تھی

آپ کو معلوم ہے کہ حضرتِ شعیبؑ کے قصے میں یہ بات آئی تھی کہ صلوٰۃ کا تعلق معاشی نظام سے کیا ہے۔ آپ کو یاد ہے جو میں نے کہا تھا کہ حضرتِ شعیبؑ کی قوم وہ تھی جو کاروبار میں ڈنڈی مارا کرتی تھی۔ اُس ڈنڈی مار قوم کو یہ سکھانے کے لیے آئے تھے کہ اس معاملے کے اندر عدل سے کام لو اور ہر ایک کی محنت کا اُس کو پورا پورا معاوضہ دو۔ وہ تو مانتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ بہرحال مجھے صلوٰۃ کی اجازت تو دیجیے۔ وہ تو اہلِ کتاب تھے اور دین تو ان کے ہاں نہیں تھا۔ اُنہوں نے سمجھا کہ کوئی عبادت کی یا Worship (پرستش) کی اجازت مانگتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم نماز کی اجازت دیدیتے ہیں' چاہے سارا دن پڑھتا رہے۔ اُنہوں نے کہا کہ جی ٹھیک ہے' ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے' اپنے طور پہ نماز پڑھ لے۔ ان کی الصلوٰۃ تو قرآن والی تھی۔ یہ جو اُنہوں نے شروع کیا تو اُنہوں نے کہا کہ یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ (11:87) اے شعیب ◆! ہم نے کہا تھا کہ نماز پڑھ لیا کر' یہ ٹھیک ہے کہ تو نے صلوٰۃ

ہی کہا تھا تو ہم سمجھتے تھے کہ جیسے ہم اپنے طور پہ یہ گھنٹیاں بجا کر کچھ پوجا پرستش کر لیتے ہیں' تو تم اپنے طور پہ اس طرح سے رکوع سجود کر لیا کرو گے۔ یہ تمہاری کس قسم کی صلوٰۃ ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ اَنْ نَّفْعَلَ فِیٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (11:87) ہم اپنے مال کو بھی اپنی مرضی سے خرچ کر سکیں۔ ارے یہ تمہاری کیسی صلوٰۃ ہے' اس صلوٰۃ کی تمہیں کون اجازت دے رہا ہے' اسے بند کرو' ورنہ گاؤں سے نکال دیں گے۔ وہ صلوٰۃ پڑھی نہیں جاتی بلکہ وہ کی جاتی ہے۔ نظامِ صلوٰۃ وہ ہے جو اموال میں دخل انداز ہوتا ہے' آپ کا سارا معاشی نظام نظامِ صلوٰۃ کے اوپر اٹھتا ہے۔ قرآن کا اتباع زندگی کے ہر شعبے اور گوشے کے اندر ہو۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پہ کہا ہے۔ سنیے کہ مصلی کے متعلق کیا کہا ہے۔ مصلی آپ نے سمجھ لیا ہے کہ وہ خدا کا اتباع کرنے والا ہوتا ہے۔ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی . وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (70:17-18) وہ جو ساری عمر سمیٹتا رہا' جمع کرتا رہا' اپنی تھیلی میں ڈالتا رہا اور پھر تھیلی کا منہ کس کر باندھ دیا۔ فاوعٰی کے معنی ہوتے ہیں کہ تھیلی کے اندر ڈال کر اوپر سے منہ کس کر بند کر دینا۔

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام انفاق کی بنیاد پہ استوار ہوتا ہے

قرآن نے تو یُنْفِقُوْنَ (42:38) کہا ہے۔ نفق اُس تھیلی کو کہتے ہیں جس کے دونوں منہ کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُس میں اُدھر سے ڈالتے چلے جایئے تو اِدھر سے نکلتا چلا جائے گا۔ قرآن کا معاشی نظام تو یہ ہے۔ اور ایک معاشی نظام سرمایہ داری کا یہ ہے کہ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (70:18) سمیٹتے چلے جایئے اور پھر ایسی گٹھلی یا تھیلی میں ڈالیے کہ وہ ایک ہی طرف سے کھلی ہو اور جدھر سے کھلی ہو وہاں سے کس کر باندھ دیجیے۔ کہا کہ جہنم اُنہیں آوازیں دے دے کر بلا رہا ہے جن کا مسلکِ زندگی یہ تھا کہ سب کچھ اپنے لیے سمیٹ کر جمع کیا اور پھر ایسی تھیلی میں ڈال کر رکھا کہ کس کر باندھ دیا۔ اُس بنک میں جہاں تمہارے دستخط کے سوا کوئی کچھ نہ نکال سکے۔ جمع کیا اور بند کر دیا۔ تو ان کو جہنم آوازیں دے دے کر بلا رہا ہے۔ کہا کہ یہ ایسا کیوں ہوا' یہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ کہا کہ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے ہی جذبات کے پیچھے چلتے تھے اور انسانی جذبات کی کیفیت یہ ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (70:19)۔ هَلُوْعًا کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جھوٹی پیاس کی طرح ایک جھوٹی بھوک ہوتی ہے' بھوک لگی رہتی ہے' کتنا ہی کھائے چلے جاؤ لیکن وہ جو بھوک کا یا اشتہا کا جو تقاضا ہوتا ہے وہ نہیں مٹتا۔ خواہ پیٹ بھر جائے لیکن آدمی خود کو بھوکا ہی محسوس کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک مرض ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو اس کو کتا بھوک کہتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ کتے کے سامنے کچھ ڈالو اور وہ کہے کہ نہیں جی آپ کا شکریہ' میرا تو پیٹ بھرا ہوا ہے میں نہیں کھاتا۔ وہ سارا دن تلاش میں پھرتا ہی رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ انسان کو اگر اُس کے جذبات پہ چھوڑ دیا جائے تو اُس کی کیفیت هلوعًا ہوتی ہے کہ کتے کی طرح تلاش میں پھرتا رہتا ہے' اُس کا جی بھرتا ہی نہیں ہے۔

نظامِ سرمایہ داری میں انسانی جذبات کی کیفیت ھلوعاً کی سی ہو جاتی ہے

کہتا ہے کہ کیفیت یہ ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا (70:20) جب اُس کا کوئی ٹکڑا چھین کر لے جاتا ہے تو کتے کی طرح بھونکنا اور چلانا شروع کر دیتا ہے۔ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (70:21) اور جب یہ کچھ مل جاتا ہے تو پھر اُس کو باندھ کر رکھ لیتا ہے۔ انسان کو اگر اُس کے جذبات پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اُنہی کا اتباع کرتا چلا جائے، جسے صلوٰۃ ضائع کرنا کہا تھا تو اُس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے مگر اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ (70:22) مصلین کی کیفیت یہ نہیں ہوتی۔ قرآن ایک لفظ میں ساری بات کہہ جاتا ہے۔ کہا کہ مصلین کی کیفیت تو یہ نہیں ہوتی۔ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (70:23) یہ وہ لوگ ہیں جو یہ نہیں کہتے کہ صلوٰۃ پانچ وقت نماز پڑھنے والی بات ہے بلکہ ان کی پوری کی پوری زندگی نظامِ صلوٰۃ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام کی کیفیت

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے کہ یہ کچھ ہو رہا ہے۔ کہا کہ وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ . لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70:24-25) یہ وہ لوگ ہیں جن کی نہایت محنت سے حلال وطیّب کمائی کے اندر بھی ہر وہ شخص جس کی ضرورتیں اپنی محنت سے پوری نہ ہوں یا وہ معذور ہو اور محنت نہ کر سکتا ہو، ان کا اس مال کے استعمال میں حقِ معلوم ہوتا ہے۔ ان کو بھی علم ہوتا ہے اور اسے بھی علم ہوتا ہے، سارے معاشرے کو علم ہوتا ہے۔ وہ خیرات نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کو As of right (بطورِ حق) لیتے ہیں۔ تو صاحب! مصلین یہ ہوتے ہیں۔ کہا کہ قیامت پہ ان کا ایمان پوچھیے تو وہ کہتے ہیں کہ ایمان ہے۔ وہ جو انہوں نے پانچ اجزائے ایمان رکھے ہیں، وہ پانچ تو تھے، یہ چھٹا[1] ایرانیوں نے رکھا ہوا ہے یعنی تقدیر پر ایمان کہ جو ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ تو یہ جو الدین ہے، یہ جو مکافاتِ عمل ہے، اس زندگی میں ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی ہے۔ کہتا ہے کہ یہ سب زبان سے تو کہیں گے مگر وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (70:26) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے عمل سے اس کی تصدیق کریں گے کہ واقعی ہمارا یہ ایمان ہے۔ کہا کہ مصلین یہ ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ مال کا الصلوٰۃ کے ساتھ کس طرح سے تعلق ہے اور یہیں سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ قرآن کے اندر جہاں دیکھیے یہی ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ یعنی اقامتِ صلوٰۃ (نظامِ صلوٰۃ) کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی نشوونما کا سامان مہیا کیا جائے۔ تو یہ تو وہی کرے گا جو اپنے ذاتی جذبات یعنی Selfishness (خود غرضی) کا اتباع نہ کرے اور جو صراطِ مستقیم خدا نے مقرر کیا ہے اُس کے ساتھ ساتھ چلتا جائے۔ یہ ہے نظامِ صلوٰۃ۔

---

[1] یعنی والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ (اچھی اور بُری تقدیر اللہ کی طرف سے ہے)۔

تصدیق کرنا اور تکذیب کرنا قرآنی تعلیم کے دو بنیادی الفاظ ہیں

اسی کے متعلق دوسری جگہ قرآن نے کہا ہے اور وہ تو بڑی اہم آیت ہے۔ یہاں کہا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے عمل سے دین کی تصدیق کرتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ تصدیق کے معنی سچ کر دکھانا ہوتا ہے' سچا کہنا یا ماننا نہیں بلکہ سچ کر دکھانا۔ یہ تو یہاں دین کی تصدیق آئی تھی اور اُس کے برعکس لفظ تکذیب ہوتا ہے۔ تکذیب کفر نہیں ہوتا کیونکہ کفر تو انکار کرنا ہی ہوتا ہے کہ میں تمہارے اس نظام کو مانتا ہی نہیں ہوں۔ جیسے تصدیق ہوتی ہے کہ زبان سے مان کر اُس کو سچ کر کے دکھانا تو اُس کے برعکس لفظ تکذیب ہوتا ہے یعنی زبان سے ماننا اور عملاً اُس کو جھوٹا ثابت کرنا۔ کہا ہے کہ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (107:1) تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو زبان سے تو اسلام کے' اجزائے اسلام کے' قیامت کے' الدین کے بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن عملاً تکذیب کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ کیا تم نے اُس کو دیکھا ہے۔ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ (107:2) کوئی شخص جو سامنے آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کی پارٹی اور جتھہ کتنا بڑا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے اور وہ اکیلا ہی ہے' معاشرے کے اندر تنہا رہ گیا ہے تو یہ اُسے دھکے دیتا ہے۔ جو بے یار و مددگار رہ گیا ہے یہ اُسے دھکے دیتا ہے۔ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (107:3) اور پھر جس کی حرکت رک گئی ہے' وہ خود محنت کے قابل نہیں رہا' معذور ہو گیا ہے تو بجائے اس کے کہ یہ اُس کے رزق کا خود بھی کچھ انتظام کرے اور دوسروں سے بھی یہ کہے کہ بھئی! ہمیں اس کی کچھ مدد کرنا چاہیے' وہ کبھی یہ نہیں کرتا' خود بھی یہ نہیں کرتا اور دوسروں کو بھی روکتا ہے یا دوسروں کو اس کی ترغیب نہیں دلاتا۔

نمازیوں کے لیے اس ذلت آمیز تباہی کی بنیادی وجہ

عزیزانِ من! یہاں دو چیزیں آ گئیں کہ ایک جو تنہا اور بے یار و مددگار رہ گیا ہے اُس کو دھکے دیتا ہے' اگر کوئی ضرورت مند رہ گیا ہے تو اُس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے انتظام نہیں کرتا۔ یہ دین کی تکذیب اس طرح سے ہے کہ وہ نمازیں تو بہت پڑھتا ہے مگر فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ (107:4) اس قسم کے نمازیوں کے لیے تباہی ہے حالانکہ مصلّین کے لیے تو یہ ہے کہ

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

تباہی ہے اس قسم کے نمازیوں کے اوپر جو الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:5) نماز کے ارکان یعنی رکعتیں' جھکنا' اٹھنا' کہاں ہاتھ باندھنا ہے' کہاں یہ کچھ کرنا ہے' یہ کچھ تو وہ کرتے ہیں لیکن وہ جو صلوٰۃ کا مقصود تھا' اُس کو بھولے ہوئے ہیں اور پسِ پشت ڈالے ہوئے ہیں۔ ایک اور جگہ اس کی مثال تمثیلاً دی ہے۔ یہ کمان اور تیر ہوتا ہے اور کمان کے نیچے وہ تندی لگی ہوئی ہوتی ہے تو وہ تندی

اصل چیز ہے۔تندی اور کمان کا اجتماع ہونا چاہیے تو پھر تیر چلتا ہے۔اگر وہ کمان کی تندی الگ رکھ دی جائے اور کمان کا وہ جو اوپر کا حصہ ہوتا ہے اُس کو الگ رکھ دیا جائے تو آپ کے پاس کتنے ہی تیر ہوں لیکن کام کوئی بھی نہیں دے سکتا۔اُس کے اندر دونوں چیزیں موجود ہیں لیکن بے کار ہے کیونکہ ان کو اکٹھا نہیں کیا۔ سَاهُوْنَ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو اس طرح کی صلوٰۃ رکھتا ہے کہ کمان کی تندی اُس سے الگ رکھ دی گئی ہو۔کہا کہ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (107:6) یہ نماز میں وہ کچھ کرتے ہیں جو نظر آتا ہے وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) اور عملاً کیفیت یہ ہے کہ رزق کا وہ پانی جسے خدا نے ہر ایک کے دروازے سے سلسبیل کی طرح گزارا تھا' سلسبیل خدا نے بہشتی نہر کو کہا ہے کہ وہ چلتی جاتی ہے' اور آواز دیئے جاتی ہے کہ کون ہے پیاسا' آؤ بھئی! پانی بھرلو میں آ گیا۔مگر وہ ہیں کہ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) وہ رزق کہ جس کو بہتے سرچشمے کی طرح رہنا چاہیے تھا' یہ اُس کو بند لگا کر روک لیتا ہے۔یہ وہ مصلی ہے جس کی تباہی ہے۔یہ ایسی نماز پڑھتا ہے جو دکھائی دیتی ہے لیکن کرتا یہ کچھ ہے۔

عزیزانِ من! یہ جو نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ معاش ہے' اس کا تعلق ہی تندی اور کمان کا ہے۔جو نماز نظر آتی ہے وہ تو یہ کرتا ہے لیکن وہ جو اُس کا مقصود ہے اُس کو الگ رکھ چھوڑا ہے اور بھلا دیتا ہے۔مقصود یہ تھا کہ اُس رزق کو بہتے پانی کی طرح رہنے دے۔اور اگر ہر شخص اپنے اپنے گھر کے اندر بند لگا کر اُس کو' اپنی زمین کے لیے روک لے تو اندازہ لگائیے کہ کیا ہو۔یہ ہیں وہ مصلین جن کے لیے تباہی ہے۔اب آپ نے غور فرما لیا۔اس سے آگے دو لفظ آتے ہیں جو اپنے اندر ایک اہم نکتہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے وقت نہیں ہے۔میں اگلے درس میں اُس کی تشریح پیش کرونگا۔وہ یہ ہیں کہ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (29:45) ۔ میں نے بتانا یہ ہے کہ ذکر کسے کہتے ہیں۔لیکن جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ بھی ایک پورا درس چاہے گا۔تو یہ جو تھوڑا سا وقت ہے تو میں اس میں اس آیت کے آخری الفاظ پیش کرنا چاہتا ہوں۔آپ نے سورۃ الماعون کے یہ الفاظ تو سن لیے تھے کہ هُمْ يُرَآءُوْنَ (107:6) تباہی ہے ان مصلین کے لیے' ان نمازیوں کے لیے جو نماز کی Form یعنی اُس کی جو محسوس حرکات ہیں یعنی جو چیزیں نظر آتی ہیں' جو اُس کا پیکر ہے تو وہ اُسی کو صلوٰۃ سمجھے ہوئے ہیں اور اُس کی روح کو گم کیے ہوئے ہے' اُس کے مقصد کو فراموش کیے ہوئے ہے تو یہ ہیں وہ نمازی جن کے لیے تباہی ہے۔

تصنع کے لفظ کا قرآنی مفہوم

یہ جو کہا ہے کہ وہ صرف فارم کو قائم رکھتا ہے' اُس کی شکل وحرکت کو قائم رکھتا ہے' اُس کے مقصود ومنتہٰی اور روح کو گم کیے ہوئے ہے' تو سورۃ العنکبوت کی اس آیت کے آخر میں ہے کہ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (29:45) خدا خوب جانتا ہے۔کس چیز کو جانتا ہے؟ ''تصنع'' کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا' مصنوعی کا لفظ یہیں سے ہے۔صنعت یا کاریگری سے کوئی چیز بنا دینا اور وہ مصنوعی ہو اور حقیقی نہ ہو۔وہ

کہتا ہے کہ یہ جو تم صرف اس کی فارم کو لیے ہوئے ہو‘ صرف اس کے پیکر کو لیے ہوئے ہو‘ محسوس نقل و حرکت کو لیے ہوئے ہو تو یہ تو اس کی ایک مصنوعی شکل ہے۔ حقیقی شکل تو اس کے مقصود اور منتہٰی کے اندر مضمر ہے جسے تم نے فراموش کر دیا‘ پسِ پشت ڈال دیا اور خالی اس کی فارم کو صلوٰۃ سمجھ لیا۔ یعنی نماز کے اندر صلوٰۃ کی صرف فارم باقی رہتی ہے اُس کی روح باقی نہیں رہتی۔ دو الفاظ میں ایک عظیم حقیقت سمجھ لیجیے۔ اسلام ان غیر متبدل بلند و بالا اصولوں کا نام ہے جو انسانی زندگی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ ان اصولوں کو جب ایک عملی نظام کی شکل دیدی جاتی ہے تو وہ الدین ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عملی شکل کے اندر اُس کے محسوس اور مرئی پروگرام ہونگے‘ جو Acceptable (قابلِ قبول) ہونگے‘ جو دیکھے جائیں گے۔ یہ اُس نظام کا پروگرام ہوگا اور اُس کے مختلف عناصر ہونگے لیکن جب دین مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اُس میں یہ فارم تو باقی رہ جاتی ہے‘ یہ محسوس شکلیں باقی رہ جاتی ہیں لیکن دین کا مقصود اُس کے اندر سے گم ہو جاتا ہے۔

مذہب میں فارم ہی فارم ہوتی ہیں روح کہیں دکھائی نہیں دیتی

اقبالؒ (1938-1977ء) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

رگوں میں وہ لہُو باقی نہیں ہے
وہ دل‘ وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں‘ تُو باقی نہیں ہے

(بالِ جبریل: رُباعیات)

عزیزانِ من! حقیقت میں اصل ”تُو“ ہے۔ یہ جتنی فارمز ہیں‘ اُس تُو کی روح کو لیے ہوئے تھیں‘ جب یہ تُو نہ رہا تو صرف فارم باقی رہ گئی۔ مذہب میں فارم باقی رہ جاتی ہیں‘ اُس کی حقیقت و مقصد و روح گم ہو جاتی ہے۔ یہ ہے جسے ہم آج لیے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ مذہب کے جتنے بھی موجودہ عناصر ہیں‘ وہ دین کی وہ شکلیں ہیں جو حقیقت میں اُس کے مقصد کے پیکر تھے۔ جو مقصد اور روح تھی وہ گم ہو گئی اور اُس کا پیکر اور فارم باقی رہ گئے۔

ان فارم یعنی مذہبی رسومات کے متعلق پرویزؒ کا مسلک

ہر چند اس مقام پہ یہ کہا جائے گا کہ وہ پھر بغیر مقصد کے جو فارم ہے‘ بغیر روح کے جو پیکر ہے تو اُس کا فائدہ کیا ہے۔ میں اُس کے فائدے کے متعلق تو سرِ دست کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میرا مسلک یہ ہے کہ یہ فارم اور یہ جو پیکر ہیں‘ یہ جس شکل میں بھی امت میں چلے آ رہے

ہیں ان کا باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ جس جس شکل میں امت میں نماز ہو رہی ہے' ان میں آپس میں فرقوں کا اختلاف ہے تو میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ میں کہتا یہ ہوں کہ وہ جس جس شکل میں بھی اسے قائم رکھے ہوئے ہیں تو اُسے قائم رکھنا چاہیے' ان میں تبدیلی نہیں کرنا چاہیے' کوئی نئی شکل پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ اُس کرنے سے تو تفرقہ اور بڑھ جائے گا۔ جس شکل میں کوئی چاہتا ہے' اُس کے مطابق وہ کرتا چلا جائے۔ آپ پوچھیں گے کہ پھر یہ کیوں کرتا چلا جائے' کیوں باقی رکھا جائے؟ عزیزانِ من! اس لیے کہ ہم امتِ مسلمہ تو نہیں رہے' مسلمان ایک قوم کی حیثیت تو ہماری ہے۔ یہ چیزیں ہمارے قومی شعار ہو چکے ہیں' یہ ہماری قوم کی علامت ہو چکی ہے۔ اگر ہم نے مسلمان قوم کی حیثیت سے بھی زندہ رہنا ہے تو یہ جو ہمارے پہچانے جانے کی علامتیں ہیں' ان کو ضرور قائم رکھنا چاہیے۔ دور سے کسی گاؤں سے اذان کی آواز آئے تو آپ کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہاں مسلمان بستے ہیں۔ اِن علامتوں کو قوم کے شعائر کہتے ہیں۔ دین میں اذان کی ندا ایک بلند چیز تھی' اُس کی روح تھی' اُس کا مقصد تھا۔ مذہب کے اندر آ کر وہ الفاظ تو باقی رہ گئے ہیں لیکن جب یہ اس مسلمان قوم کے شعائر میں سے یہ چیز ہو گئی ہے تو اس سے پہچانا جاتا ہے کہ یہ قوم ہے۔ جیسے ہمارے ہاں عبداللہ ہمارا نام ہوتا ہے جبکہ ہم خدا کے عبد نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود اس نام سے ہم پہچانے جاتے ہیں کہ ہم مسلمان قوم کے فرد ہیں۔

عزیزانِ من! میرا مسلک یہ ہے کہ قوم کے ساتھ وابستگی نہایت ضروری ہے بشرطیکہ کوئی ایسا کام یا عقیدہ اُس میں نہ ہو جو قرآنِ کریم کے نقطۂ نگاہ سے ناجائز ہو' حرام ہو' شرک ہو لیکن یہ چیزیں جو پیکر اور فارم کی شکل کے اندر ہیں' انہیں قائم رکھنا چاہیے کہ اِن سے قوم کے ساتھ ہماری وابستگی باقی رہتی ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) نے کیسے حسین انداز میں ایک مثال میں یہ بات سمجھائی:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اُسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور
خالی ہے جیبِ گُل زرِ کامل عیار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تُو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!

(بانگ درا)

آج ملتِ اسلامیہ کے اس مُردہ جسم میں صورِ اسرافیل پھونکنے کی ضرورت ہے

عزیزانِ من! یہ امیدِ بہار اس لیے ہے کہ قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ **لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ** (9:33) آخرالامر قرآن کے نظام نے دنیا کے ہر نظام کے اوپر غالب آنا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب بھی یہ شکل پیدا ہو تو یہ جو اس وقت ہم بے روح پیکر لیے ہوئے جائیں گے تو اُس میں کرنے کا کام صرف اتنا رہ جائے گا کہ ان پیکروں میں پھر سے روح پھونک دی جائے گی۔ وہ جسے صورِ اسرافیل کہتے ہیں وہ روح پھونک دی جائے گی تو ان پیکروں میں پھر جان پڑ جائے گی' یہ پھر دین کے عناصر بن جائیں گے۔ ہمیں انہیں بالکل نسیاً منسیاً نہیں کرنا چاہیے' انہیں باقی رکھنا چاہیے۔ اس میں کسی قسم کا افتراق اور انتشار پیدا نہیں ہونے دینا چاہیے' کوئی نیا فرقہ نہیں بننا چاہیے۔ جو بن چکے ہیں ان کے مٹنے کا تو میں سمجھتا ہوں وقت وہی ہوگا جب یہ نظامِ خداوندی (قرآن کی حکومت) دنیا میں قائم ہوگی لیکن اُس وقت تک اسلام ایک مذہب ہے اور مذہب کی حیثیت' قوم کے ساتھ پیوستگی کی حیثیت' سے ان شعائر کو ہمیں قائم رکھنا چاہیے۔ میرا مسلک یہی ہے' میں خود اس پہ کاربند ہوں اور جو میری بات سنتے ہیں ان سے بھی میں تاکیداً کہتا ہوں کہ وہ انہیں ضرور قائم رکھیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ محض ان پیکروں سے وہ جو فحشا اور منکر سے باز رہنے کی بات تھی' تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ تو نہیں ہوتی۔ وہ اُس وقت ہی ہوگی جب یہ دین کے عناصر بن جائیں گے۔

عزیزانِ من! یہ ہے میرے اس درس کا مقصد کہ یہ جو صلوٰۃ ہے' وہ فحشآ اور منکر سے روک دے گی۔ جب وہ روکے گی تو ہم کہیں گے کہ وہ قرآن کی صلوٰۃ ہے' اگر وہ نہیں ہے تو وہ مذہب کی نماز ہے کہ جس میں پیکر تو موجود ہیں لیکن روح موجود نہیں ہے۔ روح کے لیے ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط



تیرھواں باب: **العنکبوت** (آیت 45: صلوٰۃ اور ذکر)



عزیزانِ من! آج جون 1979ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 45 سے ہی ہو رہا ہے۔ پچھلے درس میں بھی یہی آیت زیرِ تدریس تھی۔ اِس میں، میں نے اقیـموا الصلوٰۃ کے متعلق عرض کیا تھا جسے اب ہم نماز کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے الصلوٰۃ کیا چیز ہے یا قیامِ صلوٰۃ سے کیا مقصد ہے: دو باتیں تو قرآنِ کریم نے اسی مقام پہ کہدی تھیں کہ اِنَّ الـصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (29:45) اقامتِ صلوٰۃ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ انسان کو خود غرضی کے جذبات اور عقلِ فریب کار کی حیلہ جوئیوں سے روک دے گی۔ یہ بات تو پچھلے درس میں ہو چکی تھی کہ قرآن نے یہ ٹیسٹ بتایا ہے کہ الصلوٰۃ یہ کرے گی۔ اس کے لیے نہ تو الجھن ہے، نہ ابہام ہے اور نہ مشکل ہے۔ جب اُس نے خود یہ کہا ہے کہ صلوٰۃ یہ کرے گی تو جس چیز کو ہم صلوٰۃ کہتے ہیں، اگر اُس سے یہ ہو جاتا ہے تو یہ وہ الصلوٰۃ ہے جو قرآن نے بتائی ہے۔ اگر اس سے وہ نہیں ہوتا تو پھر یہ الصلوٰۃ وہ الصلوٰۃ نہیں ہے۔ اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کیونکہ بات بالکل صاف ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہیں: بخل و خود غرضی کے جذبات اور عقلِ فریب کار کی حیلہ جوئیاں۔ ان دونوں سے صلوٰۃ روک دے گی۔

لفظ صلوٰۃ کے ذکر کا قرآنی مفہوم اور اس کی کیفیت

میں نے کہا تھا کہ اس کو Negative Aspect (منفیانہ پہلو) کہتے ہیں کہ یہ اس چیز سے روک دے گی۔ مثبت بات یا Positive سی چیز ابھی سامنے نہیں آئی۔ یہ ان چیزوں سے روک تو دے گی اور پھر مثبت طور پر کیا کرے گی؟ یہ بڑی اہم چیز آ گئی۔ اس

کا اگلا فقرہ جس میں یہ بات کہی ہے' یہ ہے کہ **و لذکر الله اکبر** (29:45)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں صلوٰۃ تو نماز ہوگئی اور پھر نماز کے بعد اُس سے بھی بڑی چیز اللہ کے ذکر کو کہتے ہیں۔ اللہ کا ذکر تو آپ کو معلوم ہے کہ عام طور پہ اور نمازیں تو نہیں لیکن فجر کی نماز کے بعد تو عموماً اور عشاء کی نماز کے بعد خصوصاً ہوتا ہے' دل پہ ضربیں لگتی ہیں اور ''اللہ ھو'' ہو رہا ہوتا ہے۔ گویا صلوٰۃ تو نماز ہوگئی اور ذکر اللہ یہ اللہ ھو ہو گیا۔ اب وہ جو کچھ ہے' اُس صلوٰۃ سے ذکر اللہ تو بڑی چیز ہے۔ اب وہ **اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ** (29:45) کیسے ہوا؟ کہتے ہیں کہ صاحب! وہ ہوتا تو ہے لیکن آپ لوگوں کو اُس کا علم نہیں ہوتا یا اگر کچھ یہ ہوتا ہے تو اُس کا نتیجہ قیامت میں نکلے گا جبکہ قرآن یہاں کی بات کرتا ہے۔ تو جو پہلی ہی چیز تھی کہ صلوٰۃ یہ کرتی ہے' وہی کچھ کم مشکل بات نہیں تھی کہ صلوٰۃ کا تو ٹیسٹ ہی یہ ہے۔ علامہؒ [1] نے کہا تھا کہ

مجھے آہ وفغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

(بالِ جبریل)

میں کیا کہوں کہ میرا تو سفر ایسا ہے کہ اس میں تو ہر قدم مشکل مقام ہوتا ہے۔ وہ یہ چیز ہوتی ہے کہ صاحب! یہ تو ہر چیز ادھیڑ کر رکھ دے گا کہ صلوٰۃ یہ صلوٰۃ نہیں' ذکر یہ ذکر نہیں' قوم یہ قوم نہیں۔ اب میں کیا کروں کہ اُس قوم کے متعلق بھی تو خدا نے کہا تھا کہ **لِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىکُمۡ** (2:185) اور یہاں ہے کہ **وَ لَذِکۡرُ اللّٰهِ اَکۡبَرُ** (29:45)۔ یہ نہیں کہا کہ وہ اُس سے بہتر ہے یا اُس سے کوئی اور چیز ہے بلکہ اس میں لفظ اکبر ہے۔ اکبر کے معنی Sovereignty کے ہوتے ہیں' کبریائی کے معنی ہوتے ہیں' اقتدارِ مطلق کے معنی ہوتے ہیں کہ اُس سے اوپر کوئی حاکم نہیں' کوئی حکمران نہیں' کسی کا اقتدار نہیں' اختیار نہیں' قانون نہیں' کسی کی حکومت نہیں۔ ذکر کوئی ایسی چیز ہے کہ وہ خدا کا ہو تو پھر کبریائی صرف اُس خدا کو حاصل ہوگی' اقتدار اُسی کا ہوگا' حکمرانی اُسی کی ہوگی' Sovereignty اُسی کی ہوگی۔ یہ اتنی بڑی چیز نکل آئی۔ الصلوٰۃ کے متعلق تو میں نے عرض کیا تھا کہ بہرحال منفیانہ پہلو ہے کہ وہ ان چیزوں سے روکتی ہے' وہ چیز مقصود بالذات نہیں ہے' مقصود بالذات تو آگے ہے اور وہ ''ذکر'' ہے۔ اور ''ذکر'' کی کیفیت یہ ہے کہ اکبر ہے تو یہ تو Superlative Degree (اعلیٰ درجہ) ہے جس کے اوپر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ کہا کہ **وَلَهُ الۡکِبۡرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ** (45:37)۔ کبریائی کے تو معنی ہی Sovereignty ہیں یعنی جس کے اوپر کوئی اور حاکم نہ ہو۔

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

پوری دنیا میں لاکھوں مرتبہ با آواز بلند پکارے جانے والے لفظ ''اللہ اکبر'' کی عظمت اور ہماری بدعملی

اللہ کے ذکر کے متعلق تو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ''اکبر'' ہے۔ اور یہ تو الگ بات ہے کہ ہمارے ہاں صلوٰۃ بھی یہ ہے جو ہم پڑھتے ہیں اور یہ جو ''اکبر'' والی بات ہے تو اُس صلوٰۃ سے پہلے مؤذن مینارے پہ کھڑا ہو کر چار مرتبہ پہلے کہتا ہے ''اللہ اکبر''۔ یہ دنیا کے اندر کتنا بڑا اعلان ہے کہ اقتدارِ مطلق صرف خدا کو حاصل ہے' کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ وہ مینار پہ کھڑا ہو کر اعلان کرتا ہے' چھ دفعہ تو ایک ہی اذان کے اندر وہ کہتا ہے۔ اگر وہ پانچ ہی اذانیں دے تو دن میں تیس مرتبہ وہ اعلان کرتا ہے۔ واقعتاً اگر کہیں ایک مرتبہ' کسی ایک خطہء زمین میں' کسی ایک ٹکڑے میں بھی' کیا یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ''اللہ اکبر'' ہوتا ہے؟ کیا اس وقت کرۂ ارض کے اوپر ایک انچ زمین بھی ایسی ہے جہاں اللہ اکبر ہے' جہاں اُس کا قانون اقتدارِ مطلق رکھتا ہے' اُس سے بالا کوئی قانون نہیں' اُس سے بالا کسی کی حکمرانی نہیں اور اس کرۂ ارض کے اوپر یہ جو ''اللہ اکبر'' دہرایا جاتا ہے' میں نے تو ایک مسجد کی بات کہی ہے' آپ دیکھیں کہ اس محلے کی مسجد' شہر کی مسجدوں' ملک کی مسجدیں اور کرۂ ارض کی مسجدوں میں جب یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ''اللہ اکبر'' تو

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

لفظ ذکر کا لغوی اور ثانوی مفہوم اور ہمارا فریضۂ حیات

عزیزانِ من! کہنے والے کا تو پوچھو نہیں کہ کتنا بڑا انقلابی انسان ہے۔ باقی تو چھوڑ دیجیے وہ ملّا اذان میں کہتا ہے کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ شہادت کے معنی ہوتے ہیں کہ آنکھوں دیکھی بات کہنا۔ اگر آپ عدالت میں شہادت کے لیے یا گواہی کے لیے جائیں اور وہاں جا کر کہیں کہ صاحب! میں نے یہ دیکھا تو نہیں ہے لیکن میں نے کسی سے سنا ہے تو آپ کو اُسی وقت عدالت سے باہر نکال دیتے ہیں۔ لفظی اعتبار سے بھی شہادۃ کے معنی ہوتا ہے کہ آنکھوں دیکھی کوئی بات کہنا۔ شہادت کہتے ہی اس چیز کو ہیں۔ وہ شخص اعلان کرتا ہے تو پہلے تو کہتا ہے کہ اللہ اکبر' پھر وہ کہتا ہے کہ میں یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہا ہوں کہ خدا کے سوا کسی اور کا قانون یہاں نہیں چلتا۔ میں اس کی شہادت دے رہا ہوں' میں شاہد ہوں' میں نے دیکھا ہے' میں دیکھ رہا ہوں۔ اور اب یہ جو مسجدوں میں بولا جا رہا ہے تو یہ کتنا بڑا

جھوٹ ہے! اہتمام یہ کیا جار ہا ہے کہ صاحب! مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر لگنے چاہئیں' دور تک آواز پہنچنی چاہیے۔ اور یہ جو چیز ہے کہ وہ کہہ رہا ہے کہ اللہ اکبر ہے تو یہ کوئی نہیں سوچتا کہ یہ ہوتا کیا ہے اور یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا یہ شہادت ہے؟ میں نے کہا تھا کہ میرے تو مقدر میں یہ چیز ہے کہ ہر قدم پہ مشکل مقام ہے۔ مذہب کے راستے میں چلتے ہوئے دین کا ہر سنگِ میل مشکل پیدا کرتا ہے۔ اعتراض ہی یہ ہوتا ہے اور روز میرے سامنے ان لوگوں کے اعتراضات' بیانات اور کفر کے فتوے آتے ہیں کہ جی! ایک چیز صدیوں سے مسلسل چلی آ رہی ہے اور یہ اُس کے خلاف ایک نئی بات پیدا کر رہا ہے۔ بہرحال عمر کا آخری حصہ ہے' بات نئی ہو یا پرانی ہو لیکن قرآن کی سند میرے سامنے ہے اور مجھے ان کے سامنے تو نہ کوئی سند پیش کرنا ہے اور نہ کوئی شہادت دینی ہے۔ میں اس کو ایک فریضۂ زندگی سمجھ کر لیے ہوئے ہوں اور دعا یہ کرتا ہوں کہ اُس کے سامنے جاؤں تو وہاں یہ بات نہ ہو کہ تم نے فلاں بات ہمارے قرآن کے خلاف کہی تھی۔ کہا کہ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (29:45)۔ یہ ہے مقصود۔ لغوی اعتبار سے' مادہ کے اعتبار سے یا عربی زبان کے اعتبار سے ''ذکر'' کے معنی ہوتے ہیں کہ ''کسی شے کو محفوظ کر لینا''۔ اور جیسے سب سے بڑی حفاظت یہ ہوتی ہے کہ وہ چیز ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے تو پتہ رہتا ہے کہ ہاں محفوظ ہے' اپنی جگہ پہ موجود ہے۔ اس لیے کسی چیز کا ہر وقت نگاہ کے سامنے رکھنا ''ذکر'' کے ثانوی معنی ہوتے ہیں۔ جس شے کے اندر وہ چیز موجود ہو تو اُس کو بھی ''ذکر'' کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم کو ذکر اللہ کہا گیا ہے۔ تو کیا ہی چیز ہے جس کی حفاظت ہو رہی ہے! اصول اور قانون کو بھی ''ذکر'' کہا جاتا ہے۔ قوانینِ خداوندی جس کی حفاظت کرنا ہر مومن کا فریضہ ہے' یہ ہے ''ذکر''۔

حضرت موسیٰ ◆ کا مشن صلوٰۃ اور ذکر کا فریضہ

یہ ''ذکر'' کرتا کیا ہے؟ ہم نے پوچھنا تو قرآن سے ہی ہے۔ یہی تو اُس کا اعجاز ہے کہ وہ جو دعویٰ کرتا ہے' اُس کی تشریح کرتا ہے' اُس کی وضاحت کرتا ہے اور ایسے کرتا ہے کہ بات محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔ یہاں صلوٰۃ اور ''ذکر'' اکٹھا آیا ہے۔ سورۃ طٰہ ہے اور واقعہ حضرتِ موسیٰ ◆ کا ہے۔ کہا کہ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (20:13) ہم نے تمہیں اپنے ایک مشن کے لیے چن لیا ہے' دل کے کانوں سے سنو کہ ہم کیا کہتے ہیں اور تم سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ کہا پہلی چیز یہ ہے کہ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ (20:13) سمجھ رکھو۔ عربی جاننے والے جانیں گے کہ پہلے اِنَّنِیْ اور پھر اَنَا اللّٰهُ کیوں کہا۔ جیسے وہ ہمارے ہاں عدالت میں ہوتا ہے کہ ہماری عدالت میں' ہمارے حکم سے۔ اقتدار جہاں ہوتا ہے' وہاں یہ چیز ہوتی ہے۔ ''انی'' یہی بات ہے۔ کچھ وقت لگ جاتا ہے ورنہ یہاں تو قرآن کا ایک ایک حرف معنی طلب ہے۔ کہا کہ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ (20:13) سنتے ہو کہ تمہیں اپنے ایک مشن کے لیے ہم نے چنا ہے' تمہارے ذمے ایک فریضہ عائد کیا جاتا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا (20:14 ہمارے سوا کسی کا اقتدار اور

اختیار نہیں ہے۔ فَاعْبُدْنِیْ (20:14) اطاعت صرف ہمارے قوانین کی اختیار کرو۔ یہ اطاعت کیسے کی جائے؟ کہا کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (20:14) صلوٰۃ قائم کرو۔ تو کیا یہ چیز مقصود بالذات ہوگی؟ کہا کہ نہیں' یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ صلوٰۃ ذریعہ ہے ایک مقصد کے حاصل کرنے کا۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (20:14) ہمارے ''ذکر'' کے لیے صلوٰۃ کا نظام قائم کرو۔ تو صلوٰۃ ہی کچھ کم چھوٹی بات نہیں تھی:

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

حضرت موسیٰ ◆ کے مشن کی وضاحت

یہی اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (20:14) کوئی چھوٹی چیز نہیں تھی۔ ہمارے ہاں اسے بہت آسان بنا دیا گیا کہ نماز ختم ہوگئی۔ کہا کہ جی ہاں ختم ہوگئی' پوچھا کہ نفل بھی پڑھ لیے' کہا کہ جی ہاں پڑھ لیے۔ تو پھر کہا کہ نماز تو ''ذکر'' کے لیے ہوتی ہے اس لیے آ'اب ''ذکر'' کریں۔ عزیزانِ من! سنیے! قرآن نے کہا ہے کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (20:14) آپ نے سمجھ لیا کہ اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ اور یہ کاہے کے لیے ہے؟ لِذِکْرِیْ (20:14) تو کرنا کیا ہوگا؟ کہا کہ اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا (20:15) مصر کی سرزمین میں جہاں فرعون نے اودھم مچا رکھا ہے' سرکشی اختیار کر رکھی ہے' وہاں ایک انقلاب برپا کرنا ہے' وہ قریب آ رہا ہے۔ اس وقت تو وہ جو انقلاب تھا' وہ زیرِ زمین چلا جا رہا تھا' Under ground چلا جا رہا تھا' محکوم قوم کے دل کے اندر فرعونیت کے استبداد کے خلاف جو جذبات تھے' وہ اندر ہی اندر ابھی تک چھپے ہوئے تھے وہ باہر نہیں آ رہے تھے۔ اب ہماری مشیّت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ ابھر کر باہر آ جائیں۔

خدا کے ذکر اور خدا کی حکمرانی کا مفہوم' قرآنی قوانین کی حکمرانی ہے

یہ ہے ہمارا وہ ذکر کہ وہاں خدا کے احکام اور خدا کے قانون کی حکمرانی بالاتر ثابت ہو جائے۔ یہ وہ انقلاب ہے جو اے موسیٰ ◆! اب تک زیرِ زمین پرورش پا رہا تھا۔ اب اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ (20:15) وہ انقلاب آ گیا ہے' وہ دیکھو! چلا آ رہا ہے انقلاب۔ وہ کہیں یونہی باہر سے نہیں آ گیا' وہ اب تک زیرِ زمین تھا' مضمر تھا' Potential Form کے اندر تھا' اب وہ اُبھر کر سامنے آ گیا ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (20:14) ہمارے ''ذکر'' کے لیے صلوٰۃ قائم کرو۔ یعنی وہ انقلاب جو اس وقت زیرِ زمین تھا' وہ اُبھر کر سامنے

آ جائے۔ کیا وہ انقلاب ایسا ہی ہوگا کہ اُس کی حکومت الٹ دی جائے اور اُس کی جگہ کوئی دوسرا آ کر بیٹھ جائے؟ تو کیا یہ تختہ الٹنے کی بات ہے؟ یہ انقلاب کیا ہے؟ اس انقلاب سے کیا ہوگا؟ یہ بڑے ہی اہم سوالات ہیں۔

آسمانی انقلاب کا ماحصل ہر نوعِ غلامی کے لیے پیغامِ موت ہے

عزیزانِ من! بڑی توجہ سے سنیئے کہ انقلاب کیا ہے۔ کہا کہ لِتُجۡزٰی كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰى (20:15) انقلاب یہ ہے کہ کسی کی محنت کا ماحصل کوئی دوسرا نہیں لے جاسکتا۔ میں اس اولوالعزم پیغمبر کی داستان شروع سے بیان کروں تو قرآن کہتا ہے کہ جس دن تُو پیدا ہوا تھا تو اُس دن سے تجھے اس مقصد کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ اب دل کے کان سے سن جو میں کہہ رہا ہوں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے۔ میرے ''ذکر'' کے لیے اقامتِ صلوٰۃ کر' تا کہ وہ انقلاب جو اس وقت زیرِ زمین تھا وہ ابھر کر سامنے آ جائے۔ وہ اس لیے سامنے آئے کہ کوئی کسی کی محنت کو لوٹ کر نہ لے جائے۔ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنۡهَا مَنۡ لَّا يُؤۡمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰٮهُ فَتَرۡدٰى (20:16) وہ لوگ جو اپنے ہی مفاد کے پیچھے لگے ہوئے ہیں' وہ تیرے راستے میں روڑے بن کر کھڑے ہو جائیں گے' موانعات کھڑی کر دیں گے' رکاوٹیں کھڑی کر دیں گے' بڑی بڑی رکاوٹیں آئیں گی۔ یہ لوگ کون ہونگے؟ کہا کہ اتَّبَعَ هَوٰٮهُ (20:16) جو اپنے ہی مفادات کے پیچھے لگے ہوئے ہونگے وہ اس انقلاب کو نہیں آنے دیں گے' اس کا دھیان رکھنا۔ فَتَرۡدٰى (20:16) اگر تم نے ان سے مصالحت کر لی' مفاہمت کر لی یا وہ ساتھ مل گئے تو یاد رکھو! جیسے وہ تباہ ہونگے' تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ اس لیے کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے:

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے

یہ چیز ہے۔ کہا ہے کہ فتـردٰی یاد رکھ! اگر ان کے ساتھ تم نے ذرا بھی مفاہمت کر لی تو یہاں 51% کا سوال نہیں ہے کہ جمہوریت قائم ہو جائے۔ یہاں تو 1% بھی نیچے چلا جائے تو وہ بھی شرک ہوتا ہے۔ فَتَـــرۡدٰى جس اولوالعزم پیغمبر کو منتخب کیا جا رہا ہے' اُس سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے ذرا بھی مفاہمت کی تو تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔

اقامت صلوٰۃ سے مقصود خدا تعالیٰ کے ذکر کو بلند کرنا ہے

کہا کہ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكۡرِىۡ (20:14)۔ عزیزانِ من! اب آپ نے سمجھ لیا کہ ''ذکر'' کیا ہوا۔ اقامتِ صلوٰۃ مقصود بالذات نہیں ہے' وہ یہ کرتی ہے کہ انسان کو مفاد پرستیوں اور حیلہ جوئیوں سے روک دیتی ہے کیونکہ یہ قلب ودماغ اور ذہنیت کی تبدیلی بھی بڑی چیز ہے لیکن بجائے خویش یہ مقصد نہیں ہے۔ مقصد تو ''ذکر اللہ'' کو اکبر کرنا ہے۔ یہ ان کے ہاتھوں سے ہوسکتا ہے جن میں یہ پہلی خصوصیات پیدا ہو جائیں کہ ذاتی مفادات نہ ہوں' اپنی ہی خواہشات کے تابع نہ چلیں۔ یہ اُس کے لیے پہلی شرط ہے۔ جن افراد میں یہ کیفیت پیدا

ہو جائے تو وہ صلوٰۃ کو قائم کر سکتے ہیں۔ اور صلوٰۃ بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہے' مقصد تو ''ذکر اللہ'' کو اکبر کرنا ہے۔ یہ نہیں کہ یہ اُس سے بہتر ہے۔ اس سے مقصد ہے کہ ''ذکر اللہ'' کی کبریائی قائم ہو جائے۔ کبریائی کی بات آ گئی تو مجھے یاد آ گیا کہ اس کے اوپر ایک خصوصی درس ہوا تھا۔ کہا کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185) یہ بات روزوں کے متعلق تھی۔ مومن کا مقصود ہی خدا کی کبریائی قائم کرنا ہے۔ کہا کہ یہ لوگ لعنت کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ (40:12) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ حکمرانی صرف خدا کے قوانین کی ہو گی تو یہ اس سے انکار کرتے ہیں۔ یہ خدا کے منکر نہیں ہیں۔ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا (40:12) لیکن اگر اُس کے ساتھ آپ انسانوں کے قوانین بھی لگا دیں تو پھر یہ ایمان لے آتے ہیں۔ خالص خداوندی قوانین کے لیے اگر کوئی دعوت دیتا ہے تو وہ اس سے کفر برتتے ہیں۔ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا (40:12) اگر ساتھ انسانوں کے قوانین شامل ہوں تو کہتے ہیں کہ اب ٹھیک ہے۔ اور وہ ملاوٹ اس قسم کی ہوتی ہے جیسی آج کل کی ملاوٹ ہوتی ہے کہ اصل شے جو ہوتی ہے اس کا تو پتہ ہی نہیں ہوتا اور وہ ساری شے ملاوٹ ہی ہو جاتی ہے۔ شرک تو آہستہ آہستہ اتنا غالب آتا ہے کہ وہ نیچے خدا کا صرف نام رہ جاتا ہے اور غلبہ سارا شرک کا ہو جاتا ہے۔ کہا کہ یہ چیز غلط ہے' ان سے کہو کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ (40:12) حکمرانی صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔ تو الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12) کبریائی بھی اُسی کی ہو سکتی ہے: وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (29:45)۔ آپ نے دیکھا کہ اکبر کے کیا معنی ہوئے۔ کبریائی صرف اُس کے قوانین کی ہے' حکمرانی صرف اُس کی ہے۔

آ جایئے پھر حضرتِ موسٰی ◆ کی داستان کی طرف۔ کہا گیا ہے کہ ہمارے ''ذکر'' کے لیے اقامتِ صلوٰۃ کرو۔ تو ''ذکر'' یہ ہے کہ وہ انقلاب جو ابھی تک زیرِ زمین غیر محسوس طور پر چلا آ رہا تھا' وہ اُبھر کر سامنے آ جائے اور اُس کا نتیجہ یہ ہو کہ کوئی کسی کی محنت کو لوٹ کھسوٹ کر نہ لے جا سکے۔ حضرتِ موسٰی ◆ نے کہا کہ جو فریضہ میرے سپرد کیا جا رہا ہے' یہ تو بڑا اہم ہے' بڑی مشکلات راستے میں ہوں گی۔ کہا کہ ایک تو یہ ہے کہ میرے بھائی ہارون ◆ کو بھی میرے ساتھ کر دیجیے' اس سے مجھے تقویت حاصل ہو گی' وہ میرا ہاتھ بٹائے گا۔ اس لیے میں بھائی کو مانگ رہا ہوں۔ اب یہاں تسبیح کا لفظ آیا ہے اور میں نے آپ کو پچھلی دفعہ ''تسبیح'' کے معنی بتائے تھے کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے اپنی پوری توانائیاں صرف کر دینا۔ حضرتِ موسٰی ◆ نے یہ چیزیں مانگیں اور بھائی کی مدد بھی ساتھ مانگی کہ مجھے تقویت حاصل ہو گی۔ کہا کہ یہ میں اس لیے مانگ رہا ہوں کہ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا (20:33)۔ اب ہمارے ہاں تسبیح کا ترجمہ تسبیح پھیرنا کر لیا کہ جی تسبیح ایہڈی وڈی اے' تے میں کلّا کتنے اک دانے گناں گا۔ دو بھراں ہون گے تے کچھ تے ونڈ لاں گے [1]۔ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا (20:33) ہم بہت زیادہ تسبیح کریں' تا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم زیادہ سے زیادہ توانائیاں صرف کر سکیں' زیادہ سے زیادہ

---

[1] جی! یہ تسبیح بہت بڑی ہے' میں اکیلا' تنِ تنہا' اس کے کتنے دانے گن سکوں گا۔ دو بھائی ہوں گے تو انہیں تقسیم کر لیں گے۔

قوت کے ساتھ کریں۔ **وَّ نَذْکُرَکَ کَثِیْرًا** (20:34) اور تیرا ''ذکر'' ہم بہت زیادہ کریں۔

اب یہ ''ذکر'' کا لفظ آ گیا۔ وہ مقصد جو تم نے ہمارے لیے مقرر کیا ہے' اُس کے لیے بھرپور توانائیاں صرف کریں اور تیرے اقتدار کو کبریائی دینے کے لیے ہم پورا زور صرف کریں۔ کہا کہ ہاں موسیٰؑ! ہم جانتے ہیں کہ مرحلہ بڑا دشوار ہے۔ **قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی** (20:36) ہاں موسیٰ! ٹھیک ہے جو تُو نے مانگا ہے وہ ہم تم کو دیتے ہیں۔ یعنی اتنا اہم کام تھا کہ یہ نہیں کہا گیا کہ بات کچھ بھی نہیں ہے' تھوڑی جئی تسبیح پھیرنی ہیگی اے' تے تھوڑا جیا ذکر کرنا ہیگا اے' تے ایہدے واسطے توں اپنیاں چیزاں منگن ڈیا ہیگا ایں[1]۔ عزیزانِ من! یہ جو چیز تھی' یہ تو وہاں آدم کی تخلیق کے وقت ملائکہ نے کہی تھی کہ **نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ**[2] (2:30)۔ کہا گیا تھا کہ **اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ** (2:30) ہم وہ کچھ جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے کہ تسبیح کیا ہوتی ہے۔ اس لیے کہا کہ **قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی**[3] (20:36) یہ کچھ بھی مل گیا۔ تو پھر کہا ہے کہ **وَ اصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ** (20:41) پھر سن لے کہ ہم نے تمہیں اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ یعنی یہ جو انقلاب برپا کرنا ہے' اس میں ایک مستبدّ جابر اور استحصال کرنے والے کے ہاتھوں سے غریبوں کی محنت کو چھڑا کر ان کا ماحصل ان کو دینا ہے۔ یہاں **لِنَفْسِیْ** کہا ہے کہ یہ میرا ایک کام ہے جس کے لیے میں نے تمہیں چنا ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ صاحب! خدا قادرِ مطلق ہے' وہ اگر چاہے کہ ہر ایک کو اُس کی محنت کا ماحصل ملے تو کیا وہ براہِ راست نہیں دے سکتا؟ لیکن یہاں وہ یہ کہتا ہے کہ انسانوں کے معاملے میں' انسانوں کی دنیا میں' ہم براہِ راست یہ کچھ نہیں کیا کرتے۔ وہ ایک انسان کو کہہ رہا ہے کہ ہم نے تمہیں اس لیے چن لیا ہے کہ میرا ایک کام رکا ہوا ہے' تُو اُس کو پورا کر دے۔

ذاتِ خداوندی انسان کے اختیار و ارادہ میں مخل نہیں ہوتی

عزیزانِ من! قرآن کا تو ایک ایک لفظ پورا نظام دے جاتا ہے۔ انسانوں کی دنیا کے اندر جو کچھ وہ اپنی مشیّت کی تکمیل کرانا چاہتا ہے تو وہ خود براہِ راست نہیں کرتا بلکہ وہ انسانوں کے ہاتھوں سے کراتا ہے۔ اُس کے لیے یہ انتظام ہوتا ہے۔ کہا کہ یہ سب کچھ ہو گیا' تم نے سمجھ لیا کہ میرا ایک کام ہے۔ کہا: ہو گیا' تو کہنے لگے کہ جی ہاں' ہو گیا۔ **اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْکَ بِاٰیٰتِیْ** (20:42) جاؤ! یہ میرے قوانین ہیں' تو اور تیرا بھائی فرعون کی طرف جائے۔ **اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی** (20:43) جاؤ اُس فرعون کی طرف

---

1. تھوڑی سی تسبیح کرنی ہے' تھوڑا سا ذکر کرنا ہے مگر تم ہو کہ اس کے لیے اتنا کچھ طلب کر رہے ہو!
2. جو فرائض ہمارے سپرد کیے گئے ہیں' ہم ان کی سرانجام دہی میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہتے ہیں اور تیرے پروگراموں کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لیے جہاں تک جانا پڑے جاتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 12)
3. ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ ◆! ہم نے تیرے مانگ پوری کر دی۔ تیری درخواست منظور ہو گئی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 707)

جس کی طغیانیاں حدود فراموش ہوگئی ہیں۔ سنو ایک بات کہ وَ لَا تَنِیَا فِیۡ ذِکۡرِیۡ (20:42) میرے ذکر میں سستی نہ کرنا۔ چار آیات میں تین مرتبہ یہ بات آ گئی یعنی اس کو اتنی اہمیت تھی کہ اُنہیں اس بات کے متعلق بار بار کہا جا رہا ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃ.. وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ (29:45) تو یہ بات سمجھ میں آ گئی۔ موسیٰؑ سے یہی کہا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ کچھ دیدو۔ تو کہا کہ یہ سب کچھ لو لیکن یہ یاد رکھو کہ وَ لَا تَنِیَا فِیۡ ذِکۡرِیۡ [1] (20:42) ۔

جنگ بدر نے ذکر کی عملی تفسیر کو اپنے ہاں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر رکھا ہے

یہ ذکر کہاں ہوتا ہے؟ یہ میدانِ جنگ میں ہوتا ہے اور میدانِ جنگ بھی بدر [2] کا میدان ہے، جسے قرآن نے خود یوم الفرقان کہا ہے جس میں حق اور باطل نکھر کر الگ الگ ہو جائیں۔ دنیا دیکھ لے گی کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے۔ حضورؐ کی تیرہ سالہ محنتِ شاقہ کا ماحصل تین سو کی تعداد میں ہے۔ اس آسمان کے نیچے اللہ کا نام لینے والے سارے کے سارے جمع ہیں اور میدانِ جنگ میں جمع ہو رہے ہیں۔ اتنے بڑے لشکرِ جرار کے مقابلے میں یہ ننھی سی جماعت ہے۔ اس کی اہمیت میں نے پہلے بھی عرض کی ہے اور وہ بار بار دہرانے کی ہے کیونکہ وہ تو عجیب چیز ہے، وہ نبی اکرم ﷺ کی دعا ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کمانڈر، پیچھے بیٹھے رہتے تھے بلکہ یہ تو سب سے اول ہوتے تھے، خود صفیں ٹھیک کرتے تھے۔

جنگِ بدر میں حضورؐ کی محویت کا عالم اور دانشِ برہانی

یہ سارا کچھ کرنے کے بعد، قبل اس کے کہ وہ بگل بجائیں یا وہ جنگ کا حکم دیدیں، کہا کہ ذرا رک جایئے اور خود ایک طرف ہو گئے۔ وہ جو تاریخ میں نقشہ آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ بڑا صحیح ہے۔ حضور ﷺ پوری محویت کے ساتھ کھڑے دعا کر رہے تھے اور محویّت کا یہ عالم ہے کہ ردائے مبارک سر سے سرک کر نیچے آ رہی تھی۔ آپؐ اس محویّت سے دعا کر رہے تھے اور دعا یہ تھی کہ اے الہ العٰلمین! تیرے ارشاد کے مطابق میں نے تیرہ سال کی زندگی میں یہ ایک اتنی سی جماعت اکٹھی کی ہے۔ اس وقت اس کرۂ ارض پر تیرا نام لینے والے صرف یہی ہیں۔ اگر یہ آج یہاں میدانِ جنگ میں ختم ہو گئے تو پھر میں آخری نبی ہوں اور پھر قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا، یہ تیرا معاملہ ہے تُو سنبھال اور میں چلا فوج کو حکم دینے کے لیے۔ یہ نہ میرا کوئی ذاتی معاملہ ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی معاملہ ہے، یہ جو آ گئے ہیں بلکہ یہ معاملہ تو تیرا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِیۡتُمۡ فِئَةً (8:45) اے جماعتِ مومنین! ہم نے سن لیا ہے۔

---

[1] اور دیکھنا! میرے پروگرام کے مطابق عمل کرنے میں ذرا سی بھی سستی نہ کرنا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 709)

[2] جنگ بدر سترہ رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624 کی صبح بدر کے میدان میں لڑی گئی۔

جب تمہارا ان سے مقابلہ ہو تو **فَاثْبُتُوْا** (8:45) ثابت قدم رہنا' تمہارے پاؤں میں لغزش نہ آنے پائے۔ اور ایک بات اور یاد رکھو **وَ اذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا** ❶ (8:45)۔ یہ ہے نقشہ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جو ذکرِ خداوندی ہے تو یہ کہاں ہوتا ہے۔ فرعون جیسے مستبد حکمران کے سامنے کھڑے ہو کر ہوتا ہے' بدر کے میدان میں ہزار ہا دستے یا جلوس کے سامنے کھڑے ہو کر ہوتا ہے۔ یہ ذکر وہاں ہوتا ہے۔ کہا کہ **وَ اذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا** (8:45)۔ اس سے کیا ہوگا؟ کہا کہ **لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ** (8:45) اس سے تمہاری کامیابی ہوگی' تم کامران رہو گے' تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ ثابت قدم رہنا اور قدم قدم پہ قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھنا' یہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائیں' میدانِ جنگ میں بھی نہ اوجھل ہونے پائیں۔ یہ تو ''ذکر اللہ'' کا ایک میدان ہے۔

مستشرقین کا مشرکانہ حربہ اور ذہنی پستی

اِس اتنے حصے سے تو یہ نظر آیا کہ جیسا کہ وہ مستشرقین عام طور پہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! یہ تو بس کچھ دین ایسا ہے کہ ہاتھ میں تلوار لے کر نکلے ہوئے ہوتے ہیں اور جو سامنے آتا ہے' گردنیں کاٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں جہاں دیکھو' ان کے ہاں شمشیر کا ذکر آتا ہے۔ عزیزانِ من! ایسا نہیں ہے۔ اگر آپ کی آنکھیں بھینگی ہوں تو اس کا علاج کیا ہے!!

کائنات کی تخلیق اور ارض وسماوات پر غور وفکر کے سلسلہ میں ذکر کا حکم اور تذکرہ

آپ قرآن کو تو دیکھیے۔ ''ذکر اللہ'' کا ایک مقام تو ہمارے سامنے آ گیا۔ ایک اور مقام بھی ہے۔ کہا ہے کہ **اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ** (3:190) تخلیقِ ارض وسماوات' اختلافِ لیل و نہار میں اربابِ عقل و دانش کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یعنی حقیقت اور ہے اور اس حقیقت تک پہنچانے کی ان میں نشانیاں ہیں' ان سے اُس حقیقت تک پہنچا جائے گا۔ یہاں **لِّاُولِی الْاَلْبَابِ** لفظ ہے۔ یہ ہے جسے ہمارے ہاں لُبِ لُباب کہتے ہیں یعنی تت کڈیا ہویا ❷۔ **لِّاُولِی الْاَلْبَابِ** (3:190) یعنی انتہائی عقل وفکر سے کام لینے والے۔ اور یہ گوشہ تخلیقِ ارض وسماوات ہے' اختلافِ لیل ونہار ہے۔ اس میں سائنسدان آئیں گے' فلاسفرز آئیں گے' مورخین آئیں گے۔ یہ دوسرا گوشہ آ گیا۔ وہ میدانِ جنگ کا گوشہ تھا۔ اور یہ علمی' عقلی' فکری' تدبر' شعور کا گوشہ آ گیا۔ کہا کہ اس میں حقیقت تک پہنچنے کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ لوگ کون ہیں؟ **الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ** (3:191) یہ وہ لوگ ہیں جو لیٹتے' بیٹھتے' چلتے' پھرتے ''اللہ کا

---

❶ اور قوانینِ خداوندی کو شدت کے ساتھ سامنے رکھو (اور اپنا ہر قدم ان کی روشنی میں اٹھاؤ) (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص406)

❷ بات کا نچوڑ دیا ہوا ہے۔

ذکر'' کرتے ہیں۔اب یہ ''ذکراللہ'' کا دوسرا گوشہ آ گیا۔اس لیے کہ اس گوشے میں بھی وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ غور و فکر سے دیکھو گے تو تمہیں نظر آئے گا کہ خارجی کائنات کے اندر کبریائی صرف خدا کی ہے۔اور یہ گوشہ وہ ہے جہاں کائنات کی یہ تخلیق اور اختلافِ لیل ونہار پہ غوروفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہاں صرف خدا کے قانون کی حکمرانی ہے' کسی دوسرے کا قانون کائنات میں نہیں چل رہا۔

عزیزانِ من! یہ وہ حصہ ہے جس میں یورپ کے مادہ پرست' کافر' ملحد' خدا کے منکر' Atheists (دہریئے) ہیں۔وہ بھی اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس کائنات میں اس حاکمِ مطلق کا قانون چلتا ہے اور کوئی اُس قانون کو شکست نہیں دے سکتا۔کہا کہ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ (3:191)۔ تو یہ ذکراللہ کیا ہے؟ یہ غوروفکر ہے' یہ Scientific Researches (سائنسی تحقیقات) ہیں۔یہ وہ میدان ہے جس میں وہ یہ کچھ کرتے ہیں اور خدا کے قانون کی بالادستی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:190) کائنات کی تخلیق میں غوروفکر کرتے ہیں۔یہ ہے یذکرون اللہ ۔یہ بھی ''ذکرِ خداوندی'' کا گوشہ ہے کہ کائنات کے اندر اس کے قانون کی حکمرانی ہے۔یہ کرتے ہیں اور اُس کے بعد یہ اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم غوروفکر کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ کارگہ کائنات جس طرح سے اپنے فریضے کو انجام دے رہے ہیں تو ہم اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ تو نے اسے بلامقصد پیدا نہیں کیا۔

کائنات کی تخلیق کا عظیم مقصد: انسانی اعمال کی نگہداشت ہے

یہ کیا مقصد ہے؟ وہ آیت دوسرے مقام پہ ہے اور میں نے کئی دفعہ آپ کے سامنے لائی ہے۔کہا ہے کہ تخلیقِ ارض و سما سے مقصد یہ ہے کہ کسی شخص کا کوئی عمل بلانتیجہ نہ رہ جائے۔قانونِ مکافات کے لیے یہ چکی چل رہی ہے۔ سُبْحٰنَكَ (3:191) تُو اس سے بہت بلند ہے کہ اتنا عظیم کارگہ کائنات تُو پیدا کرے اور وہ بلامقصد ہو' بلا قانون چل رہا ہو۔یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) اور رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ (3:191) یہ تباہی وہ ہے جو قوم اس تباہی میں آ جاتی ہے اور وہ اس دنیا کے اندر ذلیل و رسوا ہو جاتی ہے۔یا اللہ! ہمیں اس تباہی سے بچا لینا۔یہ دوسرا گوشہ آ گیا۔میدانِ کارزار میں نکلے تو ''ذکراللہ'' یہاں ہو گیا تاکہ ان کے ہاتھوں سے شکست نہ ہو جائے۔اور میدان حرب وہی میدانِ جنگ نہیں ہے بلکہ یہ عقل وفکر و بصیرت کا میدان بھی تو ہے کہ جس میں غوروفکر کرنا ہے' تحقیق کرنی ہے' ریسرچ کرنی ہے۔کہا کہ اگر ہم نے یہ ریسرچ نہ کی تو کائنات کی مخفی قوتوں کو ہم مسخر نہیں

کرسکیں گے اور جو قوم انہیں مسخر نہیں کر سکے گی اس دنیا میں ذلیل وخوار ہو جائے گی۔ اے ہمارے نشوونماد ینے والے! ہمیں اس سے بچا لینا کہ ہم دنیا میں ذلیل وخوار ہو جائیں۔

قرآنی قوانین کے سلسلہ میں لفظ برکت کا دل ودماغ کو جلا بخشنے والا مسرور کن قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہ ''ذکر اللہ'' کا دوسرا گوشہ آ گیا۔ اور یہ سارے قوانین جن کا ذکر یہاں کیا گیا ہے خواہ وہ میدانِ جنگ سے متعلق ہوں یا وہ ریسرچ لیبارٹری کے متعلق ہوں تو یہ کہاں ہیں؟ قرآنِ کریم کو خدا نے خود ''ذکر'' کہا ہے۔ یہ مجموعۂ قوانین ہو گیا۔ مثلاً اس میں بیشمار آیات ہیں جہاں قرآن کو ''ذکر'' کہا گیا ہے لیکن میں ایک ہی آیت پیش کر رہا ہوں۔ **وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ** (21:50) یہ ذکر' یہ مجموعۂ قوانینِ خداوندی برکت ہے۔ یہ اس قسم کی کھیتی' سر سبزی ہے جو سبز سے بھی زیادہ سیاہی مائل ہو جاتی ہے اور وہ بڑی گھنی ہوتی ہے۔ بہت فراوانی سے جو کھیتیاں اگتی ہیں تو اُس کو برکت کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے **مفلحون یاتفلحون** کہا ہے' **فلاحت** کے معنی ہی کھیتی باڑی ہوتا ہے۔ تمہاری محنتیں بارآور ہونگی اور اس طرح بارآور ہونگی کہ جیسے برکت والی کھیتی ہوتی ہے' بڑی گھنی کھیتی ہوتی ہے' بڑی سرسبز وشاداب کھیتی ہے۔ کہا ہے کہ **مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ** (21:50) ہم نے اس کو نازل کیا ہے مگر **اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ** (21:50) وہ اس قسم کی جو چیز ہے اُس سے انکار کر رہے ہو۔

عزیزانِ من! ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ یہ کیوں کہا کہ اس قسم کی چیز سے انکار کر رہے ہو۔ لیکن پہلے میں عرض کر دوں کہ یہ خود قرآن ذکرِ مبارک ہے۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ قرآن ذکر للعالمین (12:4) ہے۔ یعنی کسی ایک قوم' برادری' خاندان' کنبہ' ملک' زمانہ کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ للعالمین ہے اور ابدی طور پہ تمام نوعِ انسان کے لیے یہ ضابطۂ قوانین ہے۔ اسی کی رو سے مستبد قوتوں کے خلاف انقلاب برپا ہوگا' اسی کی رو سے کائنات کے پوشیدہ حقائق یا مضمر صلاحیتوں پہ ریسرچ ہوگی اور ان کو تم سامنے لاؤ گے۔ یہ ہمارے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق ہوگا۔ تو یہ ہوگا ''ذکر''۔ کہا کہ جی یہ جو آپ نے یہ سب کچھ کہا کہ ہم اتنی مشقتیں اٹھائیں' اتنی محنت کریں' جانکاہی کریں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اس قرآن کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں اور اس کے مطابق عمل کریں تو وہ جو وہاں حضرتِ موسیٰؑ سے کہا تھا کہ ہم نے تمہیں اپنے ایک کام کے لیے چن لیا ہے تو یہ سوال یہاں پیدا ہوا کہ یہ سارا کچھ ہم سے خدا اپنے کسی کام کے لیے کرا رہا ہے اور ہم خوامخواہ بیگار ہی بھگت رہے ہیں۔

عزیزانِ من! سنیے کہ کیا بات ہے یہ کہ **لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا** (21:10) ہم نے تمہاری طرف یہ ایک ضابطۂ قوانین بھیجا ہے۔ اس میں کیا ہے؟ کہا کہ **فِيْهِ ذِكْرُكُمْ** (21:10) اس میں تمہارے ہی شرف اور عزت کی باتیں ہم نے بتائی ہیں' کوئی ہمارا کام تو نہیں ہے جو رکا ہوا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ کوئی چیز جتنی زیادہ قیمتی ہوگی' اُس کی حفاظت اتنی ہی شدت سے ہوگی۔ عرب اپنے ہاں کسی

چیز کی شدت سے حفاظت کرنے کو ''ذکرِ کبیر'' کہتے تھے یعنی شدت سے اُس کی حفاظت کرنا۔ اور اُس قوم کے نزدیک بھی شرفِ انسانیت اور عزتِ انسانیت سب سے زیادہ قیمتی چیز تھی اس لیے وہ اس کے لیے بھی ''ذکر'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ معاف رکھیے کہ ہمارے ہاں جو ''مذکر'' کا لفظ ہے تو وہ عربی زبان کا ہی ہے' وہ اسی بنیادی معنی سے ہے۔ اب ہمارے ہاں وہ صرف Gender رہ گیا ہے یعنی مؤنث اور مذکر ہی معنی رہ گئے ہیں۔ وہ یہ لفظ صاحبِ شرف انسان کے لیے بولتے تھے' ہر انسان کے لیے مذکر کا لفظ نہیں بولتے تھے۔ کہا کہ **لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ** (21:10) او بابا! یہ سارا کچھ جو ہم تم سے کہہ رہے ہیں' یہ قوانین نازل کیے' اس پہ چلنے کی تاکید کر رہے ہیں' وہ رزم کا گوشہ ہو' یا بزم کا گوشہ ہو' اُس میں ہم کہہ رہے ہیں کہ ہر جگہ ان کو اپنے سامنے رکھو۔ یہ کچھ اس لیے نہیں ہے کہ اس سے ہم کچھ اپنا کام تم سے لینا چاہتے ہیں۔ **فِيْهِ ذِكْرُكُمْ** (21:10) اس میں تمہارا ہی شرف وعزت ومجد ہے۔ **اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (21:10) عقل و فکر سے کام لو تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔

اگر کائناتی قوانین انسان کی مرضی کے تابع کر دیئے جائیں تو ساری کائنات ہی تباہ ہو جائے

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ کہا ہے کہ **وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ** (23:71) اگر ہم بھی لوگوں کی ہی خواہشات' جذبات اور مفادات کے پیچھے لگنا شروع کر دیں یا اگر الحق ان لوگوں کی اپنی خواہشات کے تابع ہو جائے یعنی جیسا یہ چاہیں ویسا یہ سلسلہء کائنات چلنے لگ جائے تو **لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ** (23:71) یہ کائنات کا سلسلہ تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ بات سیدھی سی ہے کہ اتنی سی تمدنی دنیا انسان کے ہاتھ میں دی ہے تو پوچھو نہیں کہ اس نے کیا کچھ کر کے رکھ دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ** (30:41) انسانوں کے ہاتھوں میں جب یہ چیز دی گئی تو پھر خشکی اور تری ہر جگہ فساد ہی فساد برپا ہو گیا۔ کہا کہ یہ تو غنیمت ہے کہ ہم نے یہ سماوات وارض کا سلسلہ سنبھال کر رکھ لیا اور ان کے ہاتھوں میں نہیں دیا۔ کائنات کا سلسلہ ہمارے قوانین کے تابع چلتا ہے' اگر یہ بھی کہیں ان کے قابو آ جاتا ''تے مندھول کے رکھ دیندے'' یعنی تہس نہس کر کے رکھ دیتے۔

انسان کا سب سے بڑا دشمن خود انسان آپ ہے

یہ ہمارا سلسلہء کائنات تو ایک طرف رہا' ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ **بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ** (23:71) ہم نے انہیں ایک ایسا ضابطہء قوانین دیا جس میں ان کی اپنی عزت اور شرف کا راز پوشیدہ تھا۔ لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ **فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ** (23:71) یہ اپنے شرف وعزت سے بھی گریز کی راہیں نکال رہے ہیں' اپنے ہی شرف وعزت سے منہ موڑ کر بھاگے چلے جا رہے

ہیں۔ جس نوع کی' انسان کی' کیفیت یہ ہے کہ اپنے ہی شرف وعزت سے منہ موڑ کر بھاگا ہوا' اعراض برتتا ہوا' چلا جا رہا ہے تو اگر اس کے ہاتھ میں سلسلہء کائنات دیدیتے تو پھر پوچھو نہیں کہ کیا کر دیتا۔ اُس نے کہا تھا کہ یہ ظالم بھی ہے' یہ جاہل بھی ہے۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن بات کہاں لایا ہے۔ یہ بیچارہ مولوی' ملاّ کیا جانے کہ قرآن کا ربط کیا ہے۔ وہ تو صرف یہ سمجھتا ہے کہ جی! پہلے کہا کہ **وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ** (23:71) اور پھر کہا **بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ** (23:71). ان کو ربط نظر نہیں آتا' نہ آئے گا لیکن یہ بڑا گہرا ربط ہے۔ یہ سلسلہء کائنات اس لیے اس حسن وخوبی سے چل رہا ہے کہ ہم نے ان کے ہاتھ میں نہیں دیا ہوا۔ دیکھتے ہو کہ ان کے ہاتھ میں ہم نے کیا دیا ہوا ہے؟ ان کی شرف وعزت ان کے ہاتھ میں دی اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ اُسی سے منہ موڑ کر بھاگے چلے جا رہے ہیں' رسوا اور ذلیل رہنا چاہتے ہیں۔ جس کی یہ کیفیت ہے اگر اُس کے ہاتھ میں کہیں یہ کائنات آجاتی تو پوچھیے نہیں کہ کیا حشر ہوتا۔ یہاں پھر ''ذکر'' کا لفظ آ گیا۔ وہ اس سے اعراض برتتے ہیں۔ **فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ** (23:71). یہ ہے کہ بالکل زبان سے انکار نہیں کرنا بلکہ گریز کی راہیں نکالنا۔ عجیب الفاظ ہیں قرآن کے۔ یہاں کفر نہیں کہا' انکار نہیں کہا' جھوٹ نہیں کہا۔ اعراض کے معنی ہوتے ہیں کہ ''زبان سے تو کہنا کہ جی ٹھیک ہے لیکن کبھی اِدھر نکل جانا اور کبھی اُدھر نکل جانا''۔ یہاں کہا ہے کہ یہ اپنے شرف سے' اپنی عزت سے' اپنے مجد سے اعراض برتتے ہیں۔

شرف ومجد سے محرومی کے بعد انسان کی حالتِ زار

اب پھر یہ بات کچھ Abstract (غیر محسوس) سی آ گئی کہ اس اعراض برتنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ انسان سے شرف وعزت ومجد چھن جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ ہمیں محسوس طور پہ سمجھائیے کہ کیا ہوتا ہے۔ آپ تو بعد میں تقاضا کریں گے لیکن اُس خبیر وعلیم کو پہلے ہی پتہ تھا کہ یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ شرف وعزت چھن جاتی ہے تو پھر ہوتا کیا ہے۔ کہا کہ **وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ** (20:124) جو ہمارے ''ذکر'' سے اعراض برتتا ہے تو **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** (20:124) اُس کی روٹی تنگ ہو جاتی ہے' روٹی کے لیے دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب شرف اور عزت چھن جاتی ہے تو پھر کیا ہوتا ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ صاحبِ عزت وشرف ہو اور اُس کے لیے اس کو قوانین دیئے' ضوابط دیئے لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ اُن سے اعراض برتتا ہے۔ جب اعراض برتتا ہے تو پھر **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** (20:124) اس کی روٹی اُس پر تنگ ہو جاتی ہے۔

فریبِ نفس میں مبتلا قوم کی ذہنی پسماندگی

اب ہمارے ہاں فریبِ نفس والے آ گئے۔ اُنہوں نے کہا کہ اللہ کے مقربین کی تو نشانی یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں بڑے غریب'

مفلس اور محتاج ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو دولت ہے یہ تو ایک لاش ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں۔ یہ حدیثیں اور روایات بنائی گئیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ان روایات کے اندر ہے کہ یاد رکھو! محتاجی' غریبی' مفلسی وہ چیز ہے کہ وہ انسان کو کفر کے قریب لے جایا کرتی ہے لیکن یہ حدیثیں وہ سامنے نہیں لائیں گے۔ بس صرف ایسی حدیثیں سامنے لائیں گے کہ دنیا ایک لاش ہے اور اُس کے چاہنے والے کتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ تمہیں اس دنیا کے اندر کچھ نہیں ملتا لیکن آخرت تمہارے ہی لیے ہے' جنت تمہارے ہی لیے ہے۔ آیئے ذرا ہم خدا سے پوچھیں کہ وہ کیا کہتا ہے۔ کہا کہ **وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا** (20:124) جو ہمارے ''ذکر'' سے اعراض برتتا ہے تو اُس کی روٹی تنگ ہو جاتی ہے۔ **وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى** (20:124) اور جس کی روٹی یہاں تنگ ہو جاتی ہے تو وہ قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا۔ یہاں کا ذلیل ہو اور وہاں کا معزز ہو' یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ڈرامے کے دو الگ الگ پارٹ نہیں ہیں۔

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود [1]

زندگی تو ایک بہنے والی ندی ہے' یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ ندی فیروز پل کے پاس تو سوکھی ہوئی ہو اور ذرا کمپلیکس کے پاس جائے تو ٹھاٹھیں مار رہی ہو۔ یہ یہی کہتے ہیں کہ یہاں تو یہ سوکھی ہوئی ہوتی ہے لیکن آخرت میں جا کر دیکھیے کہ پھر اس میں کتنا پانی ہوتا ہے:

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

دنیا و آخرت دونوں کی بربادی

عزیزانِ من! کسی مقام پہ وہ ندی سوکھے گی تو آگے اُس کا سارا سوکھ جائے گا اسی لیے کہا ہے کہ: **وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى - قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا** (20:124-125) اے اللہ! تو نے یہاں مجھے اندھا کیوں پیدا کر دیا' میں تو چنگا بھلا دیکھنے والا تھا۔ کہنے لگے کہ تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ تمہاری کونسی آنکھیں اندھی تھیں۔ **قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا** (20:126) ہم نے تمہیں اپنے قوانین دیئے اور تم نے اُنہیں فراموش کر دیا تو یہ ہے جو تمہیں کہا گیا کہ تم وہاں اندھے تھے۔ **وَ كَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰى** (20:126) تم نے ہمیں وہاں بھلایا اور ہم نے آج تمہیں یہاں بھلا دیا۔ عزیزانِ من! جسے انسانیت کے اوپر یا فرد کے اوپر شدید ترین عذاب کہو تو وہ یہ ہے کہ:

---

[1] زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود — ایں مے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود — (اقبالؒ)

وَ کَذٰلِکَ الۡیَوۡمَ تُنۡسٰی (20:126) ۔میں نے کہا ہے کہ یہ شدید ترین' ذلیل ترین عذاب ہے۔

خدا کو بھلانا اس طرف سے نازل کردہ ضابطۂ حیات کو نظر انداز کرنا ہے

کہا ہے کہ وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ (59:19) دیکھنا! ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنھوں نے خدا کو بھلا دیا۔ یہ خدا کو بھلانا تو خدا کے ''ذکر'' کو بھلانا ہے۔ اگر خدا کا جو نام لینا ہے' وہ اُس کا ذکر ہے تو یہ جو فقیر مانگنے والا ہوتا ہے' اُس سے زیادہ تو کوئی ذکر ہی نہیں کرتا۔ دے جا بابا! اللہ کے نام پہ' اللہ بھلا کرے تمہارا' وہ صبح سے شام تک ہزار مرتبہ اللہ کہتا ہے تے روٹی منگ کے کھانداا ے [1]۔ اگر اُس کا نام لینا اور جپنا ذکر اللہ ہے تو اس فقیر اور گداگر سے زیادہ تو کوئی بھی ذکر اللہ کرنے والا نہیں ہے۔ کیا اُس سے زیادہ ذلیل روٹی بھی کسی کی ہوسکتی ہے!! کہا ہے کہ وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ (59:19) ان کی طرح نہ ہوجانا جنھوں نے خدا کو بھلا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فَاَنۡسٰھُمۡ اَنۡفُسَھُمۡ (59:19) ہم اُس کو اپنے آپ سے بھلا دیتے ہیں۔ وہ انسانیت کے شرف سے بھی گر جاتا ہے۔ سب سے سخت تریں عذاب یہ ہے کہ انسان کو یہی یاد نہ رہے کہ میں انسان ہوں۔ وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنۡسٰھُمۡ اَنۡفُسَھُمۡ (59:19) خدا کی فراموشی کا نتیجہ خود فراموشی ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے کہ میں کیا ہوں۔

انسان کا سب سے بڑا جرم اپنی ذات کو فراموش کرنا ہے

عزیزانِ من! اسی لیے اس قرآن جاننے والے نے کہا [2] تھا کہ

شاخِ نہالِ سدرہ خار و خس چمن مشو

وہ انسان سے کہہ رہا ہے کہ سدرۃ الکبریٰ کا جو شجرِ طیّب ہے تُو اُس کی شاخ ہے' تُو اپنے آپ کو اس باغ کا جھاڑ جھنکار نہ سمجھ کہ یونہی کسی نے ماچس پھینکی اور آگ بھڑک اٹھی۔

منکرِ او اگر شدی منکر خویشتن تن مشو

اگر بدقسمتی سے کبھی خدا کا منکر ہوگیا تو

منکرِ خویش تن مشو

اپنے آپ کا منکر نہ ہوجانا۔ اپنی ذات کا اقرار کرے گا تو خدا کا اقرار آجائے گا لیکن اگر منکرِ خویش ہوگیا تو اُس کا اقرار کبھی نہیں آئے گا۔ یہ ہے فَاَنۡسٰھُمۡ اَنۡفُسَھُمۡ (59:19)۔

---

[1] روٹی مانگ کر کھاتا ہے۔

[2] یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ''ذکر اللہ'' کے بھلانے سے کیا ہوتا ہے۔قرآنِ کریم نے دولفظوں میں ایک مقام پہ اتنی بڑی بلند حقیقت کو بیان کیا ہے۔کہا ہے کہ **فَاذْكُرُوْنِيْٓ** (2:152) میرا ذکر کرو۔تو **اَذْكُرْكُمْ** (2:152) میں تمہارا ذکر کرونگا۔اس سے بڑا مقام بھی معراجِ انسانیت کا کوئی ہوسکتا ہے کہ خدا انسانوں کا ذکر کررہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ **فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ** (2:52)۔''تُسی ایتھے اوہدی تسبیح پھیروُ تے اوہ اوتھے تہاڈی تسبیح پھیرے گا[1]''۔ **فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ** (2:152) میری دی ہوئی نعمتوں کو میرے بتائے ہوئے اقدار کے مطابق خرچ کروٗ یہ ہے **فَاذْكُرُوْنِيْٓ** اور پھر کہا کہ **وَ لَا تَكْفُرُوْنِ** (2:152) ان کو چھپاؤ نہیں۔کفر کے معنی چھپانا ہوتا ہے۔

نبی اکرمؐ پر درود بھیجنے کا مفہوم

تو یہ ہے ذکرِ خداوندی۔یہ کروگے تو میں تمہیں شرف وعزتِ انسانیت کی بلندیوں پہ پہنچا دونگا۔یہ ذکر تو خدا کے قوانین پہ چلنے والوں کے لیے بلندترین مقام ہے۔معاف رکھیے ہم تو یہی جانتے ہیں کہ **اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا** (33:56)۔یہی آیت ہمارے سامنے لائی جاتی ہے اور اس کا ترجمہ درود بھیجنا کیا جاتا ہے۔کبھی پھر بتاؤنگا کہ یہ کیا ترجمہ ہے اور اس کے معنی کیا ہیں۔بہرحال یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ اور اُس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔چارہی آیات پہلے مومنین سے کہا گیا کہ **هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ** (33:43) خدا اور اُس کے فرشتے تم پہ بھی درود بھیجتے ہیں۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ درود بلندترین مقام بتایا جاتا تھا۔نبی اکرمﷺ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کا شرفِ انسانیت کا اتنا بڑا مقام ہے کہ اللہ اور اُس کے فرشتے اُنؐ پہ درود بھیجتے ہیں۔اورقرآن وہی الفاظ مومنین سے بھی کہتا ہے کہ **هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ** (33:43)' وہی الفاظ ہیں۔یہ چیزیں سمجھانے کی ہیں کہ وہ درود بھیجتا ہے تو وہ کیا کرتا ہے۔وہ یہ کرتا ہے کہ **فَاذْكُرُوْنِيْٓ** (2:152) تمہیں شرفِ انسانیت سے نوازتا ہے'اس تخلیقِ کائنات میں جو بلندترین مقام ہوتا ہے وہ تمہیں عطا کردیتا ہے بشرطیکہ **اَذْكُرْكُمْ** (2:152) تم میرے قوانین کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھوٗ ان کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کروٗ ایک نظام قائم کرو۔تو وہ نظامِ صلوٰۃ کہلائے گا اور اُس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ اللہ کے ''ذکر کو اکبر'' کردے۔بس یہ کرو تو تمہاری معیشت بھی فراواں ہوجائے گی۔کہا کہ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ** (2:153)۔یہاں صلوٰۃ آ گئی۔استعانت کے معنی مدد مانگنا کیا جاتا ہے۔ اس کے بنیادی معنی یہ ہوتے ہیں جسے بھرپور جوانی میں کہتے ہیں کہ اپنی صلاحیتوں میں بھرپور توانائیاں چاہتے ہو تو صلوٰۃ اور استقامت

---

[1] تم یہاں اس کی تسبیح پھیرو تو وہ وہاں تمہاری تسبیح پھیرے گا۔

کے ذریعے سے حاصل کرو۔ اگر یہ دو چیزیں صلوٰۃ اور صبر تمہارے ساتھ ہوں تو اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (2:153) پھر تم اُس وقت اکیلے نہیں ہوتے بلکہ خدا بھی تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ (2:154) میدانِ جنگ میں ہوتا ہے' وہاں جان دینے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہاں جان دینے والے جو ہیں تو ان کے متعلق مت کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ ان کو مردہ خیال تک نہ کرو' وہ تو شرفِ انسانیت کے بلندترین مقام پہ پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہوتا ہے اللہ کا ذکر۔

اب اگلے الفاظ ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ داستان چلتی رہے تو پھر تو پوچھو ہی نہیں قرآن کی یہ باتیں ختم ہی نہیں ہوسکتیں' ایک ایک عنوان نہیں ختم ہوسکتا۔ سینکڑوں مرتبہ قرآن میں یہ بات آئی ہے اور ہر مرتبہ وہ زندگی کا ایک نیا پہلو سامنے لاتا ہے' جہاں بتاتا ہے کہ ذکر یہ کرتا ہے اور ذکر وہ کرتا ہے۔ اگر ذوقِ تحقیق ہے تو میں نے کم از کم آپ احباب کے لیے راستے کی مشکلات کو دور کر دیا ہے۔ اگر آپ ''تبویب القرآن [1]'' میں ہی دیکھیں گے تو آپ کو نظر آ جائے گا کہ سو مرتبہ تو میں نے وہاں ہی بتایا ہے کہ ''ذکر'' کیا ہے۔ ایک ایک درس کے اندر یہ بات تو نہیں آتی۔ اب آپ نے اقامتِ صلوٰۃ بھی سن لیا جواب نماز ہوگئی ہے' ذکر اللہ کی بات بھی سن لی جواب ھوحق والی بات ہوگئی یعنی قلب کے اوپر ضربیں لگانا ہوگیا۔ یہ چیزیں بھی آپ کے سامنے آ گئیں اور جو قرآن نے کہا تھا وہ بھی آپ کے سامنے آ گیا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (29:45) اور جو کچھ تم مصنوعی طور پر مکینکلی کر دیتے ہو' تو وہ بھی ہم جانتے ہیں۔ تصنعون سے لفظ صنعت نکلا ہے' یہاں سے لفظ مصنوعی (Artificial) نکلا ہے۔ اصل میں اس کا ترجمہ مکینکلی (میکانکی طور پر) ہوتا ہے۔ کہا کہ وہ چیزیں جو دوسرے دیکھ سکیں بس تم وہ کر آتے ہو۔ صلوٰۃ کے متعلق کہا کہ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ . الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِہِمْ سَاھُوْنَ . الَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ اور یہاں کہا کہ وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (29:45)۔ عزیزانِ من! خدائے خبیر و علیم ہے۔ ہم یہ کچھ کہہ رہے ہیں اور تم کچھ اپنے طور پہ مکینکلی کر آتے ہو اور پھر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیتے ہو' فریبِ نفس دے لیتے ہو کہ منشائے خداوندی پورا ہوگیا حالانکہ وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (29:45) جو کچھ تم محض مصنوعی طور پہ یا مکینکلی کر آتے ہو ہم اُس کا بھی علم رکھتے ہیں۔ یہ کچھ کرنے کے بعد تم چاہو کہ وہ ''ذکر'' وہ نتائج پیدا کر دے' وہ صلوٰۃ وہ نتائج پیدا کر دے تو ایسا نہیں ہوگا۔ یہاں تو قلب و نگاہ کے اندر پہلے ایک تبدیلی پیدا ہونی چاہیے تھی پھر اُس کے بعد ایک ایک قدم کے اوپر یہ چیک کرنا چاہیے کہ ہماری یہ صلوٰۃ یہ کر رہی ہے یا نہیں' ہمارے ذکر کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے یا نہیں؟

---

[1] اس کتاب میں قرآن کریم کو موضوعات یا مضامین کے اعتبار سے Subject-wise باب' باب Classify کیا گیا ہے۔ اسے اصطلاح میں تبویب کہتے ہیں۔ اس کتاب کی تین جلدیں ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کی گاڑی صدیوں سے غلط سمت کی طرف گامزن ہے

عزیزانِ من! یہاں سے یہ انجن جب دوسری پٹڑی پہ پڑا تھا تو وہاں سے اگر ایک بات کسی کی سمجھ میں آ جاتی کہ رکو تو سہی' ذرا ٹیسٹ کر کے دیکھو کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں واقعی اُس کا وہ نتیجہ نکلتا ہے جو قرآن نے بتایا تھا۔ اُس نے جو کہا تھا کہ یہ ریل گاڑی یہاں سے چلے گی تو اگلا اسٹیشن اصلاح پورا آئے گا' تو اصلاح پور نہیں آیا یہ تو لدھیانہ آ گیا۔ تو کبھی سوچا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ اگر کوئی اتنا ہی کہنے والا ہوتا تو کم از کم ایک اسٹیشن تک ہی انجن غلط جاتا اور وہاں سے پھر لوٹ پڑتا۔ عربی زبان میں اس عمل کو ''توبہ'' کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! قیامت تو یہ ہے کہ یہ گاڑی چلی جا رہی ہے۔ ٹائم ٹیبل ان کے پاس رکھا ہوا ہے جس کے اندر لکھا ہوا ہے کہ اس اسٹیشن کے بعد وہ اسٹیشن آئے گا' پھر اُس کے بعد وہ نہر راستے میں آئے گی' اس قسم کا پل آئے گا۔ وہ سب کچھ دیا ہوا ہے اور وہ بھی سامنے رکھا ہوا ہے' پڑھتے جا رہے ہیں ثواب ہو رہا ہے۔ گاڑی چلی جا رہی ہے لیکن نہ وہ اسٹیشن آتا ہے' نہ وہ نشانیاں آتی ہیں جو بتا دیں کہ صحیح چلا جا رہا ہے یا نہیں۔ جب اُن سے پوچھتے ہیں کہ صاحب! یہ غلط جا رہا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ ہزار برس سے تو گاڑی چلی آ رہی ہے اور اب یہ کہنے والا آ گیا ہے کہ یہ غلط جا رہا ہے ''تے ہزار برس توں ایہہ گڈی چلی آ رہی ہے تے اوہناں نوں کسے نوں سمجھ نہیں سی آئی جے ایہہ دسن والا آ گیا اے [1]''۔ او بابا! میں کہہ یہ رہا ہوں کہ تمہارے ہاتھ میں جو ٹائم ٹیبل ہے اُس میں یہ لکھا ہے کہ یہ اسٹیشن آئے گا تو وہ نہیں آیا اور تم تو کسی اور اسٹیشن پہ کھڑے ہو۔ اب اگر اس کہنے والا کا جرم یہ ہے کہ یہ نئی بات کہتا ہے تو یہ نئی بات نہیں کہتا بلکہ پرانی کہتا ہے' سب سے پہلی بات کہتا ہے کہ تمہارے ٹائم ٹیبل میں لکھا ہوا ہے اور وہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔

عزیزانِ من! یہ جو پہلے انبیائے کرامؑ آتے تھے تو اپنی قوم کو یہی ٹائم ٹیبل دیتے تھے' یہی ذکر دیتے تھے' یہی صلوٰۃ دیتے تھے۔ اُس کے کچھ عرصے کے بعد وہ قوم وہ کچھ کرتی تھی' یعنی اُنہوں نے ان کے یہی نام رکھے ہوئے تھے وہ بھی نماز کہتے تھے۔ یہ نماز تو نام ہی ہمارا نہیں ہے بلکہ یہ تو مجوسیوں کا نام ہے۔ پہلی قومیں یہودی' نصرانی' مجوسی ہیں۔ ان کے اندر یہ باتیں موجود ہیں جو انبیائے کرام ان کی طرف آتے تھے۔ اُس کے باوجود ایک دوسرا نبی کیوں آتا تھا اور وہ ان کو کیوں دعوت دیتا تھا۔ وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ جو تم کہتے ہو وہ تو ہم پہلے کر رہے ہیں کہ اللہ کو مان رہے ہیں' فرشتوں کو مان رہے ہیں' کتابوں کو مان رہے ہیں' وحی کو مان رہے ہیں' نبیوں کو مان رہے ہیں' قیامت کو مان رہے ہیں تو تم اور کونسی نئی چیز کہہ رہے ہیں؟ انجن کو مان رہے ہیں' ڈبوں کو مان رہے ہیں' پٹڑی کو مان رہے ہیں تو پھر تم کیا کہتے ہو؟

---

[1] ہزار برس سے تو یہ گاڑی چلی آ رہی ہے۔ ان میں سے تو کسی کو سمجھ ہی نہیں آئی کہ اب یہ بتانے والا آ گیا۔

فرقہ واریت پر مبنی خود ساختہ ٹائم ٹیبل صحیح منزل کی طرف راہ نمائی نہیں کرسکتا

او بابا! میں یہ کہتا ہوں کہ تم ٹائم ٹیبل کو نہیں مان رہے بلکہ **يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ** (2:79)۔ او بابا! یہ ٹائم ٹیبل تو تم نے خود بنا لیا ہے اور کہہ رہے ہو کہ یہ وہی ہے جو ہیڈ کوارٹر سے جاری ہوا تھا۔ ان کے ہاں یہ سارے الفاظ موجود تھے' وہ یہ سب کچھ کرتے تھے۔ بعینہ اُس مقام کے اوپر ہم کھڑے ہوئے ہیں۔ بس اتنا فرق یہ ہے کہ ان کے پاس اوریجنل ٹائم ٹیبل ہوتا نہیں تھا وہ نبی کی وساطت سے دوبارہ دیا جاتا تھا' ہمارے پاس اوریجنل ٹائم ٹیبل موجود ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود اُس نے لے رکھا ہے۔ عزیزانِ من! نبی تو کوئی آئے گا نہیں لیکن جب تک اس ٹائم ٹیبل کے مطابق آپ رخ نہیں کریں گے تو یہ گاڑی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچے گی' جتنی تیزی سے دوڑاؤ گے اتنی دور چلی جائے گی' جتنا وقت صرف ہوتا چلا جائے گا تو یہ سند دیتے چلے جاؤ گے کہ اسلاف کرتے چلے آئے ہیں اور اسلاف کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا' زمانے کے مدتِ مرور میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا' تمہاری سند پختہ سے پختہ تر اور تمہارا باطل پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے گا۔ جب تک تم اس ٹائم ٹیبل کو کھڑے ہو کر دیکھ نہیں لو گے اور جہاں سے کانٹے کا رخ بدلا تھا' وہاں پہ واپس آنا پڑے گا۔ وہاں سے پھر نئے سرے سے دوسری پٹڑی پہ جانا ہوگا لیکن ایک اہم چیز میرے سامنے ہے۔ وہ کیا ہے؟

عزیزانِ من! یہ کپکپا دینے والی چیز ہے۔ علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے خطبات میں ایک چیز لکھی ہے اور میرے سامنے آتی ہے تو میں کانپ جاتا ہوں۔ ان کے خطبات کی زبان بھی بڑی فلسفیانہ ہے۔ وہ چیز کسی اور کی Quotation ہے جو اُنہوں نے دی ہے۔ غور سے سنیئے' ایک ایک لفظ سمجھنے کا ہے:

The verdict of history, as a modern writer has happily put it, is that worn out ideas have never risen to power among a people who have worn them out[1].

سمجھنے والو! جھوم جاؤ کہ یہ شخص کیا کہہ گیا ہے! کہہ رہا ہے کہ

''جس قوم نے' جن لوگوں نے' اپنے ہاں کے ان بلند تصورات کو اس طرح فرسودہ کر دیا ہو تو وہ تصورات اُس قوم کے اندر دوبارہ' وہ طاقت حاصل نہیں کرسکتے' وہ کسی نئی قوم کے اندر حاصل کریں گے۔ تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ جس قوم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بلند آئیڈیاز (Ideas) کو فرسودہ کر دیا ہو تو وہ فرسودہ آئیڈیاز اُس کے ہاتھوں دوبارہ اوریجنل آئیڈیاز بن کر طاقت حاصل نہیں کرسکتے۔''

---

[1] Iqbal, Allama Muhammad: The Reconstruction of Religious Thought in Islam. The Principle of Movement in the Structure of Islam (PP.116-142) in M. Saeed Sheikh (Ed., & Annotated), Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1989, (P.120).

اس کے بعد میں اور کیا کہوں!! یہ کہا جائے گا کہ جب تم یہ بھی جانتے ہو تو پھر اس قوم کے اندر تم نے اپنی ساری عمر کیوں کھپا دی؟

عزیزانِ من! اس لیے کھپا دی کہ قرآن نے ہی کہا تھا کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ مجھے کیا حق حاصل تھا کہ میں یہ کہہ کر مایوس ہو جاتا کہ اس قوم میں مجھے کوئی ایسے افراد بھی نہیں ملیں گے جو ان باتوں کو سمجھیں گے۔ اسی قوم کے اندر یہ کرتے ہوئے مجھے پچاس برس ہو گئے ہیں، کسی قوم کے ساتھ اپنی وابستگی اور امیدوں کا جو سہارا ہے وہ بڑی چیز ہے:

یہ جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی
مگر جلے ہوئے تنکوں کو چن رہا ہوں میں

میری عمر ان جلے ہوئے تنکوں کو چننے میں گزر گئی ہے، اس لیے کہ خدا نے کہا تھا کہ ناامید نہ ہو۔ عزیزانِ من! اُس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی خود ہی فیصلہ کیوں کر لے کہ ان میں کوئی ایسے لوگ نہیں نکلیں گے جو ان چیزوں کو سمجھیں اور ان کے اوپر چلیں۔ مجھے کیا حق حاصل ہے یہ فیصلہ کر لینے کا۔ یہ چیز تھی جو میں نے کہی لیکن بہر حال اس امید کے اوپر یہ کہتا چلا جا رہا ہوں۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں، یہ قرآن کی اصطلاحات ہیں جب تک ان کو قرآنی مفہوم نہیں پہنایا جائے گا، یہ کبھی اپنے نتائج مرتب نہیں کریں گے۔ اور اگر Verdict of history (تاریخ کا فیصلہ) یہی ہے تو پھر وہ قوم تو ان کو صحیح مفہوم نہیں پہنائے گی جس نے اپنے ہاتھوں سے اس کو فرسودہ کر لیا ہے۔

عزیزانِ من! یہ آیت وہی ہے جہاں سے بات شروع کی تھی، اگلی آیت لے کر ہم درس میں آگے چلیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



چودھواں باب: **العنکبوت** (آیات 46 تا 51)



عزیزانِ من! آج جون 1979ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 46 سے ہو رہا ہے: (29:46)۔ کہا ہے کہ وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (29:46) اہلِ کتاب کے ساتھ بات کرو، وہ جھگڑا کریں تو آپ ان سے جھگڑا نہ کیجیے بلکہ بہ طریقِ احسن ان کو بات سمجھانے کی کوشش کیجیے۔

قرآنِ حکیم کے ربط کے متعلق مذہبی پیشوائیت کی سوچ

آپ کو یاد ہوگا اور یاد ہونے کی بات ہے کیونکہ میں تو اسے بار بار دہراتا رہتا ہوں۔ میں نے قرآنِ کریم کے معارف، اس کی تعلیم اور کلام کے متعلق کہا ہے کہ یہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ بے مثل و بے نظیر ہیں۔ اُس کے ساتھ ہی میں اکثر یہ کہتا رہتا ہوں کہ قرآنِ کریم میں ایک نظم و ضبط ہے، الحمد سے والناس تک ایک سِلکِ گوہر بار ہے، نہایت سلیقہ سے باہمی ربط کے ساتھ اس میں موتی پروئے ہوئے ہیں۔

اور یہی وہ چیز ہے جو ہماری مذہبی پیشوائیت کو نصیب نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں ربط اور ضبط ہے ہی نہیں۔ سمندر کی سطح کے اوپر تو آپ کو موجوں کی تلاطم خیزیاں نظر آتی ہیں' وہ بڑی عدم ہمواری کی بات ہوتی ہے' اونچ نیچ ہوتی ہے۔ ذرا گہرائی میں جا کر دیکھیے تو آپ کو نظم اور ضبط کا پتہ چلتا ہے' اس کے لیے ذرا گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے۔ اسی آیت کو لیجیے اور پہلے کی آیت کو یعنی (29:45) کو لیجیے۔ پہلے کی آیت پہ ہم نے دو درس صرف کیے تھے۔ اقامتِ صلوٰۃ اور اُس کا نتیجہ بتایا تھا کہ یہ فحشا اور منکر سے روکتی ہے۔ ذکر اللہ کے متعلق کہا تھا کہ اللہ کے سوا کبریائی کسی کو حاصل نہ ہو۔ اور اُس کے بعد یہ کہا تھا کہ یہ چیزیں' یہ الفاظ' یہ اصطلاحات تو اپنی جگہ پہ' لیکن جو کچھ تم Artificially یعنی مصنوعی طور پر یا رسمی طور پر کرتے ہو' وہ تمہارے خود ساختہ ہیں' خدا کو اس کا اچھی طرح علم ہے۔ اور اُس کے بعد اہلِ کتاب کا ذکر شروع ہو گیا۔ جو پہلے سے ہی اس مفروضے پہ چلتے ہیں کہ اس میں کوئی ربط نہیں ہے تو اُنہیں تو ربط نظر نہیں آئے گا لیکن قرآن بھیجنے والے سے پوچھو جو کہتا ہے کہ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (73:4) اس میں تو موتیوں جیسی لڑی جیسا ایک ربط ہے۔ اُس ربط کے لیے ان الفاظ کو سامنے لایئے جو میں نے پچھلے درس میں علامہ اقبالؒ (1877-1938) کے حوالے سے آپ کی خدمت میں عرض کیے تھے۔ اور میں نے کہا تھا کہ تاریخ میں یہ عظیم حقیقت ہے جو ان الفاظ میں کسی مصنف نے بیان کی ہے۔ علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے اس کا حوالہ تو نہیں دیا اور بتایا بھی نہیں کہ یہ کس کا قول ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ شاید Dickinson (ڈیکنسن) کا ہو سکتا[1] ہے۔ کسی کا بھی ہو' بات تو اس قوم کے Decay (انحطاط) کے نفسِ مضمون سے ہے جو کہی گئی ہے۔ اُسے پھر ایک دفعہ سُنیے تو آپ کو ربط کا پتہ چل جائے گا۔

ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی وجہ جواز

میں نے کہا تھا کہ صلوٰۃ کے الفاظ' ذکر کے الفاظ' صوم کے الفاظ' حج کے الفاظ' زکوٰۃ کے الفاظ' بعینہٖ ہی ہمارے ہاں ہیں لیکن صلوٰۃ' نہ تو فحشا و منکر سے روکتی ہے' نہ صوم سے خدا کی کبریائی پیدا ہوتی ہے' نہ زکوٰۃ سے عالمِ انسانیت کو نشو و نما ملتی ہے' نہ حج سے' مروجہ دلائل و براہین کی رو سے اکٹھے ہو کر آپ معاملات کو سنوارتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں موجود ہیں اور ان پہ اتنی شدت سے' اتنی کثرت سے' عمل ہو رہا ہے کہ دیگر مذاہب میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن پھر کیا ہے کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس کے نتائج وہ نہیں نکل رہے جو قرآن خود' اس کے نتائج بتا رہا ہے۔ اصطلاحات موجود ہیں' الفاظ موجود ہیں' رسوم بھی موجود ہیں مکینکلی (میکانکی طور پر) ان پہ عمل بھی ہو رہا ہے اور شدت و کثرت سے ہو رہا ہے لیکن نتائج وہ برآمد نہیں ہو رہے۔ آخر کیوں؟

---

[1] یہ نام تحقیق کا متقاضی ہے۔

اس سعی لاحاصل کے متعلق ایک اہل مغرب کی تحقیق

عزیزانِ من! اس کیوں کے جواب کے لیے اُس مفکر کے الفاظ یہ ہیں:

The verdict of history is that worn out ideas have never risen to power among a people who have worn them out[1].

آئیڈیاز' تصورات' نظریات' معتقدات' اصول میں بے پناہ قوت ہوتی ہے لیکن جو قوم ان تصورات اور نظریات کو فرسودہ کر چکی ہو' جس کے ہاتھوں ان کی توانائیاں ختم ہو چکی ہوں اور صرف شکلیں باقی رہی ہوں تو اُس قوم میں وہ نظریات دوبارہ توانائی اور زندگی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے۔ دنیا میں یہ کونسی قومیں ہیں جن کے متعلق یہ اتنا بڑا مورخ' اتنا بڑا مفکر' یوں ذکر کر رہا ہے؟ یہ دنیائے مذاہب ہے' یہ مذہب کی دنیا ہے۔

مذہب کے تفصیلی خدوخال

مذہب ہوتا کیا ہے؟ قرآنِ کریم کی رو سے خدا کی طرف سے انبیائے کرامؑ کا سلسلہ شروع سے جاری رہا' ہر قوم میں نبی آیا' ہر زمانے میں نبی آیا اور ہر ملک میں نبی آیا۔ نبی نے آکر زندگی کے کچھ تصورات دیئے' کچھ فارمولے دیئے' کچھ نظریات دیئے' کچھ اصول دیئے' کچھ قوانین دیئے اور کہا کہ ان پر چلنے کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ اُس نے چلا کے بتا دیا اور وہ نتائج برآمد کر کے بتا دیا۔ بتا دیا کہ یہ نظریات جو میں پیش کر رہا ہوں' یہ کتنی بے پناہ قوتوں کے مالک تھے۔ ایک نظریہ نے اٹھ کر ایران کی پوری مملکت کو جو ہزارہا سال سے اپنی شوکت وعظمت وتہذیب وتمدن پہ نازاں چلی آ رہی تھی' الٹ کر رکھ دیا' روما کو پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ نظریات کی قوتیں تھیں' یہ صوم وصلوٰۃ کی قوتیں تھیں۔ تاریخ آج تک اس کی گواہی دیتی ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی جو انقلاب انہوں نے پیدا کیا تھا۔ اس لیے کہ ''ذکراللہ'' کے معنی ان کو پتہ تھا کہ اس کے معنی انقلابِ خداوندی ہے۔ اور جب ''اکبر'' کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کبریائی' Sovereignty' ان کو حاصل ہوگی۔ انہوں نے بتا دیا کہ یوں حاصل ہوتی ہے۔ اُنہوں نے کہہ دیا کہ جب ہم اللہ اکبر کہتے ہیں

---

[1] Iqbal, Allama Muhammad: The Reconstruction of Religious Thought in Islam. The Principle of Movement in the Structure of Islam (PP.116-142) in M. Saeed Sheikh (Ed.&Annotated), Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1989 (P.120)

ترجمہ: ''تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو' ان کی تجدید پھر اس قوم میں نہیں ہو سکتی''۔

تو اس کا یہ مفہوم ہے کہ کبریائی اور اکبریت اور Sovereignty ، اقتدارِ مطلق، اللہ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کر کے بتا دیا۔

ایران کا گورنر پا بجولاں حضرت عمرؓ کی عدالت میں

میں تاریخ کا وہ واقعہ دہرادوں، وہ بڑا اہم ہے کہ جب حضرتِ عمرؓ (581-644/45AD) کے سامنے ایران کا وہ گورنر (ہرمزان) پابجولاں قید ہو کر آیا ہے تو آپؓ نے اُس سے پوچھا تھا کہ ذرا ایک بات تو بتایئے کہ پانچ سات پشتیں گزر گئیں، تم اور ہم دونوں ایک ہی نسل کے لوگ ہیں۔ ہمارے متعلق تمہاری کیفیت یہ تھی کہ ہم سے صلح، آشتی اور دوستی تو ایک طرف، تم تو ہمارے ساتھ لڑائی کرنا بھی اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھتے تھے، عار سمجھتے تھے۔ تم کہتے تھے کہ ان ذلیل عربوں کے ساتھ کیا ہم میدانِ جنگ میں لڑنے کے لیے جائیں؟ کہا کہ کل تم ہمارے متعلق یہ کہا کرتے تھے اور آج تمہاری کیفیت یہ ہے کہ پوری مملکت ہمارے زیرِ نگیں ہے، تم پابجولاں ہو اور تمہارا شہنشاہ جان بچانے کے لیے بھاگے بھاگے پھر رہا ہے۔ بتاؤ تو سہی کہ یہ اتنی بڑی تبدیلی ہوئی کیسے؟ اُس نے کہا کہ بات کچھ مشکل نہیں ہے، بات آسان ہے کہ پہلے جب ہم اور تم ایک دوسرے کے مقابل آیا کرتے تھے تو ایرانی عربوں کے مقابل ہوتے تھے لیکن اب یہ کیفیت ہے کہ اب ادھر سے ہم ایرانی آتے ہیں اور اُدھر سے عرب اور ان کے ساتھ ان کا خدا ہوتا ہے۔ ان دو کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

وحی کی طرف سے پیش کردہ تصورات، اعتقادات اور اصول وقوانین کی قوت اور اثرات

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ یہ خدا کس طرح سے ساتھ ہوتا ہے، وہ اتر کر تو نہیں آتا۔ یہ تھے وہ نظریات، تصورات، اعتقادات، اصول، قوانین جو اب ان کے ساتھ تھے۔ سوچیے کہ جب انہی عربوں کے ساتھ یہ نظریات آ گئے تو اس [1] نے کہا کہ ہم ایرانی تو ایک طرف رہے، دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ گویا ان نظریات میں، اس قدر توانائی اور قوت تھی، کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی مملکت بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں نبی آتے رہے، یہ نظریات دیتے رہے اور اُس پہ عمل کر کے اُس کے نتائج بتاتے رہے کہ ان میں کتنی قوت ہے۔ یہ مقصد ہے تعلیمِ خداوندی کا کہ ان کے اندر کتنی بڑی قوت ہے۔ کوئی فرعون اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکا، کوئی نمرود نہیں ٹھہر سکا، کوئی ایرانی نہیں ٹھہر سکا، کوئی رومن نہیں ٹھہر سکا۔ وہ نبی چلے جاتے تھے، اُس کے بعد ہوتا یہ تھا کہ قوم وہی ہوتی تھی، الفاظ وہی ہوتے تھے، اصطلاحات وہی ہوتے تھے، نظریات وہی ہوتے تھے، اعتقادات وہی ہوتے تھے لیکن وہ قوم اس قدر ذلیل وخوار ہوتی کہ جس کا جی چاہتا آ کر ان کو جوتے مارتا۔ یہ کیا چیز تھی جو ان میں سے گم ہو گئی تھی۔

---

[1] یہ اشارہ ہُرمزان کی طرف ہے۔

اقبالؒ (1877-1938) کے ہاں دیکھ لیجیے کہ اس مورخ نے اس کے متعلق بڑی عظیم حقیقت کہی ہے۔قرآن کے الفاظ میں وہ قوم دین کو چھوڑ کر مذہب پہ آجاتی تھی۔ دوسرا نبی آتا اور وہ آکر ان کو وہی دینِ خداوندی از سرِ نو پیش کرتا تھا جو ان کے پہلے پیغمبر نے انہیں دیا ہوتا تھا۔خدا نے کہا ہے کہ اس میں تبدیلی ہی کوئی نہیں ہوئی' یہ اٹل و ابدی قوانین تھے جو ہم دیتے چلے آرہے ہیں۔ وہ پیش کرتے تو وہ کہتے تھے کہ تم کونسی نئی چیز لے کر آئے ہو؟ یہ تو ہم بھی مانتے ہیں یعنی وہ یہ منواتے تھے کہ خدا پر ایمان' وحی پر ایمان' ان قوانین پر ایمان' قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان' حیاتِ آخرت پر ایمان ہے۔ دین کے اصول و نظریات تو پہلے نبی سے آخری نبی تک یہی تھے۔ یہ ہر نبی نے اسی طرح سے پیش کیے۔ وہ آکر یہ پیش کرتے اور یہ کہتے کہ یہ کونسی نئی بات ہے' ہم تو ان سب کو مانتے ہیں۔تو پھر ہم جس طریق پہ چلے آرہے ہیں' اُس کو چھوڑ کر ہم تمہارے ہاں کیوں چلے آئیں' تم کونسی ایسی نئی بات دے رہے ہو؟ اس میں فرق کیا تھا؟ قرآن کے الفاظ ہیں کہ اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ (53:23) یہ تمہارے ہاں صرف اصطلاحات رہ گئی ہیں جو تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑی ہیں۔ان پہ تم تَصۡنَعُوۡنَ (29:45) ہو یعنی مکینکی عمل کر کے مطمئن ہو رہے ہو اور سوچتے نہیں ہو کہ اُس نبی نے جو آکر یہ اصطلاحات یا نظریات دیئے تھے تو اُس نے کہا تھا کہ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (3:139) ہو' تم دنیا میں غالب ترین قوم بن کر رہو گے اور اُس نے تمہیں بنا کر دکھا دیا تھا۔آج تم ان سب اصطلاحات کو دہرائے چلے جا رہے ہو اور اس کے باوجود ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡكَنَةُ ق وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ [1] (2:61) اور ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا [2] (3:11) تم جہاں کہیں جاتے ہو' ذلت اور مسکنت تمہارے پیچھے سائے کی طرح چلی جاتی ہے۔ یہ کیا بات ہے جبکہ تم کہتے ہو کہ ہم وہی کچھ مانتے ہیں۔اُن کے نبی نے کہا کہ ٹھیک ہے' الفاظ وہی مانتے ہو لیکن یہ تمہارے پاس چلے ہوئے بم ہیں' چلے ہوئے کارتوس ہیں' خالی خول رہ گئے ہیں۔ میں بھی وہی دے رہا ہوں' شکل و صورت ان کی بھی وہی ہے لیکن ان کے اندر بارود بھرا ہوا ہے۔ یہ ہے دونوں میں فرق۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا شکریہ! کہیں اور جائیے اور وہاں جا کر ان کو چلائیے' ہم بالکل مطمئن ہیں۔

دنیا جہان کی کوئی بھی مذہب پرست قوم دین کی ثمر باریوں سے لطف اندوز ہی نہیں ہو سکتی

عزیزانِ من! ایک ایک لفظ توجہ سے سنیے گا' پتہ نہیں پھر موقع ملتا ہے یا نہیں۔تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب بھی ایسا نہیں

---

[1] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن میں عسکریت اور کشور کشائی کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں اور محکومیت اور تساہل انگیزی کی خصلتیں پیدا ہو گئیں۔اور اس طرح اُن پر ذلت و خواری کا عذابِ خداوندی مستولی ہو گیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔22)۔

[2] تم دیکھتے نہیں کہ یہ کس قدر ذلّت و خواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ دنیا میں ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔148)۔

ہے جس نے پھر دین کی شکل اختیار کر لی ہو۔ دنیا کا کوئی مذہب پرست طبقہ ایسا نہیں ہے جو نظریات کے الفاظ اسی طرح سے دہرائے چلا جا رہا ہو' اپنی دانست میں ان کے اوپر مکینکلی عمل بھی کرتا چلا جا رہا ہو اور وہ پھر سے ''اعلون'' (3:139) یا کبریائی کی کیفیت حاصل کر سکا ہو بلکہ وہ دن بدن گرتا چلا گیا تا آنکہ مرورِ زمانہ سے یا قوانینِ فطرت کی رو سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گھس گھس کر ختم ہو گیا لیکن دین اس کے ہاں نہیں آیا' پھر سے وہ قوتوں کا حامل نہیں بن سکا۔ ساری دنیا کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ یہ جو پہلے نبی کی امت ہوتی تھی جس کی طرف نیا نبی آتا تھا تو انہیں قرآن اہلِ کتاب کہتا ہے۔ ہر ایک کو کتاب ملتی تھی۔ یہ قرآن کی اصطلاح ہے کہ وہ لوگ جنہیں وہ کتاب ملی اور جس پہ انہوں نے عمل کیا لیکن پھر وہ اُس کے بعد مذہب پرست ہو گئے' کتاب ان کے پاس نام کی رہ گئی۔ اس لیے وہ انہیں اہلِ کتاب کہتا ہے۔ دنیا میں جو بھی نبی آیا ہے' خدا کا رسول آیا ہے' تو اُس کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مخالفت اہلِ کتاب نے کی ہے۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے کہ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ (2:41) ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا' تمہیں تو سب سے پہلے لپک کر اس کی طرف آنا چاہیے تھا جو میں تمہیں کہتا ہوں اس لیے کہ یہی تو وہ دین تھا جو تمہارے نبی کی وساطت سے تمہیں ملا تھا لیکن تم ہو کہ سب سے پہلے مخالفت کر رہے ہو۔ کسی اہلِ کتاب نے نبی کی کسی بات پہ کان نہیں دھرا' مخالفت کرتے رہے' وہ دین پہ آئے ہی نہیں۔ دین پہ آئے نہیں اور ذلتوں سے نکلے نہیں۔

سب سے زیادہ عمر رسیدہ یہودیت کے شب و روز' تاریخ کے آئینہ میں

عزیزانِ من! ساری دنیا کی قوموں کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ مٹتے ہوئے مٹ گئے لیکن ان نظریات کو دہراتے چلے گئے' پھر اُس قوم کے اندر ان نظریات نے دوبارہ توانائی حاصل نہیں کی۔ ساری دنیا کی تاریخ آپ کے سامنے ہے کہ کوئی مذہب پرست قوم اُس مذہب پہ قائم رہتے ہوئے دنیا میں عزت' فضیلت اور بلند مرتبہ حاصل کر ہی نہیں سکی۔ عمر کے اعتبار سے دیکھیے تو سب سے زیادہ سن رسیدہ مذہب یہودیت ہے' جب سے ان کا دین مذہب میں تبدیل ہوا ہے تو یہودیت کی ساری تاریخ آپ کے سامنے ہے کہ ذلت اور خواری کی زندگی بسر کیے ہوئے ہیں۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ یہ ''حبل اللہ'' پہ آجاتے تو ان کو عزت ملتی یا حبل الناس یعنی دنیا کی کوئی قوم ان کی مدد کر دے تو چار دن کے لیے جی لیں ورنہ ان کے نصیب میں زندگی نہیں آسکتی۔ یہ جو ان کی مملکت بنی ہے تو یہ وہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ان کو سہارا دیدے تو ٹھیک ہے ورنہ یہ اپنے ان فرسودہ نظریات کے زور کے اوپر پھر کبھی زندہ نہیں ہو سکتے۔ یہ سب سے بوڑھا مذہب ہے' یہ دنیا میں قریباً ختم ہو چکا ہوا ہے' محض سیاسی طور پہ ایک کمیونٹی رہ گئی ہے۔

بدھ مت، مجوسیت، جین مت اور عیسائیت کی کہانی تاریخ کے آئینہ میں

اس کے بعد بدھ مت ہے، مجوسیت ہے، جین مت ہے۔ یہ قریباً اڑھائی ہزار سال پہلے کے ہیں۔ آپ دیکھیے گا کہ ان کو دنیا میں آہستہ آہستہ کبھی وہ توانائی، عزت، فضلیت حاصل ہی نہیں ہوئی اور آج تک نہیں ہوئی۔ یہ بدھ مت والوں کی تعداد دنیا میں 1/3 ہے لیکن دنیا کے اندر ذلیل وخوار پھر رہے ہیں۔ جین مت کا تو پتہ ہی نہیں کہ کہاں چلا گیا، ان کا قصہ تو ختم ہی ہو گیا۔ مجوسیت میں کچھ چند پارسی بچے ہیں جو بمبئی میں کوئی سوڈا واٹر کی بوتل بیچتا ہے اور کوئی وائن کا ٹھیکیدار بنتا ہے۔ یہ اپنے زمانے میں کبھی عظیم دین تھے، یہ مذہب پہ آئے ہیں تو آہستہ آہستہ ایسی فرسودگی آ گئی کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہ ختم ہوتے چلے گئے۔ عیسائیت دو ہزار سال پہلے کی ہے۔ ان میں سے بھی رومن کیتھولک نے اپنے ہاں تھوڑا سا کمیونٹی کی شکل ہی سہی وہ باقی رکھی ہے لیکن دین ان کے ہاں بھی نہیں ہے۔ کہیں بھی دنیا کے رومن کیتھولک کی حکومت نہیں ہے۔ یہ جتنی بھی آپ کو عیسائی مملکتیں نظر آتی ہیں تو وہاں بھی ان کے ہاں مذہب نہیں ہے۔ مذہب کے زور پہ وہ دوبارہ وہ توانائی حاصل کر ہی نہیں سکے۔

دین کی بنیاد پر مسلم تاریخ کے روشن باب کے بعد ۱۴ سو سال سے مذہب کی پیدا کردہ تاریک رات

ان مذاہب میں جو سب سے کم عمر ہے وہ اسلام ہے جس کی عمر چودہ سو سال کی ہے اور آج ساری دنیا میں آپ دیکھیے کہ مراکو سے لے کر ملیشیا تک اس قوم کا ایک بحرِ ذخار ہے اور ان کی تعداد ایک ارب تک ہے، ان کی اپنی آزاد مملکتیں ہیں، ان کے ہاں پگھلا ہوا سونا چھلّیں مارتا ہوا، ابھر رہا ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ تاریخ بتا رہی ہے کہ جب سے دین کو چھوڑ کر انہوں نے مذہب اختیار کیا ہے تو ذرا سا کہیں کوئی ''دبکا''[1] آتا ہے تو سارے عالمِ اسلام والے کانپ اٹھتے ہیں۔ ان کے ہاں وہی نظریات موجود ہیں، صلوٰۃ موجود ہے، صوم موجود ہے، زکوٰۃ موجود ہے، حج موجود ہے، یہ سب الفاظ ان کے ہاں موجود ہیں اور اس کثرت سے دہرائے جاتے ہیں کہ کم ہی کہیں دہرائے جاتے ہونگے لیکن یہی نظریات جو ایران کے اس گورنر (ہرمزان) کی زبان میں یہ کہہ رہے تھے کہ اب تمہارے ساتھ[2] یہ شامل ہو گئے ہیں اس لیے دنیا کی کوئی طاقت تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی، تو یہ قرآن کی آیات کی تفسیر تھی جو اُس نے بیان کیا تھا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ جب تم مومن ہو تو پھر کون ہے دنیا میں جو تم پہ غالب آ جائے۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ جو غیر مسلم ہے، وہ کبھی بھی مومن پر غالب آ جائے۔ یہ کیا چیز تھی؟ تاریخ بتاتی ہے کہ ایرانیوں کے پاس تیر وتفنگ تھے اور ان کے پاس ''توپیں'' تھیں۔ اس کے برعکس اِن ''عربوں'' کے پاس تو سواریاں بھی پوری نہیں ہوا کرتی تھیں۔ پھر وہ کیوں ان عربوں کے ہاتھوں پِٹ گئے؟

---

[1] جھٹکا

[2] یہ اشارہ خدا کے قوانین واحکام کی طرف ہے۔

خالقِ کائنات کی طرف سے عطا کردہ نظریہ زندگی ایٹم سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے

عزیزانِ من! ہمیں معلوم ہی نہیں کہ ایک نظریہ کتنی قوت رکھتا ہے۔ یہ ان ایٹم والوں سے پوچھو کہ وہ ذرہ ہوتا ہے جو نظر ہی نہیں آتا لیکن پورے شہر کو توڑ دیتا ہے اور اب تو کہہ رہے ہیں کہ اُس سے پورا کرّہ ارض اڑ سکتا ہے۔ وہ سارے الفاظ ہمارے ہاں موجود ہیں' دہرایا بھی اتنا جا رہا ہے' ہم سب رو بھی رہے ہیں' کوئی دو مسلمان آپس میں ملیں تو کہتے ہیں کہ یار! اب کیا ہوگا' کیا ہمارے بچنے کی اب کوئی صورت بھی ہے' ہم سارے ایک [1] ارب کے قریب ہیں اور رو رہے ہیں جبکہ ان نظریات پہ دہرائے جانے کا عمل بھی ہو رہا ہے اور پھر عالم میں رُسوائی کیوں؟ تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ جب بھی کوئی قوم دین کو چھوڑ کر مذہب پر آ جاتی ہے تو کبھی بھی دین کی ثمر باریوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔

مذہب پرست قوم کی جذباتی کیفیت

مذہب میں' عزیزانِ من! الفاظ اور شکلوں کے اعتبار سے تو وہ نظریات اور قوانین اسی طرح سے قائم رہتے ہیں لیکن وہ اپنی توانائی کھو چکے ہوتے ہیں' وہ چلا ہوا کارتوس ہوتا ہے اور وہ اُسے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ اُس چلے ہوئے کارتوس کی حفاظت اتنا کرتے ہیں کہ اُس کے لیے اپنی جان دیدیتے ہیں۔ جب بھی کوئی انہیں آ کر یہ کہتا ہے کہ صاحب! یہ چلا ہوا کارتوس ہے تو یہ اُس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں تمہیں وہ کارتوس دیتا ہوں جس میں زندگی اور توانائی ہے۔ یہ آگے سے کہتے ہیں کہ یہ الحاد ہے' یہ بے دینی ہے' یہ کفر ہے۔ ہر نبی کے ساتھ یہی کچھ ہوا ہے۔ دلی کے فیروز باغ کا واقعہ ہے۔ ایک بوڑھا سا آدمی تھا' اُس کا ایک بیٹا تھا اور اُس کی زندگی کا سہارا تھا کہ وہ اچانک مر گیا تو اُنہوں نے دفن کر دیا۔ بوڑھا کچھ پاگل سا ہو گیا' اُس نے رات کو جا کر قبر کھودی اور اس کو نکال لیا اور اُس کی لاش کو لے کر گلے سے لپٹائے ہوئے پھر رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ جو کوئی شخص اُس کو کہتا تھا کہ بابا! یہ تو مری ہوئی لاش ہے تو وہ اُس کے پیچھے اس طرح پڑ جاتا تھا کہ جان سے مار دونگا اگر تم نے اس کو مری ہوئی لاش کہا۔ ہر مذہب پرست قوم کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب اُس کے نظریات کو یہ کہا جائے کہ یہ تو ممی شدہ لاشیں ہیں جن کو لیے پھرتے ہو' ان میں زندگی نہیں ہے تو وہ اُس کو چھرا گھونپ دیتا ہے کہ تم نے اس کو مردہ کیوں کہہ دیا۔ لہٰذا تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ جب بھی انبیائے کرام کی طرف سے دین' جس قوم کو بھی دیا گیا اور اس نے اُس پہ عمل پیرا ہو کر توانائیاں بھی حاصل کر لیں لیکن جب وہی قوم ان نظریات اور ان قوانین کی توانائیاں ضائع کر کے' اندر سے

---

[1] یہ بات جون 1979 کی 22 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

کھرچ کھرچ کے بارود نکال کے پھینک دیتی رہی تو پھر ان میں وہ توانائی نہیں آ سکی۔ میں پھر ان الفاظ کو دہرا دوں جو اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے خطبات ''تشکیلِ جدید الٰہیّاتِ اسلامیہ'' میں درج کیے ہیں:

The verdict of history is that worn out ideas have never risen to power among a people who have worn them out[1].

یہ ہے ان لوگوں کا ہسٹری کا مطالعہ۔ یہ ہے آپ کے ہاں مذہب کی تاریخ۔ یہ ہیں وہ جنہیں قرآن اہلِ کتاب کہتا ہے۔

نبی اکرمؐ کے دور میں عرب دنیا کی نظریاتی کیفیت اور ان کے ساتھ باہمی ٹکراؤ

جب نبی اکرم ﷺ نے دعوت دی تو وہاں عرب کے مشرکین ہی تھے جن کی طرف پہلے کوئی نبی نہیں آیا تھا اور ان کے پاس کتاب نہیں تھی۔ وہیں یہودی بھی تھے' وہیں عیسائی بھی تھے' وہیں مجوسی بھی تھے اور یہ اہلِ کتاب تھے۔ مخالفت اور مخاصمت ان قریش نے بھی کی اور اہلِ کتاب نے بھی کی۔ نبی اکرم ﷺ کی اس پوری زندگی میں آخر تک یہ قریش اور مشرکین' تمام کے تمام' اس مخالفت ومخاصمت میں آ گئے اور یہی ہے وہ جماعتِ مومنین جس نے پھر ایران اور روما کو الٹ کر رکھ دیا۔ کسی یہودی' کسی عیسائی' مستثنیات کو تو چھوڑ دیجیے' نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اور پھر ان قریش کا اور ان عرب کا' جو اہلِ کتاب نہیں تھے' کا تصادم ان کے ساتھ ہوا جن کے ہاں مذہب تھا۔ اور مذہب تو دین کے بالمقابل ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ چلے ہوئے کارتوس کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں! انہوں نے یہ ساری سلطنتوں کی سلطنتیں الٹ کر رکھ دیں۔ ان عرب کو ایسے نظریاتِ زندگی مل گئے تھے جن کے اندر بڑی توانائیاں تھیں۔ اور پھر ہوا یہ کہ کچھ عرصے کے بعد یہ بھی وہیں آ گئے جہاں باقی اہلِ کتاب تھے۔ دین کے نظریات کے الفاظ تو ان کے ہاں باقی رہ گئے' رسومات بھی رہ گئیں' شکلیں بھی رہ گئیں' شعائر بھی رہ گئے لیکن ان کارتوسوں کے اندر بارود باقی نہ رہا۔ انہوں نے ان سب چیزوں کو فرسودہ کر دیا' Formality perform (رسم کی ادائیگی) کرنے کا نام سمجھ لیا کہ وہ فریضہ ادا ہو گیا۔ نماز ہو گئی ہے یا تیری نماز نہیں ہوئی۔ پوچھیے کہ کیا ہوا؟ تو کہتے ہیں کہ ''تیرے گٹے ننگے نئیں سن''۔ تے فیر کی کراں؟[2] ''۔ کہتے ہیں دوبارہ سے پڑھ۔ ''پوچھیے کہ جی نہیں ہوئی سی تے کی ہویا سی' جے ہو گئی اے تے ہن کی ہویا[3]؟'' کہنے لگے کہ بس نماز ہو گئی۔

---

[1] تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو' ان کی تجدید پھر اس قوم میں نہیں ہو سکتی۔

[2] تمہارے ٹخنے ننگے نہیں تھے۔ تو پھر کیا کروں؟

[3] پوچھیے کہ جی! اگر (نماز) نہیں ہوئی تھی تو کیا ہوا؟ اگر ہو گئی تھی تو یہ پھر ہوا کیا؟

قیامت ہا کہ در قامت اوست ❶

مومن جب ''قد قامت الصلوٰۃ'' کہتا ہے تو پھر اس کے بعد دنیا کی فوجیں لرز کر رہ جاتی ہیں۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ اہلِ کتاب ہی سب سے پہلے دین کی کیوں مخالفت کرتے تھے۔ وہ اس فریب میں مبتلا ہوتے تھے کہ یہ بات وہی کہہ رہا ہے جو ہم پہلے سے کر رہے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت محض اپنی مفاد پرستی کے لیے ان کو اس فریب میں رکھتی تھی کہ اس کے نتائج وہ نکلتے ہیں لیکن وہ یہاں نہیں نکلتے بلکہ قیامت میں جا کر نکلیں گے۔ لوگ مطمئن ہو جاتے تھے اور اس پہ چلے جاتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ چلے جاتے تھے بلکہ کوشش کرتے تھے کہ اور زیادہ اس قسم کے کہیں سے کارتوس آ جائیں' برآمد کرتے تھے' فیکٹریوں میں بناتے تھے کہ زیادہ لوگ نماز پڑھیں' زیادہ لوگ حج کے اوپر جائیں۔

عزیزانِ من! اب وہ ربط ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ جو پہلی آیت تھی جس میں کہا گیا تھا کہ **اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ** (29:45) بات تو کتاب کی ہی تھی' یہ نبی بھی تو کتاب ہی لایا تھا۔ اُس کے بعد عملاً یہ تھا کہ **وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ** ❷ (29:45)۔ اس سے کیا ہوگا؟ کہا کہ **اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ** (29:45) جتنی مفاد پرستیاں' جذبات پرستیاں' خباثتیں' کدورتیں ہیں تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ سب صاف ہو جائیں گی۔ ان سے کہیے کہ وہ نماز تو ان چیزوں سے نہیں روکتی کیونکہ وہ نمازی تو نہیں رکتے یہ کہیے تو اس کے بعد آپ پر کفر کا فتویٰ لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ** (29:45 صلوٰۃ ان چیزوں سے روک دیتی ہے۔ عزیزانِ من! اُس نے یہ نہیں کہا تھا کہ نمازی رک جاتے ہیں۔ اُس نے کہا تھا کہ **وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ** (29:45) اور پھر دنیا میں خدا کے قانون کو کبریائی حاصل ہو جاتی ہے۔ **وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ** (29:45) اور اُس کے بعد جب یہی دین' یہی صلوٰۃ' یہی ''ذکر'' مذہب میں آ جاتا ہے تو پھر صرف **مَا تَصۡنَعُوۡنَ** رہ جاتا ہے' مکینکلی کچھ کرنا رہ جاتا ہے۔

عزیزانِ من! جھوم جایئے اس قرآن کے اوپر اور ربط دیکھیے۔ کہا کہ **وَ لَا تُجَادِلُوۡۤا اَہۡلَ الۡکِتٰبِ** (29:46) کتاب تو بھی پیش کر رہا ہے اور ایک یہ بھی اہلِ کتاب ہیں جو پہلے سے کتاب کے مدعی ہیں' یہ سب سے زیادہ تمہارے ساتھ جھگڑا کریں گے۔ اب ربط آپ کی سمجھ میں آ گیا۔ اب مصیبت ہمارے ہاں یہ ہو گئی کہ جب اہلِ کتاب کہیں تو پھر اہلِ کتاب وہ ہو گئے جو اُس زمانے کے یہودی' عیسائی اور مجوسی تھے یعنی ہم نہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اہلِ کتاب تو ان تمام نظریات' اعتقادات کو اسی طرح سے مانتے تھے' آج بھی مانتے

---

❶ نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز   قیامت ہا کہ در قد قامت است   (اقبالؒ: ارمغانِ حجاز)
(مومن جب اقامتِ صلوٰۃ کے لیے تکبیرِ اولیٰ میں قد قامت الصلوٰۃ کہتا ہے تو اس کے اس کہنے میں کتنی قیامتیں پوشیدہ ہیں۔ اس حقیقت کو سوزِ عشق سے ناواقف موجودہ دور کا مارا ہوا مسلمان نہیں سمجھ سکتا)۔

❷ نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔

ہیں اوران کی کتابوں میں یہ سب کچھ لکھا ہوا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہیے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو یہ سب کچھ مانتے ہیں۔یہی بات آج جب مسلمان سے کہی جائے تو وہ وہی جواب دیتا ہے جواُس دور کا یہودی اور عیسائی جواب دیتا ہے کہ ہماری طرف جو نبی آیا تھا تو تم مانتے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے نبی تھا اور جو وہ کتاب لایا تھا' وہ خدا کی طرف سے تھی اور یہی باتیں تھیں جوتم کہہ رہے ہو تو پھر تمہاری بات کیوں مانیں۔کہا کہ یہ تمہارے ساتھ مجادلہ کریں گے' جدل کریں گے۔

ملحد شخص آسانی سے قرآنی حقائق کو تسلیم لیتا ہے

عزیزانِ من! میں آپ کو اپنا تجربہ بتارہا ہوں۔میرے پاس ہمارے مذہب سے برگشتہ نوجوان بھی آتے ہیں۔وہ جرأت سے کہتے ہیں کہ یہ خدااور وحی اور یہ جو کچھ تمہاراا سلام ہے' ہم اس کو نہیں مانتے۔ان کو آپ ملحد کہہ لیجیے' بے دین کہہ لیجیے۔تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ یہ جو اس طرح سے انکار کرنے والے آتے ہیں اور مخالفت کرتے ہیں کہ ہم سرے سے مانتے ہی نہیں' تو وہ تو نہایت آسانی سے اس قرآن کی طرف آجاتے ہیں لیکن یہ جو کہتے ہیں کہ ہم سب کچھ مانتے ہیں تو ان میں سے آج تک ایک بھی قرآن کی طرف نہیں آیا۔یہ اہلِ کتاب ہیں اور وہ مشرکین عرب ہیں۔مغرب کے مفکرین' مصنفین بھی میرے پاس آتے ہیں۔یہ جو بالکل انکار کرنے والے ہوتے ہیں' تو ان سے جب میں کوئی بات کہتا ہوں تو وہ یہ نہیں کہتے کہ کیا اس سے پہلے بھی کسی نے یہ بات کہی تھی' جو میں کہتا ہوں وہ اس کو آن میرٹ (On Merit) پرکھتے ہیں' دلیل و برہان کی روسے' اُس کو پرکھتے ہیں۔جب مطمئن ہوجاتے ہیں تو قبول کرلیتے ہیں۔

مذہبی پیشوائیت کی تنگ نظری کے پیدا کردہ نتائج کا جہنم

اِن مذہب والوں سے جب بھی کوئی بات کہی تو انہوں نے یہی کہا کہ کیا اس سے پہلے بھی کسی نے یہ کہا ہے؟ یہ ہے دلیل ان کے ہاں کی اور ہر اہلِ کتاب یہی دلیل دیتا ہے۔مذہب کے اوپر جو قوم ہو'مذہبی پیشوائیت ان کو کبھی اس طرف نہیں آنے دیتی۔یہ ہیں اہلِ کتاب۔اب اُس دور کے یہودی' عیسائی' مجوسی تو اہلِ کتاب ہوئے۔ہمارے ہاں ہزار سال سے جھگڑا یہ پڑا ہوا ہے کہ ہندوؤں کو اہلِ کتاب شمار کیا جائے یا نہیں' پارسی اہلِ کتاب ہیں یا نہیں؟ یعنی ان کے متعلق یہ جھگڑا ہے اور اپنے متعلق کبھی نہیں ہوتا۔قرآن نے تو ان کے متعلق بھی کہا ہے کہ اَلَّـذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ (6:20) یہ جو انہیں ہم نے الکتٰب دی ہے' اس اعتبار سے تو یہ بھی اہلِ کتاب ہیں۔تو اب فرق کیا ہوا؟ وہ اہلِ کتاب جو دین کو چھوڑ کر مذہب پہ آ گئے تو کتاب کے مدعی وہ بھی رہے اور وہ بھی جنہیں کتاب دی گئی جنہوں نے کتاب کو دین کی حیثیت سے' منشور کی حیثیت سے لیا اور اُس پہ عمل پیرا ہوئے مگر پھر اسے چھوڑ گئے' اس منشور کو فرسودہ بنادیا۔اس پر ایک

بڑے گہرے مؤرخ مصنف [1] نے ایک بات کہی ہے کہ تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ جو قوم اپنے نہایت توانا نظریاتِ زندگی کو فرسودہ کر چکی ہو اور اُس میں توانائیاں ضائع کر چکی ہوں تو اُس قوم میں وہ نظریات دوبارہ توانائیاں حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے ان خالی کارتوسوں کے اوپر مطمئن ہوتی ہے۔ وہ تو ان کے اس مردہ بیٹے کو کوئی مردہ کہے تو وہ چھرا گھونپ دیتی ہے۔ اب فرق اتنا ہی ہے کہ پہلے جو اہلِ کتاب تھے ان کے پاس وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں نہیں ہوتی تھی' اس لیے نئے نبی کی ضرورت پڑتی تھی' وہ نیا نبی آ کر کوئی نئی بات نہیں کہتا تھا بلکہ وہی اصولی قوانین دیتا تھا جو پہلی کتاب میں دیئے گئے تھے اور وہ ان کے پاس نہیں تھی۔ اس لیے نبی کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب نبی کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ جو کتاب ہے' وہ اپنی اصلی شکل میں یہاں محفوظ ہے۔

عزیزانِ من! نبوت اور رسالت کے فرق کو سمجھ لیجیے۔ نبوت ہوتی ہے خدا کی طرف سے وحی کا ملنا' رسالت ہوتی اُس وحی کو دوسروں تک پہنچنا۔ اس اعتبار سے نبی اکرم ﷺ نبی بھی ہوئے اور رسول بھی ہوئے لیکن یہ لفظِ رسول عربی زبان میں آج بھی جتنے عرب ممالک ہیں' ان میں پیغامبر یا قاصد کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔ احتیاطاً میں نے کئی جگہ یہ کہا ہے کہ ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیے۔

آج اصفہانی کی لکھی گئی ۱۳ جلدوں پر محیط قرآنی تفسیر کہاں ہے

نبی کی سب سے زیادہ مخالفت اہلِ کتاب کی طرف سے ہوتی ہے۔ آپ ہماری تاریخ سے حیران ہونگے کہ ایسی آوازیں اٹھیں جنہوں نے خدا کی کتاب کی طرف ان اہلِ کتاب کو دعوت دی۔ آج تاریخ میں کیفیت یہ ہے کہ وہ تو خیر ایک ایک کو چن چن کر مار دیا گیا اور اُس کے بعد زیادہ تاسف یہ ہے کہ جو کچھ اُنہوں نے کہیں لکھا ہے وہ بھی نہیں ہے مثلاً اصفہانی [2] نے 13 جلدوں میں قرآن کی ایک تفسیر لکھی ہے' ان کا آج ایک ورق بھی باقی نہیں ہے۔ یہ جو اہلِ کتاب مخالفین تھے' انہوں نے اپنی کتابوں میں' اپنی تفسیروں میں' چلتے چلتے کہا ہے کہ دیکھیے ایک تو یہ بات ہے اور دوسرا ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اس کے متعلق یہ کہا ہے۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فقرہ ہیرے کی طرح چمک رہا ہوتا ہے اور یہ تھے وہ لوگ جنہوں نے خالص قرآن کی طرف دعوت دی تھی۔ یعنی وہاں جو انہوں نے ان کو گالیاں دی ہیں تو وہاں سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ ایسے لوگ تھے۔

نبی اکرمؐ کی سب سے زیادہ مخالفت اہل کتاب کی طرف سے کیوں ہوئی؟

کہا ہے کہ وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (29:46) سب سے زیادہ مخالفت ان اہلِ کتاب کی طرف

---

[1] یہ وہی مورخ ہیں' جن کا حوالہ علامہ محمد اقبالؒ (1938-1877ء) نے اپنے خطبات تشکیلِ جدیدِ الٰہیات اسلامیہ میں دیا ہے۔

[2] یہ ابومسلم اصفہانی معتزلی ہیں۔

سے ہوگی' مجادلہ ہوگا' جدل ہوگا۔ تم ان ہتھیاروں پہ نہ اترآنا۔ ان کی روش یہی ہے کہ اس مردہ لاش کو زندہ سمجھے ہوئے سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اگر تم نے اسے مردہ کہہ دیا تو یہ چھرا گھونپ دیں گے۔ کہا کہ ان اہلِ کتاب سے مجادلہ کرنا ہے تو **اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ** (29:46) بڑے ہی حسین طریق سے کرنا۔ **اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡہُمۡ** (29:46) اگر یہ سختی پہ اور تصادم پہ اترآئیں تو ٹھیک ہے پھر تو مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔ تم ان سے صرف یہی کہو کہ **وَ قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ** (29:46) ان سے کہنا کہ ہمارے ساتھ تم مخالفت کیوں کرتے ہو۔ ٹھیک ہے جو کچھ ہماری طرف نازل ہوا ہے تو ہم اُس پہ بھی ایمان لاتے ہیں اور جو تمہارے نبی کے اوپر نازل ہوا تھا ہم تو اُسے بھی صحیح مانتے ہیں کہ اُس دور میں خدا کی طرف سے یہی آیا تھا۔ تم ہماری اتنی شدت سے کیوں مخالفت کرتے ہو جبکہ ہم تو اسے بھی مانتے ہیں؟ وہ کہتے تھے کہ تم اُسے تو مانتے ہوں گے لیکن اسے نہیں مانتے جسے اب ہم مانتے ہیں۔

کسی بات کو زبانی طور پر ماننے اور اس کو عملاً تسلیم کرنے میں بنیادی فرق ہوتا ہے

کہا کہ **وَ اِلٰـہُنَا وَ اِلٰـہُکُمۡ وَاحِدٌ** (29:46) تم بھی خدا کو الٰہ مانتے ہو اور ہم بھی الٰہ مانتے ہیں تو اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے۔ تمہیں فرق بتائیں کہ کیا ہے؟ **وَّ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ** (29:46) ہم صرف اُس کو مانتے ہی نہیں ہیں بلکہ اُس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم بھی خم کرتے ہیں اور تم صرف مانتے ہو۔ مذہب میں صرف ماننا رہ جاتا ہے جس کا عملی مفہوم ہی کچھ نہیں ہوتا۔ یعنی میں خدا کو مانتا ہوں یا نہیں مانتا' صرف یہ کہہ دینے سے دونوں میں کیا فرق ہوا۔ کہا کہ **اٰمنا** ہم ان کی صداقتوں کے اوپر یقین رکھتے ہیں۔ فرق تمہارا اور ہمارا یہ ہے کہ **وَّ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ** (29:46) ہم خدا کو مانتے ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم بھی کرتے ہیں جو تم نہیں کرتے۔ **وَ کَذٰلِکَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ** (29:47) جس طرح سے پہلے انبیاء کی طرف الکتٰب نازل کی تھی' اے رسول! ہم نے تمہاری طرف بھی یہ کتاب نازل کی ہے۔ **فَالَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ** (29:47) یہ نبی اکرمؐ کے مومن ہیں' یہ ہیں حقیقت میں جو اس کے اوپر ایمان لانے والے ہیں۔ **وَ مِنۡ ہٰۤؤُلَآءِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِہٖ** (29:47) ان میں سے بھی مشرکینِ عرب وغیرہ جو ہیں جو بھی ایمان لے آئیں کیونکہ یہ تو دعوتِ عام ہے۔ **وَ مَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الۡکٰفِرُوۡنَ** (29:47) یہ ہمارے ان قوانین کے خلاف جو یہ حجت بازی کرتے ہیں' مجادلہ کرتے ہیں' سرکشی پہ اترآتے ہیں' تو یاد رکھیے کہ یہ اہلِ کتاب تو اپنے آپ کو کہتے ہیں لیکن کفر میں یہ سب سے زیادہ شدید ہیں۔ وہ جو کہا تھا کہ **وَ لَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ** (2:41) ارے بابا! تم تو سب سے پہلے اس کی مخالفت اور سرکشی نہ کرو کیونکہ تم تو کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے آنے والی چیز ہے لیکن پھر بھی سب سے زیادہ مخالفت و سرکشی اہلِ کتاب اور مذہب پرست قوم کی طرف سے ہوتی ہے۔

دین کو مذہب کی سطح پر لانے کے باعث آج یہ قوم اہل کتاب کی سطح پہ پہنچ گئی ہے

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ میں نے خود اپنے اوپر یہ ذمہ داری لی ہے' یہ کسی کی عائد کردہ نہیں ہے کہ میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآنِ خالص کی آواز پہنچاتا چلا جاؤنگا۔ پچاس برس ہوگئے ہیں' چلا ہوا ہوں' زندگی کا پتہ نہیں کہ کتنے دن باقی ہیں۔ میرا فریضہ یہ ہے کہ یہ فرق کر کے بتادوں کہ قرآن کی موجودگی میں جب دین کو مذہب بنایا ہے تو یہ قوم اہلِ کتاب کی سطح پہ آ چکی ہے۔ نئے نبی کی نہ ہی ضرورت ہے اور نہ کوئی آئے گا۔ اس کے بعد قرآنِ خالص کی جو دعوت دینے والا ہے' وہ صحیح تبلیغِ رسالت' اتباعِ نبی اکرم ﷺ میں کرتا ہے۔ اور جو قوم بھی قرآنِ خالص کے ان نظریات کو لے کر اُٹھے گی' وہ پھر وہی ہو جائے گی جو رسول اللہ ﷺ کے دور کے اہلِ قرآن[1] کی تھے۔ ابھی میں اُس آیت کی طرف آ جاتا ہوں جس میں کہا کہ وَ مَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الۡکٰفِرُوۡنَ (29:47) جو بھی اس قرآن کے مقابلے میں یہ کہے کہ ہم یہ نہیں مانتے وہ یہی چاہتے ہیں کہ قرآنی تعلیم پر پردے پڑے رہیں۔

عزیزانِ من! اہلِ کتاب کی طرف سے اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ صاحب! اصل دین تو وہی ہے جو ہمارے پاس ہے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کو کہتے تھے کہ اسؐ نے خود ہی کچھ اپنی طرف سے وضع کر لیا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ اصل دین ہے جو وحی آتی ہے۔ یہود و نصاریٰ کے جو احبار و رہبان تھے' شروع سے ان کے ہاں وہ بڑے بڑے جید عالم موجود تھے' مکے میں موجود تھے۔ کہا کہ اس شخص کے متعلق تم کہتے ہو کہ یہ بنا کر لے آتا ہے جبکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ تم تمام کے تمام مل کر اس قرآن کی آیت کی مثل بنا کر بتادو۔ اُس کا دعویٰ یہ ہے اور تم اتنے اتنے بڑے جید عالم موجود ہو اور وہ کہتا ہے کہ اور بھی دنیا میں جس جس کو اپنے ساتھ ملانا چاہو' ملا لو اور اُس کی مثل دس آیات بنا کر لے آؤ۔ اور اِس کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ وَ مَا کُنۡتَ تَتۡلُوۡا مِنۡ قَبۡلِہٖ مِنۡ کِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیۡنِکَ (29:48) اے رسول! تُو تو اس سے پیشتر نہ لکھنا جانتا تھا اور نہ پڑھنا جانتا تھا۔ ایک شخص جو نہ لکھنا جانتا ہے اور نہ پڑھنا جانتا ہے' اُس کے بعد کیفیت یہ ہے کہ اِذًا لَّارۡتَابَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ (29:48) اگر یہ کیفیت ہوتی کہ تُو بھی ان جیسا اتنا بڑا ایک عالم ہوتا یعنی عبرانی کا' عربی کا' بائبل کا اور مجوسیوں کا' تو پھر کچھ شک پیدا ہوسکتا تھا کہ صاحب! اتنا پڑھا لکھا آدمی ہے اور اُس نے کتابوں کو بھی پڑھا ہے تو وہاں سے کچھ لے آیا ہوگا۔ کہا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس نے تو تمہارے سامنے مکے میں اپنی زندگی بسر کی ہے۔ یہ تو ایک لفظ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اور یہ کتاب پیش کر رہا ہے جس کے متعلق دعویٰ یہ کر رہا ہے کہ جاؤ' دنیا کے سارے اہلِ نظر مل جاؤ اور اس کی کسی ایک سورۃ کے مطابق کوئی ایک آیت ہی بنا کر دکھا دو۔

---

[1] یعنی قرآنِ کریم کے قوانین' احکامات' اقدار' آئیڈیاز (Ideas) نظریات کے مطابق عمل کرنے والی تھی۔

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک ضمنی بات کر دوں۔ ہمارے ہاں یہ مشہور ہے کہ نبی اکرم ﷺ ساری عمر اَن پڑھ (Unlettered) رہے۔ مجھے تاریخ سے دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے۔قرآن تو اُس خدا کی کتاب ہے جو علیم وخبیر ہے اور اُسے قیامت تک پتہ تھا کہ انہوں نے کیا کیا افسانوی چیزیں اس طرح وضع کرنی ہیں اور آپؐ سے منسوب کر دینی ہیں۔آپ سوچیے کہ اتنی جلیل القدر ہستی' اتنی بڑی مملکت کا سربراہ جس کے ساری دنیا سے معاملات پڑ رہے ہیں' اس کی کیفیت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں نبی اکرم ﷺ کی انتہائی دعا یہ ہے کہ **رب زدنی علما** (20:114) یااللہ! میرے علم میں اضافہ کر دے۔وہ خدا سے علم میں اضافے کی دعائیں مانگ رہا ہے اور ہمارے سامنے یہ حدیثیں بھی پیش ہوتی ہیں کہ تحصیلِ علم کرو' علم کی تلاش میں نکلو خواہ تمہیں چین تک جانا پڑے۔جو شخص مکے اور مدینے میں بیٹھا ہوا یہ کہہ رہا ہے' کیا پھر وہ اَن پڑھ کا اَن پڑھ ہی رہے گا؟ یعنی تعلیمِ بالغاں یہاں تو ممکن ہے تو کیا وہاں اتنا بھی نہیں تھا؟ یہودیوں نے جب ایک مسئلے کے متعلق کہا کہ ہماری تورات میں یوں لکھا ہے تو آپؐ نے کہا کہ اس کی تو ہمیں خود تصدیق کرنا چاہیے۔حضرتِ زیدؓ سے آپؐ نے کہا کہ ذرا عبرانی تو سیکھ لو۔تو ایک ہفتے کے اندر اندر اُنہوں نے عبرانی سیکھ کر بائبل سے Quote (اقوال نقل) کر کے بتا دیا۔ یعنی جس کی کیفیت یہ تھی تو کیا وہ اُس کے بعد باقی عمر بھی اَن پڑھ کے اَن پڑھ ہی رہے تھے؟

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ مجھے ہسٹری میں تو جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے وہ تو کتاب خود کہہ رہی ہے کہ **وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ** (29:48) نبوت سے پہلے تیری یہ کیفیت تھی کہ تُو نہ لکھنا جانتا تھا اور نہ پڑھنا جانتا تھا۔یہ تو نہیں تھا کہ نبوت کے بعد بھی کیفیت یہی رہی ہو کہ اَن پڑھ کے اسی عمر میں اَن پڑھ ہی رہیں۔اُس سے پہلے کی صورت تو ان کے اپنے بس کی بات نہیں تھی کہ ماں باپ کسی کو نہ پڑھائیں اور ماں باپ تو ان کے تھے ہی نہیں۔ماحول ایسا تھا کہ سارے مکے میں سترہ آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔اور یہی چیز قرآن نے ایک دلیل کی حیثیت سے دی ہے کہ اگر کوئی لکھا پڑھا عالم ہوتا تو یہی تیرے خلاف دلیل ہو جاتی' یہ بھی عجیب چیز ہوئی ہے کہ تُو اَن پڑھ رہا ہے تو یہ دلیل نہیں دے سکتے۔قران کریم نے **مِنْ قَبْلِهٖ** (29:48) کہہ کر یہ کہہ دیا کہ اُس کے بعد یہ کیفیت نہیں رہی۔یاد رکھیے گا! یہ بات نہیں ہے کہ حضور ﷺ ساری عمر اَن پڑھ کے اَن پڑھ ہی رہے تھے [1]۔

قرآنِ حکیم کے حقائق انسان کی کٹ حجتیوں سے بہت بلند ہیں

یہ تو ہوئی قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی ایک خارجی شہادت۔اب قرآن اس کی داخلی شہادت کی ایک چیز اس کی تعلیم دے رہا ہے۔کہتا ہے کہ **بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ** (29:49)۔قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ علم پر مبنی ہے۔

---

[1] اس سے ظاہر ہے کہ قرآن نازل ہونے کے بعد' حضورؐ لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تھے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔922 کا فٹ نوٹ 1)۔

کٹ حجتیاں چھوڑ دیجیے' مذہبی پیشوائیت کی اسلاف پرستی کو چھوڑ دیجیے' ملوکیت اور سرمایہ داری کی مفاد پرستی کو چھوڑ دیجیے' جذبات کا اتباع کرنے والوں کو چھوڑ دیجیے۔قرآن کہتا ہے کہ یہ آیات تو اتنی بینات ہیں کہ جب تُو پیش کرتا ہے تو جن کے سینے میں علم ہے' وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو پہلے سے ہی کچھ معلوم تھا کہ کچھ بات ہے' اُنہیں یہ چیز بیگانہ اور اجنبی نظر ہی نہیں آتی بلکہ مانوس نظر آتی ہے۔اس کے ثبوت میں فرانس کے اُس ڈاکٹر مورس بکائے کی کتاب [1] کا' میں نے دو درسوں میں ذکر کیا تھا۔اس حوالے سے غالب (مرزا اسداللہ خاں) یاد آیا۔کیا بات ہے غالب (1797-1869) کی!

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ مورس بکائے (Maurice Bucaille) نے اپنی بائبل سے برگشتہ ہو کر یہ چیز کہی کہ ایک یہ قرآن بھی کتاب ہے کہ اس میں بعض چیزیں Translation (ترجمے) کی رو سے جو میں دیکھتا ہوں تو مجھے اُس میں چمک نظر آتی ہے۔میں نے کہا کہ دیکھوں تو سہی کہ اس کتاب میں ہے کیا؟ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ ۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (29:49) العلم سے کام لینے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ اگر تم یہ پیش کرو تو وہ یوں محسوس کریں گے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔کہا کہ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (29:49) کٹ حجتیاں تو وہ کرتے ہیں جو اُس چیز کو اُس مقام پہ رکھتے نہیں ہیں۔علم کی بارگاہ سے پوچھو تو وہ اس کے حق میں فتویٰ دیدیگا۔اربابِ علم تو محسوس کرتے ہیں کہ یہ بھی میرے دل میں ہے۔مذہب پرست قوم کبھی بھی العلم پہ نہیں آتی' کبھی بھی علمی دلیل پہ نہیں آتی بلکہ ان کے ہاں تو یہ ہوتا ہے کہ اسلاف نے کیا کہا' ہمارے ہاں کیا مانا جاتا ہے۔العلم کو معیار وہ قوم بنائے گی جو پہلے سے مذہب پرست نہ ہو۔اور وہیں یہ قرآن پھر سے نشاۃِ ثانیہ حاصل کر سکے گا۔قرآن کے یہ نظریات اور یہ اصول اور قوانین اُس قوم کے اندر پھر سے توانائی حاصل کریں گے جو العلم کو معیار بنائیں گے۔قرآن نے کہا کہ تُو تو اس چیز کے سوچنے کا' پرکھنے کا' ماننے کا معیار' العلم کو بنا رہا ہے لیکن مذہب والوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ تو مذہب میں بڑے Superstitious (توہم پرست) ہو جاتے ہیں۔مذہب میں' بڑی توہم پرستی ہو جاتی ہے' مگر تُو العلم پیش کرتا ہے۔

---

[1] یہ کتاب اب پاکستان میں بھی چھپ چکی ہے۔اس کا حوالہ یہ ہے:

Bucaille, Maurice (1998). The Bible, The Qur'an And Science. Lahore: Islamic Book Service.

مذہب پرست قوم عقل وشعور کے بالمقابل معجزوں کا مطالبہ کرتی ہے

یہ کہتے ہیں کہ وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (29:50) تُو معجزہ کیوں نہیں دکھاتا؟ کہا کہ معجزہ کا علم سے کیا تعلق! معجزہ تو وہ ہوتا ہے جو علم کی نفی کرتا ہے۔ العلم تو یہ کہتا ہے کہ سنکھیا کھانے سے موت ہو جاتی ہے۔ معجزہ یہ کہتا ہے کہ جتنا جی چاہے پھانک لیجئے' دیکھیے ہماری کرامات ہیں کہ کچھ نہیں ہوتا۔ معجزے کے تو معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ جہاں عقل اور علم عاجز آ جائیں' جہاں یہ ہو تو اُسے معجزہ کہتے ہیں۔

کائنات کا ایک ایک ذرہ' نباتات کی ایک ایک پتی' انسانی جسم کا ایک ایک حصہ' بذاتِ خود ایک عظیم معجزہ ہے

قرآن کہتا ہے کہ تُو العلم کے متعلق باتیں کرتا ہے تو کیا مذہب پرست قوم العلم پہ آ جائے گی؟ مذہب پرست قوم تو ہمیشہ معجزات اور کرامات مانگتی ہے۔ وہ تو ان کے ہاں ایک نبی آتا تھا لیکن اب تو انہوں نے قدم قدم کے اوپر نبی بنالیا ہے جو کرامات دکھاتا ہے۔ وہ تو پھر بھی زندہ ہے لیکن یہ تو پتھروں کے نیچے دفن ہیں اور پھر بھی کرامات دکھاتے ہیں۔ حضرت صاحب کے مزار پہ گئے اور دعا مانگی اور کہا کہ یہ کچھ ہو گیا۔ مذہب پرست قوم کی ذہنی سطح تو یہاں تک ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تُو اس قوم کے سامنے جا کر علم کی باتیں کرتا ہے جو کہتی ہے کہ بالوں میں سے دودھ نکال کر دکھاؤ۔ کہتا ہے کہ تم معجزہ چاہتے ہو!! کہا کہ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (29:50) ذرا اس کارگہہ کائنات کے اوپر نگاہ دوڑاؤ تو دیکھو کہ ایک ایک پتی خدا کا معجزہ ہے۔ ذرا ایک پتی کے برابر پتی بنا کر دکھاؤ' ذرا ایک مکھی کے برابر مکھی بنا کر دکھاؤ۔ یہ عظیم الشان کائنات خدا کا معجزہ ہے' صرف عِنْدَ اللّٰهِ ہے۔ نبی تو تمہیں دعوتِ حیات دیتا ہے' زندگی بخش پیغام دیتا ہے' تمہیں اُس پہ عمل کرنا ہے' علم اور عقل کی رو سے پرکھ کر اُس کو تسلیم کرنا ہے جبکہ تم یہ کہتے ہو کہ معجزے کے ذریعے یہ کچھ کرو۔ سُنو اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (29:50) کائنات میں معجزات بکھرے ہوئے ہیں' جاؤ اور وہاں دیکھو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہی کہتا ہوں کہ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (29:50) او بابا! میں تو تمہیں یہ کہتا ہوں کہ تم اندھے ہو' جا رہے ہو' آگے کنواں ہے' اس میں گر جاؤ گے جبکہ تم اس کے جواب میں یہ کہتے ہو کہ تم ہمیں اپنے منہ سے آگ نکال کر دکھاؤ تو پھر ہم مانیں گے کہ ہم گر جائیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ کیا دونوں میں کوئی ربط ہے؟ کہا کہ جب نہیں مانتے تو پھر دھڑام سے گر جاتے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (29:50) اندھو! آگے کنواں ہے اس میں گر جاؤ گے۔ میں تمہیں اس سے آگاہ کر رہا ہوں۔

خدائے حکیم نے نبی اکرمؐ کی طرف صرف کتاب نازل کی

عزیزانِ من! اب آئی وہ بات کہ دین آتا ہے تو خدا کی کتاب لے کر نبی آتا ہے' صرف خدا کی کتاب لے کر آتا ہے اُس کے یہ

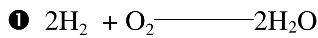
مخالفین کہتے ہیں کہ تُو اس کی دعوت دیتا ہے یا یہ نظام دیتا ہے تو ہماری خاطر اس کے اندر کچھ تھوڑی سی ترمیم کر دے۔ جواب یہ ملتا ہے کہ بابا اگر یہ میری کتاب ہوتی' میرے نظریات ہوتے یا میں نے کچھ وضع کیا ہوتا تو تمہاری خاطر کچھ Compromise (مفاہمت) بھی کر لیتا۔ او بابا! یہ تو خدا کی طرف سے ملی ہوئی کتاب ہے' میں تو اس میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں کر سکتا' میں اس کے اندر کیا کروں؟ تو نبی وحی خالص پیش کرتا تھا اور کہتا یہ تھا کہ میں صرف تمہیں ہی آگاہ نہیں کرتا بلکہ میری اپنی کیفیت یہ ہے کہ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی اس کے نتیجے سے نہیں بچ سکتا۔ خارج سے جو علم آیا ہوا ہوتا ہے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ لیبارٹری میں بیٹھا ہوا سائنٹسٹ بھی اگر اپنے ہاں اُس کے ذرا خلاف کچھ کرتا ہے تو سب سے پہلے تو اُس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ خارج کا نظریہ اور قانون کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ نبی ہمیشہ وحی خالص پیش کرتا ہے' اپنی طرف سے اُس میں ایک لفظ تک نہیں ملاتا۔ وحی اُس کتاب کے اندر محفوظ ہوتی ہے' مندرج ہوتی ہے' اُس سے باہر ایک لفظ نہیں ہوتا۔

معجزات کی دنیا عقل کا ساتھ دے ہی نہیں سکتی

وہ اپنی طرف سے ایک لفظ نہیں کہتا اور نہ ہی وہ اپنے دعوے کی دلیل میں اس قسم کے معجزے اور کرامتیں پیش کر کے ان کی عقل کو ماؤف کرتا ہے۔ کرامت دیکھ کر جو مانا جائے تو وہ بات تو عقل کو ماؤف کر دیتی ہے۔ کہا کہ میں تو قرآن پیش کرتا ہوں۔ اَوَ لَمۡ یَکۡفِهِمۡ اَنَّـآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَرَحۡمَةً وَّ ذِکۡرٰی لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (29:51) کیا یہ ان کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم نے اس قسم کی کتاب نازل کر دی ہے۔ دین میں خدا کی کتاب کافی ہوتی ہے' اُس کے ساتھ کسی چیز کے ملانے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ وہ ملاؤ تو شرک ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم اپنے پیش کردہ فارمولے میں انسانی عقل کو شامل ہی نہیں کرتا

سائنس کے کسی فارمولے کے ساتھ کچھ اور ملا کر بتایئے تو آپ وہ چیز کبھی نہیں بنا سکیں گے جو وہ فارمولا کہتا تھا کہ میں بناؤں گا۔ پانی کا قطرہ' ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایک خاص Proportion (تناسب) کے ملنے [1] کا نام ہے۔ اگر آپ اُس کے ساتھ کاربن ڈائی آکسائیڈ ملا دیں گے تو آپ کبھی بھی پانی کا قطرہ نہیں بنا سکیں گے۔ ملانا تو ایک طرف رہا' آپ اُس کا Proportion (تناسب) بگاڑ کر بھی پانی نہیں بنا سکتے۔ یہ نظریئے اور یہ فارمولے خالص ہوتے ہیں۔ اُس میں کچھ ملا تو وہ شرک ہوتا ہے۔ شرک یہ ہوتا ہے کہ وہ سائنسدان اپنے فارمولے میں کچھ ملا لے تو جو کچھ اُس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ نہیں نکلتا۔ نبی وحیٔ خالص پیش کرتا ہے' وہی وحی خالص خدا کی



[1] $2H_2 + O_2 \longrightarrow 2H_2O$

کتاب کے اندر درج ہوتی ہے' ایک بھی لفظ اُس سے باہر نہیں ہوتا' ایک لفظ کا اُس میں اضافہ نہیں ہوتا' تحریف نہیں ہوتی' کسی قسم کا اُس میں ناسخ و منسوخ نہیں ہوتا۔ اور اس میں تو کہہ دیا گیا ہے کہ **تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا** (6:115) وہ کتاب مکمل ہوتی ہے' **لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (10:64) اُس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ عزیزانِ من! پختہ فارمولے کی تو یہی Definition (تعریف) ہونی چاہیے: وہ فارمولا فی ذاتہٖ مکمل ہو' اُس میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکے۔ منسوخ کے معنی یہ ہیں کہ وہ فارمولا تو ہو لیکن اُس کا وہ نتیجہ پیدا نہ ہو یعنی خالی کارتوس ہو۔

قرآنِ حکیم کی کوئی آیت کبھی منسوخ نہیں ہوئی اور نہ ہی ہوگی

ان کے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ قرآن میں پانچ سو آیات ایسی ہیں جو قرآن میں رکھی ہوئی تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ جو Worn out ideas (فرسودہ خیالات) ہیں وہ اس قوم میں پھر سے توانائیاں حاصل کر لیں گے؟ **اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ**[1] (29:51) اسی کے اندر سارا سامانِ نشوونما ہے لیکن **لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ** کے لیے ہے جو اس کے خود مکتفی ہونے پر ایمان رکھے کہ یہ کتاب کافی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن نے کہاں ایمان کہا ہے۔

ہمارے دارالعلوموں میں فارغ التحصیل علما کی دستارِ فضیلت کا ماجرا

اس پہ ایمان لایئے کہ یہ فارمولا فی ذاتہٖ مکمل ہے' خود مکتفی ہے' محفوظ ہے' غیر متبدل ہے۔ اس پہ ایمان لایئے تو یہ سب کچھ اُس کو مل جائے گا۔ مذہب پرست قوم والے خدا کی کتاب کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے اس لیے یہ تو انہوں نے نہیں کیا۔ کتاب کو تو صرف ثواب حاصل کرنے کے لیے' شبینے پڑھنے کے لیے' ناظرہ دہرانے کے لیے' مُردوں کو بخشنے کے لیے رکھا لیکن جہاں تک اپنی زندگی کا تعلق ہے تو یہ آپ کے ہاں جو دارالعلوم ہیں' یہاں دس دس سال کے بعد فارغ التحصیل ہو کر عالم ہونے کی دستارِ فضیلت سے ان کا سرِ مبارک مزین ہوتا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ان میں اٹھارہ علوم دس سال تک پڑھائے جاتے ہیں' لیکن ان کے نصاب میں قرآن شریف داخل نہیں۔ آخری سال میں صرف سورۃ البقرہ کی ایک بیضاوی کی تفسیر ہے تو اُس کو یونہی ذرا ساتبرکاً پڑھا دیا جاتا ہے۔ قرآن تو یہ کہتا تھا کہ ان سے

---

[1] ان سے کہو کہ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ خدا نے' میری وساطت سے' تمہاری طرف اس قسم کا ضابطۂ زندگی بھیجا ہے۔ جو لوگ اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں گے' ان کے لیے اس میں سامانِ رحمت و ربوبیت ہوگا' اور شاہراہِ حیات کے ہر موڑ پر اس امر کی یاددہانی کہ انہیں کس طرف جانا چاہیے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔923)۔

پوچھو کہ کیا یہ کافی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کہتے ہیں کہ کافی نہیں ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس میں ہے ہی کچھ نہیں' بات تو ساری اٹھارہ علوم میں ہے جو ہم پڑھاتے ہیں۔ آپ کی فقہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ ان کے ہاں یہ اٹھارہ علوم ہیں: علمِ کلام' علمِ منطق' علمِ نحو وغیرہ وغیرہ لیکن اُس میں قرآن نہیں ہے جبکہ قرآن کہتا ہے کہ **اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ** (29:51) کیا یہ ان کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ چھاتی پہ ہاتھ مار کر کہتے ہیں کہ بالکل یہ کافی نہیں ہے۔ کافی کیا!!! یہ تو کہتے ہیں کہ یہ تو ہے ہی کچھ نہیں۔

عزیزانِ من! میں آپ کو سب سے بڑا جرم بتاؤں۔ تاریخ بتاتی ہے اور یہ تواریخ کی کتابوں میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے جو آخری قریب کے دن تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ قلم دوات لائیے' پھر اُس کے بعد آپ ◆ پہ بیہوشی طاری ہوگئی۔ حضرتِ عمرؓ (581-644/45AD) نے کہا کہ اس میں کچھ کرنے کی بات نہیں ہے' **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهُ** اللہ کی کتاب ہمارے پاس ہے اور وہ ضابطہء زندگی ہمارے لیے کافی ہے۔ یہ **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهُ** کا ایک ٹکڑا ان کتب تاریخ کے اندر آ گیا اور پتہ نہیں کیسے اس کے اندر آ گیا۔ میں ساری تاریخ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ میں نے اِس دور کے اندر قرآن کی اس آیت کو لیا کہ **اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ** (29:51) اور کہا کہ اس کی پوری تفسیر ہمیں حضرتِ عمرؓ کے اس عمل میں ملتی ہے جو آپؓ نے فرمایا تھا **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهُ** آپ حیران ہونگے کہ میرے متعلق یہ فتویٰ ہے' کہا گیا ہے کہ یہ شخص جو **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهُ** کہتا ہے یہ کفر ہے' یعنی **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهُ** کہنا کفر ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ انہوں نے کفر کا فتویٰ لگایا۔ ایک شیعہ مجتہد نے کتاب لکھی۔ اُنہوں نے ان کو پکڑا اور کہا کہ اس شخص کو کافر جو کہتے ہو کہ جو **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهُ** کہتا ہے تو اُس سرچشمے کی طرف جاؤ جہاں سے یہ **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهُ** کی بات نکلی تھی۔ یہ اُس نے بڑی ٹھیک بات کہی ہے کہ اس کا کیا جرم ہے' اُدھر ان کو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہو اور اِدھر اِس پہ کفر کا فتویٰ لگاتے ہو۔

قرآنی حقائق کو مسخ کرنے کی جسارت

قرآن کہتا ہے کہ **اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ** (29:51) کیا ان کے لیے خدا کی کتاب کافی نہیں ہے؟ کافی نہیں کے سلسلہ میں درمیان میں ذرا کچھ لطیفہ بھی ہونا چاہیے۔ نبی اکرمؐ کی ایک حدیث ہے' حضورؐ نے فرمایا کہ **مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَيْسَ مِنَّا** جس شخص کو قرآن اور چیزوں سے مستغنی نہیں کر دیتا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یہ حدیث قرآن کی اس آیت کی تفسیر ہے۔ پھر ہماری شامت آئی۔ عربی زبان میں یہ Root (مادہ) میں غنٰی غ کے زبر کے ساتھ ہو تو اُس کے معنی مستغنی کر

دینے کے ہیں اوران کے ہاں غ کے زیر سے جو غِنٰی ہے وہ گانے کو کہتے ہیں' آپ نے لفظ مغنی سنا ہوگا۔ تو اس حدیث کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ جو قرآن گا کرنہیں پڑھتا' وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دین جب مذہب بن جاتا ہے تو پھر اُس میں کیا تماشے ہوتے ہیں' یہ **اَوَ لَمۡ یَکۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ** (29:51) کا ترجمہ ہورہا ہے' **حَسۡبُنَا کِتَبَ اللّٰهُ** کے خلاف کفر کے فتوے لگ رہے ہیں' یہ حدیث جو گوہرِ تابدار ہے اور قرآن کی تفسیر ہے' اُس کو یہ معنی پہنائے جارہے ہیں۔ اُس شخص کے الفاظ پھر دہرا دوں کہ

The verdict of history is that worn out ideas have never risen to power among a people who have worn them out.[1]

جو قوم غنٰی کے معنی یہ کرلے کہ "جو گا کرنہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے"، تو تم ان سے کیا توقع کرتے ہو۔ **اَوَ لَمۡ یَکۡفِهِمۡ** (29:51) کہا تھا۔ تو اب اس کے لیے دلیل کونسی ہے؟ کہتا ہے کہ دلیل مانگتے ہو۔ سنو **قُلۡ کَفٰی بِاللّٰهِ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ** (29:52) باہر سے کسی کو بطور منصف لانے کی ضرورت ہی نہیں ہے' رسول کہتا ہے کہ تمہارے اور میرے درمیان مقابلے میں اللہ آتا ہے اور میری طرف سے وہ کافی ہے۔ میرے سامنے آؤ تو سہی تو میں بتاؤنگا کہ اللہ کیسے کافی ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ العنکبوت کی آیت 51 تک آگئے' 52 سے پھر لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط



---

[1] تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کردیا ہؤان کی تجدید پھر اس قوم میں نہیں ہوسکتی۔

پندرھواں باب: **العنکبوت** (آیات 52 تا 55)



عزیزانِ من! آج جون 1979ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 52 سے ہو رہا ہے: (29:52) لیکن اس سے پہلی آیت جو سابقہ درس کے آخر میں ہمارے زیرِ تبصرہ آئی تھی وہ ایسی اہم ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اُس پر مزید گفتگو کی ضرورت ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ایک درس میں یہ کہا تھا اور نہ بھی کہتا تو آپ کو معلوم ہے کہ جس مقام پہ کسی گاڑی کا کانٹا بدلا جاتا ہے وہ بڑا اہم مقام ہوتا ہے۔ وہیں سے پتہ چلتا ہے کہ گاڑی نے جانا کس پٹڑی پہ تھا اور یہ کس پٹڑی پہ چل پڑی۔ اگر آپ نے اُس گاڑی کو اُس کی صحیح منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے' اُس کے Destination (منزل) تک لے جانا ہے تو آپ کو اُسے پھر اُس کانٹے والے مقام پہ لانا ہوگا اور وہاں سے صحیح پٹڑی پر ڈالنا ہوگا۔ اس کے سوا اُس کے اصلی صحیح Destination (منزل) تک پہنچنے کی' کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر آپ اُس کو اور تقویت دیتے جائیں گے' اور کوئلہ ڈالتے جائیں گے' اور پانی بھرتے چلے جائیں گے' جتنا تیز کرتے چلے جائیں وہ اپنی منزل سے اتنا ہی دور ہوتی چلی جائے گی۔ یہ مسلمہ بات ہوگئی' اس کے لیے کسی ارسطو(384-322BC) کی منطق کی ضرورت نہیں ہے یہ تو سیدھی سی بات ہے۔

مذہب ایک انفرادی چیز ہے جبکہ دین اجتماعیت کے بغیر تشکیل ہی نہیں پاتا

یہ جو آیت (29:51) ہے' یہ ہے جہاں سے وہ کانٹا بدلا گیا ہے اور جب تک اسے اچھی طرح سے نہ سمجھ لیا جائے' آپ اُس مقام پہ واپس نہیں آ سکتے اگر واپس آنا چاہیں بھی۔ یہاں سے دین کی گاڑی دوسری پٹڑی پہ جا کر پڑ گئی اور ہزار بارہ سو سال سے اُسی پٹڑی پہ چلی جارہی ہے۔ مذہب انفرادی چیز ہوتی ہے' ہر Individual (فرد) کا اپنا اپنا ہوتا ہے۔ کسی نے رام کو بھگت بنا لیا' کسی نے کرشن کو' کسی نے شیو جی کی پوجا کر لی' کسی نے وشنو پوجا کر لی' کسی نے پراونوں کو مان لیا' کسی نے وید کو مان لیا۔ وہ اُتنے حصے تک ہے کہ جہاں تک وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے ایشور پرماتما سے اپنا کوئی تعلق قائم کر لیا ہے اور وہ صرف ذہنی چیز ہوتی ہے۔ اُس کے بعد پھر زندگی کے معاملات سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن دین تو ایک اجتماعی ہیئت انسانیہ کا نام ہے: چھوٹے پیمانے پر ایک جماعت' ایک پارٹی' ذرا وسیع پیمانے پر اُسی کو ایک امت کہا۔ یہ تو ساری اجتماعیت ہے اور اُس کے لیے اپنی آزاد مملکت کا ہونا لازمی قرار دیا۔ تو یہ بھی اجتماعی چیز ہے۔ جماعت ہو' پارٹی ہو' استخلاف فی الارض ہو یعنی مملکت ہو تو اُس میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اُس میں فائنل اتھارٹی ایک ہونی چاہیے۔ جماعت کا ایک منشور' پارٹی کا ایک منشور' ایک ضابطہ ہو۔ اگر مملکت ہے تو اُس کا ایک ہی ضابطہء قانون' ایک ہی آئین ہو۔ جہاں وہ ایک سے زیادہ ہوئے تو پہلے انتشار' پھر افتراق' پھر اختلاف' پھر زوال' پھر سکوت اور پھر ختم۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ اسلام مذہب نہیں' یہ تو دین ہے' اس کی تو بنیاد ہی ہیئت اجتماعیہ سے ہوتی ہے۔ یہ جو کسی ایک ہیئت اجتماعیہ کو مجتمع رکھنے کی' برقرار رکھنے کی بنیادی چیز ہے وہ یہ ہے کہ اُس میں فائنل اتھارٹی ایک ہوگی۔

دین کے قیام کی شرط اوّل یہ ہے کہ یہاں فیصلے قرآن کے مطابق ہوں گے

اور یہی چیز ہے جس پہ قرآن نے زور دیا ہے۔ سارے قرآن میں آپ شروع سے آخر تک دیکھ لیجیے خواہ وہ امت سے کہا گیا ہو' وہ مملکت سے کہا گیا ہو' خود رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہو تو کہا یہی گیا ہے کہ **وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ** (5:44) کفر اور ایمان میں مابہ الامتیاز یہ چیز ہے کہ اگر قرآن کے مطابق فیصلے کیے جائیں تو اسلام ہے اور اگر اس سے الگ فیصلے کیے جائیں تو اسلام نہیں ہے۔ گویا فائنل اتھارٹی کو قرآنِ کریم نے متعین کر دیا۔ یہ جو اتھارٹی ہے اُس کے متعلق خود ہی کہہ دیا کہ **وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ** (6:115) یہ ضابطہء قانون صدق وعدل کے ساتھ مکمل ہو گیا ہے' اس میں تبدیلی بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ مکمل ہے' غیر متبدل ہے اور یہ کہہ دیا کہ ہم نے اسے نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ مکمل' غیر متبدل' محفوظ ضابطہء قانون اور فائنل اتھارٹی ایک ہی ہے' اس کے ساتھ دوسرا کوئی نہیں ہے۔ یہ تھی وہ آیت جو ہم نے

پچھلے درس میں لی تھی۔ جسے بڑی تحدی کہتے ہیں یہ ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ **اَوَ لَمۡ یَکۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ** (29:51) کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے ان کی طرف یہ ایک الکتاب نازل کر دی ہے اور جو خفیہ نہیں رکھی جاتی' پوشیدہ نہیں رکھی جاتی' اس میں کوئی Secrecy (راز) نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **یُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ** (29:51) ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے' انہیں دی جاتی ہے۔ رسولؐ سے کہا کہ **یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ** (2:129) تم اس کتاب کی تعلیم دیتے ہو' اس کی حکمت کو سمجھاتے ہو۔ تو گویا کتاب ہے' حکمِ دین ہے' رسولؐ کو یہ حکم ہے کہ تعلیم بھی دو۔ امت سے کہا گیا' نوعِ انسانی سے کہا گیا کیونکہ یہ ذکر للعٰلمین ہے لیکن ایک ہی ہے۔

ملتِ اسلامیہ کا منشور قرآنِ حکیم کے سوا کوئی اور نہیں

عزیزانِ من! یہ بڑی اہم آیت ہے۔ کہا ہے کہ **اَوَ لَمۡ یَکۡفِهِمۡ** (29:51) کیا یہ ان کے لیے کافی نہیں ہے؟ ابھی یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ قرآن نے اس انداز میں یہ بات کیوں کہی ہے کہ کیا یہ کافی نہیں ہے؟ جب تک امت کا یہ ایمان رہا اور اس ایمان پر یہ عمل پیرا رہی کہ یہ خدا کی کتاب ہمارے لیے ضابطہءحیات ہونے کے لیے کافی ہے' یہی ہماری پارٹی کا منشور ہے' یہی ہماری امت کے لیے ضابطہءحیات ہے' یہی ہماری حکومت کا آئین بھی ہے اور ضابطہءقوانین بھی ہے' تو دین اپنی اصلی شکل پہ رہا' ان کی اجتماعیت بھی قائم رہی اور اس میں کوئی تفرقہ بھی پیدا نہیں ہوا۔ قرآن نے اسی لیے تفرقہ کو شرک کہا ہے۔ شرک کے معنی ہیں کہ ایک سے زیادہ اتھارٹی کو ماننا۔ جسے اب ہم نہایت آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ اسلام میں مختلف فرقے ہیں۔ ہم کبھی سوچتے ہی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ - مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ** (30:31-32) دیکھنا کہیں تم مشرکوں میں سے نہ ہو جانا یعنی اپنے اندر فرقے نہ پیدا کر لینا۔ یہ بات تو سیدھی سی ہے کہ ایک سنٹرل اتھارٹی ہوگی تو جماعت قائم رہے گی' امت قائم رہے گی' مملکت قائم رہے گی' نظامِ اجتماعی قائم رہے گا۔ اگر ایک سے زیادہ اتھارٹیز ہو جائیں گی تو اُس میں تفرقہ پیدا ہوگا اور اسی کا نام شرک ہے۔

سب سے بڑا شرک یہ ہے کہ امت میں فرقے پیدا کر دیئے جائیں

شرک کسی بُت کے سامنے جھکنے کا نام نہیں ہے' تفرقہ تو اس سے کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔ وہ جو کسی بُت کے سامنے جھکنا ہے تو وہ ذہنی جہالت ہے' وہ تو صحیح تعلیم دینے سے بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ واقعہ قرآن میں ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ جب کچھ دنوں کے لیے گئے اور حضرتِ ہارونؑ پیچھے تھے تو سامری نے اُنہیں ایک گوسالہ بنا دیا اور لوگوں نے اُس کی پرستش شروع کر دی۔ حضرتِ موسیٰؑ جب آئے تو آپؑ نے حضرتِ ہارونؑ سے سختی سے کہا کہ میں چند دن کے لیے باہر گیا اور تم نے یہ کیا کر دیا ہے۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ گوسالہ کی

پرستش کر رہے تھے' بت پرستی کر رہے تھے تو تم نے ان کو روکا کیوں نہیں۔ حضرت ہارونؑ بھی ایک نبی تھے۔ کہنے لگے کہ بھائی! میں یہ دیکھ بھی رہا تھا' مجھے اس کا علم بھی تھا کہ یہ شرک ہے لیکن اگر میں ان کو اس سے روکتا تو ان میں تفرقہ پیدا ہو جاتا اور تُو نے آ کر مجھے اس سے زیادہ سخت الفاظ میں کہنا تھا کہ تم نے قوم میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ میں نے تفرقہ پیدا ہونے سے بچانے کے لیے یہ گوارہ کر لیا کہ کچھ وقت کے لیے یہ جہالت میں بُت کے سامنے آ جائیں تو بات سمجھائیں گے تو بات ختم ہو جائے گی لیکن اگر تفرقہ پیدا ہو جاتا تو وہ تو ختم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا کا ایک نبی بت پرستی کو تو کچھ وقت کے لیے گوارہ کر رہا ہے لیکن تفرقہ پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اور حضرتِ موسیٰؑ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ حضرتِ موسیٰ ◆ کیا خود خدا مطمئن ہوتا ہے۔

فرقہ پرستی ہی بڑا شرک کیوں ہے؟

آپ نے سوچا کہ تفرقہ یا فرقہ پرستی کو شرک کیوں کہا گیا ہے۔ اُس میں اتھارٹیز ایک سے زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ محض بُت کے سامنے جھکنے والی بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ (29:51) ۔مکمل' غیر متبدل' محفوظ ضابطہء حیات قیامت تک کے لیے ہے تو کہا کہ کیا یہ کافی نہیں ہے؟ میں عرض کر رہا تھا کہ جب تک امت نے یہ سمجھا کہ یہ ہمارے لیے کافی ہے تو امت بھی ایک رہی' تفرقہ بھی نہیں ہوا' ان کی مملکت بھی مجتمع رہی' دین بھی ایک نظام کا نام رہا لیکن وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (61:9) اس چیز کو گوارہ ہی نہیں کریں گے' پسند ہی نہیں کریں گے' برداشت ہی نہیں کریں گے کہ یہ مشرکین ہیں۔

شرک کی بنا پر ایک سے زیادہ فائنل اتھارٹیز کا وجود اور ان کی حکمرانی

اب وہ اس تاک میں تھے کہ ان کے ہاں سے یہ بات ختم کی جائے۔ اُنہیں پتہ تھا کہ اگر ان کے سامنے بُت رکھا تو یہ اُس کی پرستش نہیں کریں گے۔ وہ اس لیے کہ محسوس بتوں کو تو پہلے ہی کعبے سے نکالا گیا تھا۔ اب اُس کی طرف تو یہ لوگ نہیں آئیں گے اور اُس شرک سے اتنا کچھ بگڑے گا بھی نہیں۔ ان کو حقیقی شرک کی طرف لائیے' ایک سے زیادہ فائنل اتھارٹیز ان کے اندر پیدا کر دیجیے۔ صدرِ اول میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ان کے تصور میں بھی ایک سے زیادہ اتھارٹیز آ جائیں۔ تاریخ میں ہے لیکن درس میں وہ مقام نہیں ہے جہاں میں اس تفصیل میں جاؤں۔ بہرحال بنو امیہ کے دور (661-750AD) کو بڑا ہی بدترین سا دور کہا جاتا ہے۔ اس نکتہ نگاہ سے آپ دیکھیں تو بنو امیہ کے زمانے (661-750AD) میں بھی قرآن کے علاوہ کوئی کتاب ہی نہیں تھی۔ میں ایک سے زیادہ فائنل اتھارٹیز کے نکتے کی طرف آ تا ہوں۔ عباسیوں کے زمانے (750-1258) میں یہ ایرانی ہجوم کر کے آئے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''شاہکارِ رسالت'' میں لکھا ہے کہ وہ انتقام لینے کے لیے آئے تھے۔ یعنی اُنہیں عربوں کے ہاتھوں جو شکستِ فاش ہوئی ہے تو وہ اُسے

برداشت نہیں کر سکے تھے۔

بنوامیہ کے دور کے بعد عباسیوں کا زمانہ اور ایرانیوں کے جوشِ انتقام کا طریق

ایرانی اس شکستِ فاش کو بھلا ہی نہیں سکے تھے۔ وہ اس تہ تک پہنچے تھے کہ ان کے ہاں ایک سے زیادہ اتھارٹیز کسی نہ کسی طرح سے پیدا کر دی جائیں۔ یہ بات تو بڑی مشکل تھی لیکن امت کے اندر ایک نازک ترین مقام آتا ہے اور وہ نبی اکرم ﷺ کی ذات سے عقیدت اور محبت کا ہے۔ یہ ایک بڑی جذباتی چیز تھی۔ اُنہوں نے ان کے ان جذبات کو Exploit (سلب ونہب) کیا اور کہہ دیا کہ رسول اللہؐ نے یوں فرمایا ہے' تو اس کے بعد سننے والا کانپ اٹھتا ہے۔ جیسا کہ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کی طرف ہر بات کو منسوب کر دیا گیا۔

دہلی شاہی مسجد کے حجرے میں پتھر پر قدم شریف کے دیدار کی کہانی اور سرینگر میں حضرت بل کا سلسلہ

یہاں تو ہم نے نہیں دیکھا' وہ دلی میں شاہی مسجد تھی جہاں اللہ اکبر کی آواز بلند ہوتی تھی۔ اُس مسجد کے ایک کونے کے اندر ایک حجرہ تھا' اُس حجرے کے اندر نقش شریف یا نقشِ قدم یا قدم شریف تھا' اُس کے اندر ایک اتنا سا بکس تھا' اُس کے اندر ایک پتھر تھا اور پتھر کے اندر ایک پاؤں کا نشان تھا۔ اُس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ یہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کے پاؤں مبارک کا نشان ہے۔ صرف یہ نسبت تھی۔ کسی نے یہ تحقیق بھی نہیں کی اور اتنا بھی نہیں سوچا کہ پتھر کے اندر یہ نشان کیسے ہوسکتا ہے لیکن ہر جمعرات کی شام کو وہ وہاں سے نکلتا تھا' مسجد میں جمعہ کے اجتماع کے علاوہ اتنا اجتماع کبھی نہیں ہوتا تھا جتنا اجتماع اُس نقش کو' قدم شریف کو' دیکھنے اور سجدہ کرنے کے لیے ہوتا تھا۔ اور وہ سری نگر والے حضرتِ بل کی تو پوچھو ہی نہیں۔ وہ بل کیا ہے؟ وہ بال ہے۔ وہاں یہ چیز ہے کہ ایک شیشی کے اندر حضورؐ کا بال مبارک ہے۔ مجھے اس سے واسطہ نہیں ہے کہ وہ Genuine (اصلی) ہے یا نہیں ہے' میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جذباتی چیز ایسی ہوتی ہے کہ اگر اُسے حضور نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا جائے تو لوگ اُس کو تو سجدے کرنے لگ جاتے ہیں۔ اُنہوں نے یہ کیا کہ ہر بات کو کہہ دیا کہ رسول اللہؐ نے یہ فرمایا ہے۔

حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کا فرمان

اللہ تعالیٰ نے تو رسول اللہؐ سے بھی قرآن میں یہ کہا تھا کہ تمہارے پاس معاملات آئیں تو تم نے بھی قرآن کے مطابق ان کے فیصلے کرنے ہیں۔ یعنی حضور ﷺ کے لیے بھی اتھارٹی یہ قرآن ہی تھا۔ یہ بات وہاں چلی گئی۔ تھوڑے عرصے کے بعد اب یہ چیز آ گئی کہ ہاں

صاحب! قرآن ہے اور قرآن کے ساتھ اطاعت ہے، وہ ارشاداتِ رسول اللہ ﷺ کی ہوگی۔ اب یہ ارشادات نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیے گئے۔ میں یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہتا کہ منسوب کیے گئے بلکہ جتنی احادیث ہیں ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ منسوب الی الرسول ہیں۔ ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جاتی ہے، یقینی طور پر کوئی نہیں کہتا کہ یہ حضورؐ کا ارشاد ہے۔ یہ تو کہہ ہی نہیں سکتے۔

حضورؐ کی طرف منسوب کی گئی روایات کی تفصیل

دوسو، اڑھائی سو سال کے بعد کہیں جا کر یہ روایات جمع ہوئی تھیں۔ یہ زبانی روایات تھیں، بغیر کسی Written (تحریری) مواد کے تھیں، اس سے پہلے کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ ان کے چھ مجموعے تو سُنیّوں کے ہیں۔ ویسے تو انہوں نے گنایا تھا کہ یہ احادیث چودہ لاکھ کے قریب ملی تھیں۔ بہرحال مستند چھ مجموعے تو سنیوں کے ہیں، چار مجموعے شیعہ حضرات کے ہیں۔ سنیوں میں سب سے بڑا مجموعہ امام بخاریؒ [1] کا ہے، 256ھ میں ان کی وفات ہوئی تھی۔ اُنہوں نے خود لکھا ہے کہ مجھے چھ لاکھ کے قریب یہ احادیث یا روایات ملیں، میں لوگوں سے پوچھتا تھا اور لوگ بتاتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ پانچ لاکھ ستانوے ہزار کے قریب تو میں نے خود مسترد کر دیں۔ تو صاحب! ان کو اس کا کیا حق تھا۔ اور اگر یہ چیز تھی کہ اس کا فیصلہ کسی انسان نے کرنا تھا تو جو اُنہوں نے باقی رکھیں، وہ بھی تو ایک انسان ہی کا فیصلہ ہے۔ وہ 2900 اُنہوں [2] نے باقی رکھیں۔ اسی طرح سے اس کے بعد یہ بھی نہیں ہوا کہ یہ ایک مجموعہ کافی ہو جائے گا بلکہ انہی کے شاگرد مسلمؒ [3] نے بھی اتنا ہی مجموعہ اکٹھا کر دیا۔ اُس کے بعد داؤدؒ [4] آئے اور انہوں نے اکٹھا کر دیا، پھر ابوعیسیٰؒ [5] امام آئے اور انہوں نے اکٹھا کر دیا۔ اسی طرح ابوعبداللہ [6] اور امام عبدالرحمٰن [7] آئے انہوں نے بھی اکٹھا کیا۔ اب چھ تو یہ سنیوں کے مجموعے ہوئے اور یہ منسوب الی الرسول ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ قرآنِ کریم تو بار بار کہتا ہے کہ وحی کی اطاعت، ماانزل اللہ کی اطاعت، جو خدا نے نازل کیا ہے اُس

---

1. امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ (194-256ھ)۔
2. ان میں سے مکررات حذف کرنے کے بعد 2762 اپنے مجموعے صحیح بخاری میں درج کیں۔
3. امام مسلمؒ بن حجاج (204-261ھ)۔
4. امام ابوداؤدؒ (203-275ھ)۔
5. امام ابوعیسےٰؒ محمد ترمذی (209-279ھ)۔
6. امام ابوعبداللہ ابن ماجہ (سنِ وفات 273ھ)
7. امام عبدالرحمٰن نسائی (سنِ وفات 303ھ)

کی اطاعت کرو تو یہ جو ہم نے اکٹھی کی ہیں' انہیں کتنا بھی ہم صحیح کیوں نہ کہیں' یہ ماانزل اللہ میں تو نہیں آتیں' خدا کی طرف سے نازل کردہ تو نہیں ہیں' وحی تو نہیں ہے۔ ان کو یہ دقت پڑی کہ خدا تو یہ کہتا ہے کہ جو ہم نے نازل کیا ہے اُس کی اطاعت کرو' وہ تمہارے لیے اتھارٹی ہوگی۔ یہاں سے آ کر یہ کانٹا بدلتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کیا کیا جائے؟

لاکھوں روایات کے متعلق مثلہ معہ کا عقیدہ

اب یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ خدا کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو صرف قرآن ہی نہیں ملا بلکہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ اور بھی ہے۔ وہ جو اعتراض تھا کہ اطاعت یا اتھارٹی تو ماانزل اللہ کی ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف سے ملے' تو انہوں نے اس کا جواب بنا لیا کہ خدا کی طرف سے صرف قرآن نہیں ملا تھا بلکہ یہ مثلہ معہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ ہے۔ پھر دشواری پیش آئی۔ قرآنِ کریم میں تو قرآن کی مثل کے متعلق ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پہ ہے کہ وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ۪ وَ ادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ(2:23) اگر تمہیں اس کے ما انزل الله ہونے میں شبہ ہے یا کسی قسم کا شک ہے کہ یہ ہے تو تم اس کی مثل سارا قرآن نہیں بلکہ ایک سورۃ بنا کر لے آؤ' اپنے ساتھ دنیا بھر کے مفکر اور دانشور بھی شامل کر لو۔ اور وہیں تحدی سے یہ کہہ دیا کہ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُھَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَۃُ ۚۖ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ (2:24) اگر تم نہ لا سکے اور تم یقیناً نہیں لا سکو گے تو پھر سوچ لو کہ تمہارا انجام کیسی تباہی ہوگا۔ اس کی مثل لانے کا دعویٰ کرنے کا قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں آیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ مثلہ معہٗ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ لاؤ۔ کہا کہ بھئی! قرآن تو یہ کہتا ہے کہ تم اس کی مثل نہیں لا سکو گے' انہوں نے کہا کہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ انسان نہیں بنا سکیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہی دو قسم کی وحی نازل کی ہیں۔

یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ دو قسم کی وحی ہے: ایک وحی قرآنِ کریم کے اندر ہے اور دوسری وحی ان احادیث کے اندر ہے۔ جو احادیث دو سو سال تک کہیں جمع نہیں ہوئیں' لکھی نہیں گئیں' انسانوں نے لکھیں' انسانوں نے جمع کیں' انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ چھ لاکھ میں سے کونسی (قریباً) تین ہزار ہم چنیں۔ ان تین ہزار کے متعلق نہ ہی خدا نے کہا تھا کہ ہم نے انہیں نازل کیا ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ یہ ایک انسان کا فیصلہ ہے لیکن اُس کے متعلق عقیدہ یہ ہوا کہ یہ منزل من اللہ وحی ہے۔ اور پھر یہ کہا کہ وحی دو قسم کی ہے: ایک وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے' ایک وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی لیکن دونوں میں فرق نہیں ہے' برابر ہیں۔ یہ جو عقیدہ مثلہ معہ کا آیا ہے تو اب اس میں دو اتھارٹیز آ گئیں۔ اصطلاح کے طور پہ تو دو آئیں کہ ایک قرآن اور دوسری احادیث لیکن تعداد کے اعتبار سے آپ دیکھیے تو قرآنِ کریم میں تو 6666 کے قریب آیات ہیں لیکن یہ احادیث لاکھوں تک پہنچتی ہیں۔

قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل

قرآنِ کریم کے منزل من اللہ ہونے کی ایک دلیل قرآن نے خود یہ دی کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں اختلافات ہوتے۔ گویا اس کے اندر اختلاف کا نہ ہونا بھی اس کے منزل من اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ اگر کسی مملکت کے ضابطہء قانون اور آئین کے اندر ہی اختلافات ہوں' ان میں ایک دوسرے کی Contradiction (تضاد) ہوں تو وہ ضابطہ ہی نہیں بن سکتا۔ اب وہاں وہ جو مجموعے ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ تو بات الگ رہی' وہاں تو ایک مجموعے کے اندر ہی خود اتنی Contradictions (تضادات) ہیں۔ اور پھر دوسرے مجموعے بھی ہیں۔ میں ابھی عرض کر رہا تھا کہ یہ جو اہل السنّت والجماعت کے مجموعے ہیں' ان کو ہی لے لیجئے' تو وہ چھ ہیں۔ اُس کے علاوہ شیعہ حضرات کے چار مجموعے بالکل اُس سے مختلف ہیں اور ان میں بھی اختلافات ہیں۔ تو کانٹا مڑ گیا' وہ جو دین کی بنیاد تھی وہ ہل گئی' ایک اتھارٹی نہ رہی بلکہ زائد ہوگئیں۔

روایات کے مختلف مجموعوں کے بعد مختلف ائمہ فقہ کی مختلف فقہیں

اب یہ جو ان میں اختلافات ہوئے تو ان کی بنا پر یہ جنہیں ہم ائمہ فقہ کہتے ہیں' مملکت کے قانون بنانے والے' تو ان کی رو سے مختلف فقہیں مسلمانوں میں رائج ہوگئیں۔ یعنی پہلی چیز تو یہ ہوگئی کہ وہ جو ایک درخت تھا اُس میں دو شاخیں شیعہ اور سنی کی ہوئیں۔ شیعہ حضرات تو ایک طرف رہے' آپ ان سنیوں کو لے لیجیے۔ ان کے اندر اہلِ حدیث اور پھر اہلِ فقہ ہوئے۔ وہ اختلاف دیکھیے جو میں نے کہا تھا۔ یہ کس سے پیدا ہوا ہے؟ اگر آپ نے ایک اتھارٹی سے زیادہ دوسری اتھارٹی ساتھ ملالی تو اختلاف شروع ہو گئے۔

اہل تشیع' اہلِ فقہ' اہل حدیث' دیوبندی' بریلوی' حنبلی' شافعی' مالکی' چشتیہ' نظامیہ' صابریہ' اب ان سب کے مجموعے کا نام امت مسلمہ ہے

ابھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق کہہ رہے ہیں کہ احکام نافذ ہوں گے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ شیعہ حضرات نے اس کے خلاف Agitation (ہنگامہ) کیا ہے کہ ہم انہیں تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کیونکہ یہ اہلِ فقہ کا مذہب ہے' یہ ہمارا نہیں ہے' میں نے اس سے پیشتر لکھا تھا کہ بات تو ابھی اہلِ تشیع نے شروع کی ہے' آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ اہلِ حدیث اس کے خلاف احتجاج کریں گے۔ آج صبح [1] کے اخبار میں اہلِ حدیث کا احتجاج بھی آ گیا ہے کہ ہم تو فقہ کو نہیں مانتے۔ ان میں سے ایک فقہ' فقہ حنفی ہے' جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم ہمیشہ Majority (اکثریت) میں رہے ہیں' ہماری اکثریت رہی ہے اس

---

[1] یعنی جون 1979 کی 29 تاریخ کے اخبار میں۔

لیے ہم اہلِ فقہ سوادِ اعظم ہیں۔ ہمارے ہاں ہندوستان یا پاکستان میں یہ جو اہلِ فقہ حنفی ہیں تو ان میں دو ہیں: ایک دیوبندی ہیں اور ایک بریلوی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ یہ جو دونوں ہیں یہ اہلِ حدیث کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے' یہ دونوں ایک فقہ کے پابند ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ ابھی تو یہ ایک فقہ ہے' ابھی تو حنبلی فقہ' شافعی فقہ' مالکی فقہ اور ہیں۔ مسلمانوں کے مختلف ممالک میں یہ الگ الگ فقہیں ہیں۔ یہاں سے کانٹا بدلا گیا' گاڑی دوسری پٹڑی پہ چل پڑی۔ امتِ واحدہ کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ یعنی اب اگر کسی سے کوئی پوچھے کہ آپ کون ہیں۔ وہ کہے کہ جی مسلمان ہوں۔ تو وہ کہے گا کہ او ہو! مسلمان تو ہوئے لیکن ''کیہڑے مسلمان ❶''؟ جی سنی مسلمان ہوں۔ ''او کیہڑے سنی مسلمان ❷؟'' جی وہ ہم اہلِ فقہ ہیں۔ کونسی فقہ کے پابند ہیں؟ جی فقہ حنفی کے پابند ہیں۔ کیا دیوبندیا بریلوی؟ جی بریلوی۔ یہ تو ٹھیک ہے' اسلام فقہ ہی تو نہیں ہے تو آپ کونسے خانوادہ میں بیعت ہیں؟ الحمد للہ جی میں چشتیہ' خاندان میں بیعت ہوں۔ کونسے چشتیہ میں' نظامیہ یا صابریہ؟ گاڑی زور زور سے چلے جا رہی ہے اور اپنی منزل سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آج صرف مسلمان کہنا کافی نہیں ہے' وہ پہچانا ہی نہیں جا سکتا۔ گاڑی چلتی ہے اور آپ کو ہر اسٹیشن پر اپنے آپ کو کسی فرقے' کسی فقہ اور کسی خانوادے سے متعلق کرنا پڑتا ہے۔

خدا کا قانون ہماری اس بغاوت سے غافل نہیں ہے

عزیزانِ من! سوچیے کہ کہاں سے بات بگڑی؟ قرآن نے کہا تھا کہ **اَوَ لَمۡ یَکۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ** (29:51) کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم نے یہ اس قدر جامع کتاب تمہاری طرف نازل کر دی ہے؟ آج ہمارے ہاں کا یہ طبقہ چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ ہاں یہ کافی نہیں ہے۔ خدا کو چیلنج کیا جا رہا ہے کہ یہ کافی نہیں ہے۔ وہ بے بس تو نہیں ہے کہ یہ کچھ سنتا رہے۔ (معاذ اللہ) اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بڑا انتقام لیتا ہے بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ جونہی آپ ایک علاج کے ساتھ دوسرا علاج ملاتے چلے جائیں گے تو مریض کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جائے گی۔ کوئی چار دوائیاں ڈاکٹر کی لے لیجیے' دو تین حکیم کی لے لیجیے' کچھ ہومیو پیتھک والوں کی لے لیجیے' کچھ آیورویدا ❸ والوں کا ایک نسخہ لے لیجیے اور پھر کچھ تعویذ بھی باندھ لیجیے۔ یہ کرنا شروع کر دیجیے اور پھر ٹھیک ہے اُس کے ساتھ کفن بھی لے آیئے اور گورکن کو بھی ساتھ کہہ دیجیے۔ یہ شرک ہے۔ جو میں نے کہا تھا کہ وہ تو پھر چپ نہیں بیٹھا رہتا تو اُس

---

❶ کون سے مسلمان؟

❷ ارے بھئی! کون سے سُنّی؟

❸ Ayur-veda. The ancient Hindu system based on naturopathy and homeopathy.

کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ قانون تو واحد ہوتا ہے جو نتیجہ ہوتا ہے۔ فارمولے میں جب بھی آپ نے ذرا کچھ اور شریک کیا تو وہ یہی نہیں کہ وہ اپنا نتیجہ نہیں پیدا کرتا بلکہ پتہ نہیں کیا کیا تباہ کن نتائج پیدا کر دیتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ **اَوَ لَمۡ یَکۡفِہِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ** (29:51) کیا یہ کتاب تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟ لیکن یہ قوم دھڑلے سے خدا کو یہ کہتی ہے کہ یہ کافی نہیں ہے۔ اس وقت تک تو بہر حال اسلام مذہب تھا' اپنے اپنے طور پر اہلِ حدیث نے کچھ نماز پڑھ لی' اہلِ فقہ نے اپنے طور پر پڑھ لی' بریلیوں نے اپنی جماعت کرالی' دیوبندیوں نے اپنی کرالی۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں علامہ اقبالؒ کے تصور کا پاکستان

اُنہوں نے یہ سوچا کہ اس گاڑی کو پھر لوٹا کے پیچھے لانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ایک ایسا خطہء زمین حاصل کیا جائے جہاں پہلے سے دین کا کوئی نظام رائج نہ ہو۔ علامہ اقبالؒ (1938-1877) کا پاکستان کے تصور دینے کا مقصد یہ تھا۔ اُنہوں نے یہ کہا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں ہے' یہ ایک آخری کوشش ہے کر دیکھیں۔ اور وہاں جا کر ہم نیا نظام رائج کریں اور وہ نظام قرآن کے اوپر مبنی ہو۔ وہ یہ کہہ کر چلے گئے' قائداعظمؒ [1] نے خطہء زمین لے کر دیدیا۔ یہ مقصد تھا کہ اس گاڑی کو پھر اس کانٹے کے مقام پر لے آئیں۔ قائداعظمؒ جیسی شخصیت' جس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اُسے دین کا کیا پتہ تھا' وہ یہ کہتا ہے کہ ہماری آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتاب متعین کرتی ہے۔ ہمارے لیے کوئی اور اتھارٹی نہیں ہے۔

قائداعظمؒ کا فرمان یہ تھا کہ یہاں حکمرانی صرف خدا کی کتاب کی ہوگی

اس کے لیے اُنہوں نے 1948ء میں یہاں آ کر آخری بات کہی کہ ہمیں کچھ فرصت نہیں کہ آئین بتا سکیں یا بنا سکیں کہ ایسا ہوگا لیکن میں ایک بات ساری دنیا سے کہہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یہاں تھیوکریسی (مذہبی پیشوائیت) نہیں آئے گی۔ تھیوکریسی (مذہبی پیشوائیت) الگ الگ فرقوں کی فقہ کا نام ہوتا ہے جس کو خدا کا قانون کہہ کر منوایا جاتا ہے۔ اُنہوںؒ نے کہا تھا کہ یہاں حکمرانی صرف خدا کی کتاب کی ہوگی۔ عزیزانِ من! انؒ کی اس بات سے بڑے حوصلے بندھے تھے۔

قائداعظمؒ اور پرویزؒ کے باہمی تعلقات

میں یہ سنی ہوئی باتیں نہیں کہتا' مجھے تو دس سال تک ان کی رہنمائی کے نیچے کام کرنے کی سعادت حاصل ہے۔ میری اور ان کی صبح شام یہی بات ہوتی تھی کہ خدا کی کتاب کی حکمرانی ازسرِ نو پھر قائم کی جائے گی۔ یہ جواب تھا اس کا جو یہ کہتے ہیں کہ ہاں یہ کافی نہیں ہے۔

---

[1] قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948)

اور یہی چیز تھی جو اقبالؒ (1938-1877) نے اپنے خطبات ❶ میں بھی لکھی ہے کہ اس گاڑی کو پھر سے اُس مقام پہ وہ امت لا سکے گی جو اس دور میں حضرتِ عمرؓ (581-644/45AD) جیسی آزادانہ روح کو لے کر اٹھے اور اعلان کرے کہ حسبنا کتٰب اللہ ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔

آج کی شریعت میں قرآن شامل نہیں ہوتا

یہ جتنے بھی آپ کے ہاں کے مذہب کے عناصر ہیں' وہ ایک ایک پہ تنقید کرتے چلے جاتے ہیں اور اُس کے بعد کہتے ہیں کہ یہ ایک ہی اعلان ہے کہ حسبنا کتٰب اللہ ۔ یہ اَوَ لَمۡ یَکۡفِھِمۡ (29:51) کا ترجمہ ہے۔ کہا کہ ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔ یہ ساری چیزیں یعنی پہلے تو کہا تھا کہ یہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ' مثلہ معہ ہے۔ آہستہ آہستہ یہ جو معہ تھا' یہ پیچھے ہٹتا گیا اور مثلہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ آج کوئی بھی چیز جو شریعت کے نام پہ پیش کی جاتی ہے تو اُس میں قرآن کی کسی آیت کا حوالہ نہیں ہوتا۔ یہ رہ گیا:

کہ از یٰسینِ او آساں بمیری

تلاوت کرو' ثواب حاصل کرو۔ وہ جس نے یہ کہا تھا کہ آؤ رسول ﷺ کی آواز کے اوپر کہ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ (8:24) وہ تمہیں دعوت دیتا ہے اُس چیز کی جو تمہیں زندگی بخشے گی۔ اور جو میں کہا کرتا ہوں کہ اب کیفیت یہ ہے کہ نزع کے عالم میں جس کی موت جلدی نہ آتی ہو تو کہتے ہیں کہ اسے سورۃ یٰسین سناؤ تا کہ اس کا جلدی سے خاتمہ ہو۔ یعنی یہ اب مارنے کے کام آ رہا ہے۔ یاد رکھیے! وہ جو میں آپ کے ہاں اُس کے الفاظ دہراتا چلا جا رہا تھا کہ جس قوم نے اپنے Ideas (خیالات) کو فرسودہ اور ناتواں بنا دیا ہو' Powerless (بے قوت) کر دیا ہو تو وہ Ideas (خیالات) اُس قوم میں دوبارہ توانائی حاصل نہیں کر سکتے۔ جو قرآن ان کے ہاں موت کو آسان کرنے کے کام آ رہا ہو تو وہ ان کو زندگی کیسے عطا کر دے گا۔ اور جب زندگی نہیں ملے گی تو قرآن کیا دے گا۔ قرآن نے تو کہا تھا کہ لِیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا (36:70) یہ تو فائدہ ہی اُس کو دے سکتا ہے جو زندہ ہے جبکہ یہ قبرستانوں میں جا کر وعظ کرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے خلاف پائے جانے والے تصورات

پھر آ جایئے اُسی مقام پہ جہاں سے کاٹا بدلا تھا۔ کہا کہ اَوَ لَمۡ یَکۡفِھِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡھِمۡ ❷ (29:51)۔

---

❶ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) Reconstruction of Religious Thought in Islam

❷ ان سے کہو کہ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ خدا نے' میری وساطت سے' تمہاری طرف اس قسم کا ضابطۂ زندگی بھیجا ہے جو بتاتا ہے کہ انہیں کس طرف جانا چاہیے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص923)

اور آگے بڑھیے تو مثلہ معہ قرآن کے ساتھ ہے یعنی اس قرآن کے ساتھ اس کی مثل ہے۔ بیشتر روایات ہیں کہ جن سے قرآن میں اختلاف واقع ہوتا ہے وہ قرآن کے خلاف جاتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر تو ذہن میں آتا تھا کہ بہرحال یہاں تو کہہ دیں گے کہ قرآن غالب ہے وہ اُس کے اوپر ہے اور یہ اس کے تابع ہیں لہٰذا حکم قرآن کا چلے گا۔ آپ حیران ہونگے کہ عقیدہ یہ ہے کہ جہاں کسی روایت میں اور قرآن میں اختلاف ہو تو روایت قرآن کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔ یہ تو روایت تک بات ہوئی۔ اب اہلِ فقہ کو لے لیجیے۔ اہلِ فقہ کا یہ ایک عقیدہ ہے کہ ہمارے آئمہ کی فقہ کے کسی فیصلے میں اور قرآن یا حدیث میں اختلاف واقع ہو تو اُنہوں نے کہا ہے کہ پہلے تو کوشش کیجیے کہ قرآن اور حدیث کی ایسی تاویل کر دی جائے جو اُس فقہ کے مطابق آ جائے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ منسوخ سمجھی جائیں اور فقہ کے فیصلہ کا حکم صادر کیا جائے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب گاڑی کا کانٹا بدلتا ہے تو اُس کے بعد پھر ہوتا کیا ہے۔

مرتد کی سزائے قتل کا فتویٰ

آپ کو پتہ ہے کہ یہ مسلمان جسے ارتداد کہتے ہیں یعنی مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو جانا اور جس کی سزا موت ہے، وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ جہاں کہیں یہ اختلاف واقع ہوا اور کوئی یہ کہدے کہ نہیں صاحب! قرآن کا حکم غالب ہونا چاہیے تو یہ ان کے ہاں ارتداد ہے اور ایسا کہنے والا مرتد ہو جاتا ہے، اُس کی سزا قتل ہے۔ کہا کہ **اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ** (29:51) یہ جو تم زندگی بخش حرارتیں، توانائیاں، نشوونما (Development) چاہتے ہو تو یہ اسی کے اندر ہے۔ یہ ایک ضابطہء ہدایت ہے، ضابطہء قوانین ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ **لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ** [1] (29:51)۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! ہم تو مسلمان ہیں اور یہ چیز ہمارے ہی لیے ہے۔ **وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ** (2:8) تم ایسے لوگوں کو بھی دیکھو گے کہ جب ان سے پوچھو تو وہ کہیں گے کہ جی، اللہ پر ایمان ہے، آخرت پر ایمان ہے۔ **وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** (2:8) لیکن وہ ان پہ ایمان نہیں رکھتے۔ یہ اٹھتے بیٹھتے اقرار کرتے ہیں، دہراتے ہیں، اذانیں دیتے ہیں، دنیا میں اعلان کرتے ہیں۔ **يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (2:9) اللہ کو بھی دھوکا دیتے ہیں اور جماعتِ مومنین کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔ یہ اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں دھوکا دیتے ہیں۔ **وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ** (2:9) جبکہ یہ دھوکا اپنے آپ کو دیتے ہیں، فریبِ نفس میں مبتلا رہتے ہیں۔

---

[1] جو لوگ اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں گے یہ ان کے لیے ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 923)

دوسروں کو دھوکا دینے والا نفسیاتی مرض میں مبتلا ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ اَنۡفُسَهُمۡ بڑی عجیب اور گہری چیز ہے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے' Sub-conscious Mind (تحت الشعور یہ ذہن) کے اندر ایک چیز ہوتی ہے' اس لیے کہ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ (2:9) عقل وفکر سے یہ کبھی اس بات پہ غور نہیں کرتے کہ اس کے معنی کیا ہیں جو ہم زبان سے کہتے ہیں اور عملاً ایسا نہیں کرتے۔ اس کے لیے عقل وشعور اور تدبر اور فکر اور بصیرت اور علم کی ضرورت ہے لیکن یہ اس طرف کبھی نہیں آتے۔ صرف نفسیاتی طور پر کہے چلے جاتے ہیں' جذباتی طور پر کہے چلے جاتے ہیں' دھوکا دینے کے لیے کہے چلے جاتے ہیں۔ یہ سائیکولوجی کا مسلمہ ہے کہ دھوکا دینے والا تو سب سے پہلے اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ کہا کہ وَذِکۡرٰی لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (29:51) یہ ایمان والی قوم کے لیے ہے۔ اور وہ بتادیا کہ ایمان کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زبان سے کہہ دیا کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اور وہ ایمان والے ہوگئے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ عملاً اس کی صداقت پیش کرے۔ میں نے ایک دفعہ پہلے بھی عرض کیا تھا اور پھر دہرادوں۔ جب ہم مینار پہ چڑھ کر اور لاؤڈ اسپیکر پر ساری دنیا سے کہتے ہیں کہ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں شہادت دیتا ہوں اس بات کی کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ خدا کے سوا کوئی ایسی اتھارٹی نہیں ہے جس کی اطاعت اختیار کی جائے' خدا کے سوا کوئی قادرِ مطلق نہیں ہے' خدا کے سوا کسی کی Sovereignty نہیں ہے' کسی کا اقتدار نہیں ہے۔ کیا اس وقت صورت حال واقعۃً ایسی ہوتی ہے جس کا اعلان کیا جاتا ہے؟

شہادت کا مقام اور شہادت دینے والے کا معیار

عزیزانِ من! گواہی تو کسی واقعہ کی دی جاتی ہے جو ہو چکا ہو یا جو موجود ہو۔ یعنی میں وہاں کھڑا ہوں جہاں یہ واقعہ ہے۔ کم از کم ساری دنیا میں تو نہیں لیکن جہاں جہاں میں یہ اعلان کر رہا ہوں یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کی اتھارٹی یہاں نہیں ہے۔ اشھد میں شہادت دیتا ہوں' گواہی دیتا ہوں۔ اور کوئی چیز جو وہاں واقعہ ہی نہ ہوا ہو' وہ وہاں موجود ہی نہ ہو' تو اُس کے متعلق کھڑے ہو کر کہنا کہ اشھد' میں گواہی دیتا ہوں تو آپ یوں کیجیے کہ عدالت میں جا کر کسی واقعہ کے متعلق جو ہوا ہی نہ ہو کہیے کہ میں اُس کا گواہ ہوں تو پھر پوچھیے نہیں کہ آپ کا مقام کونسا ہوتا ہے۔ یعنی کسی ایسے واقعہ کے متعلق جو واقعتاً ہے ہی نہیں' جو موجود ہی نہیں' جو Exist ہی نہیں کرتا' اُس کے متعلق تو آپ مینارے پہ کھڑے ہو کر دنیا کے سامنے کہتے ہیں کہ اشھد ا میں گواہی دیتا ہوں۔ او! اس چیز کی گواہی دیتے ہو جو ہے ہی نہیں۔ یعنی ہم نے تو آگے چلنے کے بعد یہ طے کیا کہ اہلحدیث کی رو سے صبح کی نماز کا یہ وقت ہے' دیوبندیوں کی رو سے یہ وقت ہے' بریلویوں کی رو سے یہ وقت ہے' ہم نے تو یہ قانون بنالیا ہے۔ اگر سورج بھی یہ کہے کہ آج میں اہلحدیث کی فقہ کے مطابق برآمد

ہونگا' آج دیوبندیوں کے مطابق' آج میں بریلویوں کے مطابق' تو آپ سوچیے کہ دنیا کا حشر کیا ہوگا۔ کہا کہ شہادت چاہتے ہو۔ تمہارے ہاں تو یہ بات نہیں ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ خارجی کائنات پہ غور کیجیے۔ تمہیں وہاں کیا نظر آ رہا ہے۔ میں جھگڑا نہیں کرتا کہ تم کیا نام لو' تم Law of Nature (قانونِ فطرت) ہی کہدو۔ یہ تو سارے کے سارے مانتے ہو کہ کوئی ایک اتھارٹی ہے' ایک قانون ہے جو ساری کائنات کے اندر کارفرما ہے۔ آپ دیکھیے کہ شہادت کہاں کہا ہے؟ ایک چیز ہے جو واقعتاً سامنے ہے' جسے بتایا' سمجھایا' دکھایا جاسکتا ہے۔ یہاں تک تو یہ بھی مان لیں گے کہ ہاں صاحب! بات تو ٹھیک ہے کہ یہاں تو واقعی خدا کا قانون ہے۔ جب آپ اس پوری کائنات میں خدا کا قانون مانتے ہیں تو کیا آپ اس کائنات سے کہیں باہر واقع ہوئے ہیں' تو آپ پہ اُس کا قانون کیوں نہ لاگو ہو۔ کہا کہ **وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ** (29:52) یہ تو میں شہادت دیتا ہوں اور اُس کے بعد پھر میں بتا دیتا ہوں کہ جو بھی خدا کے قانون سے انکار کر کے باطل کے قوانین کو اپنے لیے ضابطہء حیات بنائے گا تو اُس کی تباہی آئے گی' اُس کا بے حد نقصان ہوگا۔

ذاتِ خداوندی انسانی نفسیات سے بہت بلند ہے

یاد رکھیے! سارے قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا کہ اگر تم ہمارا حکم نہیں مانو گے تو ہمیں غصہ آ جائے گا اور ہم یہ کریں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے' ہم تو تمہیں یہ بتاتے ہیں کہ یہ کرو گے تو تمہارا بھلا ہوگا اور یہ نہ کرو گے تو تمہارا نقصان ہو جائے گا۔ **هُمُ الْخٰسِرُوْنَ** (29:52) تباہی آ جائے گی' نقصان ہو جائے گا۔ جب تم یہ کہتے ہو تو وہ کہتے ہیں کہ **وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ** (29:53) ذرا وہ عذاب' وہ تباہی لاؤ تو سہی۔ وہ کہاں ہے؟ آج بھی یہ کہا جاتا ہے' بعض لوگ تو کچھ مایوس ہو کر یہ کہتے ہیں کہ خدا واقعی اگر یہ کچھ کرتا ہے تو پھر اس قدر ظلم و ستم ہو رہا ہے تو وہ کیوں کچھ نہیں کرتا۔ بعض سرکشی کے عالم میں کہتے ہیں کہ صاحب! تم کہتے ہو کہ ظلم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے' اگر ہوتا ہے تو پھر اپنے خدا کو ذرا بلاؤ اور **وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ** (29:53) ۔ وہ عذاب جلدی سے لاؤ۔ یہاں ایک اصول بتایا کہ **وَ لَوْ لَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ** [1] (29:52)۔

کسی Accident (حادثہ) کے علاوہ ہر تباہی و بربادی ہمیشہ قانون کی رو سے ہی ہوتی ہے

عزیزانِ من! ایک تباہی' ایک نقصان' ایک حادثہ Accident ہوتا ہے۔ Accident (حادثہ) کسی قانون کے تابع نہیں

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے قانونِ مہلت و تدریج کی رو سے اعمال اور ان کے نتائج کے محسوس طور پر سامنے آنے کا درمیانی وقفہ متعین نہ ہوتا' تو وہ عذاب ان پر کبھی کا آ چکا ہوتا۔ وہ اس مہلت کے وقفے کے بعد ہی آئے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 924)

ہوتا مثلاً ایک تندرست وتوانا آدمی ہو جس کے متعلق یہ سوال ہی نہ ہو کہ یہ مر جائے گا' وہ چلا جا رہا ہے اور پیچھے سے آ کر ایک موٹر نے ٹکر ماری ہے تو یہ قانون کی رو سے نہیں ہے۔ آج کی اصطلاح میں یہ باتیں Special Ordinance (خصوصی آرڈیننس) کے تحت ہوتی ہے۔ جو باتیں By Accident (حادثے کے ذریعے) ہوتی ہیں ان میں قانون نہیں ہوتا۔ قانون کی موت وہ ہوتی ہے جو مرض کے بعد آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کہیں سے تشخیص ہی نہ کرائیں' شناخت ہی نہ کرائیں' ورنہ اُس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ابتداًوہ ذرا سا جرثومہ ہوتا ہے' ذرا سا اپنے اعتدال سے ہٹی ہوئی چیز ہوتی ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ ایک قاعدے قانون کے مطابق بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر اُس کی تشخیص کرالی جائے اور وہ جو قانون ہے اس سے اس کا ازالہ ہو جائے تو اُس میں شفا ہو جاتی ہے۔ اگر یہ نہ کیا جائے تو اُسی قانون کی رو سے آخر پھر ایک دن موت واقع ہو جاتی ہے۔ قانون کے مطابق موت اور زندگی اس طرح واقع ہوتی ہے۔ یہ Accident (حادثہ) کی رو سے نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ افراد کی موت کی طرح قوموں کی موت بھی اسی طرح سے ہوتی ہے۔ Accident (حادثہ) تو الگ بات ہے کہ کوئی زلزلہ آ گیا اور پورے کا پورا گاؤں ہی زمین میں چلا گیا' ورنہ یہ چیز ہے کہ قومیں غلط روش اختیار کرتی ہیں' آہستہ آہستہ غلط روش کے تباہ کن نتائج پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں' وہ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

عدالتِ خداوندی میں انسانی اعمال ہمیشہ دو پلڑوں میں تُلتے ہیں

قانون کے معاملے میں اُس نے ایک اس قدر عجیب اصول دیا ہے کہ انسان غور کرتا ہے تو روح وجد میں آ جاتی ہے۔ وہ جو موازین کہا ہے کہ جن کو ہم پلڑے کہتے ہیں تو کہا ہے کہ یہ تخریبی کاموں کے اور تعمیری کاموں کے پلڑے ہیں' ایک میزانِ عدل ہے۔ ایک طرف کسی قوم کے تعمیری کام ہوتے ہیں' دوسری طرف اُس کے تخریبی کام ہوتے ہیں۔ جب تک تعمیری کاموں کا پلڑا جھکا رہتا ہے تو اُس قوم میں زندگی ہوتی ہے۔ جب تخریبی کاموں کا پلڑا جھکنا شروع ہو جاتا ہے تو پھر وہ قوم زوال پذیر ہوتی ہے۔ اور جب وہ اتنا جھک جاتا ہے کہ وہ دوسرا پلڑا کچھ کر نہیں سکتا تو یہ اس کا Fall (انحطاط) ہوتا ہے۔ پہلا زوال تھا' یہ سقوط ہے' پہلا مرض تھا اور یہ اُس کی موت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ قانون کی رو سے ہوتا ہے۔ کسی اسٹیج کے اوپر بھی اگر وہ قوم کھڑے ہو کر جائزہ لے اور اپنے مرض کی تشخیص کرالے' صحیح علاج شروع کر دے' یعنی تعمیری کام زیادہ کرنے شروع کر دے تو تخریبی کاموں کا پلڑا اُٹھ جاتا ہے۔ اُس نے یہ اصول بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو اُس کے اندر جلدی مچاتے ہیں تو ہمارے ہاں سے یہ تباہیاں حادثے (Accident) کی رو سے نہیں آتیں بلکہ قانون کی رو سے آتی ہیں۔ اور اس کے لیے اَجَلٌ مُّسَمًّى [1] (29:53) ہے۔ ہر مرض کے لیے یہ ہوتا ہے کہ کم از کم اتنے عرصے تک اس کی توانائی

---

[1] قانونِ مہلت وتدریج کی رو سے' اعمال اور ان کے نتائج کے محسوس طور پر سامنے آنے کا درمیانی وقفہ متعین ہے (ماخوذ از پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص924)

یعنی وہ جو مریض کی قوتِ مدافعت ہوتی ہے' وہ اس کا مقابلہ کرتی جائے گی اور جب یہ اسٹیج آ جائے گی تو پھر وہ ڈاکٹر کہہ دیتا ہے کہ اب تو کوئی امید نہیں ہے:

یوں خدا کی خدائی تو برحق ہے
پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

تو پھر مریض کا یہ مقام آ جاتا ہے۔

زندگی اور موت دونوں کے لیے خدا نے قانون مقرر کر رکھے ہیں

وہ کہتا ہے کہ اگر ہمارا یہ قاعدہ مقرر نہ ہوتا اور ہوتا یہ کہ جونہی انہوں نے کوئی برائی کی یا کوئی تخریبی کام کیا' ہم اس کا ٹینٹوا دبا دیتے اور ختم کر کے رکھ دیتے۔ کہا کہ ہم یہ نہیں کرتے' ہم ڈکٹیٹر نہیں ہیں' ہم حادثوں سے موتیں نہیں لاتے۔ ہمارے ہاں تو زندگی اور موت دونوں کے لیے قانون مقرر ہے۔ یہ مدت جس میں مایوس ہونے والے کہتے ہیں کہ صاحب! وہ ظالم کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑ لیتا' انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ اگر کوئی خدا ہے تو اس طرح سے کیوں ہو رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اس لیے ہے کہ ہمارا قانونِ مہلت ہے تا کہ کسی وقت بھی اگر یہ احساس کر لیں کہ ہم مر رہے ہیں تو اپنا صحیح علاج کرا لیں تو بچ جائیں گے۔ اگر نہیں بچتے تو کہا کہ **وَ لَیَاْتِیَنَّھُمْ بَغْتَةً وَّ ھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ** (29:53) اور جب وہ آخری پوائنٹ آ جاتا ہے' جب اس کی تباہی ہوتی ہے تو اُس وقت پھر یہ سوچنا شروع کرتے ہیں کہ ہم نے رات کو تو کچھ نہیں کیا تھا تو صبح اٹھتے ہی تباہی کیوں آ گئی۔ وہ کہتا ہے کہ رات کی بات نہیں ہے۔ وہ مریض جب ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! میں رات کو اچھا بھلا سویا تھا' کچھ تکلیف بھی نہیں تھی لیکن اب صبح اٹھا ہوں تو گردے میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ وہ ڈاکٹر کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ رات کو کچھ نہیں تھا بلکہ یہ تو چھ مہینے سے اندر پتھری بن رہی تھی۔ **وَّ ھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ** (29:53) اور تمہیں اس کا شعور نہیں تھا۔

جہنم یا جحیم قرآن حکیم کی دو اصطلاحات ہیں

عزیزانِ من! آگے ایک اور اہم بات آ رہی ہے۔ شدہ شدہ' جستہ جستہ تو وہ مختلف مقامات پر' مختلف درسوں میں آپ کے سامنے آتی رہی ہے لیکن آج وہ آیت ہی سامنے آ گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ **یَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ** (29:54) عذاب آتا کیوں نہیں' یہ اس کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ کہا کہ موت کا جو قانون ہے وہ اس کے اوپر حاوی چلا آتا ہے۔ قرآن نے جہنم ایک اصطلاح استعمال کی ہے: اس دنیا کے اندر بھی قوموں کی تباہی کی اور زندگی چونکہ مسلسل چلتی ہے اس لیے آخرت کی بھی تباہی کی۔ وہ میں نے آپ کو بتا یا دیا تھا

کہ **مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى** (17:72) جوقوم یہاں تباہیوں تک پہنچتی ہے تو وہ آخرت میں بھی ایسی ہی ہوگی لیکن بہرحال جہنم ایک اصطلاح ہے۔ جہنم کے لفظی معنی یہ ہوتے ہیں جہاں ''انسانیت جل جاتی ہے' جس مقام کے اوپر انسانیت جلائی ہو جاتی ہے''۔ دوسرا لفظ جحیم ہے کہ ''جہاں آگے بڑھنے کی رفتار رک جاتی ہے''۔ یہاں ہے کہ **یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ** (29:54) عذاب آتا کیوں نہیں ہے؟ یہ جلدی مچاتے ہیں کہ وہ عذاب آ کیوں نہیں جاتا۔ مگر آہ:

محرم نہیں ہے تُو ہی نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(اقبالؒ)

تجھے ہی نظر نہیں آتا کہ ان تاروں کے اندر کیا کیا پوشیدہ ہے!

کوئی قوم بھی راتوں رات تباہ نہیں ہو جاتی

کہا ہے کہ **وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌۢ الْكٰفِرِیْنَ** (29:54) ان کی آنکھیں ہوتیں تو یہ دیکھتے کہ جہنم تو آج بھی ان کو چاروں طرف سے محیط ہے اور گھیرے ہوئے ہے جبکہ یہ کہتے ہیں کہ عذاب آتا کیوں نہیں ہے۔ تباہ ہونے والی قومیں یونہی Over-night (شباشب) تباہ نہیں ہو جاتیں' کہا ہے کہ **اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ** (29:54) جہنم تو چاروں طرف سے چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ وہ تو ان کے اوپر چھائی ہوئی ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ عذاب آتا کیوں نہیں ہے۔ کہا کہ **وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ** (82:16) یہ نہیں کہ جہنم ان سے غائب ہے۔ کہا کہ جہنم کی نگاہوں سے تو یہ آج بھی غائب نہیں ہیں۔ انہیں نظر نہیں آ رہا لیکن وہ تو انہیں اس وقت بھی دیکھ رہی ہے۔ **وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ** (82:16) اُس کی نگاہوں سے یہ اوجھل نہیں ہیں بلکہ انہیں نظر نہیں آ رہا' ان کی آنکھوں میں بصارت تو ہے' Physical (طبعی) بینائی تو ہے لیکن بصیرت نہیں ہے۔ کہا کہ جسے یہ عذاب کہیں گے تو وہ کیا ہوگا؟

یوم الدین کے الفاظ کے اندر بڑے حقائق پوشیدہ ہیں' دراصل اس نظام میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا

ہر نماز کی رکعت میں' سورۃ الفاتحۃ میں' ہم کئی مرتبہ پڑھتے ہیں کہ **مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ** (1:3)۔ لیکن ہم بغیر سمجھے کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں' کھڑے ہو کر کبھی سوچتے ہی نہیں ہیں۔ تم روز **مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ** کہتے ہو لیکن **وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ** (82:17) تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ یہ **یَوْمِ الدِّیْنِ** کہتا کیا ہے؟ یہ کونسا دن ہے؟ کونسا دور ہے؟ جس کے متعلق تم یہ کہتے ہو۔ ارے

پھر سوچو کہ ثُمَّ مَآ اَدۡرٰکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ (82:18) تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ یہ کیا ہے؟ کیا انداز ہے قرآن کا بات کہنے کا اور بات سمجھانے کا! کہا کہ ہمارے سوا تمہیں کون بتا سکتا ہے کہ یہ یَوۡمِ الدِّیۡنِ کیا ہے۔ سُنو! یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡئًا (82:19) یوم الدین، الدین کا نظام وہ ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے اوپر کسی قسم کا کنٹرول نہیں رکھے گا۔ وَّالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19) اور ہر معاملہ خدا کے قانون کے مطابق ہوگا۔ یہ ہے یوم الدین۔

عزیزانِ من! یہ ہے اسلامی نظام، یہ ہے نظامِ خداوندی، یہ ہے یوم الدین، یہ ہے الدین کا نظام۔ پھر سنیے! کہا ہے کہ یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡئًا (82:19)۔ پھر پنجابی کا لفظ میرے سامنے آ گیا کہ "کوئی دبیل نہیں ہووے گا کسے دوجے دا❶"۔ یہ بڑا جامع لفظ ہے۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس

دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے

نکتۂ شرعِ مُبیں ایں است و بس

یہ ہے دین کا نظام۔ دوسری جگہ اس ❷ نے کہا ہے۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست

اس نظام کے اندر کوئی بھی، نہ کسی سے کچھ مانگنے والا ہے اور نہ کسی شے سے محروم رہنے والا ہے۔

عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

نہ کوئی غلام، نہ آقا، نہ حاکم، نہ محکوم۔ یہ ہے یوم الدین۔ یہ ہے لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡئًا وَّالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19)۔ بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِیۡنَ (82:16) یہ آج بھی جہنم کی نگاہ سے غائب نہیں ہیں، اوجھل نہیں ہیں، چھپے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اُس کے سامنے ہیں۔ اُس کی نگاہ سے غائب نہیں ہیں لیکن انہیں وہ آج نظر نہیں آتی۔ کہا کہ کوئی بات نہیں۔ یہ ابھی مہلت کا درمیانی وقفہ ہے۔ جب وہ تباہی آئے گی تو پھر کیا ہوگا؟ اب تو یہ ہے کہ جہنم انہیں دیکھ رہی ہے اور یہ اُسے نہیں دیکھ رہے۔ کہا کہ وَبُرِّزَتِ الۡجَحِیۡمُ (79:36) اُس دن جہنم کو محسوس طور پر ہم ان کے سامنے لے آئیں گے۔ وہ ان کو آج بھی دیکھ رہی ہے لیکن یہ

---

❶ کسی دوسرے کا کوئی بھی دبیل (دبایا ہوا) نہیں ہوگا۔

❷ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

اُسے نہیں دیکھ رہے۔ وہ اس طرح سے پردہ پلٹ کر بے حجاب سامنے آ جائے گی اور پھر یہ اُس کو دیکھ لیں گے۔ کیا یہ سب کے سب دیکھ لیں گے؟ کہا کہ نہیں وَبُـرِّزَتِ الْـجَـحِيْـمُ لِمَنْ يَّـرٰى (79:36) اِسے وہی دیکھ سکے گا جو آنکھوں میں بینائی رکھتا ہے۔ اندھا تو مرتے مر جائے گا' تو اس کو اُس وقت بھی نظر نہیں آئے گا کہ جہنم آ گیا ہے۔ کیا بات ہے اس بـرزت کے لفظ کی! عربی جاننے والے اس کو جانتے ہیں کہ ایک چیز مستور ہوتی ہے' Potential (مضمر) ہوتی ہے۔ جب وہ Actualize (بارز) ہو جاتی ہے' محسوس شکل میں سامنے آ جاتی ہے تو وہ چیز برزت ہوتی ہے۔ یہاں بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ (79:36) کہا ہے۔ اب بھی وہ موجود ہے' وہ دیکھ رہی ہے' وہ چاروں طرف سے محیط ہے۔ پھر وہ محسوس شکل میں سامنے آ جائے گی لیکن اُس وقت اُنہی کے سامنے آ جائے گی جو آنکھیں رکھتا ہے۔

اس قدر دامن گیر جہنم کا احساس اہلِ نظر ہی محسوس کر سکیں گے

عزیزانِ من! آنکھیں رکھنے کی بات اقبالؒ (1938-1877) نے بڑی عجیب کہی ہے:

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب

کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

پیدائشی اندھا اور سورج کی روشنی کیا معنی؟ یہاں لمن یرٰی آیا ہے یعنی جو دیکھنا چاہے اور

بڑی مشکل سے ہوتا چمن میں دیدہ ور پیدا

قوموں پر عذاب کی نوعیت: عذاب ان کے اوپر سے بھی اور عذاب نیچے سے بھی

کہا ہے کہ يَـوْمَ يَـغْشٰهُـمُ الْعَـذَابُ مِنْ فَوْقِهِـمْ وَ مِنْ تَـحْـتِ اَرْجُلِهِـمْ وَ يَـقُـوْلُ ذُوْقُـوْا مَـا كُـنْـتُـمْ تَـعْـمَـلُوْنَ (29:55). یہ کیا دور ہوگا جسے ہم نے جہنم کہا ہے؟ کہا کہ وہاں چل کر دیکھ لینا کہ یہ کیسے ہے لیکن یہاں کا جہنم تمہیں بتا دوں۔ اب یہ وہ آ گیا کہ عذاب آئے گا' ان کے اوپر سے بھی' ان کے پاؤں کے نیچے سے بھی۔ عزیزانِ من! بات وہی ہے' یہ پہلے بھی کئی دفعہ آ چکی ہے لیکن پھر دہرا ہی دیتا ہوں۔ یہ وہ ہے جو اقبالؒ نے کہا ہے کہ

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

قیامت' میزان' اعمال نامہ' جہنم اور پل صراط بہت لمبی چوڑی داستانیں ہیں۔ یہ سب وہاں کی داستانیں تُو کہہ رہا ہے لیکن

ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

او کمبخت! اس قیامتِ موجود کو بھی تو دیکھ کہ یہ جو قیامت آئی ہوئی ہے اور اس وقت موجود ہے' کس قدر غضب ہے کہ تُو اسے دیکھ نہیں رہا اور

اُس کے متعلق باتیں کر رہا ہے۔

عزیزانِ من! جب گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑی ہے تو پھر یہ ہوا ہے۔ جو کچھ قرآنِ کریم نے کہا ہے اس کے متعلق تو یوں کرو' ہوتا ہوا تا تو کچھ نہیں ہے صرف ثواب ہوتا ہے۔ پوچھا کہ اس ثواب کا بدلا؟ کہ جی وہ قیامت میں جا کر ملے گا۔ کہ غلط کام کرتے ہو اس کا عذاب ہوتا ہے؟ کہ صاحب! یہاں تو کچھ نہیں ہوتا' وہاں جا کر ہوتا ہے۔ ایک ذرا سا وہ کانٹا مڑنا ہوتا ہے۔

ہزار حیف نہ بنی قیامتِ موجود

یہاں تو قدم قدم کے اوپر قیامتِ موجود ہے۔ اور وہ قطعہ تو بڑا ہی دلچسپ ہے:

ز دوزخ واعظِ کافر گرے گفت

واعظ جو ساری دنیا کو کافر بناتا چلا جاتا ہے' دوزخ کے متعلق بڑی لمبی چوڑی داستانیں بیان کرتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے یا نہیں ہے ''ایہہ جدوں دوزخ دی گلاں کرداائے تے کچیاں وٹ وٹ کے کردا[1] ائے''۔ میری بیٹیاں تو نہیں سمجھ رہی ہونگی۔ کیا کروں مشکل یہی ہے کہ یا عربی میں بات کی جائے گی یا پنجابی میں۔ جہنم' ''ایتھوں شروع کرداائے حوالات اچوں''[2]۔ یعنی مقدمہ عدالت میں بعد میں پیش ہونا ہے اور عذاب یہاں سے شروع کر دیتا ہے' جیسے پولیس والے کرتے ہیں کہ عدالت تو بعد میں چھوڑ دیتی ہے لیکن یہ پہلے ہی مار مار کر کچومر نکال دیتے ہیں۔ تو یہ واعظ یہاں سے شروع کرتا ہے اور پھر اس کے بعد وہ سانپ اور بچھو اور پھر وہ قصے کہانیاں ہیں۔ عزیزانِ من! سائیکولوجی میں اس کو Sedative Tendency (اضطراب ربار جحان) کہتے ہیں۔ یہ ایک Complex (الجھاؤ) ہوتا ہے کہ دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر خود اذیت دینے کی قوت نہیں ہے تو کم از کم گالیاں دے کر تو اذیت پہنچا سکتا ہے' کچیاں تے وٹ سکدا[3] ائے' بچھو اور سانپ اور یہ تو وہ کر سکتا ہے:

ز دوزخ واعظِ کافر گرے گفت

کہتا ہے کہ واعظ جو دوسروں کو کافر بنانے والا ہے' دوزخ کے متعلق اُس نے بڑی لمبی چوڑی بات کہی ہے۔ کہتا ہے کہ وہ یہ کچھ کہہ رہا تھا اور کہیں کوئی کافر بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

حدیثِ خوشتر ازوے کافرے گفت

---

1. جب یہ دوزخ کی بات کرتا ہے تو کچکچا کر' دانت پیس پیس کر' بات کرتا ہے۔
2. جہنم کی یہ بات' یہ جیل خانے سے شروع کرتا ہے۔
3. کچکچاہٹ (دانت پیسنے کی حالت) تو وہ ظاہر کر سکتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات ایک کافر نے کہی تھی۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ

''نداند آں غلام احوال خود را
کہ دوزخ را مقامِ دیگرانے گفت''

جو واعظ دوسروں کا مقام بتاتا ہے تو کم بخت کو اپنا پتہ ہی نہیں کہ کہاں کھڑا ہے۔ وہ دوسروں کے متعلق کہتا ہے کہ عذاب ہوگا۔ آزاد کو تو پتہ ہوتا ہے کہ یہ جنت ہے، یہ جہنم ہے:

''نداند آں غلام احوالِ خود را
کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت''

کہا ہے کہ **یَوۡمَ یَغۡشٰهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ** (29:55) قوموں کے اوپر عذاب آتا ہے، اوپر سے عذاب آتا ہے، نیچے سے عذاب آتا ہے۔ عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن تو اتنی جامع اور مکمل کتاب ہے کہ اپنے ہر دعوے کی تفسیر یہ خود کر دیتا ہے۔ بس صرف بات ڈھونڈنے اور دیکھنے کی ہے۔ اس قسم کا عذاب کہاں آتا ہے؟ کہا کہ **قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَ عَلَیۡکُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِکُمۡ اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ** (6:65) آؤ تمہیں بتائیں کہ جب قومیں تباہ ہونے لگتی ہیں، ان پہ عذاب آتا ہے تو اس کی کیا شکل ہوتی ہے؟ کہتا ہے اُس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں: بعض اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ یہ اوپر کے جو سربراہ اور اوپر کے جوان کے ہاں کے لیڈر ہوتے ہیں، وہ بگڑتے ہیں اور ان کی وجہ سے عذاب آتا ہے، کبھی یہ ہوتا ہے کہ جو نیچے کے لوگ ہوتے ہیں، جن کو کچلا جاتا ہے، وہ سرکشی اختیار کر کے انقلاب نہیں بلکہ فساد برپا کر دیتے ہیں، کبھی ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا** (6:65) وہ مختلف پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں اور وہ پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ **وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ** (6:65) اور اس طرح سے آپس میں ہی کٹ کٹا کر مر جاتی ہیں۔ کہا کہ قوموں کے اندر عذاب کی یہ شکلیں ہوتی ہیں۔ اوپر کا جو طبقہ ہے وہ بگڑتا ہے تو وہ نیچے تک Epidemic (وبا) پھیلتی ہے، نیچے کا طبقہ تنگ آ جاتا ہے تو وہ سرکشی اختیار کر لیتا ہے اور فساد برپا کر دیتا ہے، کبھی اوپر کا طبقہ لیڈر اور سربراہ ایک پارٹی بنا لیتے ہیں اور مختلف پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ مصروفِ جنگ وجدل ہو جاتی ہیں اور اس طرح سے ایک دوسرے سے ٹکرا کر ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ مولانا روم کی وہ حضرتِ نوحؑ کی کہانی پڑھا کرتے تھے کہ ایک طوفان آئے گا، اس سے بچنے کے لیے اُس نے ایک کشتی بنائی کہ جو اُس میں ہوں گے وہ محفوظ رہ جائیں گے اور یہ سارے کافر ڈوب کر مر جائیں گے۔ تو وہ حضرتِ نوحؑ نے دیکھا کہ ان کافروں نے وہ مٹکے لے لیے اور وہ مٹکے سیلاب میں رکھ کر تیرنا شروع کر دیا۔ حضرتِ نوحؑ نے اللہ میاں سے کہا کہ یہ سارا کچھ کیا، ہم سے کشتی بنوائی، ہم

نے اتنی محنت کی اور اس میں صرف چار آدمی آئے لیکن جنہوں نے تباہ ہونا تھا وہ تو مٹکوں کے اوپر تیر رہے ہیں۔ تو کہا کہ ذرا ٹھہر جائیے۔ وہ ذرا سے ٹھہرے تو ایک آندھی آئی اور وہ ایک مٹکا دوسرے مٹکے سے ٹکرا کر ٹوٹا تو سارے گم گئے ہو۔

انسانی عمل کا نتیجہ اس عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے

کہا کہ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَفۡقَهُوۡنَ (6:65) دیکھو کہ ہم کس طرح سے لوٹا لوٹا کے' پھرا پھرا کے' مثالوں کے ذریعے سے' بات واضح کرتے ہیں کہ کم بختو! کسی طرح سے تو سمجھو۔ یہ ہے وہ عذاب جو اس طرح سے آتا ہے۔ یہاں لفظ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ (6:65) ہے' اس کے معنی تو ذائقہ ہوتے ہیں لیکن یہاں وَ یَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (29:55) وہی لفظ یہاں آیا ہے۔ وہاں نصرف تھا کہ ہم لوٹا لوٹا کے' پھیر پھیر کے' لاتے ہیں۔ تو یہاں ذوقوا ہے۔ جب عذاب آئے گا یا اوپر کا طبقہ سب کو تباہ کرے گا' یا نیچے کا طبقہ سرکشی اختیار کرے گا تو ان سے کہا جائے گا کہ ذوقوا نتیجہ بھگتو۔ مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (29:55) جو تم کیا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم شروع سے آخر تک یہ کہتا ہے کہ یہ تباہیاں' یہ بربادیاں' یہ جسے عذاب کہتے ہو' یہ کہیں باہر سے نہیں لایا جاتا۔

ایک سزا تو وہ ہے کہ وہ ہنٹر والا یا بید والا اُس کو بید مارے تو باہر سے یہ سزا ملتی ہے۔ ایک سزا یہ ہوتی ہے کہ آپ اپنی انگلی آگ میں ڈال لیجیے' یہ تکلیف اُس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔ اس درد کو کوئی باہر سے پیدا نہیں کر رہا۔ آپ نے خلافِ قانونِ فطرت کچھ کیا تو یہ اُس کا فطری نتیجہ ہے۔ اسی طرح سے بعض معاوضے یا صلے ہوتے ہیں۔ وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ یہاں کسی مزدور سے کہیے کہ صاحب! یہ میری چٹھی ہے آپ مال روڈ[1] پہ جا کر فلاں دکاندار کو دے آیئے تو تمہیں ایک روپیہ دیا جائے گا۔ اُسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ چٹھی کیا ہے' وہ دکاندار کونسا ہے۔ اس کا مقصد چٹھی میں کیا ہے اور کیوں بھیجی جا رہی ہے سے نہیں ہوتا۔ اُس کا تو یہ کام ہے کہ اُس نے چٹھی پہنچائی اور جا کر ایک روپیہ لے لیا۔ اُس کا تو بس اتنا ہی واسطہ ہوتا ہے۔ جو کام اس نے کیا ہے یہ اس کام کا معاوضہ ہے جو اُسے خارج سے مل رہا ہے۔ اور آپ جو صبح اٹھ کر دو تین میل کی سیر کر آتے ہیں تو آپ سیر سے واپس آ کر گھر والوں سے یہ تو نہیں کہتے ہیں کہ ''مینوں اک روپیہ دیؤ میں تین میل چل کے آیا ہیگاں[2]''۔ آپ کو باہر سے تو کچھ نہیں ملتا بلکہ اس سے آپ کی صحت پہ اثر پڑتا ہے۔ یہ جو آپ نے سیر کی ہے تو وہ عمل خود نتیجہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جو آپ عمل کر رہے ہیں یہ اُس کا نتیجہ از خود مرتب ہوتا جاتا ہے' خارج سے کوئی یہ نہیں کر رہا۔ یہ جو اس طرح سے نتیجہ خود مرتب ہوتا ہے تو یہ ہے جسے قرآن قانونِ مکافاتِ عمل کہتا ہے۔ بعض صلے تو ایسے ہوتے ہیں کہ کام

---

[1] یہ لاہور پاکستان کے مشہور و خوبصورت سڑک کا نام ہے۔

[2] مجھے ایک روپیہ دو کیونکہ میں تین میل چل کر آیا ہوں۔

کیا تو کہیں سے صلہ ملا اور بعض صلے ایسے ہوتے ہیں کہ

صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ

باہر سے کچھ نہیں ملتا بلکہ وہ کام خود اُس کا صلہ ہوتا ہے۔ جہاں کہیں اس قسم کا صلہ ملتا ہے تو قرآن اُس کے متعلق کہتا ہے کہ **تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (45:28) جو کچھ تم نے کیا اُس کا بدلہ ملا۔ اور کہیں آتا ہے کہ **ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (29:55) جو تم نے عمل کیا وہی بدلہ تھا۔

خدا تو انسانی اعمال کا حساب ساتھ کے ساتھ کرتا چلا جاتا ہے

کہا کہ یہ تباہیاں' یہ خرابیاں' یہ عذاب' یہ نقصانات کہیں خارج سے نہیں آتے بلکہ وہ تو جو تم کر رہے تھے' اُس کے اندر سے یہ چیزیں تیار ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اتنے عرصے تک آہستہ آہستہ نتائج مرتب ہو رہے تھے۔ اسی لیے خدا نے اپنے آپ کو **سَرِيْعُ الْحِسَابِ** (2:202) کہا ہے کہ ہم تو ساتھ کے ساتھ حساب کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ پھر آپ کا بیلنس ہی آخر میں جا کر مرتب ہوتا ہے۔ یہ درمیان میں آہستہ آہستہ ہمارے اس قانونِ مہلت کے مطابق نتیجہ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے' اس کا ایک Accumulative Effect (مجموعی اثر) ہوتا ہے۔ جب وہ آخر میں وقت آ جاتا ہے کہ جب اُس نتیجے نے محسوس طور پہ سامنے آنا ہوتا ہے تو یہ چیز کوئی باہر سے نہیں لاتا۔ وہ قتل تو ایسی چیز ہے کہ جو کوئی باہر سے کسی کو قتل کرتا ہے' جو خود سنکھیا کھا کے یا آہستہ آہستہ افیون کھا کے ایک دن موت تک پہنچتا ہے تو وہ اُس کے عمل کے اندر نتیجہ خود موجود ہوتا ہے۔ تو یہ جو چیز ہے کہ **وَ يَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (29:55) جو کچھ تم کر رہے تھے وہی اس محسوس شکل میں تمہارے سامنے آیا ہے۔ یہ ہے وہ عذاب' تباہی جس کے لیے کہا کہ یہ بڑی جلدی مچا رہے ہیں کہ آتا کیوں نہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ شکر گزار ہوں کہ خدا نے یہ مہلت کا وقفہ رکھا ہے کہ اگر کسی وقت بھی ہماری آنکھیں کھل جائیں تو ہم اس روش سے باز آ جائیں' گاڑی کو پھر سے اُس پوائنٹ پہ لے جائیں جہاں سے کانٹا بدلا تھا۔ بجائے اس کے کہ شکر گزار ہوں' اُلٹے گلہ طراز ہوتے ہیں کہ ہوتا کیوں نہیں ہے' آتا کیوں نہیں ہے' یہ یونہی ہے جو کچھ تم کہہ رہے ہو۔ اُن سے کہا جاتا ہے کہ تھوڑا سا انتظار کیجیے وہ وقت آ رہا ہے' جب وہ وقت آئے گا تو پھر یہ کسی کے تابع نہیں چلے گا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ العنکبوت کی آیت 55 تک آ گئے' 56 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط



سولھواں باب: **العنکبوت** (آیات 56 تا 59)



عزیزانِ من! آج جولائی 1979ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 56 سے ہو رہا ہے: (29:56)۔

انبیائے کرام کی طرف سے ہجرت کے عمل کو میدانِ عمل سے لاتعلق شمار کرنا صحیح نہیں

سابقہ آیات میں اُس کشمکش کا ذکر چلا آ رہا تھا جو دین یعنی نظامِ خداوندی کے داعی اور اُس کی مخالف قوتوں کے درمیان برپا ہوتی ہے۔ اُس کشمکش میں جیسے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم میں تمام انبیائے کرامؑ کی یہ جو پوری کی پوری سرگرمیوں کی داستان ہے اس میں وہ مقام ضرور آ جاتا ہے، جسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ یورپ سے تو گلہ نہیں تھا' اُنہوں نے تو اس کا ترجمہ Flee (بھگ جانا) کیا اور بات کہاں سے کہاں پہنچا دی' اس کا ترجمہ فرار ہوا تو گویا انہوں نے یہ تصور دیا کہ اس کشمکش میں یہ داعی' یہ انقلابی' یہ دعوت دینے والی جماعت' میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی تھی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔

وحی کے الفاظ اور اس کے حقائق کو تراجم میں پیش ہی نہیں کیا جا سکتا

ہمارے ہاں کے بھی بعض انگریزی کے مترجمین نے یہی لفظ اختیار کیا ہے۔ اُس کے بعد کچھ آئے تو انہوں نے کچھ تھوڑا سا اس کو Improve (بہتر) کیا اور اس کو Migration (نقل مکانی) کہا۔ اس سے بات نہیں بنتی۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، میں ہی

نہیں کہہ رہا بلکہ یہ خود یورپ کے بھی ایسے عربی زبان کے فاضل، جنہوں نے قرآن پہ غائر نگاہ کی ہے، مثلاً گب (Gibb) جیسا شخص ہے، وہ ماڈرن رجحاناتِ اسلام [1] میں لکھتا ہے اور اپنے ہاں کے بڑے بڑے ترجمہ کرنے والوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا کہ تم قرآن جیسی کتاب کا ترجمہ کرنے بیٹھ گئے ہو، کیا کبھی اس قسم کی کتابوں کے ترجمے ہو سکتے ہیں۔ اُس کا بڑا خوبصورت پیکج ہے۔ اُس کے بعد اُس نے قرآنِ کریم کے چھ [2] لفظ پیش کیے اور اُنہیں کہا ہے کہ تم سارے مل کر ذرا اس کا ترجمہ کر کے بتا دو۔ تم یہ کر ہی نہیں سکتے۔ یہ کتاب تو وہ ہے، یہ عربی زبان کی کتاب ہے۔ عربی زبان کے مرادفات یا وسعت کی یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک چیز کے لیے ہزار ہزار پانچ پانچ سو الفاظ ہیں مثلاً اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744)، اور تلوار کے لیے ایک ہزار، شیر کے لیے پانچ سو الفاظ ہیں [3]۔ یعنی اتنی وسیع زبان ہے کہ اتنے مرادفات اُس میں ملتے ہیں۔ عربی زبان میں جو تفسیریں لکھی گئیں تو ان میں ایسی تفسیریں بھی ہیں مثلاً جلالین ہے۔ وہ اُنہوں نے تفسیر نہیں لکھی بلکہ کیا یہ ہے کہ قرآن کی آیت کے لفظ قوسین میں لکھ دیئے اور اُس کے ساتھ عربی زبان کا ہی دوسرا مرادف لفظ لکھ دیا کہ اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ اب اگر قرآن کے الفاظ کو الگ کر کے جو اُس کے مرادفات اُنہوں نے لکھے ہیں اُنہیں پڑھ کر دیکھیے تو اُس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُسی زبان کے مرادفات ہیں، اور وہ لکھنے والے عربی ادب کے بڑے امام ہیں۔ وہی زبان ہے، اُسی زبان کے مرادفات ہیں اور یہ اُس زبان کے بڑے ادیب ہیں۔ وہ اُس لفظ کی جگہ لفظ لکھتے ہیں اور دونوں لفظوں کے اندر نظر آ جاتا ہے کہ کتنا فرق ہے چہ جائیکہ دوسری زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔

مذہب اور دین کے بنیادی فرق کو سمجھے بغیر قرآن کا نظام سمجھ میں نہیں آ سکتا

ہجرت کے متعلق میں نے عرض کیا کہ اس کا Migration (نقلِ مکانی) یا Flee (فرار) ترجمہ کیا تو ساری بات ہی مسخ ہو کر رہ گئی۔ اُنہیں ہم کیا قصوروار ٹھہرائیں کہ دین کا تصور ہی ان کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا بلکہ وہاں تو مذہب کا تصور تھا۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری ساری زندگی اس میں بسر ہو گئی ہے کہ میں مذہب اور دین کا فرق نمایاں کر کے آپ کو بتاؤں۔ بس اگر یہ فرق سمجھ میں

---

[1] Gibb, H.A.R.: Modern Trends in Islam (1945, P.4)

[2] وہ آیت جو اس نے اپنے ہاں "اسلام میں جدید رجحانات" میں لکھی ہے، یہ ہے: اِنّا نحن نحی و نمیت والینا المصیر (50:43)۔ وہ اس کا انگریزی میں ترجمہ دینے کے بعد لکھتا ہے کہ

It is impossible to present in English (or perhaps any other language) the force of the five-times repeated "We" in the six words of the original.

[3] جو قارئین یہ دیکھنا چاہیں کہ کسی دور میں، کسی قوم کی زبان میں کتنے الفاظ ایسے تھے جو تصورات (Concepts) کے مظہر تھے، ان کے لیے رچرڈ مورس بک (Richard Maurice Bucke) کی کتاب Cosmic Consciousness (آفاقی شعور) بڑی کارآمد ہے۔ ان الفاظ کے تصوراتی مشتقات (Root-Concepts) سے اس قوم کی ذہنی سطح کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آ جائے تو اسی سے سارا اسلام سمجھ میں آ سکتا ہے۔ خدا کی طرف سے دین ملتا تھا' ایک نظامِ زندگی تھا' ایک ضابطۂ حیات تھا جس کے لیے اپنی آزاد مملکت کا وجود ناگزیر تھا۔ اُس مملکت کے اندر ایک نظام ہے یا نظامِ حکومت آپ کہہ لیجیے بلکہ حکومت کا لفظ بھی نہیں' ایک نظامِ زندگی ہے' پوری زندگی کا ایک نظام ہے جس کے لیے کم از کم جس کو یہ سیاسی آزادی کہتے ہیں' پہلا قدم یہ ہے کہ ایک ایسا خطۂ زمین ہو جس میں کسی دوسرے کا کوئی سیاسی' معاشی' معاشرتی دخل نہ ہو۔ اپنی نئی بنیادوں کے اوپر وہاں یہ نظام قائم ہوتا ہے۔ یہ ہے دین۔ اس کے برعکس یہ جتنی مفاد پرست قوتیں ہیں مثلاً ملوکیت' آمریت یا آج کے دور میں ڈکٹیٹر شپ' تو یہ بات وہی ہے جو پہلے دور میں ملوکیت ہوا کرتی تھی۔ نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت بھی یہی ہے۔ یہ انسانوں پر کسی انسان کی جو حکومت ہے' یہ سب اُس کی یہی شکلیں چلی آتی ہیں۔

مذہب کو عام کرنے اور پھیلانے میں مذہبی پیشوائیت کی تکنیک

اس نظامِ خداوندی یعنی دین کے اندر انسانوں کی انسانوں پر یہ حکومت باقی نہیں رہتی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ اُس کے بعد وہ رسول اس دین کو قائم کر کے چلا جاتا' بعد میں یہی قوتیں پھر سر اٹھاتیں اور مذہبی پیشوائیت ان کی سرِ خیل ہوتی' آگے آگے ہوتی' وہ اُس نظام کے تصور کو مسخ کر دیتی۔ اُس کی تکنیک یہ ہوتی تھی اور وہ آپ کو معلوم ہے کہ جھوٹ کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ سچ کے لباس میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ ایک شخص آ کر کسی معاملے کے متعلق تمام باتیں جھوٹی کرتا چلا جائے' یقین دلاتا چلا جائے' کہ میں جو کہہ رہا ہوں بالکل سچ کہہ رہا ہوں' آپ مطمئن ہو جائیں اور اگر آخر میں اٹھتے وقت وہ یہ کہے کہ میں نے جو کچھ کہا تھا جھوٹ کہا تھا تو اُس کی ساری سازش ناکام رہ جائے گی۔ وہ کبھی کسی جگہ بھی یہ نہیں کہے گا کہ میں نے جھوٹ کہا تھا' وہ سچا بن کر سامنے آئے گا تو لوگوں کو فریب دے سکے گا۔ یہ مذہبی پیشوائیت کی جو تکنیک تھی کہ اپنے جھوٹ کو دین کے' سچ کے' لباس میں پیش کرے' وہ تکنیک یہ تھی کہ وہ زبان وہی ہے جس زبان میں رسول وہ نظامِ خداوندی یا انقلاب یا وحی لایا تھا تو اُسی زبان کے وہی الفاظ استعمال کرتے تھے لیکن مفہوم بدل لیتے تھے۔ اور اگر وہ نہیں ہے تو پھر ترجمے میں تو بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ ایک تو یہ کرتے تھے کہ وحی کے الفاظ کے مفہوم بدل دیتے تھے اور دوسرے یہ کہ اُس رسول کے دور میں یہ جو نظام کے کچھ ارکان ہوتے ہیں' وہ جو محسوس شکلوں میں سامنے آتا ہے' وہ تو اُس پروگرام کی تکمیل کے لیے محسوس شکلیں اختیار کرنا پڑتی ہیں' جیسے فوج کے لیے صبح کی پریڈ بھی لازمی ہوتی ہے' وہ وردی بھی لازمی ہوتی ہے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہوتی' یہ تو ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ دین میں اُن چیزوں کو اختیار کیا جاتا ہے جسے آپ ارکان کہتے ہیں۔ وہ یہی ہیں جسے آپ صوم' صلوٰۃ' حج اور زکوٰۃ کہتے ہیں۔

آج ہمارے ہاں دورِاول کی تاریخ انہی خطوط کی ترجمانی کرتی دکھائی دے گی

صدرِاول کی تاریخ میں دیکھیے تو یہی چیزیں آپ کو ملتی ہیں۔اس کے علاوہ کوئی اور پروگرام آپ کو نظر نہیں آتا۔یہ کرتے یہ تھے کہ ان کی شکلیں اُسی طرح سے قائم رکھتے تھے لیکن ان کا مقصود و مفہوم بدل دیتے تھے۔اور لوگ مطمئن ہوتے تھے کہ یہ وہی ہو رہا ہے جو نبی نے کہا تھا۔فارم کے اعتبار سے' رسول کے اعتبار سے' تو وہی کچھ ہو رہا تھا لیکن اُس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا تھا۔جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں' یہ ایسا ہی ہے جیسے فوج سے نکلا ہوا سپاہی وردی ساتھ لے آئے' علی الصبح اٹھ کر پوری کی پوری وردی پہنے' اُسی طرح سے جیسے کہ وہ فوج میں کرتا تھا' اگر بندوق ہے تو لے' ورنہ ڈنڈا ہاتھ میں لے کر گلی میں گھنٹہ بھر لیفٹ رائٹ کرتا رہے۔اور وہ کہدے کہ میں فوجی فریضے کو سرانجام دے رہا ہوں' تو یہ وہ فریضہ تو سرانجام نہیں دے رہا۔مذہب کرتا یہ ہے۔اس لیے میں نے پھر دوبارہ زور دیا ہے کہ یہاں ایک لفظ ہجرت آ گیا ہے اور اُسی سے ساری بات واضح ہوتی ہے۔

نبی کے سامنے تو ایک مقصد ہوتا ہے' ایک منزل ہوتی ہے' جسے اس نے حاصل کرنا ہوتا ہے

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ یہ جو ہجرت ہے' یہ جو ایک نبی کا انقلابی پروگرام ہوتا تھا' اُس کے اندر ایک اسٹیج آتی تھی اور کم وبیش ہر نبی کے پروگرام میں یہ اسٹیج آئی۔نبی جس مقام پہ پیدا ہوتا تھا' جس قوم میں پیدا ہوتا تھا' تو سب سے پہلے وہ انہی کو دعوت دیتا تھا۔وہاں سے اُس کی مخالفت بھی ہوتی تھی' کچھ سعادت مند روحیں اُس کی آواز پہ لبیک بھی کہتی تھیں۔اس کے بعد جب وہ دیکھتا کہ یہاں اب میرے اس نظام کے کامیاب ہونے کا امکان نہیں ہے تو وہ وہاں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھا رہتا تھا کہ کوئی بات نہیں' کامیابی ہو یا نہ ہو' میرا فریضہ تو بانگ دیتے جانا ہے' اور اذان دیتا چلا جائے اور نمازی آئیں اور آ کر جو جی میں آئے کر کے چلے جائیں' میں نے تو اپنا فریضہ ادا کر دیا۔نبی اپنے آپ کو اس فریب میں نہیں رکھتا تھا (معاذ اللہ)۔اس کا تو فریب کا سوال ہی نہیں تھا۔اس کے سامنے تو ایک انقلاب آفریں مقصد تھا۔

اب پہلی چیز تو یہ ہے کہ ''ہجرۃ'' کے معنی ہیں: چھوڑ دینا' ترک کر دینا۔اس پروگرام میں جس جس چیز کو چھوڑنا پڑتا تھا وہ چیز بھی ہجرت ہوتی تھی اور آخر میں ایک ایسا مقام آجاتا تھا جہاں وہ دیکھتا تھا کہ یہاں پہ اس نظام کی کامیابی کے امکانات روشن نہیں ہیں۔وہ پھر کسی ایسی فضا کو دیکھتا تھا' ایسے مقام کو دیکھتا تھا جہاں اُس کو کامیابی کے امکان نظر آتے تھے۔وہ پاؤں جوڑ کر اُسی مقام پہ نہیں بیٹھا رہتا تھا کہ کوئی بات نہیں' میں تو فریضہ ادا کر رہا ہوں' اگر کامیاب نہیں ہوتا تو میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔وہ اپنے اُس وطن کو چھوڑ کر' اُس سرزمین کو چھوڑ کر' اپنی قوم کو چھوڑ کر' اُس فضا کی طرف چلا جاتا تھا جہاں اس انقلاب کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہوتے تھے۔یہ

جو یوں ترکِ وطن تھا تو اسے ہجرت کہا جاتا تھا۔ یہ بڑا اہم مقام ہے۔ ایک ہی جگہ رہ کر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چھوڑ دینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اپنا وطن' اپنا گھر' اپنی جائے پیدائش' اپنا ماحول' اپنا معاشرہ' ان سب کے اندر ایک عمر گزارنے سے ان کے ساتھ عجیب تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ وطن تو پھر اتنی اہمیت حاصل کر لیتا ہے کہ آج موجودہ دور کی سیاست میں تو اُس نے معبود کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ وطن کی خاطر یہ تمام جنگیں اور یہ تمام لڑائیاں اور یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن اس کے سامنے تو وطن بھی مقصود بالذات نہیں تھا۔ اتفاق ہے کہ جہاں یہ پیدا ہو گیا تھا' اس کے سامنے تو اُس نظام کو عملاً متشکل کرنے کا مقصد تھا۔ یہاں نہیں ہوتا تو قرآن نے کہا ہے کہ **وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا** (73:10)۔

کسی سے لاتعلقی بھی حسن کارانہ انداز کی رہین منت ہوتی ہے

یہ ''ہجر'' بھی وہی ہے جس سے لفظِ ہجرت ہے کہ ٹھیک ہے اب اگر یہ صورت ہے کہ یہاں امکانات نہیں ہیں' یہ لوگ ادھر آتے نہیں نظر آتے تو ان کو چھوڑ دو۔ **وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا** (73:10) یعنی کسی کے ساتھ جو بنانا ہے' کسی کے ساتھ جو تعلق قائم کرنا ہے' اُس میں تو حسن کارانہ انداز ہوتا ہی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کو چھوڑنا ہے' چھوڑ دو لیکن حسن کارانہ انداز سے چھوڑو۔ اسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ تو وہ مقصد کیا تھا کہ جس کے لیے یہ ہجرت ہوتی تھی؟

ہجرت کا مقصد

اگر مذہب ہی مقصود ہو تو اُس کے لیے کیا ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کوئی ایک مقام چھوڑ کر دوسرے مقام پہ جائے؟ مذہب میں تو پرستش' بندگی' پوجا پاٹ' عبادت' نماز روزہ ہوتا ہے۔ دوسری عبادتوں کو چھوڑ دیجیے یہ جسے میں نے نماز روزہ کہا ہے اسے لے لیجیے اور بتائیے کہ کونسی ایسی سرزمین ہے جہاں مسلمانوں کو نماز روزے کی اجازت نہ دی جاتی ہو۔ اور تاریخ میں بھی انبیائے کرامؑ کے لیے وہ کونسا مقام ایسا آتا ہے یا مسلمانوں کی ہسٹری میں آتا ہے جہاں مخالف قوتوں نے اُنہیں نماز روزے سے روک دیا ہو۔ پرستش کی اجازت تو ہر جگہ ہوتی ہے' کوئی قوم بھی اس میں مزاحمت نہیں کرتی۔ وہ قومِ شعیبؑ کا قصہ تو آپ کو معلوم ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ اُنہوں نے ان سے صلوٰۃ کے متعلق یہ کہا تو اُنہوں نے سمجھا کہ یہ پوجا پاٹ کی کوئی شکل ہے' اُنہوں نے کہا کہ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے' ہم اس طرح سے اپنے بتوں کی' معبودوں کی بھگتی پرستش پوجا کرتے ہیں تو تم اپنے طور پہ کرتے ہو۔ ہمیں اس میں کیا اعتراض ہے۔ اور جب وہ الصلوٰۃ آگے بڑھی ہے تو اُس قوم نے کہا کہ شعیبؑ! ہم نے تو کچھ اور سمجھا تھا۔ ہم نے سمجھا تھا کہ تُو صلوٰۃ کی اجازت مانگتا ہے تو نماز پڑھ لیا کرے گا۔ تیری صلوٰۃ تو کچھ ایسی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کریں' یہ کس قسم

کی صلوٰۃ ہے؟ اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اور کہا کہ یا تو مہربانی کر کے اپنی پرانی روش پہ آجایئے ورنہ ہم تمہیں خود اس ملک سے نکال دیں گے۔ یعنی مقام وہ آجاتا ہے کہ اگر یہ اُس وطن کو نہیں چھوڑتا تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ تو یہاں پرستش' بندگی کی بات تو نہیں ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیّبہ میں آپؐ مکے میں تھے۔ اگر نماز ہی کی بات ہے تو حضورؐ نے اس کی ابتدا بھی نہیں کی تھی۔ عرب کے اندر حنیف کچھ افراد تھے' ایک مسلک تھا' ایک مذہب تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم حضرتِ ابراہیمؑ کے مسلک پہ ہیں' اسی لیے اپنے آپ کو وہ حنیف کہتے تھے۔ اور وہ نماز پڑھتے تھے۔ باقی قریش تو بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ وہ حنیف خدا کی بندگی' پرستش کرتے تھے۔ ان قریش نے اُنہیں کبھی کچھ نہیں کہا تھا' کوئی مزاحمت نہیں کی' کوئی مخالفت نہیں کی۔ تو بات اگر یہاں بھی نماز ہی پڑھنے کی تھی تو ان کی نماز کیوں ایسی تھی کہ وہ اتنی مخالفت کرتے چلے گئے۔ پتہ چلا کہ یہ وہ نماز نہیں تھی' بات کچھ اور تھی۔

بیعت کا مقصود و منتہا

یہی ہجرت ہے جس کے لیے جب مدینے والوں نے آپ ﷺ کو دعوت دی ہے تو یہ واقعہ بڑا اہم ہے جو موجود ہے۔ اُنہوں نے آپ ﷺ کو دعوت دی تھی اور دعوت میں یہ کہا تھا کہ ہم آپ ﷺ کی حفاظت کریں گے' آپ ﷺ کو پناہ دیں گے' آپ ﷺ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اس بات کے اوپر آپ ﷺ ان سے وعدہ لیتے تھے' بیعت لیتے تھے' عہد لیتے تھے تو ان میں سے ایک ایک آتا تھا اور اس بات کا معاہدہ کرتا تھا۔ ان کا جو سردار تھا' وہ دروازے میں کھڑا تھا' اُس کے یہ الفاظ ہیں' کہ تم اندر جا کر بڑی آسانی سے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر یہ معاہدہ کر رہے ہو' تم نے کچھ سمجھا بھی ہے کہ اس معاہدے کے معنی کیا ہیں' اس کے مضمرات کیا ہیں' اس سے ہوگا کیا؟ سنو! تمہارا یہ معاہدہ عرب اور عجم سے اعلانِ جنگ کے مرادف ہے' لہٰذا سمجھ کر معاہدہ کرنا۔ گویا نظر آیا کہ یہ جو انقلاب تھا' یہ جو اعلان تھا' یہ جو دعوت تھی' یہ کوئی نماز پڑھنے کی بات نہیں تھی' کوئی پوجا پاٹ' بھگتی اور پرستش کی بات نہیں تھی بلکہ یہ تو عرب اور عجم کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ یہ تھا وہ ہجرت کا مقام اور پھر وہ ہوا۔ ہر نبیؑ کی زندگی میں اور نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیّبہ میں بھی ہوا۔ نبی اکرم ﷺ کی ہجرت کے بعد کی زندگی آپ دیکھ لیجیے' دوسرے ہی سال 2ھ' ہجرت کے بعد پہلی دفعہ' جو حکم دیا گیا تھا وہ تو جسے ہم یہ صیام کہتے ہیں' یہ روزے فرض ہوئے' جب میں روزوں پہ آؤنگا تو یہ بات وہاں عرض کرونگا۔

مذہب میں نتائج پر غور ہی نہیں کیا جاتا جب کہ دین معاشرتی سطح پر ہر آن ایک نئی منزل کی نوید دیتا ہے

قرآنِ کریم نے جہاں کوئی حکم دیا ہے تو اُس کے ساتھ بتا دیا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ دین اور مذہب میں یہی فرق ہوتا ہے۔ مذہب میں یہ کچھ کرتے رہنا ہوتا ہے' نتیجے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' اُس کا نتیجہ نکلتا ہی کچھ نہیں' مکینکل (میکانکی) حرکات کا نتیجہ کیا نکل سکتا

ہے۔ دین میں ہر پروگرام کا متعین نتیجہ ہوتا ہے کہ یہ کرو گے تو یہ ہو کر رہے گا۔ یہ **کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ** (2:183) کے متعلق جو حکم دیا ہے تو اس کا کیا نتیجہ تھا؟ یہ کہ **لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ** (2:185) تا کہ ہم تمہیں جو Guidance (ہدایت و رہنمائی) دے رہے ہیں' Directions (ہدایت) دے رہے ہیں' اس کی بنا پر خدا کی کبریائی مسلط ہو جائے۔ اس لیے روزے فرض کیے گئے۔ کبریائی تو Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کو کہتے ہیں۔ کون جانے کہ یہ کیا چیزیں ہیں' کیا کہہ گیا ہے؟ اس لیے روزے فرض کیے ہیں تا کہ تم خدا کی کبریائی کو ثبت (Establish) کر سکو۔

نبی اکرمؐ کی ذات کے لیے لفظ ہجرت انسانیت کی سطح پر ایک بہت بڑے پروگرام کا حصول ہے

قرآنِ کریم میں ہے کہ **وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (45:37) خارجی کائنات میں تو خدا کی کبریائی از خود قائم ہے' ہر شے اُس کے قانون کے تابع سرگرمِ عمل ہے۔ یہ ہے کبریائی۔ انسانی دنیا میں یہ کبریائی انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کو سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا کہ **وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا** (17:111)۔ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ اے کپڑا لپیٹنے والے! اے لحاف اوڑھنے والے! **قُمْ** (74:2)۔ یہ **قُمْ** تو بڑی عجیب چیز ہے۔ خزاں کے درخت پہ زندگی کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا' آخری پتی تک بھی اُس میں سے جھڑ جاتی ہے۔ **قم** ۔ اٹھ کھڑا ہو۔ اس قسم کے خزاں دیدہ معاشرۂ انسانی میں اس کے بعد اُسی درخت میں نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں' نئی زندگی کے آثار کو لیے ہوئے تبسم کناں غنچے چٹکتے ہیں' پھول کھلتے ہیں۔ یہ جو اُس خزاں کے بعد کیفیت ہوتی ہے' عربی زبان میں اُسے ''مدثر'' کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ کائنات کے خزاں دیدہ درخت کو بہارِ نو سے آشنا کرنے والے! اٹھ! (74:1-2) اور **وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا** (17:111) اُس کی کبریائی اس دنیا کے اندر قائم کر۔ **لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ** (2:185) تا کہ خدا کی کبریائی کو تُو قائم کرے اور ان ہدایات کے مطابق کرے جو اُس نے دی ہیں۔ انہوں نے ابھی 17 ہی روزے رکھے تھے کہ بدر کے میدان[1] میں آنا پڑا۔ وہ پہلی جنگ تھی۔ اُس کے متعلق سورۃ توبہ میں ہے کہ یہ اس لیے ہے تا کہ **كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا** (9:40) خدا کی بات اونچی ہو' خدا کا قانون اونچا ہو' خدا کا نظام ثبت ہو۔ جنگ کا مقصد یہ تھا۔ وہاں بدر کے میدان کے اندر **لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ** کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ وہ جو انہوں نے کہا تھا کہ یہ عجم اور عرب کے خلاف اعلانِ جنگ ہے' تو دوسرے ہی سال وہ چیز سامنے آ گئی۔ یہ کیا چیز تھی کہ یہ جب تک وہاں قریش میں رہے تو وہ اپنے ہاں کے لوگوں کو بھی نماز پڑھنے سے نہیں روکتے تھے۔ وہاں سے یہ مدینے میں آئے ہیں تو اُنہوں نے کہا ہوگا اچھا ہوا کہ یہاں سے نکل گئے لیکن پھر کیا تھا کہ وہاں سے ہجوم کر کے یہاں مدینے آئے ہیں اور یہاں آ کر

---

[1] جنگِ بدر: 17 رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء۔

اُنہوں نے حملہ کیا ہے۔ اُنہیں اس کے اندر کیا چیز نظر آتی تھی؟ وہ انقلاب نظر آتا تھا' وہ جانتے تھے کہ اُس میں مفاد پرستانہ' سرمایہ دارانہ' آمریت کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔ اُنہیں پتہ تھا کہ قریش کی ساری دولت' عظمت' حشمت' مٹ جائے گی اگر کہیں یہ نظام قائم ہو گیا۔ یہ تھی ہجرت اور ہر نبی کی دعوت میں یہ مقام آتا تھا کہ وہ اپنے ہاں کا وطن چھوڑ کر اُس مقام کی طرف جاتا تھا جہاں اس نظام کے قائم ہونے کے امکانات زیادہ روشن نظر آتے تھے اور وہاں جا کر وہ اس نظام کو قائم کرتا تھا۔ تو کیا اس کو آپ Flight (فرار) کہیں گے' یا کیا یہ Migration (نقلِ مکانی) ہوگی؟

لفظ ہجرت کی ترجمانی اقبالؒ کی زبانی

عزیزانِ من! یہ تو بات ہی کچھ اور ہے' یہ ایک پروگرام ہے۔ پھر وہی اقبالؒ (1877-1938) یاد آ گیا' اُس کو اللہ تعالیٰ نے یہ عجیب سعادت دی تھی کہ قرآن کے ان مفاہیم کو اپنے حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ ہجرت کے متعلق کہتا ہے کہ

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است

ہجرت انبیائے کرامؑ کی ہی بات نہیں ہے یہ تو ایک مسلم کی زندگی کا آئین ہے۔

ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

اس سے ثبات قائم ہوتا ہے اور پھر آگے تشبیہہ ہے۔ پہلے تشبیہہ سے ان عربوں کو سمجھایا گیا ہے۔ ہمارے ہاں تو پانی کی کچھ قدر ہی نہیں ہے' اتنا مل جاتا ہے' ٹونٹی کھولیے تو پانی مل جاتا ہے لیکن اُن ملکوں میں جہاں کہیں اگر ایک چشمہ ہے تو بس وہ چشمہ زندگی کا مرکز ہے' وہیں چار درخت اگ آتے تھے تو وہ نخلستان بنتا تھا وہ ان کا باغ ہوتا تھا۔ یہ تھے ہی بادیہ نشین' صحرا نشین' خانہ بدوش۔ ان میں خانہ بدوش کی یہ اصطلاح بڑی خوبصورت ہے۔ خانہ بدوش یعنی اپنا گھر کندھے پہ اٹھائے ہوئے چلے جا رہے ہیں' ''ایہہ جیہڑے پکھی واس ہوندے نیں[1]''۔ عربوں کی زندگی صحراؤں میں یہ تھی کہ جہاں کہیں پانی ہوا تو وہاں آ کر انہوں نے ڈیرہ ڈال لیا۔ اب اگلی بات یہ ہے کہ اگر اُس چشمے سے پانی ختم ہو جائے تو کیا پھر بھی وہ وہیں بیٹھے رہتے تھے؟ نہیں' اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ پانی ختم ہوا تو اُنہوں نے وہاں سے نقلِ مکانی کی اور دوسری جگہ چلے گئے جہاں پانی ہے۔ یہ سمجھانے کے لیے بڑی عمدہ چیز تھی۔ اسے آپ ان کی ہجرت کہیں گے کہ جہاں زندگی کے اسباب موجود ہیں وہ وہاں ٹھہر گئے۔ جب تک دیکھا کہ وہاں زندگی کے آثار موجود ہیں' وہ وہاں ٹکے رہے' جونہی دیکھا کہ وہ اسباب وہاں نہیں ہیں تو پھر جس جگہ موجود ہیں وہ وہاں چلے گئے۔ اسی کو اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ

---

[1] یہ جو خانہ بدوش ہوتے ہیں۔

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنئ او از تنک آبی رم است

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس چشمے سے پانی خشک ہو جائے تو وہاں سے اٹھ کر اُس چشمے کی طرف چلا جائے:

معنی او از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

یہ شبنم کے قطرے کو چھوڑ کر سمندر کو فتح کرنے کی طرف جانا ہے۔ یہ کتنی خوبصورت تشبیہہ ہے۔

قرآنِ حکیم کی نظر میں مہاجرین کا مقامِ بلند اور ہجرت نہ کرنے والوں کا ذکر

کہا کہ یہ ہے ہجرت۔ نبی کی انقلاب آفریں زندگی کے پروگرام میں یہ بڑی اہم اسٹیج ہے۔ اسے اتنی اہمیت حاصل ہوتی ہے کہ پروگرام کا نیا باب آتا ہے' اُس کے بعد نیا ورق الٹتا ہے۔ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے کہ یہ مجاہدین اور مہاجرین ساتھ کے ساتھ چلے جاتے ہیں بلکہ پہلے مہاجرین ہیں پھر مجاہدین آتے ہیں۔ جس مقام کی طرف نبی ہجرت کر کے جاتا ہے' وہاں اس کا امکان ہوتا ہے۔ جہاں وہ پہلے ہوتا ہے' وہاں اس کا امکان باقی نہیں رہتا۔ حضور ﷺ جب ہجرت کر کے گئے ہیں تو جو لوگ پیچھے رہ گئے' خواہ وہ مکے میں ہوں یا کسی دوسری جگہ ہوں اور وہ ہجرت کر کے نہیں گئے ہیں' تو اُس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآن نے اسے کن الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِىْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ (4:97) یہ لوگ جو اس طرح سے پاؤں توڑ کر مطمئن ہو کر وہیں بیٹھے رہے اور ہجرت کر کے وہاں نہیں گئے جہاں رسول اور جماعت گئی تھی' تو ٹھیک ہے یہ طبعی زندگی کے چار دن تو گزار لیں گے' لیکن بات یوں کی ہے کہ جیسے موت کے وقت فرشتے ان سے پوچھیں گے کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تم دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر رہے تھے۔ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ (4:97) اُنہوں نے کہا کہ ہم یہاں بڑے کمزور تھے' ناتواں تھے۔ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (4:97) اگر یہاں اس کا امکان نہیں تھا تو کیا تم مجبور تھے' مقہور تھے' بے کس تھے' بے بس تھے؟ کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ یہاں سے اٹھ کر وہاں چلے جاتے؟ کہا کہ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ (4:97) مومن ہیں' وہاں بیٹھے ہوئے بھی بہرحال ان احکام کی اطاعت کرتے ہی تھے' مذہب کے رنگ میں تو ضرور ہی کرتے ہونگے۔ اُس کے باوجود کہا ہے کہ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ (4:97) سیدھے جہنم میں جائیں گے۔ وَ سَآءَتْ

مَصِیۡرًا (4:97) کتنا بُرا ہے' وہ لوٹ کے جانے کا ٹھکانہ! گویا اس کی اہمیت اتنی ہے لیکن یہ تو قرآن ہے' خدا کا ارشاد ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ ہم تو کمزور تھے' ناتواں تھے' بے کس تھے' بے بس تھے' اس لیے نہیں گئے تو اُنہیں تو یہ کچھ کہا گیا۔

اگلی ہی آیت میں ہے کہ واقعی کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جو اس چیز کو بطور عذر پیش نہیں کرتے تھے کہ ہم اس لیے نہیں گئے کہ کمزور تھے' وہ واقعی اس حالت میں ہوتے تھے۔ اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الۡوِلۡدَانِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ حِیۡلَۃً وَّ لَا یَہۡتَدُوۡنَ سَبِیۡلًا. فَاُولٰٓئِکَ عَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّعۡفُوَ عَنۡہُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا (4:98-99) ایسے لوگ تھے جو وہاں بیٹھ کر بھی کوئی انقلاب آفریں قدم نہیں اٹھا سکتے تھے اور ان کے اوپر راستے بھی بند کر دیئے گئے تھے کہ وہ کہیں جا بھی نہ سکیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو واقعی معذور سمجھے جائیں گے' ان کے لیے جو کچھ آگے چلنے کی راہیں ہیں' تو ان کے متعلق خدا سوچے گا۔ گویا پروگرام میں ہجرت ایک ایسی کڑی آتی ہے کہ اگر راستہ کشادہ ہو' دوسری جگہ موجود ہو' اُس کے باوجود اگر وہ وہاں اٹھ کر نہیں گئے تو اُس کے متعلق کہا ہے کہ یہ سیدھے جہنم میں جائیں گے۔ اگر فی الحقیقت ایسے حالات میں کوئی ہے کہ نہ وہ وہاں کچھ کر سکتا ہے نہ جانے کا راستہ پا سکتا ہے تو کہا کہ ہاں' اس حد تک یہ قابلِ معافی ہیں اور ان کے لیے ہم کچھ راستہ کریں گے۔ آخر الامر جانا ان کو بھی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ تمام مسلمان جہاں بھی تھے' وہ سب کے سب یہاں جمع ہو گئے تھے۔

اگلی آیت میں یہاں تک بھی کہہ دیا کہ وَ مَنۡ یُّہَاجِرۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ یَجِدۡ فِی الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا کَثِیۡرًا وَّ سَعَۃً (4:100) یہ جو چیز ہے کہ یہاں سے اٹھ کر جائیں گے تو دنیا تنگ ہو جائے گی' پتہ نہیں کچھ کھانے کو بھی ملے گا یا نہیں۔ کہا کہ یہ بات غلط ہے۔ تم اٹھ کر جاؤ تو سہی' دیکھو تو سہی کہ ایک دروازہ بند ہوگا تو ہم تمہارے لیے سات دروازے کھولیں گے' ہماری زمین بڑی وسیع ہے' جاؤ وہاں اور دیکھو۔ آگے ہے کہ وہ یہی نہیں ہے کہ وہ یہاں سے نکلا ہے اور اپنوں کے پاس جا پہنچا ہے اور اس انقلاب میں حصہ لیا ہے تو پھر جا کر کچھ بدلہ ملے گا۔ آیت کے آگے ہے کہ اٹھ کر جانے والے کی اگر راستے میں موت بھی آ جائے گی تو ہم اسے بھی مہاجر ہی سمجھیں گے۔ بات تو اس نیت کی تھی جس کے لیے یہ اٹھا تھا' اس پہ تو اُس کو قابو نہیں تھا کہ واقعی وہاں زندہ پہنچ جائے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہجرت کا پروگرام اتنا اہم ہے۔

ہم نے عبادت کے بلند ترین مفہوم کو محدود ترین سوچ کا قیدی بنا رکھا ہے

اب یہاں اس آیت پہ آیئے۔ کہا ہے کہ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِیۡ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعۡبُدُوۡنِ (29:56) اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! ہماری زمین بڑی وسیع ہے اس لیے تمہیں یہیں پاؤں توڑ کر بیٹھے نہیں رہنا چاہیے' اٹھنا چاہیے' وہاں جانا چاہیے۔

پھر فوراً ہی کہا کہ فَاعْبُدُوْنِ (29:56). عبادت عربی زبان میں ہے۔اب ہمارے ہاں عبادت کا لفظ عربی زبان میں رہے یا اس کا ترجمہ پرستش کیا جائے تو معنی اس کے پرستش ہی کے رہ گئے۔ یہ پوجا پاٹ' بندگی' بھگتی رہ گیا۔ پرستش فارسی کا لفظ ہمارے ہاں آ گیا۔ آہستہ آہستہ لفظ عبادت نے بھی پرستش کے ہی معنی اختیار کر لیے: یہ شخص بڑا عبادت گزار ہے' نمازیں تو پڑھتا ہی ہے' یہ ساتھ میں ساری رات نفل پڑھتا ہے' تسبیح پھیرتا ہے' روزے رکھتا چلا جاتا ہے۔عبادت پرستش ہی کے معنی کے اندر رہ گیا۔ میں خدا کی پرستش کرتا ہوں' اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔ بندگی' پرستش رہ گیا۔سوال یہ ہے کہ یہاں جو کہا کہ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ (29:56)۔اگر سوال پرستش کرنے کا ہی تھا تو جہاں یہ بیٹھے ہوئے تھے تو پرستش سے تو ان کو یہاں بھی کوئی نہیں روکتا تھا۔ یہ کہنا کہ تم یہیں کیوں اطمینان سے بیٹھے رہے' کیوں اٹھ کر نہیں گئے' ہماری زمین اتنی وسیع تھی' نقلِ مکانی کر کے' ہجرت کر کے' وہاں کیوں نہیں گئے جہاں اس نظام کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔سوال تو یہ ہے کہ اگر فَاعْبُدُوْنِ کے معنی پرستش یا بندگی یا پوجا ہی کرنا ہے تو اس ہجرت کی کیا ضرورت تھی۔فَاعْبُدُوْنِ کے یہ معنی نہیں ہیں' عبادت کے یہ معنی تو ہیں ہی نہیں' عبدیت کے تو یہ معنی ہیں ہی نہیں۔اس کے تو معنی ہی محکومیت اختیار کرنے کے ہیں۔عربی زبان میں بھی اور قرآنِ کریم میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں آتا ہے یعنی کسی کی محکومیت اختیار کرنا۔

دین قرآنِ کریم کی متعین کردہ حدود کے تحت نظام کی تشکیل کا نام ہے

اب بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہاں بیٹھ کر نماز روزے کی تو تمہیں اجازت تھی لیکن محکومیت تو انسانوں کی تھی۔محکومیت اگر انسانوں کی ہو اور اُس کے اندر اگر تم مذہب کے ان ارکان کے اوپر کاربند رہو تو یہ دین نہیں ہے۔دین کے معنی یہ ہیں کہ قرآنِ کریم یا احکامِ خداوندی یا کتاب اللہ یا اللہ کی محکومیت کے اندر آنا ہے۔کسی انسان کی حکومت' وہ کسی انداز اور کسی شکل میں بھی ہو' دین نہیں ہے' وہ اسلام نہیں ہے' کفر ہے۔جب وہ مومن اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کہتا ہے تو یہ اعلان ہے کہ ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں' کسی اور کی نہیں۔یہ تو بہت بڑا اعلان ہے' بہت بڑی بغاوت ہے' بہت بڑی سرکشی ہے۔یعنی ہم کسی نظام کے بھی تابع نہیں رہے' ہم کسی حکومت کی بھی محکومیت اختیار نہیں کرتے' اگر وہ انسانوں کی حکومت ہے۔اور اسی کے لیے جسے استخلاف فی الارض کہتے ہیں اپنی آزاد مملکت کا موجود ہونا دین کے لیے لازمی چیز ہے۔ جہاں کسی اور کی حکومت قائم ہو تو اُس کے اندر آپ مذہب پہ تو کاربند رہ سکتے ہیں لیکن دین پہ کاربند رہنے کی اجازت تو نہیں دیتے۔دین تو اپنا نظام قائم کرتا ہے' ان کے نظام کو تو سب سے پہلے اکھیڑتا ہے۔کہا ہے کہ مَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (2:256) سب سے پہلے تو انسانی نظام کے خلاف سرکشی اختیار کرنا ہے' اُس کو مٹانا ہے اور اُس کے بعد نظامِ خداوندی قائم کرنا دین ہے۔

خدا کا وعدہ ہی خدا کے قانون کا ترجمان ہوتا ہے

یہ ہے وہ مقصد استخلاف کا۔ یہ میں اس لیے عرض کررہا ہوں کہ یہ نظر آئے کہ یہ لفظ کہاں کہاں آتا ہے۔ **وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (24:55) یہ ہمارا وعدہ ہے۔ جب خدا کہتا ہے کہ میرا وعدہ ہے تو اُس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ میرا قانون یہ ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ ہم وعدہ خلافی نہیں کرتے تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کا یہ نتیجہ لازماً نکل کر رہے گا۔ اگر وہ نتیجہ نہیں نکلتا تو سمجھ لیجیے کہ ہم اُس قانون کا اتباع اُس طرح نہیں کر رہے جیسا خدا چاہتا ہے۔ خدا کا یہ وعدہ ہے کہ ایمان اور عملِ صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں استخلاف' مملکت' آزادی' اپنی حکومت قائم ہوگی۔ تو جو اپنی حکومت ہے وہ تو اور طریقوں سے بھی قائم ہوجاتی ہے' ہلاکو اور چنگیز سے بھی ہوجاتی ہے' دنیا میں اور قوموں کی حکومت بھی قائم ہوئی ہے۔ کہا ہے کہ یہ حکومت قائم ہونا مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ ایک مقصد کا ذریعہ ہے۔ وہ مقصد کیا ہے؟ کہا کہ **لَیُمَکِّنَنَّ لَھُمۡ دِیۡنَھُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَھُمۡ** (24:55) اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ دین جو خدا نے تمہارے لیے منتخب کیا ہے' وہ Establish (قائم) ہوجائے۔

دین کے Establish (قائم) ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ پھر وہاں معاشرے میں خوف وحزن نہیں رہتا

مملکت بھی مقصود بالذات نہیں ہے۔ دین Establish (قائم) نہیں ہوسکتا جب تک استخلاف فی الارض نہ ہو اور استخلاف فی الارض یعنی اپنی آزاد مملکت بھی مقصود بالذات نہیں ہے' اس کا مقصد دین کو Establish (قائم) کرنا ہے۔ کہا کہ دین کو Establish (قائم) کرنے کے معنی ' کیسے سمجھو گے کہ دین Establish (قائم) ہوگیا۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ **وَلَیُبَدِّلَنَّھُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِھِمۡ اَمۡنًا** (24:55)۔ ایک تو یہ بات ہے کہ اُس میں آپ کو کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا۔ وہ خوف باہر سے حملہ آوروں کا ہی تو نہیں ہوتا بلکہ اپنے ہاں کے جو خوف ہوتے ہیں وہ تو اُس سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ قرآن نے اُس کو تو ''حزن'' کہا ہے' جسے ہم دل گرفتگی کہتے ہیں۔ کہا کہ پہلی چیز تو اُس میں یہ ہوگی کہ کسی قسم کا کسی کو خوف نہیں ہوگا۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ جب یہ بات نہیں ہوگی تو پھر یہ ہوگا کہ **یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا** (24:55) تم میری محکومیت اختیار کرسکو' کسی اور کو شریک نہ کرو۔ اگر اس کا ترجمہ پرستش ہے تو یہ لمبا چوڑا پروگرام' کہ ایمان' اعمالِ صالحہ' اُن کا فطری نتیجہ' استخلاف فی الارض ہو اور اُس کے بعد پھر یہ' کہ دین کو تمکن ہو' خوف مٹے تاکہ تم میری نماز پڑھ سکو۔ وہ تو انگریز کے زمانے میں بھی پڑھتے تھے' وہاں ہندو کے زمانے میں آج بھی پڑھتے ہیں۔ یہ سارا تم اتنا کچھ ہم سے کرارہے ہوتا کہ تم میری نماز پڑھ سکو۔ یہ سارا پروگرام اس لیے دیا جارہا ہے تاکہ تم میری عبادت (محکومیت) اختیار کرسکو' کسی اور کی نہیں۔

واضح تر انداز میں دین کا منشور کتاب اللہ کی حکمرانی کا نام ہے

دین کا منشور تو اللہ تعالیٰ نے چند لفظوں میں دیا ہے۔ کہا کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' خواہ انہیں قانون سازی کے اختیارات ہوں' خواہ انہیں حکمرانی یا انتظامیہ کے اختیارات ہوں' حتٰی کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو' اُس کو بھی یہ اختیار نہیں کہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔ کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ **وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ** (3:79) یہ کتابِ خداوندی ہے جس کو تم پڑھتے پڑھاتے ہو' سمجھتے سمجھاتے ہو' اُس کی رو سے تم خدا کے محکوم بن جاؤ۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔ یہ ہے دین۔

آزادیٔ ہند کے سلسلہ میں ہندو کا پروگرام اور اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا تصورِ آزادی

یہاں عبادت کا لفظ آیا ہے۔ ہندوستان میں کیا کشمکش تھی؟ وہاں آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ہندو ان سے کہتا تھا کہ ہم ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے ایک لڑائی لڑ رہے ہیں تو کیا تم نہیں چاہتے ہو کہ ہندوستان کو آزادی ملے' کیا تم نہیں چاہتے ہو کہ انگریز یہاں سے نکل جائے' کیا تم اس کے محکوم رہنا چاہتے ہو؟ وہ یہ کہتا تھا۔ پہلے اقبالؒ (1877-1938) نے کہا اور پھر اُس کے بعد قائداعظمؒ محمد علی جناح (1876-1948) نے کہا کہ یہاں تک یہ ٹھیک ہے۔ تم نے تو کہیں آج یہ کہنا سیکھا ہے' تمہاری تو ساری تاریخ باہر کی قوموں کی محکومی میں گزر گئی۔ یہ تو ہم نے چودہ سو سال پہلے یہ بتایا تھا کہ جو کسی کی محکومیت ہے اُس میں دین نہیں آ سکتا۔ تم ہم سے کیا پوچھتے ہو کہ ہم انگریز کو یہاں سے نہیں نکالنا چاہتے۔ ہندو کہنے لگے کہ پھر ہمارے ساتھ اس میں شریک کیوں نہیں ہوتے۔ کہاؒ کہ فرق یہ ہے کہ تمہارے نزدیک آزادی یہ ہے کہ انگریز یہاں سے نکل جائے تو یہ سرزمین آزاد ہو گئی' ہمارے نزدیک اتنی سی بات آزادی نہیں ہے' آزادی کا پہلا قدم تو یہ ٹھیک ہے کہ انگریز یہاں سے چلا جائے۔ ہماری آزادی یہ ہے کہ تمہاری حکومت بھی اُس کے بعد قائم نہ ہو۔ ہندو کہنے لگے کہ ہم تو جمہوریت کے لیے کہہ رہے ہیں۔ کہا کہ جمہوریت تو وہی انسانوں کی حکومت ہے۔ ہماری آزادی یہ ہے کہ کسی انسان کی حکومت قائم نہ ہو' ہماری آزادی یہ ہے کہ محکومیت صرف خدا کی کتاب کی ہو۔ کہاؒ کہ بتاؤ کیا تم ہمارے ساتھ اس آزادی کے اندر شریک ہوتے ہو؟ یہ تھی وہاں جنگ۔ کہا کہ تمہاری آزادی تو یہی ہے کہ انگریز نکل جائے اور تمہاری جنگ ختم ہو جائے گی لیکن ہماری جنگ تو آخری انسان تک رہنی ہے' جس انسان نے کسی پر حکومت کا دعویٰ کرنا ہے تو اُس کے خلاف ہماری جنگ ہوگی۔ اگر یہاں رہنا ہے تو تمہارے خلاف ہماری جنگ ہوگی۔ وہاں یہ چیز تھی جو اقبالؒ (1877-1938) کے ذہن میں آئی کہ ایسا ہی مقام ہے جہاں ہجرت کا

حکم دیا گیا ہے۔عزیزانِ من! یہ پاکستان کی تحریک اور مطالبہ درحقیقت اتباعِ انبیائے کرامؑ کے پروگرام میں ہجرت کا مقام تھا:

معنئ او از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہرِ تسخیر یم است

کہا کہ ہم ایک ایسا خطۂ زمین چاہتے ہیں اور پھر جو اگلی بات ہے تو وہاں یہ نظر آتا ہے کہ پھر وہ آزادی کیا ہے۔ایسا خطۂ زمین کہ جس میں اس سے پہلے کوئی نظامِ حکومت قائم نہ ہو‘ وہاں جا کر ہم خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کریں گے۔جب یہ ہوگا تو اُس وقت ہم کہیں گے کہ ہم آزاد ہیں۔وہاں سے یہ تصور اقبالؒ (1938-1877) نے لیا تھا‘ یہ تھا مقصد وہاں کی جنگ کا۔آزادی کا لفظ تو ہم میں اور ان میں مشترک تھا لیکن ان کے مفہوم میں بعد المشر قین تھا۔اُن کی آزادی ان کی جنگ ختم ہوگئی کہ جب انگریز چلا گیا۔ہماری آزادی تو یہ نہیں ہے۔ہماری آزادی تو یہ ہے کہ فَاِيَّایَ فَاعْبُدُوْنِ (29:56) تاکہ تم صرف میری محکومیت اختیار کرسکو۔

پاکستان کے بنیادی پروگرام پہ لکھی جانے والی تاریخ کی تاریخی پسماندگی

افسوس یہ ہے کہ اس نکتۂ نگاہ سے ہماری یہ تاریخ ہی مرتب نہیں ہوئی۔مرتب کیوں نہیں ہوئی؟ کوئی ہونے ہی نہیں دے گا۔آزادی کا یہ مفہوم سامنے آجائے گا تو پھر آپ کو یہاں اس سے بھی زیادہ بدتر غلامی نظر آئے گی جو اس تیس سال کے اندر آپ نے جو کچھ کیا ہے۔یہ پتہ چلا کہ فَاِيَّایَ فَاعْبُدُوْنِ (29:56) کے لیے یہ کیوں ضروری ہوتا ہے کہ جہاں آپ ہیں تو ضروری نہیں کہ پاؤں توڑ کر وہیں بیٹھے رہیں۔یہ جتنے بھی نیشنلسٹ علما تھے‘ ان کے ساتھ جنگ ہی یہ تھی۔وہ یہ کہتے تھے کہ تم مذہب کی آزادی چاہتے ہو؟ گانگریس نے ریزولیشن پاس کر رکھا ہے کہ ہندوستان کی جمہوری حکومت میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کی پوری پوری آزادی ہوگی۔اقبالؒ (1938-1877) یہ کہتا تھا کہ تم مذہب کی آزادی کو دیکھتے ہو تو وہ تو انگریز کی مملکت میں بھی ہمیں حاصل ہے تو اس کے لیے پھر اس کی کیا ضرورت ہے جو تم جدوجہد کہہ رہے ہو۔مذہب کی آزادی تو ہمیں اب بھی حاصل ہے لیکن ہم دین کی آزادی چاہتے ہیں۔اور یہی بات تھی کہ یا وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی یا سمجھنا چاہتے ہی نہیں تھے۔بحث ہی ساری یہ ہے۔اس بحث کو اکٹھا کیجیے تو دین اور مذہب کا فرق سامنے نظر آتا ہے۔یعنی اتنے اتنے بڑے جید علما کہ ساری دنیا کے مسلمان ان کے سامنے احترام سے نگاہ جھکاتے تھے مثلاً مولانا حسین احمد مدنی (1957-1879)‘ ابوالکلام آزاد (1958-1880)‘ مفتی کفایت اللہ‘ مولانا احمد سعید (1986-1913)۔یہ جمعیت العلماء پوری کی پوری تھی‘ دیوبند کے چند ایک کو چھوڑ کر باقی سارے کے سارے اس میں شامل تھے۔جنگ ہی یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ ہندو مذہب کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے تو پھر تم کاہے کے لیے ایک الگ مملکت مانگتے ہو۔اور یہ اقبالؒ (1938-1877) اُنہیں سمجھاتے تھے کہ یہ مذہب کی اجازت دیتا ہے لیکن دین کی اجازت کبھی نہیں دے سکتا اور ہم دین کی اجازت چاہتے ہیں۔اقبالؒ نے

اپنے دور میں یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

وحی کی روشنی میں قائداعظمؒ کی زبانی تحریک پاکستان کی وضاحت

سجدے کی اجازت اور جو اسلام کی آزادی ہے اس میں بڑا فرق ہے۔ یہ چیز تھی جو قائداعظمؒ [1] نے اپنے حیدرآباد کے انٹرویو میں کہی تھی کہ ''بابا! تم آزادی اور پابندی کی اپنی Definition (تعریف) لیتے ہو لیکن ہماری آزادی اور پابندی کے حدود خدا کی کتاب قائم کرتی ہے۔'' ان کے طعنے کے بموجب یہ تھا کہ یہ بات ایک کلین شیو' Suited Booted (انگریزی سوٹ میں ملبوس) ایک شخص کہہ رہا ہے۔ شعر تو فارسی کا ہے لیکن ہے بڑا خوبصورت۔

سرِ خدا کہ عارفِ سالک بہ کس نہ گفت

کہ خدا کا راز اُس کی بات' زاہد اور عابد نے کسی کو بھی نہیں بتائی تھی

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

مجھے حیرت ہے کہ یہ جو ''بادہ کش'' ہیں انہوں نے یہ بات کہاں سے سن لی کہ ہماری آزادی اور پابندی کے حدود خدا کی کتاب قائم کرتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ بات جناحؒ [1] کہہ رہا ہے۔ اور اُس کے مقابل میں علمائے کرام' پورے کے پورے' اُسے کافرِ اعظم قرار دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ نماز روزے کی یہ اجازت ہے تو تم بتاؤ کہ تم اور کیا چاہتے ہو۔ وہاں یہ جنگ تھی ان کے ساتھ۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است

تقسیم کے دوران اس ہجرت کے وقت نہ بھلائی جانے والی اذیتیں اور شہادتیں

ہجرت کے اندر بڑے سخت مقامات آتے ہیں۔ وہ جو ہمارے ہاں اُدھر سے اِدھر آزادی کے دوران میں آنے کے دن تھے' تو جو کچھ اُس زمانے میں قیامتِ کبریٰ برپا ہوئی' ہماری اگلی نسلوں کو تو اس کا پتہ ہی نہیں۔ وہ ہم سے پوچھو کہ جو اُس کے اندر شہید ہوئے تھے اور ان کے اوپر کیا کیا بیتی تھی۔ اُس وقت جذبہ صرف یہی تھا کہ فَاِيَّایَ فَاعْبُدُوْنِ (29:56) تم کس طرح ایسی زندگی بسر کر سکتے ہو جس میں اطاعت و محکومیت صرف قوانین خداوندی کی ہو' کسی اور کی نہ ہو۔ سو جس مقام پہ ایسی زندگی بسر کرنا ممکن ہو' وہاں چلے جاؤ۔

---

[1] قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948)۔

تحریکِ آزادی کے نام نہاد دانش وروں کی سوچ

عزیزانِ من! کیا بتائیں اپنی بدقسمتی کو کہ ہمارے ہاں کے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس زمانے میں بھی آزادی کی تحریک کے رہنما گنے جاتے تھے، وہ ٹی وی پہ آتے ہیں، ان سے پوچھا جاتا ہے کہ صاحب! تحریکِ پاکستان کے مقاصد کیا تھے، اس کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ وہ کہتے ہیں کہ اصل میں ہندو کی تنگ نظری تھی، اُس کی وجہ سے مجبور ہو کر ہم نے یہ کیا

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے

بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

یعنی اگر وہ ذرا سا بھی کشادہ ظرف ہو جاتا تو ہمیں یہ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، یہ تو اُس کی تنگ نظری تھی جس سے ہم مجبور ہو گئے۔ دوسرے صاحب اٹھے تو اُنہوں نے کہا کہ صاحب! یہ سارا مسئلہ ہی معاشی تھا، یہ مسلمان جو بڑے بڑے سیٹھ تھے تو انہیں پتہ تھا کہ ہم ہندوستان میں رہے تو ان کے مقابلے میں تو ہماری سرمایہ داری شے ہی کچھ نہیں، اپنا وطن ہوگا تو اپنے کارخانے لگائیں گے، اپنی ملیں لگائیں گے، تو یہ مقصد تھا۔

میں اس سارے تیس سال میں یہ انتظار کرتا رہا کہ کسی زبان پہ بھی اُس جناحؒ [1] کا یہ فقرہ آتا جو انہی کے اندر بیٹھے ہوئے اُس شخص نے 1941ء میں کہا تھا اور اقبالؒ (1877-1938) نے تو 1938ء میں یہ کہا تھا اور جناحؒ [1] 1948ء تک ان میں رہا اور یہی کہتا رہا کہ "ہماری آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتاب قائم کرتی ہے"۔ میں انتظار میں رہا کہ کوئی بھی ان میں سے کہتا ہے کہ اس مقصد کو تو قائداعظمؒ [1] نے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ یہ تھا مقصد، یہ تھا جذبۂ محرکہ پاکستان کی تحریک کا: **فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ** (29:56) اس لیے کہا کہ ان سے کہو کہ **یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا** [2] (29:56)۔ کبھی آپ نے غور کیا کہ قرآن نے یہاں **عبادی** کہا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن کے ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہونا چاہیے۔ "اے وہ کہ جو تم چاہتے ہو کہ صرف خدا کے محکوم بن کے رہو"۔ تو **اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ** (29:56) اگر یہاں اس کا امکان نہیں کہ جہاں تم پیدا ہوئے یا جہاں تم بس رہے ہو تو ہماری زمین بڑی وسیع ہے، وہاں جاؤ **فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ** (29:56) تاکہ ہماری ہی محکومیت تم اختیار کر سکو، پھر تم **عبادی** بن سکو گے۔

---

[1] قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948)۔

[2] تم میرے قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر، ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرو (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 925)۔

ہجرت کے معاملہ میں قرآنِ حکیم کی روشن تعلیم

عزیزانِ من! یہ ہے ہجرت کا مقام' دین کے نظام کے پروگرام کے اندر ایک مقام۔ اب اس راستے میں بڑی مشکلات آئیں گی۔ پہلی مشکل تو یہ ہے کہ ہم لاکھوں کی تعداد میں راستے میں ہی کٹ گئے تھے' اُس ہجرت میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ کہا کہ **كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ** (29:57) کوئی بھی انسان ایسا ساتھ دینے والا نہیں ہے کہ آخر الامر اُس کو مرنا نہ ہو۔ موت کی تو کیفیت یہ ہے۔ پہلا ڈر یہ آسکتا ہے کہ یہاں سے گئے اور راستے میں ہی کہیں موت واقع ہو جائے۔ اس نظام کے اندر جو محشر برپا ہونگے اُس میں موت ہو گی۔ کہا کہ موت سے کون بچ سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ اگر یہاں رہو گے تو کیا پھر موت سے بچ جاؤ گے؟ نہیں' موت تو ایسی شے ہے جس سے کوئی متنفس بچ ہی نہیں سکتا۔ ایک موت تو یہ موت ہے' جسے اقبالؒ (1877-1938) نے حیاتِ بے شرف کہا ہے۔ کہا کہ **ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ** (29:57) اور ایک موت وہ ہے جس میں ہر قدم ہماری طرف اٹھتا ہے۔ مہاجر کا تو ہر قدم ہماری طرف اٹھتا ہے۔ دیکھیے حضرتِ ابراہیمؑ جب ہجرت کے لیے اٹھے ہیں تو کہا کہ **اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ** (37:99) میں خدا کی طرف جا رہا ہوں' اور یہ بھی کہ **اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ** (29:26) میں خدا کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ خدا تو ہر مقام پہ موجود ہے' وہ تو کہتا ہے کہ ہم تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہیں۔ اب یہ کہنا کہ میں خدا کی طرف جا رہا ہوں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کسی خاص مقام میں نہیں ہے۔ یہ جو اُس کی طرف جانا ہے تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نظام کی طرف جانا' اُس سرزمین کی طرف جانا کہ جہاں خدا کی محکومیت کے سوا کسی انسان کی محکومیت ہی نہ ہو۔

اقبالؒ کے الفاظ میں ہم نے قرآنِ حکیم کو چیستان بنا دیا

یہ ہے اُس کی طرف جانا۔ یہ جو **اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ** (2:156) ہے' وہ جواب ہم صرف ہر موت کے اوپر ہی کہتے ہیں' قرآن نے تو یہ کہا تھا کہ **لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا** (36:70) یہ قرآن تمہیں زندگی اور حیات کی دعوت دیتا ہے۔ اور ہم **اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ** (2:156) موت کے اوپر یا ہر بری خبر پر کہتے ہیں حالانکہ جہاں یہ آیا ہے وہ بہت ہی عظیم مقام ہے۔ جب میں وہاں آؤں گا تو پھر عرض کرونگا۔ یہ جو خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے' جان دینے والے ہیں' وہاں یہ چیز ہے کہ لوگ ان سے کہتے ہیں کہ اس کے راستے میں اتنی اتنی مشکلات آتی ہے' جان تک دینی پڑتی ہے' تو وہ کہتے ہیں کہ تم ہمیں کیا ڈراتے ہو کہ **اِنَّا لِلّٰهِ** (2:156) ہم نے تو اپنی زندگی کا مقصود اور منتہیٰ خدا کے پروگرام کی تکمیل کو بنا لیا ہے۔ اور **وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ** (2:156) جتنی مشکلات آئیں ہمارا ہر قدم اُس کی طرف اٹھے گا۔ اور اب بقول اقبالؒ (1877-1938):

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

یہ انا للہ، اب یہ انا للہ بن کر رہ گیا ہے۔

قرآنی نظامِ حیات کے تحت نوعِ انسانی کو وہ کچھ ملے گا جو وہ چاہے گی، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ

عزیزانِ من! کہا ہے کہ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ❶ (29:57) اور اُس کے بعد کہا کہ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (29:58) موت تو ہر ایک کو آنی ہے۔ ایک موت تو یہ ہے جس میں ہر قدم ہماری طرف اٹھتا ہے، کیا بہار آفریں ہے یہ راستہ، کتنی زندگی بخش ہے یہ موت! اس لیے کہا کہ ان کے متعلق کہنا تو ایک طرف، ذہن میں بھی نہ سمجھو کہ یہ مر گئے ہیں، مر تو تم گئے ہو جو صرف سانس لے رہے ہو۔ کہا کہ یہ کچھ کرنے والے جب وہاں جا کر اعمالِ صالحہ سے یہ نظام قائم کریں گے تو اس کے نتیجے میں ہم ان کو وہاں Establish (قائم) کر دیں گے۔ یہاں وہی ایک تشبیہہ الجنۃ کی ہے۔ عربوں کو سمجھانے کے لیے اس سے بہتر تمثیل کی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہاں ایک لفظ غرفًا بھی آیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ اس زبان کی جامعیت ہے۔ ایک لفظ کے اندر زندگی کی جو تین بلند ترین نعما یا مقاصد ہو سکتے ہیں وہ اس میں ہیں۔ غرفا کے لفظ کے اندر بلندیاں، روانیاں، فراوانیاں ہیں۔ یہ تینوں چیزیں کسی شے میں جمع ہوں تو اُس کو غرفًا کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی کیا مانگے! اگر یہ غرفًا والی بات مانگ لی جائے تو

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

---

❶ اس جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ تم جان دے دو گے۔ سو اس دنیا میں ہمیشہ کے لیے کسی نے بیٹھے رہنا ہے؟ ہر ذی حیات موت کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا ہے۔ اسے ایک نہ ایک دن مرنا اور اپنے اعمال کے لیے ہمارے حضور جواب دہ ہونا ہے سو تمہارا ہر قدم ہماری مقرر کردہ منزل کی طرف اٹھنا چاہیے (اعمال کی جواب دہی سے مفہوم یہ ہے کہ ان کے نتائج خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب ہوتے ہیں)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔925)۔

پھر ہاتھ کیوں اٹھیں گے؟ لیکن وہ ہاتھ اٹھوانے والا کہتا ہے کہ وہاں جو کچھ چاہو گے وہ تمہیں مل جائے گا(50:35)۔ بات تو ختم ہو گئی لیکن کہا کہ **و لنا مزید** (50:35) ہمارے پاس اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔تمہارا چاہنا' تمہاری آرزوئیں' تو بڑی محدود ہوتی ہیں' تم تو وہاں تک ہی مانگ سکتے ہو' ہمیں پتہ ہے کہ تمہاری آرزو محدود تھی' ہماری نعماء لامحدود ہیں' تمہاری آرزو کے مطابق تمہیں مل گیا کہ جو تم نے چاہا لیکن اس کے بعد ابھی بہت کچھ اور ہے جو تمہارے چاہنے کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تو ہم وہ بھی دیں گے۔

یہ وہ جنت ہے جس کا تعلق اس دنیاوی اور آخرت کی زندگی سے ہے

کیا بات ہے اس دینے والے کی! **غرفًا** : بلندیاں' روانیاں' فراوانیاں۔ یہ تین چیزیں جمع ہوں تو **الجنة** بنتی ہے۔اور یہ اسی زندگی کی بات ہے' اسی دنیا کی باتیں ہو رہی ہیں۔ وہاں جا کر جو کچھ ہے اُس پہ تو ہمارا ایمان ہے لیکن یہ سب کچھ اسی زندگی' اسی دنیا کے اندر ملنے والی چیز ہے۔ کہا کہ **تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا** (29:58) یہ درخت ایسا نہیں ہے جو پانی نہ ملنے کی وجہ سے خشک ہو جائے۔تمہارے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا تسلسل وہ رواں دواں چشمہ ہے جس سے اس درخت کی شادابیاں ہمیشہ قائم رہیں گی' یہ ہر موسم میں پھل دے گا:

بہار ہو کہ خزاں' لا الہ الا اللہ [1]

بخشش کا تصور تو قرآنِ حکیم کی تعلیم کے ہی خلاف ہے

کیا یہ جو سب کچھ ہے' یہ بخشش کے طور پہ ملے گا؟ ہمارے ہاں تو ایک لفظ بخشش ہی رہ گیا ہے کہ اللہ اُس کو بخش دے' پھر یہ گداگروں کی طرح کچھ بخشیش مل جائے۔تو کیا جنت اس طرح سے ملے گی؟ ذہن میں تو یہی ہے کہ اُس کے فضل و کرم پہ منحصر ہے کہ وہ جسے چاہے بخش دے۔ کہا کہ **نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ** (29:58) کام کرنے والوں کا یہ کیسا خوبصورت معاوضہ ہے جو ہم دے رہے ہیں!

بہشتے بہر پاکان حرم ہست

بہشتے بہر ارباب ہمم است

ہمت والے' جو صاحبِ کرم ہیں' جنت ان کے لیے ہے:

---

[1] یہ نغمہ فصل گُل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں' لا الہ الا اللہ
(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش

ان ہندی مسلمانوں کو کہو کہ خوش رہو

بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

''اللہ واسطے وی جنت مل جاندی ہوندی اے''۔ گداگرو! خوش رہو۔ مست رہو اس گداگری کے اندر۔ جس کو مانگ کے کھانے کی لت پڑ جاتی ہے تو وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔

زندگی کی چھوڑی ہوئی یادیں اور تصوف کی باتیں

کہا ہے کہ **نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ** (29:58) دیکھو! ہم کام کرنے والوں کو ان کے کاموں کا کتنا اچھا بدلہ دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! بات اور آگے چلی جائے گی ورنہ میں عرض کرتا کہ زکوٰۃ وغیرہ کے تصورات کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ ہمارے ہاں تو وہ اللہ کا فضل مانگتے ہیں، حتٰی کہ عدل والی بات بھی نہیں ہے:

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو ❶

میری بھولی ہوئی منزلیں یاد آتی ہیں، بچپن کی ابتدائی عمر تو ساری تصوف کی وادیوں میں گزری۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمیں کیا تعلیم ملا کرتی تھی؟ یہ کہ ایک اللہ کے عاجز، وہ ایک پتھر پہ، چٹان پہ، بیٹھ کر خدا کی عبادت کرتے رہے۔ بارہ برس تک عبادت کی تو آواز آئی کہ تمہاری عبادت ہم نے قبول کر لی مانگ کیا مانگتا ہے۔ وہ بوکھلا گئے کہ کیا مانگوں تو ایک خوبصورت بزرگ آ گئے اور کہا کہ تم کچھ افسردہ خاطر سے بیٹھے ہو، کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ جی! وہ یوں ہوا تھا، آواز آئی ہے اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ کیا مانگوں؟ کہنے لگے کہ بات تو بڑی آسان سی ہے، تم نے بارہ برس تک اُس کی عبادت کی ہے، اُس سے کہو کہ میں تجھ سے اجر مانگتا ہوں اور کہنے لگے کہ اجر یہ ہے کہ بارہ برس تک تم اس پتھر پر بیٹھے ہو اب بارہ برس تک وہ پتھر تم پر بیٹھے۔ بیٹھ گئے نیچے اور پتھر سر پر رکھ لیا۔ بارہ برس گزر گئے، پھر آواز آئی کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ کہنے لگے کہ ''مولا اجر نہ دئیں، فضل دئیں''۔

---

❶ کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے، جو سینے میں، غمِ منزل نہ بن جائے
(اقبالؒ: بالِ جبریل)

صبر کا قرآنی مفہوم اور اس کی ثمر باریاں

وہ کہتا ہے کہ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (29:58) کام کرنے والے کا اجر۔ اور کتنا خوبصورت اجر ہے جو ہم دیتے ہیں۔ اُس کو غرفًا بلندیاں' روانیاں' فراوانیاں' نہ سوکھنے والے درخت' ہمیشہ پھل دینے والے درخت دیتے ہیں۔ یہ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ہے' یہ بہشت فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ کیا یہ ایک آدھ دن کی بات ہے؟ کہا کہ نہیں ''بڑے ڈھاڈے نال پیار پیا اے ❶''۔ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (29:59)۔ شرطیں ملاحظہ فرماؤ۔ میں نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں بس وہ ترجمے ہوئے تو پوچھو نہیں کہ اُنہوں نے دین سے مذہب پہ پہنچا دیا۔ بڑی مصیبت جب آتی ہے تو آپ کہتے ہیں کہ میاں! صبر کرو' صبر کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ جہاں انتہائی بیچارگی ہوتی ہے' بےبسی ہوتی ہے' کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا تو وہاں کہتے ہیں ''صبر کر لے ہُن ہور کی ہوسکدا اے ❷''۔ وہ کہتا ہے کہ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا (29:59)۔ اس کے معنی استقامت کے ہوتے ہیں کہ کسی بات کے اوپر جم کر کھڑے ہو جانا چاہیے' کتنی مصیبتیں آئیں' چاہے کتنی تکالیف آئیں لیکن پاؤں میں لغزش نہ آئے۔

ادھر آ پیارے ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

اور اُس کے بعد اس بات کا یقین ہو کہ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (29:59)۔

توکل کا قرآنی مفہوم خدا کے قانون پر بھروسے کا نام ہے

پہلے تو ''توکل'' کا لفظ ہے کہ ''سائیں ہوریں بیٹھے ہوئے نیں' او میاں کوئی کم کرو' نہیں صاحب توکل بخدا بیٹھے آں ❸''۔ یعنی وہ دوسرے کمائیں گے اور لے آئیں گے کیونکہ یہ توکل بخدا ہے۔ ''اونہ لیان روٹی' تے پتہ لگ جائے میاں صاحب نوں کہ اللہ تے توکل کی ہونداا ے ❹''۔ ہمارے ہاں گداگری کا نام ''توکل'' ہوتا ہے۔ یہ عربوں کے ہاں کا بڑا عظیم لفظ ہے۔ میں وہ مثال دیا کرتا ہوں کہ دس پندرہ ہزار فٹ کی بلندی کے اوپر ہوائی جہاز اڑ رہا ہے' اُس جہاز سے پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگاتا ہے تو وہ کس بھروسے پہ یہ

---

❶ ایک بڑی ہی ''زور آور'' ہستی سے پیار ہوا ہے۔

❷ صبر لو میاں! اب کیا ہوسکتا ہے!

❸ حضور پیر سائیں تشریف فرما ہیں۔ او بابا! کوئی کام کرو۔ نہیں صاحب! ہم تو خدا پہ توکل کیے بیٹھے ہوئے ہیں۔

❹ وہ کھانا نہ لائیں تو صاحب بہادر کو پتہ چل جائے کہ توکل کیا ہوتا ہے۔

چھلانگ لگا دیتا ہے۔ وہ جو ہاتھ میں چھتری ہوتی ہے تو اُس پہ یہ یقینِ کامل ہوتا ہے کہ یہ مجھے دھوکا نہیں دے گی' یہ کھلی اور میں حفاظت سے زمین پہ آ گیا۔ کسی چیز کی اکملیت کے اوپر یہ جو اس قسم کا بھروسہ ہوتا ہے' اُسے توکل کہتے ہیں۔ یہ جو یہاں سے اب مریخ پہ اور آسمان پہ اور سورج پہ چاند پہ جا رہے ہیں' اندازہ لگائیے کہ وہ کس طرح سے بلاتکلف چلے جاتے ہیں۔ ہم یہاں سے انارکلی نہیں جا سکتے' بچہ جاتا ہے "تے ماں دعاواں منگن ڈئی ہوئی اے کہ یا اللہ! خیر نال گھر آ جائے❶"۔ اور وہ وہاں سے اس اطمینان سے جاتے ہیں۔ چاند پہ جانے والوں کا کس چیز پہ بھروسہ ہوتا ہے؟ ان کا خدا کے قانون کے اوپر بھروسہ ہوتا ہے' اُس قانون کو اُنہوں نے معلوم کر لیا ہے۔ اُس کے مطابق اگر ہماری یہ روش ہے تو سنو! اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ (13:31) خدا اپنے قانون کی خلاف ورزی کبھی نہیں کیا کرتا۔

لفظ غیب اور آخرت کا قرآنی مفہوم

ان کو اس بات کے اوپر "توکل" ہے کہ خدا کا قانون کبھی دھوکا نہیں دیا کرتا۔ یہاں کہا ہے کہ عَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ (29:59) خدا کے قانون کے اوپر اس قسم کا بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ جو آیت ہے کہ یؤمنون بالغیب (2:3) تو یہ ہے ایمان بالغیب کہ یہاں بیٹھے ہوئے اُس قانون کے مطابق' کمپیوٹر کے اوپر' جب نتیجہ یوں سامنے آئے تو یہ یقین ہے اس چیز کا کہ جس چاند کو دیکھا نہیں ہے اُس پہ پہنچ کر رہیں گے۔ یہ ہے غیب کے اوپر ایمان۔ قانون اور فارمولا پہلے ہوتا ہے اُس کا نتیجہ بعد میں نکلتا ہے۔ یہ بعد میں جو نتیجہ نکلنے والی بات ہے وہ ہے وَ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ (2:4) "آخرت" کے معنی ہی یہ ہیں کہ بعد میں نتیجہ نکلنے والی چیزیں۔ ہر قانون کا' ہر فارمولے کا' نتیجہ بعد میں نکلتا ہے لیکن نتیجہ اُس کے لیے ہوتا ہے جو یقین رکھے کہ اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ توکل تو کامیابیوں کے لیے بڑی یقینی چیز ہے لیکن توکل تو قانونِ محکم پہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ چیز ہو کہ کبھی ہوا اور کبھی نہ ہو تو یہ بات توکل میں نہیں ہے۔ یہ بات خدا کے قانون میں نہیں ہے کہ "کدے ہوندا تے کدے نہیں ہوندا❷"۔ کہا ہے کہ یہ ہے وہ عاملین کا اجر جو ہم نے پہلے بتایا ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے ہجرت اور اُس کے بعد اُس کا نتیجہ ہے جو وہاں جا کر نکلے گا۔ وقت ہو گیا۔ سورۃ العنکبوت کی آیت 59 تک ہم آئے ہیں' 60 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔ سلسلۂ کلام آگے بھی یہی چلا آ رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ اگلے درس میں اس سورۃ کے اختتام تک بھی آئیں گے اور آخری آیت تو پوچھو نہیں کہ کس قدر وجد آفریں ہے!

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ط

---

❶ ماں دعائیں مانگتی ہے' کہ یا اللہ! یہ بچہ خیر و خیریت سے گھر پہنچ جائے۔

❷ کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا۔

سترھواں باب: **العنکبوت** (آیات 60 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! جولائی 1979ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ العنکبوت کی آیت 60 سے ہو رہا ہے: (29:60)۔

آپ کو یاد ہے کہ سابقہ درس میں سلسلۂ کلام ہجرت کے متعلق تھا۔ میں نے یہ بتایا تھا کہ یہ ہجرت دین کے نظام کے پروگرام کی ایک بڑی اہم کڑی ہے اور اُس سے مفہوم یہ ہے کہ رسول جس مقام میں مبعوث ہوتا تھا' جس مقام سے اپنے پروگرام کی ابتدا کرتا تھا' ایک وقت تک وہ اس میں مصروفِ کار رہتا تھا لیکن جب وہ دیکھتا تھا کہ اس جگہ اس نظام کے قیام کے لیے فضا مساعد نہیں ہے تو کوئی اور مقام جہاں وہ دیکھتا تھا کہ حالات زیادہ بہتر اور سازگار ہیں تو وہ اُس مقام کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔ یہ نہ تو فرار (Escape) تھا اور نہ ہی کسی نقلِ مکانی (Migration) کی شکل تھی بلکہ اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا کہ

ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

یہ تو قطرۂ شبنم کو چھوڑ کر سمندر کو مسخر کرنے کا پروگرام ہوتا تھا۔ یہ بڑا اہم پروگرام ہوتا تھا۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے مہاجرین اور مجاہدین دونوں کا اکٹھا ذکر کیا ہے۔

موجودہ انسانی زندگی کے بعد تسلسلِ حیات ایک عظیم حقیقت کی نوید ہے

اب اس کے راستے میں پہلا خیال یہ آتا تھا کہ سفر لمبا ہے' حالات ناسازگار ہیں' ہوسکتا ہے کہ پیچھے سے یہ لوگ جو مخالفین ہیں تعاقب بھی کریں گے۔ موت کا خطرہ تھا اور موت کے متعلق تو قرآنِ کریم کا جو یہ بنیادی عقیدہ ہے' جسے حیاتِ آخرت کہتے ہیں' وہ اصل میں تسلسلِ حیات ہے۔ یہ انسانی زندگی کے اندر عظیم چیز ہے۔ انسان سب سے زیادہ موت سے ڈرتا ہے۔ موت کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ موت خاتمہ نہیں ہے' یہ تسلسلِ حیات ہے' یہ تو ایک ندی کا ایک باغ میں سے گزر کر صحنِ گلستاں میں داخل ہو جانا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے ڈرنے کی کونسی بات ہے۔ یہ جو تسلسلِ حیات ہے کہ میں نے زندہ رہنا ہے' اس سے انسان کے اندر عظیم انقلاب واقع ہوتا ہے۔ اس کو موت ہوتی ہی نہیں ہے' یہ مرتا ہی نہیں ہے' مرتی تو یہ دنیا ہے جو پیچھے رہ جاتی ہے۔ پہلی چیز تو قرآن نے یہ کہی تھی کہ اس کے متعلق پہلا خیال ذہن میں یہ آئے گا کہ ہوسکتا ہے کہ راستے میں موت واقع ہو جائے تو موت حیاتِ بے شرف کا نام ہوتا ہے۔ اور جو مرگِ باشرف ہے وہ تو حقیقت میں زندگی ہے' اس لیے موت سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ انسان کا ایک ایمان اتنے بڑے خطرے کو زائل کر دیتا ہے۔ یہ جو ہم بے پناہ قوتیں دیکھتے ہیں کہ ان مومنین کے اندر پیدا ہو جاتی تھیں جس سے

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

وہ اس ایمان سے ہو جاتی تھیں کہ میں نے تو مرنا ہی نہیں ہے۔ جس جنگ میں' جس لڑائی میں' جس تصادم میں' آپ کو یقین ہو کہ میں نے نہیں مرنا تو پھر پوچھو ہی نہیں' اُس کے اندر اُس میں کتنی قوتیں ہوتی ہیں!

ہجرت کے بعد فکرِ معاش کی بے چینی اور فکرمندی کا علاج

اب ہم آج کے درس پہ آتے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ روٹی کی فکر ہوتی ہے' یہ بڑی فکر ہوتی ہے۔ یہاں بنا بنایا ہوا کوئی کام کاج' ذرائع کاروبار' جہاں بھی انسان رہتا ہے وہاں کچھ نہ کچھ ٹھیہ تو اُس کا ہوتا ہی ہے۔ اس نقلِ مکانی سے دوسری جگہ جانا ہے' وہاں معلوم نہیں کہ کیا ہو۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے یہاں ایک آیت کے چند الفاظ میں پورا معاشی نظام یعنی باطل کا معاشی نظام اور اُس کے بعد صحیح معاشی نظام ایک مثال کے ذریعے سے واضح کر دیا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ یہ جو بھوک کا ڈر ہے یہ باطل کا نظام ہے اور اُس باطل کے نظام میں ہوتا یہ ہے کہ جو کسی کے ہاتھ آتا ہے وہ اسے سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ یعنی یہاں کوئی اپنی اپنی ضرورت پوری نہیں کرتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں کوئی قوت ہوتی ہے' اسباب زیادہ ہوتے ہیں' سامان زیادہ ہوتا ہے' اقتدار ہوتا ہے تو وہ دوسروں کا حصہ سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے ۔ بارٹر سسٹم میں تو پھر بھی اس کا امکان بہت تھوڑا سا تھا یعنی وہ جنس ہوتی تھی جس کو سنبھال کر رکھنا ہوتا تھا۔ اب تو انسان جنس کتنی زیادہ ذخیرہ کر لے گا' کتنے عرصے تک وہ اس کا ذخیرہ کر رکھے گا۔ بارٹر سسٹم میں اس قسم کے طبقاتی امتیاز پیدا نہیں ہوتے تھے' یہی ہوتا تھا کہ کسی کے پاس کچھ زیادہ غلہ ہو گیا اور کسی کے پاس کچھ تھوڑا غلہ ہو گیا۔ زیادہ غلے والے نے اپنا غلہ تیلی کو دیدیا اور وہاں سے تیل لے لیا۔

بارٹر سسٹم کے بعد سکے کی ایجاد اور اس کے ابلیسی اثرات

یہ جو Coin یا سکہ [1] ایجاد ہوا ہے تو یہ ایجاد تو ایک ضرورت کے لیے ہوا تھا کہ کون من بھر غلہ اٹھائے پھرے تو اُس کی بجائے ایک روپیہ جیب میں ڈال لیا تو برابر ہو گیا' یہ ایک ضرورت تھی لیکن اس نے دنیا میں وہ ابلیسی نظام قائم کیا ہے جس کا حل ہی کوئی نہیں۔ اب یہ جو ضرورت سے زائد سمیٹنا ہے تو اُس کی انتہا ہی کوئی نہیں ہے۔ ہزاروں' لاکھوں' کروڑوں' اربوں روپیہ اب آپ سمیٹتے جایئے۔ جتنا آپ سمیٹتے چلے جائیں گے تو یہ دوسروں کا حصہ ہے' جو آپ سمیٹ رہے ہیں۔ یہ Even Distribution (ہموار تقسیم) نہیں ہے' ہوتا یہ ہے کہ کسی کے پاس دس بھی نہیں ہیں' کسی کے پاس کروڑ روپیہ ہے۔ یہ اتنا فرق جو پیدا ہوا ہے تو یہ ایک سکے نے کیا ہے۔ اس نے بڑی ابلیسی لعنت پیدا کر رکھی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ باطل کے نظام میں ہر فرد ضرورت کے مطابق نہیں لیتا' ضرورت کے بعد سمیٹ کر رکھتا ہے۔ صحیح نظام یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق لے لیجیے اور باقی کے متعلق فکر نہ کیجیے' جو دوسرے ضرورت مند ہیں وہ ان کے لیے چھوڑ دیجیے۔

---

[1] دنیا کا پہلا سکہ لیڈئین لائن (The Lydian Lion) تھا جو 610 تا 600 ق م کے دوران بادشاہ ایلیاٹیس (King Alyattes) نے سارڈس، لیڈیا، ایشیا کوچک (موجودہ ترکی) نے بنوایا تھا۔ 600 ق م میں چین نے بھی اپنا پہلا سکہ بنایا۔ 550 ق م میں قدیم یونان میں بنا لیکن اس پر سب محققین متفق ہیں کہ لیڈئین لائن سکہ پہلا سکہ ہے (بحوالہ وکیپیڈیا Wikipedia, the Tree Encyclopedia)

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کی ایک دلکش مثال

یہ نظام ہے کہ صرف ضرورت کے مطابق لینا ہے۔ عزیزانِ من! ایک مثال سے آپ غور کیجیے اور دیکھیے کہ قرآن بات ہجرت کی کر رہا ہے' بتا یہ رہا ہے کہ اس باطل کے نظام میں تمہیں یہ فکر بھی جان کو لاگو ہو رہی تھی کہ روٹی کا کیا انتظام ہوگا۔ جس نظام کی طرف تم جا رہے ہو تو آ ؤ تمہیں بتائیں کہ وہاں نظام کیا ہوتا ہے۔ ایک مثال ہے' جھوم جایئے۔ کہا کہ **وَ کَاَیِّنۡ مِّنۡ دَآبَّۃٍ لَّا تَحۡمِلُ رِزۡقَہَا ٭ۖ اَللّٰہُ یَرۡزُقُہَا وَ اِیَّاکُمۡ ٭ۖ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ**[1] (29:60) ہمارا نظامِ فطرت کائنات کے اندر دیکھیے' کائنات میں ذی حیات ہے جسے رزق کی ضرورت ہے اور رزق کے معنی ہیں وہ چیزیں جن کے اوپر زندہ رہنا ہوتا ہے۔ خارجی کائنات میں جنہیں رزق کی ضرورت ہے' وہ انسانی آبادی سے کروڑوں لاکھوں گنا زیادہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا دیکھو تو سہی کہ ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ پوری چراہ گاہ' پورا جنگل' ہری بھری گھاس ہے' ایک بکری یا ایک بیل یا گائے کا جتنے میں پیٹ بھرتا ہے اتنا وہ کھا لیتی ہے اُس کے بعد آرام سے بیٹھ کر سو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ کچھ کھا لے اور باقی جتنا رکھا ہوا ہے اُس کو اپنی پیٹھ پہ لاد کر لے جائے۔ وہاں اس لیے صحیح نظام چل رہا ہے کہ ہر ایک صرف ضرورت کے مطابق لیتا ہے اور اُس سے زیادہ سمیٹ کر نہیں رکھتا' اُس سے زیادہ پیٹھ پہ لادے ہوئے نہیں پھرتا۔ کہا کہ یہ جہاں انسان بھوکا مرتا ہے تو وہ اس وجہ سے مرتا ہے کہ ضرورت پوری کرنے والا ضرورت تک محدود نہیں رہتا بلکہ باقی اپنی پیٹھ پہ لاد کر چل دیتا ہے اور دوسرے لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر ہمارا نظام فطرت کا ہو کہ اُس میں ہر ذی حیات اپنی ضرورت کے مطابق پیٹ بھر کر کھا لیتا ہے اور باقی کو سمیٹ کر پیٹھ پہ لاد کر نہیں چلا جاتا تو یہ مسائل پیدا نہ ہوں۔ کہا کہ تم جس نظام کی طرف جا رہے ہو' وہاں یہ نظام ہوگا۔ کیسے باتوں باتوں میں کتنے اہم مسائل ہیں جو حل کر دیتا ہے۔

آج کے اکنامک سسٹم کی ایک بنیادی کمزوری طبقاتی وجود کو جنم دینا ہے

اکنامکس (اقتصادیات) کا یہ Basic Problem (بنیادی مسئلہ) ہے کہ جو طبقات ہیں ان کی تفریق کیسے مٹے۔ کہتا ہے کہ اس مسئلے کی بنیاد یہ طبقاتی وجود ہے۔ اسی لیے اُس نے کہا تھا کہ **یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ** (2:219) یہ پوچھتے ہیں کہ ہم

---

[1] کتنے ذی حیات ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرتے ہیں' یا اس کا ذخیرہ کرتے ہیں؟ ان سب کو خدا کے کائناتی قانون ربوبیت کے مطابق سامانِ زیست ملتا ہے (11:6)۔ لہٰذا' اگر تم بھی اپنے ہاں ویسا ہی نظام رائج کرو' انفرادی لوٹ کھسوٹ اور ذخیرہ اندوزی چھوڑ دو' تو تم سب کو اسی طرح رزق ملتا چلا جائے گا (6:152) اس لیے کہ وہ سب کی سنتا اور ہر ایک کی ضروریات سے واقف ہے۔ اس کی نگاہوں سے کوئی بھی اوجھل نہیں رہ سکتا۔ (یہ تو تمہارا غلط نظام ہے جو اس قسم کی معاشی پریشانیاں اور ناہمواریاں پیدا کر دیتا ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔926)۔

اپنی محنت کی کمائی میں سے کتنا کچھ لیں اور کتنا کچھ دوسروں کی ضرورت کے لیے دیدیں؟ کہا کہ کتنا کچھ؟ ایک بیل سے پوچھو کہ اُس کے سامنے غلے کا ڈھیر لگا ہوا ہوتا ہے' وہ اُس میں سے کھاتا ہے پیٹ بھر جاتا ہے تو اُس کے بعد آرام سے بیٹھ کر جگالی کرنے لگ جاتا ہے۔ اُس کو پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ باقی کون لے جاتا ہے' دوسرا بھوکا بیل آتا ہے وہ اُس کو کھالیتا ہے۔ چراہ گاہوں میں جاؤ' جنگلوں میں جاؤ اور دیکھو کہ ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق اُس میں سے لیتا ہے اور باقی کو باندھ کر ساتھ نہیں لے جاتا۔ کہا کہ بس اتنا سا راز ہے۔ آپ نے غور فرمایا۔ قرآن نے **اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا** (29:60) پہلے کہا کہ قانونِ کائنات کی رو سے یوں ان کو ملتا ہے۔ **وَ اِيَّاكُمْ** (29:60) جس نظام کی طرف تم جا رہے ہو وہاں یہ نظام ہوگا' وہاں کوئی ضرورت سے زیادہ سمیٹ کر نہیں رکھے گا۔ پہلا مرحلہ موت کا تھا' اُس کو تو یوں حل کر کے رکھ دیا کہ مرتے تو یہ ہیں جو تمہاری موت پہ روتے ہیں' تم تو زندہ رہتے ہو۔ رزق کا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا کہ یہاں تم اس لیے ڈر رہے ہو کہ باطل کا نظام تھا۔ وہاں جو جا رہے ہو تو وہاں فطرت کا نظام ہے' ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق لیتا ہے اور جو ضرورت سے زائد ہے اُس کو سمیٹ کر نہیں رکھتا۔ اس لیے یہ مسئلہ بھی وہاں حل ہو جائے گا۔

انسانیت کے معاشی نظام کی مشکلات کے حل کے سلسلہ میں فطرتی نظام کی مثال

اسی لیے ایک ہی آیت کے بعد کہا کہ **اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ** (29:62) خدا کے اس نظام کے مطابق چلو تو اُس میں ہر ایک کو ملتا ہے' اس کی خلاف ورزی کرتے ہو اور اپنا نظام چلاتے ہو تو پھر ہر طاقتور یا صاحبِ اقتدار زیادہ سے زیادہ سمیٹ کر رکھتا ہے۔ وہ دوسروں کو ضرورت کے مطابق نہیں دیتا' دوسروں کو محروم کرنے کے لیے سمیٹ لیتا ہے۔ کہا کہ یہ ہے سارا راز۔ اس نظام کو بدلنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ وہاں یہ نظام قائم ہو جسے آپ نظامِ کائنات کہتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا' اُسے حل کر کے رکھ دیا۔ اب اگلی بات آئی۔ عجیب چیزیں آ رہی ہیں۔ وہی جو میں نے کہا تھا کہ یہ جتنے اہلِ کتاب تھے وہ سب کہتے تھے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں۔

اگر انسانیت کے سامنے خدا کا صحیح تصور پیش کر دیا جائے تو اس کرّہ ارض کی تقدیر بدل سکتی ہے

خدا ہی کو نہیں بلکہ وہ جو آپ کے ہاں اجزائے ایمان ہیں کہ اللہ کو مانو' وحی کو مانو' کتابوں کو مانو' رسول کو مانو' آخرت کو مانو تو یہ عیسائی یہودی وغیرہ سارے ان اجزا کو مانتے ہیں۔ وہ کہتے یہ تھے کہ ہم تو انہیں مان رہے ہیں۔ خود ان مشرکینِ عرب کی بھی کیفیت یہ تھی کہ یہ بھی خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ ایمان کا ہی لفظ میں لیے چلا آ رہا ہوں کیونکہ ہمارے ہاں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے۔ ہم نے بھی جو اس کا ترجمہ کیا ہے تو اُس کا مفہوم ہی کچھ نہیں ہے۔ جسے ہم ایمان کہتے ہیں اس کا مطلب ہے ''ماننا'' یعنی میں خدا کو مانتا ہوں۔ ہندو بھی خدا کو

مانتا ہے' عیسائی بھی خدا کو مانتا ہے' یہودی بھی خدا کو مانتا ہے۔تو خدا کو مانتا ہوں کے کیا معنی ہوئے؟ یہ کسی نے کبھی سوچا بھی ہے؟ پہلے نہیں سوچا تو ابھی سوچ لیجیے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی بات ہے کہ یہ کہیں کہ خدا ہے تو آپ نے مان لیا کہ ''ہے'' تو پھر کیا ہوا اور دوسرے نے کہا کہ ''نہیں ہے'' تو پھر کیا؟ تو اس سے کیا فرق پڑا؟ وہ ہے تو ہے' تمہارے نہ کہنے سے اُس کی نفی تو نہیں ہو جاتی۔ وہ تو خدا نے یہ کہا ہے کہ اگر ساری کائنات بھی ہمارا انکار کر دے تو ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ سورج تو موجود ہے' اگر ساری دنیا اپنی آنکھیں بند کر لے تو کیا سورج گم ہو جائے گا۔صرف یہ کہنا کہ خدا کو مانتا ہوں تو بے معنی چیز ہے۔ آج کی دنیا میں ایسی بات قرآن کر رہا ہے۔ یہ جتنے سیکولر سٹیٹ بھی ہیں یعنی جن کی مملکت میں' حکومت میں' سیاست میں خدا نہیں آتا' وہ بھی خدا کو مانتے ہیں۔ ساری Christian World (عیسائی دنیا) خدا کو مانتی ہے' ساری Jews World (یہودیوں کی دنیا) خدا کو مانتی ہے' ہندو خدا کو مانتے ہیں اور یہ Secular States (سیکولر ریاستیں) ہیں۔ ان کے ہاں کے سارے سائنٹسٹ (استثنا کو چھوڑ کر) خدا کو مانتے ہیں۔قریش خدا کو مانتے تھے۔ اب دیکھیے کہ قرآن نے ماننے اور نہ ماننے میں کیا فرق کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ (29:61) ان سے پوچھو کہ سلسلۂ کائنات کس طرح سے جاری ہے؟' کس نے زمین کو پیدا کیا؟' کس نے آسمان کو پیدا کیا؟' شمس و قمر کس کے زور سے چل رہا ہے؟ تو یہ کہیں گے کہ اللہ کے قانون سے۔ یہاں تک تو یہ کہیں گے کہ اللہ نے یہ کچھ کیا۔قرآن کہتا ہے کہ فَاَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ [1] (29:61)۔ میں ایک آیت پڑھ کے ابھی عرض کرونگا کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ (29:63) ان سے پوچھو کہ بارش کون برساتا ہے؟' بادل کون لاتا ہے؟' ہوائیں کون چلاتا ہے؟ وہ کہیں گے خدا کرتا ہے۔ یہاں تک تو تم نے مان لیا۔ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ (29:63) مشکل یہ ہے کہ اس پہ کچھ زیادہ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ اب میں عرض کرتا ہوں وہ جو کہتا ہے کہ پھر یہاں پہنچ کر تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ یہ جو کہا تھا کہ فَاَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ (29:61) یہاں تک تو تم خدا خدا کرتے ہو لیکن اس سے آگے تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟

---

[1] ان سے کہو کہ پھر تم انسانی معاشرہ کی تشکیل بھی اسی کے قانون کے مطابق کیوں نہیں کرتے۔ یہاں پہنچ کر تم کیوں الٹے پھر جاتے ہو؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' 926)۔

عام سطح پر خدا کو ماننے اور قرآن کی رو سے خدا کو ماننے میں بڑا فرق ہے

وہ آگے کیا بات ہے جس کے متعلق کہا کہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟ کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ خدا کا جو ماننا ہے وہ کیا ہوتا ہے؟ تمہارے اس ماننے میں اور قرآن کی رو سے خدا پر ایمان رکھنے میں کیا فرق ہے؟ کہا کہ تم مانتے یہ ہو کہ خارجی کائنات اُسی نے پیدا کی' اُسی کا قانون چلتا ہے۔ یورپ کا سائنٹسٹ بھی یہ مانتا ہے کہ کائنات میں قوانینِ فطرت ہیں اور وہاں فطرت کا واحد قانون ہے' Universal (عالمگیر) قانون ہے' ایک قانون ہے اور کوئی ایک قوت ہے اُس قانون کو چلا رہی ہے۔ وہ خدا کا نام نہیں لیتے۔ وہ کائنات کے اندر تو اُس کا اقتدار و اختیار مانتے ہیں۔ اُس نے کہا تھا کہ اس سے آگے جب بات کی جاتی ہے تو کیا وہاں تمہیں موت پڑ جاتی ہے؟ اب میں بتاتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔ کہا کہ **وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ** (43:84) خدا پہ ایمان یہ ہے کہ جیسے تم کہتے ہو کہ کائنات میں اُس کا قانون کارفرما ہے تو انسانوں کی دنیا میں بھی اُس کا قانون کارفرما ہونا چاہیے۔ خدا اسے ایمان کہتا ہے۔ ایمان کی Definition (تعریف) بھی آ گئی اور ساری دنیا سے ایمان کا فرق بھی آ گیا۔

عزیزانِ من! یہ جو بات ہے میں بار بار کہتا ہوں کہ دنیائے مذاہب کی کسی کتاب سے اس قسم کی بات نکال کر بتا دیجیے جو کہتا ہے کہ **وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ** (43:84) تم **فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ** نہیں مانتے۔ ہم مسلمان بھی نہیں مانتے۔ کیا ہماری زندگی میں وہ الٰہ ہے؟ کیا ہماری مملکت میں وہ الٰہ ہے؟ کیا ہمارے دائرہ اقتدار کے اندر وہ الٰہ ہے؟ ہم نے الٰہ کا ترجمہ ''معبود'' کیا کہ جس کی پرستش کی جائے حالانکہ فی السمآء الله وہاں بھی وہی معبود ہے اور ہم ہیں کہ زمین پہ اُس کی پرستش کرتے ہیں۔

الٰہ کا ترجمہ معبود کی بجائے صاحبِ اقتدار کرنا چاہیے

ہم نے الٰہ کا ترجمہ ''معبود'' کیا اور پرستش سے مسئلہ حل کر دیا۔ عزیزانِ من! الٰہ کہتے ہی ''صاحبِ اقتدار'' کو ہیں۔ کہا کہ یہاں تک تم مانتے ہو کہ خارجی کائنات میں اقتدار اُس کا ہے تو پھر اپنی تمدنی زندگی کے اندر اُس کا اقتدار کیوں نہیں مانتے۔ ایمان یہ ہے کہ جس طرح اُس کے قانون کا اقتدار خارجی کائنات میں کارفرما ہے' تو تمہاری اپنی زندگی کے اندر بھی اُسی کا قانون کارفرما ہونا چاہیے۔ یہ ہے خدا پر ایمان۔ پرستش والا الٰہ تو عرب بھی نہیں مانتے تھے۔ قرآن میں پرستش کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا' قرآن میں تو لفظ ہی محکومیت ہے۔ الٰہ معبود کو تو کہتے ہی نہیں' الٰہ تو صاحبِ اقتدار اور صاحبِ اختیار کو کہتے ہیں۔ عیسائیوں کو چھوڑ دیجیے' یہودیوں کو چھوڑ دیجیے' مجوسیوں کو اور ساری دنیا کو چھوڑ دیجیے صرف مسلمانوں کو لے لیجیے تو کیا مسلمانوں کی دنیا کے اندر **اِلٰـهٌ وَّفِی الْاَرْضِ** ہے؟ خدا ہے؟ جبکہ مسلمان کا خدا پہ ایمان تو ہم مانتے ہیں' کم از کم اپنے متعلق تو ہمیں یہ ہے کہ جی الحمد للہ' ہمارا اللہ پر ایمان ہے۔ ذرا اُس سے پوچھیے کہ جس پر ایمان کا

آپ دعویٰ کر رہے ہیں وہ ہے کیا؟

اے ایمان والو! خدا پر ایمان لاؤ

کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا (4:136) اے وہ جو اپنے آپ کو کہتے ہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہوئے ہیں' اے مسلمانو! ' اے وہ جو کہتے ہو کہ ہم مومن ہیں' اے وہ جو کہتے ہو کہ ہمارا خدا پہ ایمان ہے! اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) اوکم بختو! خدا پہ ایمان لاؤ۔ عزیزانِ من! پھر سے سوچیے کہ قرآن نے پہلے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا کہا ہے۔ یہ خطاب کرنے کا کس قسم کا انداز ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا (4:136)۔ ان سب سے پوچھیے کہ صاحب! ذرا اس آیت کے معنی تو بتا دیجیے کہ قرآن نے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا جو کہا ہے تو وہ کس کو مخاطب کر رہا ہے۔ وہ ہمیں مخاطب کر رہا ہے۔ اور اُس کے بعد کہتا ہے کہ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (4:136) ایمان لاؤ۔ وہ ہمارے ایمان کو تسلیم ہی نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ ایمان لاؤ۔ وہ ایمان تسلیم کس طرح سے کیا جائے کیونکہ ایمان تو اِلٰـهٌ وَّفِی الْاَرْضِ پر ہونا چاہیے۔ انہیں تو اتنا ہی آتا ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر سے اس پہ کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے۔ اس پورے دائرے کے اندر تو کفر کے فتوے لگانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جس پہ تم ایمان ثابت کرتے ہو اُس سے پوچھو وہ تو تم سب سے کہتا ہے کہ ایمان لاؤ۔ یا یہ کہیں کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا میں ہم شامل نہیں ہیں' ہم سے اُس نے یہ نہیں کہا۔ پہلے ہی کہہ دو کہ ہم یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا میں شامل نہیں ہیں تو پھر ہمارا تمہارا جھگڑا ہی نہیں ہے "خس کم جہاں پاک" لیکن اگر آپ سب اس میں شامل ہیں تو اُس کے بعد بھی دوسروں پہ کفر کا فتویٰ لگا رہے ہیں جبکہ قرآن کہتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136)۔

سب سے پہلے تو خدا کا رسول خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی پر ایمان لاتا ہے

عزیزانِ من! بات اس سے بھی آگے ہے لیکن اُس کی تفصیل میں' میں کسی اور وقت جاؤں گا' یہ وقت نہیں ہے۔ ایمان لانے کی تاکید ہے۔ نبی اکرم ﷺ پر وحی نازل ہوئی' قرآن نازل ہوا تو اس سے بڑا اور صاحبِ ایمان کون ہوسکتا ہے۔ کہا کہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (2:285) رسول بھی اس کے اوپر ایمان لایا ہے۔ عزیزانِ من! ایمان یہ چیز ہے' خود رسول کو بھی ایمان لانا پڑتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس Context (سیاق وسباق) میں یہ چیز نہیں بیان کرونگا۔ یہ اتنی عظیم چیز ہے کہ اہلِ مذاہب ہی نہیں' دنیا کی کسی کتاب میں آپ کو یہ بات کہیں نہیں ملے گی کہ وہ رسول جو خدا کی وحی دوسروں کے سامنے پیش کر رہا ہے تو اُس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ خود پہلے اس کے اوپر ایمان لایا ہے۔ رسول اس کے اوپر ایمان لاتا ہے تو ہم آپ کونسے باغ کی مولی ہیں۔

قرآن انسانوں کے خودساختہ ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا

یہ ایمان لانا کیا چیز ہے؟ جنہیں بھی ہم کہتے ہیں کہ خدا پر ایمان لاتے ہیں تو یہ کیا چیز ہے؟ خدا کا کچھ تصور تو ہر ایک کے ذہن میں ہوتا ہے۔ وہ ہر ایک کے تصور کے مطابق ایمان کو ایمان نہیں مانتا۔ ہر ایک کے ذہن میں خدا کا الگ الگ تصور ہے لیکن قرآن خدا کا وہ تصور دیتا ہے' جو خدا نے خود اپنے متعلق دیا ہے۔ کوئی دوسرا شخص خدا کے متعلق صحیح تصور دے ہی نہیں سکتا۔ وحی کی جو بنیادی ضرورت ہے وہ خدا کا صحیح تصور دینا ہے۔ اور میں یہ عرض کردوں کہ قرآنِ کریم نے خدا کا جو تصور دیا ہے اگر وہ صحیح تصور ہمارے سامنے ہو تو سارا اسلام سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ جو اٰمَنَ الرَّسُوْلُ (2:285) ہے کہ رسول بھی خدا کے اُس تصور پر ایمان لاتا ہے جو خود خدا نے وحی کے ذریعے سے رسول کو دیا ہے کیونکہ اُس سے پہلے رسول کے ذہن میں خدا کا کوئی تصور تھا تو اُسے بھی اُس تصور کی بجائے اس تصور کو ماننا پڑتا تھا۔ اور وہ بنیادی تصور یہ ہے کہ جیسے وہ السمآء میں الٰہ ہے اسی طرح سے وہ تمہاری ارضی زندگی کے اندر بھی الٰہ ہونا چاہیے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ (2:285) اکیلا رسول ہی نہیں بلکہ جس طرح سے باقی مومنین ایمان لاتے ہیں اُسی طرح سے رسول ایمان لاتا ہے۔ اسی لیے رسول نے کہا تھا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163) میں سب سے پہلے ایمان لا کر اسلام لایا ہوں۔ یعنی سوچیے کہ یہ پوری آبادی خواہ وہ ایک ارب کی ہے یا نوے کروڑ کی مسلمانوں کی آبادی ہے۔ تو کیا ہم ساری زندگی میں کبھی خدا پر ایمان لائے ہیں؟' کبھی ایسا Occasion (موقع) ہوا ہے کہ آپ خدا پہ ایمان لائے ہوں؟ جبکہ وہ تاکید کرتا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (2:136) اے ایمان والو! ایمان لاؤ لیکن ہم کبھی ایمان لائے ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ہم اُس ایمان کے معیار پہ ہیں ہی نہیں' ہم اُس کی نگاہ میں ایمان والے ہیں ہی نہیں۔ وہ تو کہتا ہے کہ ایمان لاؤ اور ہم تو ایمان نہیں لائے۔

ایمان لانے کے ثبوت میں انسان کو کچھ کرنا پڑتا ہے

آپ یاد رکھیے کہ امنوا کا یہ لفظ تو Verb (فعل کی حالت میں) ہے کہ اٰمِنُوْا ایمان لاؤ' یؤمنون ایمان لائے۔ یعنی اس میں کچھ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایسے نہیں ہے کہ جیسے میرا نام غلام احمد ہے تو میرا نام رکھ دیا ہوا ہے اور ساری عمر وہی نام چلا آتا ہے' اس نام کے لیے مجھے کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ الف ب سیکھنے کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اسے Verb (فعل) کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ایمان کے لیے Verb (فعل) کی بات ہے' کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا وہ جو ایمان لائے' جنہوں نے ایمان کے لیے کچھ کیا۔ یؤمنون جو ایمان لاتے ہیں۔ ہر جگہ فعل یعنی Verb کا صیغہ آیا ہے۔

عزیزانِ من! یہ تو دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے بعد' سوچ اور فکر کے بعد' شعور کے بعد' تدبر کے بعد' تعقل کے بعد'

بصیرت کے بعد' قلب و دماغ کے اطمینان کے بعد' اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہے کہ میری ارضی زندگی کے اندر بھی اقتدار صرف اُس کے قانون کا ہوگا۔ یہ ہے جسے ایمان کہا جائے گا۔ ایمان تو ایک طرف رہا کفر کے لیے بھی قرآن میں Verb (فعل) کا صیغہ آیا ہے۔ ان **الـذیـن کفروا** ۔ پیدائشی طور پر نہ کوئی مومن ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی کافر ہوتا ہے۔ یہ جو National Distribution (قومی تقسیم) ہے' یہ الگ چیز ہے' میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ مسلمان قوم اپنے آپ کو تو مسلمان کہتی ہے' تو یہ ایک قوم کی حیثیت سے دنیا میں ہے۔ اسی طرح سے جو غیر مسلم ہیں' وہ ان سے الگ ایک قوم ہیں لیکن یہ جو ایمان کا سوال ہے تو وہ تو ہر شخص کو خواہ مسلمان کے گھر میں بھی پیدا ہوا ہے تو اپنی زندگی میں وہ جب بھی اُس کو سمجھے تو اُس کو ایمان لانا پڑتا ہے اس طرح جیسا قرآن نے رسول سے کہا کہ وہ بھی ایمان لایا تھا۔ یہ جو اس طرح خدا پر ایمان لانے والے ہیں' یہ ہیں قرآن کی رو سے **یٰٓـاَیُّھَـا الَّـذِیْنَ اٰمَنُوْٓا** ' ورنہ تو یہ مسلمان ہیں۔ ایمان پورے کے پورے عقل و شعور کے بعد لایا جاتا ہے۔

وہ تو سورۃ الفرقان کی آیت آپ کو معلوم ہے' قرآن بتاتا ہے کہ مومن کون ہوتے ہیں۔ مومن وہ ہوتے ہیں' جو اس طرح سے ایمان لاتے ہیں کہ **وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا** (25:73) اور تو اور خدا کی آیات بھی ان کے سامنے پیش کی جائیں تو وہ ان کے سامنے بھی اندھے بہرے ہو کر نہیں جھکتے۔ یوں ایمان لایا جاتا ہے۔ عقل و فکر کے بعد' تعقل کے بعد' آنکھیں اور کان کھول کر پھر Accept (تسلیم) کرتے ہیں۔ اور جب کسی چیز کو عقل و فکر کی بنیادوں پہ Accept (قبول) کیا جائے تو اُس میں تزلزل واقع نہیں ہوتا۔ لغزش اُس میں آتی ہے جس کو آپ نے عقل و فکر و دلائل و براہین کی رو سے کسی چیز کو نہیں مانا ہوتا' جونہی کسی نے آ کر اُس سے زیادہ بڑی تجویز دی تو آپ کے ایمان میں لغزش آ گئی۔

ہمارے ہاں عقل و فکر کو دعوت دینا ایمان کی کمزوری تصور کیا جاتا ہے

ہمارے ہاں تو **یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ** کے متعلق کہا ہی یہ جاتا ہے کہ ایمان لانے کے اندر عقل و فکر کو کوئی دخل نہیں ہوتا' ہمارے ہاں تو اس ایمان کی انتہا ہے۔ ان کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ایک حدیث ہے کہ **اھل الجنة سُفہٌ** جنت میں جتنے بھی ہونگے سب بیوقوف ہونگے۔ ''اللہ پناہ دیوے اوس جنت توں۔ اک بیوقوف نال واہ پے جاوے تے عذاب ہو جاندا اے[1]''۔ اب ایمان اور کفر کا امتیاز دو فقروں میں آ گیا۔ کہا کہ **وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ** (5:44) آ و تمہیں بتائیں کہ کفر اور ایمان کا امتیاز کیا ہے۔ جو بھی خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا' حکومت قائم نہیں کرتا' وہ کافر ہوتا ہے۔ اب سمجھ لیا کہ

---

[1] اُس جنت سے اللہ پناہ دے۔ ایک ہی بیوقوف سے واسطہ پڑے تو عذاب ہو جاتا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کے بعد اٰمَنُوْٓا کیوں کہا ہے۔ اے وہ کہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے پھرتے ہو! ایمان لاؤ اس بات کے اوپر کہ تمہاری زندگی کے اندر صرف کتاب اللہ کی حکومت ہوگی' کسی اور کی نہیں ہوگی۔ مانتے ہو تو ایمان کے درجے میں تم آتے ہو' نہیں مانتے ہو تو جیسے یہ باقی اور مکھیاں وغیرہ پھرتی ہیں' تم بھی پھرتے رہو گے۔ اب یہ بات سمجھ آئی کہ جب ان سے کہا جائے کہ صاحب! یہ کائنات کس نے بنائی' یہ مینہ کس نے برسایا' یہ پودے کون اگاتا ہے تو کہتے ہیں کہ صاحب! الحمدللہ خدا نے کیا ہے۔ اور اُس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ **فَاَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ** (29:61) جب تم اپنی دنیا کی طرف آتے ہو تو یہاں تمہیں کیا موت پڑ جاتی ہے کہ تم یہاں خدا کو نہیں مانتے۔ ہجرت کے معنی یہ ہیں کہ جہاں خدا کو صرف پرستش کے لیے مانتے تھے اور یہاں سے اب تم وہاں جا رہے ہو جہاں صرف خدا کی کتاب کی حکومت ہوگی۔ دیکھ رہے ہیں کہ ہجرت کے معاملے میں قرآن کیا کیا فرق بتاتا چلا جاتا ہے۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے' دنیا اور اس کی متاع بڑی اہم چیز ہے۔ قرآنِ کریم نے' مومن تو بہت آگے ہے' آدم کا مقام یہ بتایا ہے کہ **سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا** (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہم نے سب تمہارے لیے تابع تسخیر کر دیا ہے:

مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

کیا بات ہے اس شخص [1] کی! کہا کہ

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

تسخیر کائنات مقصود بالذات نہیں ہے

تسخیرِ کائنات کو' بنیادی متاع کی تسخیر کو' اتنی اہمیت ہے لیکن گھوڑے کو سواری کے لیے مسخر کر کے رکھنا اور گھوڑے کو اصطبل میں کوتل گھوڑا کر کے باندھ رکھنے میں بڑا فرق ہے۔ پہلا گھوڑا آپ کو منزل تک پہنچانے کا ذریعہ ہے' مقصود بالذات نہیں ہے۔ اُس گھوڑے کی پرورش ضروری ہے' کھانہ دانہ ضروری ہے' دیکھ بھال ضروری ہے لیکن وہ آپ کے مقصد کے حاصل کرنے کا فقط ایک ذریعہ ہے۔ اور اگر اُسی کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے کہ جیسے وہ سنتے ہیں کہ بادشاہوں کی طرح ہوتا تھا کہ یہاں سے وہاں تک کوتل گھوڑے بندھے ہوئے ہیں اور ان کے اوپر بڑا خرچ آتا تھا' بڑی دیکھ بھال ہوتی تھی۔ وہ بادشاہ ان کو بندھا دیکھ کر ہی خوش ہوتے تھے۔ یعنی وہ مقصود بالذات ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دنیا' اس کی متاع' یہ کائنات اور اس کی تسخیر نہایت ضروری ہے لیکن صرف ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

ہونے کی جہت سے ہے اور اگر یہی زندگی کا مقصد بن جائے تو پھر یہ جو چیز ہے لھو ولعب سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہاں تک قرآن کہتا چلا آیا کہ رزق کا بھی سامان ہوگا' ذات کا بھی سامان ہوگا لیکن یہ دنیا' اس کی متاع' جتنا کچھ اس کے اندر ہم نے دیا ہے وہ **وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ** (29:64) یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ اگر اس کو مقصود بالذات سمجھ لو گے تو یاد رکھو! یہی تمہیں نقصان دے جائے گی۔

انسان کا یہ جسم اور اس کے یہ تمام اعضا مقصود بالذات نہیں ہیں

میں اُس گھوڑے کی مثال سے بھی ذرا نیچے اترتا ہوں اور واضح کرتا ہوں۔ یہ آپ کے ہاتھ' پاؤں' آنکھیں' یہ سارے جتنے اعضا ہیں' یہ آپ کا جو ارادہ ہوتا ہے' جو فیصلہ ہوتا ہے' اُس کے بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ہاتھ طاقتور ہونا چاہیے تاکہ جب آپ کسی کو مضبوطی سے گرفت کا فیصلہ کریں تو یہ اُس کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ جو ہماری زندگی کی موجودہ سطح ہے' اس میں انسانی ذات کے فیصلے کو بروئے کار لانے کے لیے اس جسم کے اعضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جو جسم ہے یہ مقصود بالذات نہیں ہے' یہ اُس ذات کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ وہ فیصلے کس قسم کے کرتے ہیں۔ کسی کا گلہ گھونٹنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو پھر بھی یہ ہاتھ اُسی طرح گرفت کرتا ہے۔ گلہ گھونٹنے والے کے ہاتھ کو چھڑانا چاہتے ہیں تو پھر بھی آپ اُسی طرح سے زور دیتے ہیں۔ ہاتھ کا تو کام اتنا ہی تھا کہ وہ آپ کے فیصلے کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ کہا کہ یاد رکھیے! یہ کائنات' اس کی قوتیں' بڑی اہم ہیں لیکن ان کا مقصد صرف اتنا ہے اور یہ مقصود بالذات نہ بن جائیں۔ ہجرت کا پہلا مقام جہاں باطل کا نظام ہے وہاں یہ دنیا کی متاع' دنیا کی دولت' یہ سب چیزیں' مقصود بالذات بن جاتی ہیں۔ اور جہاں ہم تمہیں لیے جا رہے ہیں' اُس نظام میں یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! نکتہ ہجرت کا چلا تھا۔ دیکھنے کو یہ آیتیں آپ دیکھتے ہیں کہ کس قدر مختلف مضامین کو لیے چلی آ رہی ہیں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح اُسی کی تشریح کرتی چلی آ رہی ہیں! ان تمام کے اندر کتنا معنوی ربط ہے! کہا کہ یاد رکھو! وہاں یہ چیزیں یوں نہیں ہوگی جیسے یہاں اس کو مقصود بالذات بناتے ہو۔

لہو ولعب کا مفہوم اور اس کا ماحصل

دو الفاظ یہاں آئے ہیں: **لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ** (29:64)۔ یہ الفاظ تو ہمارے ہاں بھی ہیں۔ یہ جتنے واعظ حضرات ہیں' یہ بھی استعمال کرتے ہیں کہ یہ ساری دنیا **لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ** کی زندگی ہے لیکن خود گردن گردن تک اُس میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب بھی آپ کہیں مردم شماری کر لیجیے تو سب سے زیادہ تنومند و توانا یہ ہوتے ہیں جن کے نزدیک دنیا کی زندگی **لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ** کی زندگی ہوتی ہے۔ یہ **لَهْوٌ وَّ**

لَعِبٌ کیا چیز ہے؟ عربوں کے ہاں ہر وہ شے جو کسی بلند مقصد کو نگاہوں سے اوجھل کر دے اُسے وہ **لَھُوٌ** کہتے تھے۔ نکلا ہے منزل پر جانے کے لیے راستے میں ایک طرف اُس کو ہرن دکھائی دیا ہے اور وہ اُس کے پیچھے دوڑ پڑا ہے تو یہ عربوں کے نزدیک **لَھُوٌ** ہو جاتا ہے۔ اگر دنیاوی متاع اور اس کے مقاصد، بلند مقصد سے غافل کرتے ہیں تو یہ **لَھُوٌ** ہو جاتا ہے۔ **لَعِبٌ** اس سے بھی بڑی دلچسپ چیز ہے۔ کشتی دریا میں یا پانی میں ہے، موجیں اس کو مسلسل حرکت میں تو رکھ رہی ہیں لیکن ساحل کی طرف نہیں آنے دیتیں تو ہر وہ چیز جو حرکت میں تو رکھے لیکن ساحل کی طرف نہ آنے دے، اُسے عرب **لَعِبٌ** کہتے ہیں۔

انسانی ذات کی نشو ونما کا انحصار انسانی مقاصد کے حصول پر منحصر ہے

یہ ہے دنیا کی اس متاع کی حقیقت۔ یہ نہایت ضروری ہے، اس کی تسخیر بڑی ضروری ہے جیسے تندرست جسم کی بڑی ضرورت ہے لیکن ہے صرف ایک بلند مقصد کے حصول کے لیے۔ انسان کا یہ جسم جب اُس کے فیصلے کو بروئے کار لاتا ہے تو اس سے انسان کی ذات کی نشو ونما ہوتی ہے، اُس کا ایک مقصد حاصل ہوتا ہے۔ مفلوج جسم ہو تو فیصلے کو بروئے کار نہیں لا سکتے، انسانی ذات کی نشو ونما نہیں ہو سکتی۔ انسانی ذات کی نشو ونما اس کے مقصد کے حصول سے ہوتی ہے۔ یہ ہے اصل مقصد اس کائنات کا اور اس میں طبعی زندگی کا:

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن

دیکھیے نشو ونما کے لیے کیا بات کہی! آہ و نالہ کے معنی تو اس کا وہی گداز ہوتا ہے:

ترا دیں نفس شماری، مرا دیں نفس گدازی [1]

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

اس کی یہ اہمیت ہے کہ یہ چمن مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے۔ یہ نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے۔ اسے سیرِ گل کے لیے سمجھنا یا آشیاں کے لیے سمجھنا غلط نگہی ہے۔

نہ تُو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تُو نہیں جہاں کے لیے

---

[1] تُو مری نظر میں کافر میں تری نظر میں کافر ترا دیں نفس شُماری، مرا دیں نفس گدازی (اقبالؒ: ضربِ کلیم)

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

یہ زندگی تو انسان کی آنے والی زندگی کا دیباچہ ہے

کہا ہے کہ وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ط وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (29:64) زندگی تو اس کے بعد شروع ہونے والی ہے' اس آہ و نالہ کی پرورش کرلو' یہاں اس کی نشو ونما کا سامان بہم پہنچاؤ۔ اور اُس کے بعد پھر دیکھو کہ زندگی تو وہ شروع ہوگی' یہ تو تمہید ہے۔

جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

کہا کہ یہ تو کتاب کا دیباچہ ہے۔ زندگی تو اس کے بعد ابھی شروع ہونی ہے۔

عربی زبان ایک بے مثل زبان ہے: ابواب اور مادوں کی ایک دو مثالیں

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' یہ عربی بھی عجیب زبان ہے۔ ایک تو میں نے کہا تھا کہ ان کے ہاں کسی لفظ کا Root یا مادہ عموماً تین حرفوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ اس معنی کی بنیاد ہوتا ہے اور اوپر یہ درخت کی شاخیں ہوتی ہیں اور پتے اور پھول ہوتے ہیں لیکن جڑ یعنی مادہ وہی ہوتی ہے۔ Root (مادہ) کے بنیادی معنی ہر جگہ وہی جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک ''باب'' ہوتا ہے اور باقی اُس کے Root (مادہ) ہوتے ہیں' شاخیں ہوتی ہیں۔ تو وہی لفظ جب مختلف ابواب اور اوزان میں آتا ہے تو پھر پوچھو ہی نہیں کہ معنوں میں کیا فرق پیدا کرتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (29:64)۔ یہ جو الْحَيَوَانُ لفظ ہے تو مادہ تو اس کا بھی الحیٰوۃ ہے اور الحیٰوۃ تو ان کے نزدیک مسلسل حرکت کا نام تھا۔ انہوں نے اس چیز کا تصور لیا۔ حیاۃ سانپ کو کہتے ہیں کہ وہ ہر وقت حرکت میں رہنے والا' تڑپنے والا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی تو یہ ہے کہ جو ہر وقت تڑپتی رہے۔ الحیٰوۃ تو زندگی ہوئی۔ الْحَيَوَانُ بھی الحیٰوۃ کے مادہ کا ہی لفظ ہے لیکن باب بدلا ہوا ہے۔ یہ حَيِّي يَحْيٰى کا مصدر ہے اور فعلان کے وزن پر ہے۔ ان کے ہاں ایک باب فعلان ہوتا ہے اور ایک باب فعیل ہوتا ہے۔

رحمان اور رحیم کے الفاظ میں ایک بنیادی فرق

یہ الفاظ جو شروع میں اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ . اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (1:1-2)۔ ہمارے

ہاں تو ان کا ترجمہ صرف یہ کر دیا کہ مہربان' بہت مہربان۔ Merciful and Beneficient یہی ترجمہ کرتے ہیں لیکن دیکھا نہیں ہے کہ وہ ایک ہی Root (مادہ) سے دو اوزان کیوں لایا ہے؟ فعیل کے وزن پر جو لفظ ہوتا ہے اس کا مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی شے جو ایک لگے بندھے قاعدے قانون کے مطابق مسلسل ہوتی چلی جائے اُس کے لیے جو التزاماً ہوتا ہے' وہ فعیل کے وزن پر ہوتا ہے جیسے یہ رحیم ہے۔ اب جتنے لفظ اس باب پہ آئیں گے تو ان کے معنی تو وہی ہونگے جو اُس Root یا مادے میں ہیں لیکن اُس میں خصوصیت یہ ہوگی کہ ایک تسلسل کے ماتحت' ایک قاعدے کے ماتحت' اُسی طرح سے التزاماً ہوتا چلا جائے۔ اور جونہی وہی Root (مادہ) فعلان کے وزن پہ آئے جیسے الرحمٰن ہے تو فعلان کے وزن کے معنی ہوتا ہے کہ وہ چیز اُس بندھے لگے قاعدے کے مطابق نہ ہو بلکہ ضرورت کے مطابق فوری طور پہ کوئی چیز نمودار ہو جائے مثلاً اُس کی پرورش کی جو صفتِ رحیمیت ہے وہ قاعدے قانون کے مطابق ہو رہی ہے لیکن درمیان میں ایسے مواقع آ جاتے ہیں کہ جہاں وہ By Emergent (فجائی طرح سے) کچھ ہوتا ہے تو یہاں کوئی چیز فوراً کچھ کرنی پڑتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ ایسے مواقع جہاں کوئی چیز اُس کو یک لخت کرنی پڑتی ہے تو اُس کے لیے باب فعلان ہوتا ہے۔ رحیم وہ پرورش ہے جو قاعدے قانون کے مطابق ہوتی چلی جائے۔ جیسے رحمِ مادر کے اندر بچے کی پرورش ہے وہ ایک انداز ہے۔ جونہی بچے کی پیدائش ہوئی اور اُس نے اس زندگی کے اندر آ کر سانس لیا تو سارے وہ قاعدے بدل جاتے ہیں اور یہاں اُس کے لیے یک لخت ایک نیا قاعدہ شروع ہو جاتا ہے۔ رحمِ مادر میں وہ ماں کی چھاتیوں سے دودھ نہیں پیتا ہے' وہاں وہ اس طرح سے سانس نہیں لیتا ہے' حالانکہ نشوونما مسلسل ہو رہی ہوتی ہے۔ جونہی اُس کی پیدائش ہوئی ہے تو وہ سارے قاعدے بدل گئے اور یک لخت ایک نیا قاعدہ شروع ہو گیا۔ وہ رحیم تھا اور یہ رحمٰن ہے [1]۔

آئندہ ملنے والی انسانی زندگی کا دارومدار کسی نئے قانون کے تابع ہوگا

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ یہ جو یہاں کی زندگی ہے' یہ وہ حیات ہے جو Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع چلتی ہے' قاعدے قانون کے مطابق چلتی ہے۔ اس کے بعد بھی زندگی ہے اُس زندگی کے لیے اُس کو کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی' وہ فعلان کے وزن کے اوپر الحیوان لفظ لے آیا ہے کہ اس قاعدے اور قانون کو چھوڑ کر یک لخت کسی اور قانون کے مطابق ایک زندگی ملے گی لیکن لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ (29:64) اے کاش! یہ لوگ علم سے کام لیتے تو پھر سمجھ میں آتا کہ ہم کیا کہہ گئے ہیں۔ کہا کہ یہ جو

---

[1] اس کی مزید تفصیل وتشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحۃ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔ 105 تا 116 نیز مادہ (Root) اوزان' افعال' اور ابواب کے نکات کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الانبیاء' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005 ص ص 20 تا 21 نیز انہی 2 صفحات کے فٹ نوٹ۔

یوں خدا کو ماننے والے ہیں تو ذرا ان کی خدا پرستی دیکھا کرو۔ کہتا ہے کہ **فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ o لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ۙ وَ لِیَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ** (29:65-66) ان کی یہ کیفیت ہے کہ عام حالات میں جو مانتے ہیں، وہ کشتی میں سوار ہوں اور کشتی بھنور میں پھنس جائے تو اُس وقت ان کی کیفیت دیکھو کہ دعائیں کریں گے یا اللہ! ہمیں بچالے' مولا! ہمیں بچالے۔''مولا تے اک پاسے رہیا' ایہہ تے کہندے نیں او یارہویں والے! آ بچالے تے اپنے دی نیاز کراں گے [1]''۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کیونکہ یہ اسی زندگی کو زندگی سمجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُس وقت جو خدا ہے وہ ان کو یوں یاد آتا ہے اور جونہی وہ کشتی ساحل پہ لگی تو پھر کہاں کا خدا اور کہاں کی نیاز۔

گم شدہ بیل کے ملنے کی صورت میں نیاز بانٹنے کے وعدہ سے انحراف

''اومر میراثی دا بیل چوری ہو گیا سی [2]''۔ وہ اُس کی تلاش میں نکلا۔ پیر مجاز! میرا بیل مل جائے تو میں تمہیں پانچ روپے کی نیاز دیدونگا' آگے گیا تو کہا: یارھویں والے! میرا بیل اگر مل جائے تو میں گیارہ روپے کی نیاز بانٹوں گا' آگے گیا تو کہا: شاہ گھوڑے شاہ! میرا بیل مل جائے تو میں سترہ روپے کی نیاز بانٹوں گا۔ تو کسی نے کہا کہ ''اوئے! بیل تیرا تے سارا تیناں روپیاں داسئ تے توں نیازاں منی جان ڈیاں ہیگاں ایں' تے توں ویکھیا وی ہے کہ کنے اک روپیے بنڑ گئے۔ کہندا: رسی ہتھ پے لین دے ساریاں نوں جھل دیدیاں گا [3]''۔ کہا کہ ان کے ایمان کے مظاہرے تو یہ ہوتے ہیں' یہ بھی اپنے آپ کو **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا** کہتے ہیں لیکن یہ ایمان نہیں ہے۔ وہ آپ کو یاد ہے کہ میں تلسی داس (1624-1550) کا ہندی کا دوہا سنایا کرتا ہوں کہ

دکھ میں تو ہر کو بھجیں سکھ میں بھجیں نہ کو
جو سکھ میں ہر کو بھجیں تو دکھ کاہے کو ہو

غلط معاشرے کے اندر یہ سارے خدا یاد آجاتے ہیں:

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا

---

[1] خدا تو رہا ایک طرف، یہ تو کہتے ہیں کہ اے گیارھویں والے! آ، ہمیں بچالے تو ہم اتنے کی نیاز دیں گے۔
[2] وہ ایک میراثی تھا اس کا بیل چوری ہو گیا تھا۔
[3] او بابا! تمہارا بیل تو صرف تین روپے کا تھا اور تم ہو کہ نیاز مانگے جا رہے ہو۔ دیکھا بھی ہے کہ یہ نیازیں کتنے میں پڑیں گی؟ کہنے لگا کہ ایک دفعہ بیل ہاتھ آنے دو، پھر دیکھو کہ میں کس طرح ان تمام کو جھل دے جاتا ہوں۔

عربوں کے نزدیک کعبہ کی نوعیت اور ان کی اپنی معاشرتی اور تمدنی زندگی

کہا کہ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (29:66) اس ذہنیت اور نہج زندگی کا انجام عنقریب ان کے سامنے آ جائے گا۔ انہی آنے والوں کو کہا کہ ہم تمہیں اس نظام کی طرف لیے چلے جا رہے ہیں۔ ذرا سا اندازہ لگائیے کہ تم نے اس کعبہ کو بُت کدہ بنا دیا ہے لیکن خدا کے نام کی طرف تم نے اس کو منسوب کیا ہوا ہے۔ صرف اُس کے نام کی طرف منسوب کرنے کی کیفیت یہ ہے کہ سارے عرب میں' سب سے ممتاز حیثیت' تمہاری ہے۔ یہ عرب کے قافلے جو سامانِ تجارت لے کر جاتے تھے اور سامانِ تجارت ہی ان کا ذریعہ معاش تھا کیونکہ زرعی پیداوار تو ہوتی نہیں تھی۔ کیفیت ان کی یہ تھی کہ سارا ملک ہی لوٹ کھسوٹ میں مصروف تھا' قافلوں میں لٹ گئے' میدانِ جنگ میں جو قابو آیا وہ لے آئے۔ میدانِ جنگ میں بھیڑوں کے علاوہ ہوتا ہی کیا تھا' یہ غنیمت لفظ غنم سے نکلا ہے جس کا مطلب بھیڑ ہے۔ بات میں سے بات یاد آئی کہ دیکھیے مرورِ زمانہ کا لفظوں پہ کتنا فرق پڑتا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ غنیمت ہے کہ اتنا ہاتھ میں آ گیا لیکن کبھی ذہن میں آیا کہ ''بھیڑ تے کوئی لبھی ہی نہیں ہیگی تے اسی غنیمت کیوں کہنے ہیگے آں❶''۔ اسی لیے جو میں کہا کرتا ہوں کہ اگر قرآن کو سمجھنا ہو تو اوریجنل معنی کی طرف جاؤ' ورنہ غنیمت کے معنی یہی ہونگے جو ہم آج کل کہتے ہیں۔ وہ تو لوٹ کھسوٹ وہاں اتنی تھی لیکن یہ قریش کے قافلے قرآن کہتا ہے کہ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ (106:2) تم دیکھتے نہیں کہ تمہارے قافلے سردی گرمی ادھر سے وہاں' وہاں سے یہاں' چلتے جاتے ہیں۔ کہا کہ ایک خدا کی طرف نسبت رکھنے سے تمہیں یہ مقام حاصل ہے۔ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ (106:3) او! اگر تم اُس خدا کے محکوم بن جاؤ تو پھر دیکھو کہ تمہارا مقامِ انسانیت کہاں چلا جاتا ہے۔ ''ایہدے نام نال نسبت رکھن نال تہاڈی ایہہ کیفیت ہیگی اے' عبداللہ نام کہلان نال تہاڈی اے کیفیت ہیگی❷ اے''۔ اگر واقعی تم اللہ کے عبد ہو جاؤ تو دیکھو کہ کہاں جا پہنچتے ہو۔ وہاں درحقیقت ہم تمہیں بتائیں گے کہ وہ نظام خدا کا ہوگا' کعبہ اُس کا مرکز ہوگا۔ کہا کہ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ط اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ❸ (29:67) یہ اتنی سی نسبت سے اتنا کچھ تمہیں حاصل ہو رہا ہے' کہیں تم

---

❶ بھیڑ تک تو کوئی ملی نہیں' پھر ہم غنیمت کیوں کہتے ہیں۔

❷ اس کے نام سے نسبت رکھنے سے تمہاری یہ کیفیت ہے۔ عبداللہ نام کہلوانے سے تمہاری یہ شان ہے۔

❸ (اگر انہوں نے یہ دیکھنا ہو کہ جس سرزمین میں ہمارے قانون کا احترام کیا جاتا ہے' اس میں انسان کیسے امن سے زندگی گزارتا ہے' تو اس گئے گزرے زمانے میں بھی) اس کی مثال حرم کعبہ کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ جو شخص وہاں پہنچ جائے' وہ ہر خطرہ سے مامون ہو جاتا ہے حالانکہ اردگرد بے امنی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ لوگ دن دھاڑے اچک لیے جاتے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ کیا ایسی واضح شہادت کے بعد بھی یہ اپنے خود ساختہ غلط نظام پر ایمان رکھنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہے اور ان خوشگواریوں سے منہ موڑنا چاہتے ہیں جو ہمارے قانون کے اتباع کا لازمی نتیجہ ہے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔928)

اُس کے بن جاؤ تو پھر کیا پوچھنا۔لیکن مصیبت یہ ہے کہ تم باطل پر تو ایمان رکھتے ہو کہ صرف خدا کی طرف نسبت ہونی چاہیے۔اور جب ہم تمہیں اُدھر بلاتے ہیں تو اُس سے سرکشی برتتے ہو۔کبھی ایک دفعہ اُس کے ہو تو جاؤ۔وہ (مرزا اسداللہ خاں) غالب [1] بڑے زور کی بات کہہ گیا ہے:

دلِ ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

خدا کے نام پر فتویٰ لگانے والوں کی حالتِ زار

عزیزانِ من! کبھی اُس کے ہو تو جایئے۔ **وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوۡ کَذَّبَ بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَہٗ ؕ اَلَیۡسَ فِیۡ جَہَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡکٰفِرِیۡنَ** [2] (29:68)۔یہ اس سورۃ کی آخری آیتیں آ گئیں اور میں نے کہا ہوا ہے کہ سورۃ کی آخری آیتوں میں تو ''تت کڈھ کے رکھ دیندے نیں [3] '' نچوڑ ہوتا ہے۔کہا کہ ایک تو وہ شخص ہے جو خدا کی بات نہیں بلکہ اپنی بات کرتا ہے اور خدا کی طرف منسوب کرتا ہے' کہتا ہے کہ کیا اس سے بڑا ظالم بھی کوئی ہوگا؟ اور پھر **یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡہِمۡ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ ہٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ** (2:79) خود فتوے لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے۔ایک تو یہ ہے اور دوسرا یہ ہے کہ **اَوۡ کَذَّبَ بِالۡحَقِّ** (29:68) واقعی جب خدا کی کتابِ حق کو پیش کر دیا جائے تو وہ اس کی تو تکذیب کرے اور جو اپنی بات ہے اُس کو خدا کی شریعت بتائے۔یہ دونوں جرائم ہمارے ہیں۔

عزیزانِ من! آخری آیت پہ آ گیا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ جو اہم ترین مسئلہ ہے وہ اس میں حل ہو جاتا ہے۔ قرآن کے متعلق کہا ہے کہ **تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ** (6:116) اور **ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ** (98:5) یہ خدا کا قانون مکمل ہے' غیر متبدل ہے'اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا' تبدیلی نہیں ہو سکتی' اسے محفوظ کر دیا گیا(15:9) یہ **ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ** (12:104) ہے' یہ قیامت تک کے لیے ہو گیا۔تو اب ایک ایسی شے جو غیر متبدل ہے' مکمل ہے' محفوظ ہے بس یہی وہ محکم نظامِ زندگی ہے جو انسانیت کے قیام کا ضامن ہے تو اُس میں کسی قسم کے غور و فکر کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

---

1. مرزا اسداللہ خاں غالب(1869-1797)
2. یہ سب کچھ واضح طور پر کہہ دینے کے بعد' اس سے پوچھو کہ اس سے زیادہ سرکش اور مجرم اور کون ہو سکتا ہے جو اپنے ذہن سے باتیں وضع کرے اور انہیں خدا کی طرف منسوب کر دے۔یا جس کے پاس' خدا کی طرف سے' حق کی بات آ جائے اور وہ اس کی تکذیب کرے۔کیا اس قسم کے منکرینِ حقیقت کا آخری ٹھکانہ وہ نہیں جہاں زندگی کی کھیتیاں جھلس کر راکھ کا ڈھیر ہو جایا کرتی ہیں؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔928)۔
3. نچوڑ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔

تو اس بات میں تدبر کا ہے کا' تفکر کا ہے کا۔ اسی کا نام اُس نے صراطِ مستقیم کہا ہے' خود خدا کا راستہ کہا ہے۔ اور کہا ہے کہ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (11:56) تیرا خدا صراطِ مستقیم پہ جا رہا ہے۔

صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کے باعث نستعین کی لازوال نعمت سے سرفراز ہونے والوں کا ذکر

اللہ کی کتاب کی ابتدا اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ (1:1) سے ہے اور اُس میں اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (1:5) کی پہلی دعا سکھائی گئی ہے۔ وہ کون ہیں جن کے لیے دعا سکھائی گئی ہے؟ یہ ان کے لیے ہے جو صرف زبان سے ہی اعتراف نہیں کرتے بلکہ اپنی عملی زندگی سے شہادت پہنچاتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَا (1:4) ہم تیرے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرتے بلکہ صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ یہ کا ہے کے لیے کرتے ہیں؟ اس لیے کہ کیا خدا کا بھلا ہو جائے عزیزانِ من! خدا کی محکومیت اختیار کرنے سے خدا کا کچھ نہیں بنتا وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4) کہا ہے۔ نَسۡتَعِیۡنُ کے معنی ہیں کہ بھرپور جوانیاں پیدا ہو جانا' انتہائی شباب آ جانا' جتنی صلاحیتیں انسان کی ہوں ان کو پوری نشوونما مل جانا۔ کہا ہے کہ ہم اس لیے تیری محکومیت اختیار نہیں کرتے کہ اِس سے تیرا کچھ بھلا ہو جائے' تیری سلطنت مستحکم ہو جائے' تمہاری مملکت بڑھ جائے۔ خدا تو مستغنی ہے' وہ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ (3:97) ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اگر ساری دنیا بھی ہمارا انکار کر دے تو ہمارا کچھ نہیں بگڑتا ہے۔ حق تو اپنے مقام پہ الحق ہوتا ہے وہ کسی کے ماننے کا محتاج نہیں ہوتا۔ ہم جو تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں تو اس لیے کہ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4) اس سے ہماری اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے' بھرپور توانائیاں اُس کو حاصل ہوتی ہیں۔

عزیزانِ من! اور کچھ نہیں تو کبھی سورۃ الفاتحۃ[1] پہ ہی غور کر لیا کیجیے۔ یہ سورۃ' نماز پڑھنے والے' دن میں ہر نماز کی رکعت میں دہراتے چلے جاتے ہیں کہ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4). یہ لوگ جو اپنی زندگی یوں بسر کرنے والے ہوں تو ان کے لیے یہ آرزو ہے کہ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (1:5). صراط بالکل سیدھے راستے کو کہتے ہیں' مستقیم ہوتا ہے جس میں اعتدال پورے کا پورا رکھا ہوا ہو' اُس کے اوپر وہ چیز قائم ہو۔ قرآن مکمل ہے' غیر متبدل ہے' محفوظ ہے۔ اسی کے اوپر چلنے کی آرزو ہے' تمنا ہے' خواہش ہے' کوشش ہے' جدوجہد ہے۔ یہ صراطِ مستقیم مومن کا انتہائے آرزو ہے۔ ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ ایک صراط شاہراہ کہیے' اُس کو ہائی روڈ یا ہائی وے کہتے ہیں' وہ کراچی سے شروع ہوئی ہے تو پشاور تک چلی گئی ہے۔ وہ ایک ہی سڑک ہے' آپ اُس سے تو اِدھر اُدھر ہو نہیں سکتے۔

---

[1] سورۃ الفاتحۃ کی مکمل تشریح و تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورہ الفاتحۃ ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007ء۔

اس اعتبار سے تو اس راستے میں' اس دین میں' عقل و تدبر و فہم و فراست کی گنجائش ہی کہیں نہیں رہتی۔ لگا بندھا ایک راستہ اور اُس کے اوپر آنکھیں بند کر کے چلے جانا لیکن زندگی کے تقاضے تو بدلتے رہتے ہیں۔ خود اُس نے یہ کہا ہے کہ **یَسۡـَٔلُهُۥ مَن فِی ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ** (55:29) ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ اُس کا سوالی ہے' وہ اُس سے سوال کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ **كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِی شَأۡنٍ** (55:29) اور خدا ہر آن میں ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔

''كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِی شَأۡنٍ'' کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! خدا نے کہا یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی نشو و نما کے لیے ہمارے قانون کی محتاج ہے' ہمارے ذرائع نشو و نما کی محتاج ہے او راشیائے کائنات کی یہ کیفیت نہیں ہے کہ یہ جامد ہیں' لگی بندھی ہیں کہ بس ایک دفعہ جو بچے کو دودھ دیا ہے تو ساری عمر اُس کے لیے یہی کافی ہو گیا اور کچھ تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ کائنات کی ہر شے کی کیفیت یہ ہے کہ **كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِی شَأۡنٍ** (55:29) وہ تو ہر آن اُس کی نشو و نما کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں اور ہم بدلتے ہوئے تقاضے کے مطابق دیتے رہتے ہیں۔ عربی زبان میں رزق کے بنیادی معنی یہ ہیں: وہ سامانِ نشو و نما جو ضرورت کے مطابق دیا جائے۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں۔ زندگی کے تقاضے تو بدلتے رہتے ہیں' ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ تمدنی زندگی میں آپ پوچھیے ہی نہیں کہ انسان کہاں سے کہاں چلا جاتا ہے۔ ایک شاہراہ ہے' ایک راستہ ہے' اُسی کے اوپر آپ نے چلنا ہے۔ یہ تو پھر مذہب ہے جس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی ہی نہ ہو' کوئی اور راستہ ہی نہ ہو بلکہ اُسی پہ لگے بندھے چلے جانا ہے۔ مسواک کی جتنی لمبائی انہوں نے ہزار سال پہلے متعین کی تھی' اتنی لمبائی کی مسواک اگر ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ نہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ مسجد میں ہر شخص ایک ہی مسواک کو دھو کر استعمال کر لیتا ہے۔ جب وہ اُس لمبائی سے کم ہو جاتی ہے تو پھر وہ غیر شرعی ہو جاتی ہے۔ آپ سوچیے کہ جس مذہب کی کیفیت یہ ہو کہ اگر مسواک کرنے سے اس کی لمبائی کم ہو گئی ہے تو وہ غیر شرعی ہو جاتی ہے' اُس میں کسی اور قسم کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

عزیزانِ من! میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ یہ بنیادی نکتہ ہے جو اس آیت کے آخر میں آ گیا ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ شاہراہ' ہائی وے' ہائی روڈ ایک ہے۔ اگر کسی ملک میں ایک ہی شاہراہ ہو اور کوئی سڑکیں' گلیاں اور پگڈنڈیاں ہوں ہی نہ' تو وہ چل ہی نہیں سکتا' یہ سوال ہی نہیں ہے۔ اور اگر یہ ہائی روڈز مختلف سمتوں کو جانے والی ہوں تو تب بھی مصیبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُس ہائی روڈ کا تو ایک ہونا بڑا ضروری ہے۔

سبیل یا سُبل کا قرآنی مفہوم یعنی صراطِ مستقیم کی طرف جانے والی پگڈنڈیاں

کہا ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا فِیۡنَا (29:69) جو دین کے معاملے میں' زندگی کے تقاضوں کے معاملوں میں' جدوجہد کرتا ہے' کوشش کرتا ہے' اجتہاد کا لفظ یہیں جَاھَدُوۡا سے نکلتا ہے' یعنی سوچتا ہے' لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا (29:69)' سبل کے معنی راستہ ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ جو زندگی کے معاملے میں اجتہاد کرتا ہے' زندگی کے تقاضوں کو سامنے رکھتا ہے اور صراطِ مستقیم کو بھی ذہن میں رکھتا ہے۔ عزیزانِ من! عربی زبان میں سبیل یا سُبل ان چھوٹی پگڈنڈیوں اور راستوں کو کہتے تھے جو مختلف مقامات سے تو نکلیں لیکن آخر میں آ کر صراطِ مستقیم میں مل جائیں۔ کہتا ہے کہ زندگی کے تقاضے تو بڑے بدلنے والے ہیں' جو بھی ان تقاضوں پہ فکر کرتا ہے' غور کرتا ہے تو ہم اُس کو سبلنا بیسیوں راستے دکھا دیتے ہیں۔ عربی زبان کی رو سے سُبل کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ راستہ جو بیشک مختلف سمتوں سے آئے لیکن آخر میں آ کر صراطِ مستقیم میں مل جائے تو اُسے سُبل کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ ہم اُس کو سبل دکھاتے ہیں' بیسیوں راستے دکھاتے ہیں۔ ہر زمانے کے تقاضے کے مطابق ایک نیا راستہ دکھاتے ہیں۔ مال روڈ پہ تم اِدھر سے بھی جا سکتے ہو' اُدھر سے بھی جا سکتے ہو' وہاں ذرا راستے میں پانی آئے گا تو یہ راستہ ذرا ٹھیک ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے دین۔ صراطِ مستقیم جو ہے وہ ایک ہی ہے' غیر متبدل ہے' واحد ہے' مکمل ہے' محفوظ ہے لیکن زندگی کے جو یہ چھوٹے چھوٹے راستے ہیں' مختلف بستیوں سے' شہروں سے' اِدھر سے' اُدھر سے چلے آ رہے ہیں' بالآخر وہ سب راستے آ کر اِس صراطِ مستقیم میں مل جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! بڑے غور سے سننے کی بات ہے کہ قرآن سُبل کی کیا بات کہتا ہے! مومن کی زندگی اور اس کے نظام کو وہ جنت سے تعبیر کرتا ہے۔ کہا کہ عَیۡنًا فِیۡهَا (76:18) اُس معاشرے کے اندر ایک چشمہ ہے' اُس میں سے پانی نکلتا ہے۔ تُسَمّٰی سَلۡسَبِیۡلًا (76:18)۔ لفظی معنی یہ ہیں کہ اُس کا نام سلسبیل ہے۔ یہ نام نہیں ہوتا بلکہ تسمٰی کسی چیز کی خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ اُس چشمے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چلتا جاتا ہے' راستہ پوچھتا جاتا ہے' پوچھتا چلا جاتا ہے اور چلتا چلا جاتا ہے کہ کیا تقاضے ہیں' تمہاری کیا Problem (مسئلہ) ہے' تمہاری کیا کیفیت ہے۔ وہ پوچھتا چلا جاتا ہے' رواں رہتا ہے۔ اور آخر میں جا کر صراطِ مستقیم میں مل جاتا ہے۔ اب راستے میں جو بھی بستیاں آئیں' وہ ہر ایک سے پوچھتا چلا جائے کہ تمہاری کیا دقت ہے' تمہاری کیا صورت ہے۔ میں تو یہ بات کرتا ہوں کہ ہر گھر کے باہر آواز دیتا ہے کہ کتنا پانی چاہیے بہن! ڈول لے کر آ جاؤ' میں آگے جا رہا ہوں' پانی بھر لو۔ وہ ہر گھر کے باہر آواز دیتا چلا جاتا ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق مجھ سے لے لو' وہ کہیں کھڑا نہیں رہتا' چلتا جاتا ہے۔ یہ سَلۡسَبِیۡلًا (76:18) ہے' ہر ایک سے پوچھتا جاتا ہے۔ کیا بات ہے خدا کی کہ ایسے الفاظ چنے ہیں اس کے لیے! پوچھتا چلا جاتا ہے اور پھر آگے

بڑھتا چلا جاتا ہے۔اور یہی ہے وہ جس کو اُس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (88:12) چشمہ ہے' جو رواں دواں رہنے والا ہے۔

ہزار بارہ سو سال سے شریعت کے نام پر بنے ہوئے قوانین کی کیفیت

عزیزانِ من! اور آخری بات ایک نکتے کی کہہ دوں۔شریعت کا نام تو آپ نے سنا ہوگا اور ہر چیز شریعت سے متعلق بھی۔یہ جو شریعت کے مطابق آپ کے قوانین نافذ ہوئے ہیں تو یہ ہزار بارہ سو سال پہلے بنے تھے اور اُس زمانے کے تقاضوں کے مطابق تھے۔ انہی کو اُسی طرح سے نافذ کرنا اور اُن میں جو ذرا ردو بدل ہے ان کے نزدیک اسلام کے خلاف ہے' دین کے خلاف ہے' تو اس شریعت میں روانی نہیں ہے' وہ جاری نہیں ہے' وہ بند ہے۔یعنی اُس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں' وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔وہ قوانین ہزار برس میں جہاں تھے' جیسے بنے تھے' ویسے کے ویسے ہی ہوتے ہیں۔ان کے ہاں شریعت کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں کسی قسم کی تبدیلی جائز نہیں ہوتی۔

عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں' یہ بڑے بڑے علما ہیں' میری کیا حیثیت ہے' ان کو عربی زبان کے لفظ کے معنی پتہ نہیں ہیں کہ کیا ہیں؟

شریعت کے لفظ کا قرآنی مفہوم

عربوں کے ہاں شرع کا لفظ یعنی شریعت کے لفظ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایسا راستہ جو انسان کو یا حیوان کو یا ہر پیاسے کو پانی کے گھاٹ پر لے جائے' یہ پہلی چیز ہے۔ہر راستے کو وہ شریعت یا شرع نہیں کہتے تھے۔اس میں پہلی شرط یہ ہے کہ ہر وہ راستہ جو پانی کے گھاٹ پہ لے جائے۔اور اگلی شرط یہ ہے کہ پانی وہ ہو جو رواں ہو' بند پانی نہ ہو۔اگر بند پانی ہو تو وہ اُس کو کَــــــرَعٌ کہتے ہیں' اُس کو شریعۃ کہتے ہی نہیں تھے۔یعنی وہاں پہنچنے کے بعد بھی اگر دیکھتے ہیں کہ پانی تالاب کا ہے' جوہڑ کا ہے' بند ہے اور بہہ نہیں رہا ہے تو وہ اُس کے لیے شریعت کا لفظ نہیں استعمال کرتے تھے اُس کے لیے ان کے ہاں کَرَعٌ کا لفظ ہے۔پہلی بات یہ ہے کہ شریعت وہ راستہ ہے جو سرچشمۂ حیات پہ لے جائے۔قرآن نے کہا ہے کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (21:30) پانی سرچشمۂ حیات ہے۔ شریعت میں پہلی بات یہ ہے کہ ہر راستہ جو سرچشمۂ حیات کی طرف لے کر جائے اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ وہاں لے کر جائے جہاں پانی رواں ہو' جاری ہو تو اُسے وہ شریعت کہیں گے۔اگر پانی بند ہے' جوہڑ ہے تو وہاں تک جانے والے راستے کو شریعت کہتے ہی نہیں ہیں۔

صراطِ مستقیم پر سفر کرتے ہوئے حسن کارانہ انداز اختیار کرنا شرط اوّلین ہے

عزیزانِ من! یہ تو بنیادی طور پہ' لفظی طور پہ ہی' غلط ہے کہ اس کو شریعت کہا جائے جو ہزار سال پہلے بنی اور آج تک وہ غیر متبدل ہے' نہ یہ زندگی کے سرچشمے پہ لے جانے والی ہے' نہ وہ سرچشمہ جاری ہے کہ جس پہ لے جانے والی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ انسانیت تڑپ

تڑپ کرمر رہی ہے۔قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **وَ الَّـذِیْـنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا** (29:69) جو اس صراطِ مستقیم کے اوپر اجتہاد کرتا ہے تو ہم اُس کو ہزاروں راستے دکھاتے ہیں لیکن ہر راستہ آ کر صراطِ مستقیم میں ملے گا۔اور اب سوال یہ ہے کہ یہ سارا سفر کیسے طے کریں گے؟ کہا کہ **وَ اِنَّ اللّٰـهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ** (29:69) نہایت حسن کارانہ انداز سے سفر کو طے کیجیے گا' افراتفری نہ ہو بلکہ اس میں بھی ایک حسن ہونا چاہیے۔اس راستے کے طے کرنے میں بھی ایک خوبصورتی ہونی چاہیے۔قرآنِ کریم نے اسی لیے نیک اعمال کو بھی اعمالِ حسنہ کہا ہے۔کہا ہے کہ یہ چیز وہ ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ العنکبوت آج ختم ہوئی۔آئندہ ہم سورۃ الروم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

